دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۶۱ ویں جلد

از جنوری ۱۹۴۸ء تا جون ۱۹۴۸ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

جلد ۶۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۸ء عدد ۱

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قومی اور جمہوری حکومت نے اردو زبان کے ساتھ چند مہینون مین جو سلوک کیا وہ غیر ملکی اور مستبد حکومت چند صدیون مین بھی نہ کر سکی تھی، اور اس کے جواز کے لئے جو دلیل پیش کیجاتی ہے، اس کو نہ منطق سے واسطہ ہے نہ سچائی سے، اسے کون منصف مزاج یقین کر سکتا ہے، کہ صوبۂ متحدہ کی اکثریت کی زبان ہندی، اور اردو صرف ۱۴ فیصدی کی زبان ہے، یہان تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہو کہ علمی و ادبی اردو، عام بول چال کی زبان، اور شہری اور دیہاتی زبان مین فرق ہے، لیکن صرف عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش، تلفظ کی صحت و شائستگی اور لب و لہجہ کا کوئی ایسا بنیادی فرق نہین ہے جس کی بنا پر ان زبانون کو بھی مختلف زبانین کہا جائے، چہ جائیکہ ان کو ہندو مسلم زبانین قرار دیا جائے، زبان کی یہ تقسیم بالکل نئی ہے شہر کے باشندون کی زبان خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان، اسی طریقہ سے دیہات کے تمام باشندون کی زبان بالکل ایک ہی، عام بول چال کی زبان ہندو مسلمان یکسان بولتے اور سمجھتے ہین، اور اس کے مقابلہ مین جو زبان گڑھی جا رہی ہے، اسے نہ صرف مسلمان بلکہ وہ ہندو بھی نہین سمجھتے جو سنسکرت سے ناواقف ہین اگر ہندی ہوتی تو بھی غنیمت تھا

اردو نہ صرف اس لئے کہ ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، بلکہ علمی، لسانی، سیاسی اور تمدنی کسی حیثیت سے بھی کوئی ہندوستانی زبان اس کے مقابلہ مین حکومت کی زبان بننے کی صلاحیت نہین رکھتی، وہ خالص ہندوستان کی پیدا شدہ ہے اس مین ہندو مسلم دونون کلچرون کے عناصر یکسان ہین اس کی زمین تمام تر ہندی اور پراکرت کی ہے، صرف گل بوٹے فارسی اور عربی کے ہین، اس کے قاعدے، مادے، مصادر، اور اکثر نام محاورے اور اصطلاحین ہندی اور پراکرت وغیرہ کی ہین، صرف وہ اسماء اور اصطلاحین جو ہندوستانی زبانون مین نہ تھین، یا ان کے مقابلہ مین عربی اور فارسی کی ان سے زیادہ خوبصورت اور زبان کے لئے قابلِ قبول تھین، ان دونون زبانون کی ہین، اور ان مین بیشتر الفاظ کا نو

اتنے چڑھ چکے ہین جنھین ایک دیہاتی بھی آسانی سے سمجھتا ہے زمینداری، کاشتکاری، مقدمہ، عدالت اور حکومت کے مختلف شعبون کے متعلق عربی اور فارسی کی جس قدر اصطلاحین ہین، انھین کون دیہاتی نہین سمجھتا، اردو مین ہندوستان کی پرانی زبانون کے الفاظ کے مقابلہ مین عربی اور فارسی الفاظ کا تناسب چوتھائی سے بھی کم ہے، اس مین ہندو کلچر اور ہندوستان کے مقامی اثرات بھی پوری طرح موجود ہین، اس کی تفصیل مین پڑنے کا یہ موقع نہین ہے، راقم نے کئی سال ہوئے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے اجلاس مین اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ پڑھا تھا، جو اکیڈمی کے رسالہ کے کئی نمبرون مین چھپ چکا ہے،

اردو گو ہندو مسلم عوام کے اختلاط سے پیدا ہوئی لیکن اُس نے حکومت کی گود مین پرورش پائی، اور ایک عرصہ تک ہندو مسلمان ادیبون اور اصحاب علم و قلم کی تصنیفی زبان رہ چکی ہے، اور اب بھی ہے، اس نے ہندوستان کی اکثر پرانی زبانون اور عربی فارسی اور ترکی وغیرہ بیرونی زبانون کے بہترین عناصر کو جذب کیا ہے، اس لئے اس مین جو وسعت ہے، اور علوم و فنون اور حکومت و تمدن کے ہر شعبہ اور ہر شاخ کے متعلق جس قدر الفاظ اور اصطلاحین اردو مین موجود ہین، وہ ہندوستان کی کسی زبان مین بھی نہین مل سکتین، انگریزی حکومت اور مغربی تمدن نے جو نئی چیزین پیدا کین، اُن کے مترادفات بھی اردو مین بن گئے، یا اصل زبان کے جو الفاظ اس مین کھپ سکتے تھے، وہ اس مین جذب ہو کر اردو کا جز بن گئے، اور آج کوئی نیا لفظ ایسا نہین ہے، جس کا مرادف اردو مین موجود نہ ہو، ان مین اکثر زبانون پر چڑھ کر عام ہو چکے ہین، سیاسی حیثیت سے بھی اردو کی کچھ کم اہمیت نہین، ایشیا کے اکثر ملکون خصوصاً ہندوستان کے پڑوسی اسلامی ممالک مین ہر جگہ کم و بیش اردو کے سمجھنے والے موجود ہین، ایشیا کے جن ملکون مین بھی مسلمانون کی قابل لحاظ آبادی ہے، ان مین اردو نامانوس نہین اس لئے تمام ہندوستانی زبانون مین ان ملکون سے ربط و تعلق کا ذریعہ بھی اردو ہی ہو سکتی ہے سنسکرت اور ہندی صرف ہندوستان کے اندر محدود ہے،

اردو زبان کا مسئلہ ایسا متفقہ ہے جس پر نہ صرف ہر مسلک و خیال کے مسلمان بلکہ سنجیدہ اور صحیح الخیال

ہندو بھی متحد ہیں، گاندھی جی کی راے سب کو معلوم ہے، حال ہی میں لکھنؤ میں آل انڈیا اردو پریس، اور آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنسیں ہوئی ہیں، ان میں ہندو اخبار نویسوں اور ادیبوں نے بھی بالاتفاق اردو کی حمایت، اور حکومت کے رویہ پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اردو کی حمایت میں جو اعلان شائع ہوا ہے، اس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کے نام ہیں، انفرادی طور پر بھی بہت سے ممتاز ہندوؤں نے اردو کی تائید میں بیانات دئے ہیں، اور اس جماعت کے علاوہ جو پرانے بھارت کو زندہ کرنا چاہتی ہے، حق پسند ہندو بھی اردو کے ساتھ حکومت کی روش کو پسند نہیں کرتے،

کانگریس ایک طرف تو بلا اختلاف مذہب و ملت ہندوستان کے تمام فرقوں کی نمایندگی، ان کے کلچر کے تحفظ اور متحدہ قومیت کی مدعی ہے، دوسری طرف اردو کے ساتھ جو ہندو مسلمانوں کے میل جول کی پیداوار اُن کے اتحاد کی نشانی، دونوں کے مشترک کلچر کا سب سے بڑا نمونہ اور اس کی امین و محافظ ہے، کانگریسی حکومت کا یہ طرزِ عمل نہایت حیرت انگیز ہے، اگر اردو تنہا مسلمانوں کی زبان بھی ہوتی، تو بھی ایک جمہوری ادارہ کی حیثیت سے اردو کا تحفظ کانگریس کا فرض تھا، زبان زبردستی پیدا نہیں کیجاتی، بلکہ طبعی اور فطری پیدا ہوتی، اور بڑھتی ہے، اس لئے اردو کے مقابلہ میں نئی زبان کا فروغ پانا آسان نہیں ہے اور ایک نہ ایک دن حکومت کو اردو کا واجبی حق ماننا پڑے گا،

مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہ دریابادی کی مشہور و مقبول کتاب تصوف اسلام کا تیسرا اڈیشن چھپ کر تیار ہو گیا ہے، گو اس کے ابواب میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہے لیکن بعض ابواب کے مباحث میں مفید اضافے اور پوری کتاب میں جزوی ترمیمیں کی گئی ہیں اور یہ نیا اڈیشن پہلے اڈیشنوں سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، یہ کتاب اردو میں قدیم اکابر صوفیاے کرام کی تصانیف کا جو تصوف کی امہات کتب اور روحِ شریعت ہیں، خلاصہ اور عطر ہے اور مصنف کے قلم سے اُن کی ضروری تشریح و توضیح ہے، اصحابِ ذوق دار المصنفین سے طلب فرمائیں،

مقالات

اسلامی طب کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبدالسلام ندوی

اسکندر اعظم نے جب مشرق مین فاتحانہ اقتدار حاصل کیا، تو سیاسی مصالح کی بنا پر معاشرتی تمدنی اور علمی حیثیت سے یونان اور مشرق کے مفتوحہ ممالک مین ربط و علاقہ پیدا کرانا چاہا، اور اس غرض سے مشرقی ممالک میں یونانیون کو آباد کیا، اور یونان کے علماء و فضلاء کو یونانی علم و ادب کی اشاعت کی ترغیب دلائی، جو یونانی حکام اسکندر کی طرف سے ان ممالک میں مقرر تھے، انھون نے بھی اس کی تقلید کی، اور اس طرح مشرقی ممالک مین یونانی تمدن اور یونانی علوم عام طور پر پھیل گئے، اور اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد مشرق کے بہت سے شہر یونانی علوم و فنون کے مرکز بن گئے جن مین اسکندریہ جندیسا پور اور حران کو خاص طور پر اہمیت حاصل تھی۔

ان مین اسکندریہ کے اسکول نے طب کیمیا اور علوم طبعیہ مین زیادہ شہرت حاصل کی اور اسلامی فتح کے زمانہ تک اس کی یہ شہرت قائم تھی، اور مسلمان سب سے پہلے اسی اسکول سے آشنا ہوئے، کیونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ مین جب اسکندریہ فتح ہوا، تو اس وقت اسکندریہ کا سب سے بڑا فلسفی یحییٰ نحوی زندہ تھا، اور جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر اور اسکندریہ کو فتح کیا، تو وہ ان کی خدمت مین حاضر ہوا اور وہ اس کے علم و فضل کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اس کو اپنا ہم دم و ہم نشین بنا لیا، اس کے بعد

شہرزوری کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہا اور خالد بن یزید المتوفی سنہ ۸۵ھ نے اس سے طب کی تعلیم حاصل کی،[۱]

اسکندریہ کا سب سے زیادہ مشہور طبیب اصطفن تھا جس نے خالد بن یزید کے لئے کیمیا وغیرہ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا،[۲]

اسکندریہ کا ایک اور طبیب عبدالملک بن ابجر کنانی تھا جس نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے ہاتھ پر ان کی گورنری کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، اور وہ طب میں ان کا معتمد خاص بن گیا،[۳] لیکن اسکندریہ اسکول کا اثر صرف بنو امیہ کے زمانہ تک قائم رہا اور خلفاے عباسیہ کے دور حکومت تک تجاوز نہ کر سکا، عباسی دور میں اسکندریہ کے صرف ایک عیسائی طبیب بلیطیان کے نام کا پتہ چلتا ہو جو منصور کے زمانہ خلافت کے چوتھے سال اسکندریہ کا پادری مقرر ہوا، اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے اپنے دور خلافت میں عبیداللہ بن مہدی کو مصر کا گورنر مقرر کیا، تو اس نے اس کی خدمت میں ایک نہایت حسین وجمیل کنیز ہدیۃً بھیجی، جس پر وہ فریفتہ ہو گیا، اتفاق سے وہ ایک بار سخت بیمار پڑی، اور اطبار کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا، تو لوگوں نے ہارون رشید کو مشورہ دیا کہ مصر سے کسی طبیب کو بلوائیے وہ اطباے عراق سے بہتر اس کا علاج کر سکے گا، ہارون رشید نے اس کے لئے عبیداللہ بن مہدی کو لکھا اور اس نے اس کے لئے بلیطیان کا انتخاب کیا، بلیطیان مصر سے روانہ ہوا تو مصر سے چند دوائیں بھی ساتھ لیتا آیا اور بغداد میں پہنچ کر کنیز کو یہ دوائیں کھلائیں، تو وہ بالکل صحیح و تندرست ہو گئی،[۴]

بلیطیان کے سوا عباسی دور میں اسکندریہ کے اور کسی طبیب کا نام نہیں ملتا، بلکہ عباسی دور میں سب سے

---

[۱] شہرزوری نے یحییٰ نحوی کا تذکرہ دو جگہ لکھا ہے، ایک جگہ وہ اس کو اسکندرانی اور دوسری جگہ دیلمی کہتا ہے لیکن درحقیقت یہ دونوں ایک ہی ہیں [۲] فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر ص ۴۹۴ [۳] طبقات الاطبار جلد اول ص ۱۱۶ [۴] ایضاً جلد دوم ص ۸۲، ۸۳،

زیادہ اثر جندیساپور کے اسکول کا ہوا، جہان نہایت قدیم زمانہ سے ایک طبی درسگاہ موجود تھی، جس کو نوشیروان نے قائم کیا تھا، اور اس مین یونانی علوم و فنون آرامی زبان مین پڑھائے جاتے تھے، اور یونانی علوم و فنون کے ساتھ پہلوی زبان مین ہندی علوم و فنون کی تعلیم بھی ہوتی تھی، اور بعض ہندو اس خدمت کو انجام دیتے تھے،

علامہ جمال الدین قفطی نے اخبار الحکماء مین اس شہر کے آباد ہونے کی جو تاریخ لکھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر کیونکر یونانی علوم و فنون بالخصوص فن طب کا مرکز بن گیا، وہ لکھتا ہے کہ جندیساپور کے اطباء نے اکاسرہ کے زمانہ سے فن طب مین مہارت حاصل کی اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ساپور بن اردشیر نے جب انطاکیہ اور شام کو فتح کیا، تو اس نے فیلپ قیصر روم سے اس شرط پر مصالحت کی کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کر دے، قیصر روم نے اس شرط کو منظور کر لیا، لیکن لڑکی کے آنے سے پہلے ساپور نے اس کے لئے قسطنطنیہ کی شکل کا ایک شہر تعمیر کیا، جس کا نام جندیساپور رکھا، شہر کے آباد ہونے کے بعد جب قیصر روم کی لڑکی اس مین آئی، تو روم سے ہر قسم کے ضروری اشخاص بھی اس کے ساتھ آئے، جن مین بہت سے حذاق اطباء بھی تھے، ان اطباء نے اس شہر مین قیام کیا تو وہان کے نوجوانون کو فن طب کی تعلیم دینی شروع کی، اور انھون نے رفتہ رفتہ اس فن مین اس قدر ترقی کر لی کہ تمام لوگون سے ممتاز ہو گئے، اور ایک جماعت کے نزدیک ان کا طریقۂ علاج یونان اور ہندوستان کے طریقۂ علاج سے بھی بڑھ گیا، کیونکہ انھون نے ہر گروہ کی نمایان خصوصیات کو لیکر اپنے استنباطات سے ان مین بہت کچھ اضافہ کیا تھا، بہت سے اصول و قوانین مرتب کئے تھے، اور کتابین تصنیف کی تھین جن میں ہر قسم کی عمدہ باتین جمع کی تھین،[1]

اہل عرب پر اموی اور عباسی دور حکومت سے پہلے ہی اس اسکول کا اثر پڑنے لگا تھا،

---

[1] اخبار الحکماء قفطی، ص ۹۳،

چنانچہ عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ نے جو خود عہد رسالت میں تھا، زمانہ اسلام سے پہلے ہی فارس کا سفر کیا تھا، اور اہل جندیسا پور وغیرہ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاص حجۃ الوداع میں بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حارث ہی کے علاج کا مشورہ دیا، اور چونکہ وہ مسلمان نہ تھا، اس لئے اس واقعہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ طبی امور میں اہل کفر کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے[۵۱]،

اس کے بعد عباسی دور حکومت میں اہل جندیسا پور کا اثر و رسوخ خلیفہ منصور کے زمانہ میں خاص طور پر بڑھا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۸ھ میں منصور کو معدہ کی شکایتیں پیدا ہوئیں، اور اطبار کے علاج کے باوجود روز بروز بڑھتی گئیں، بالآخر اوس نے تمام اطبار کو جمع کر کے کہا کہ "میں تمام شہروں کے اطبار میں سے ایک ماہر طبیب کو بلانا چاہتا ہوں"، سب نے بالاتفاق جورجیس کا نام لیا، جو اس وقت جندیسا پور کا افسر الاطبا اور وہاں کے شفاخانے کا مہتمم تھا، منصور نے اوس کو طلب کیا، اور وہ اپنے دو شاگردوں یعنی ابراہیم اور عیسیٰ ابن شہلا کے ساتھ بغداد میں آیا، اور ۱۵۲ھ تک منصور کا طبیب خاص رہا، اس کے بعد بیمار ہو کر اپنے وطن جندیسا پور کو واپس گیا، اور اپنے عوض منصور کے علاج کے لئے اپنے شاگرد عیسیٰ بن شہلا کو چھوڑ گیا[۵۲]، اس کے بعد خلیفہ مہدی کے زمانہ میں اس کا بیٹا ہادی بیمار ہوا، تو اس نے علاج کے لئے جندیسا پور سے جورجیس کے بیٹے بختیشوع کو طلب کیا، لیکن بعض اطبار کی دراندازی سے مہدی نے اوس کو اعزاز کے ساتھ جندیسا پور میں واپس کر دیا، اور ۱۷۱ھ تک وہاں کے شفاخانے کا اہتمام کرتا رہا، پھر ہارون رشید درد سر میں مبتلا ہوا، تو اس نے اوس کو دوبارہ طلب کر کے افسر الاطبار مقرر کیا[۵۳]، اس کے بعد بختیشوع کے بیٹے جبرئیل نے جعفر بن یحییٰ بن خالد برمکی، اور ہارون رشید کی ایک کنیز کے علاج میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، تو ہارون رشید نے اس کو پانچ لاکھ درہم

---

۵۱ اخبار الحکما قفطی ص ۱۱۱، ۱۲۰، ۵۲ اخبار الحکما قفطی ص ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱،
۵۳ " " صفحہ ،،

عطا کئے، اور اس کو افسر الاطبا مقرر کر دیا،[۵۱]

جندیسا پور اسکول کا ایک مشہور طبیب سابور بن سہل تھا جو جندیسا پور کے شفاخانے مین مریضون کا علاج کرتا تھا، متوکل اور اس کے بعد کے خلفاء کے درباروں میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اس نے ۲۵۵ھ مین خلیفہ مہتدی باللہ کے زمانہ مین وفات پائی،[۵۲]

حرانی اسکول کا اثر ثابت بن قرہ حرانی کے ذریعہ سے قائم ہوا، جو ۲۲۱ھ میں حران مین پیدا ہوا، پھر بغداد مین آکر مستقل طور پر اقامت اختیار کر لی، حرانی اسکول مین ریاضیات و فلکیات نے سب سے زیادہ ترقی کی تھی، اور غالباً اس کی وجہ حرانیون کی ستارہ پرستی تھی، اس نے محمد بن موسیٰ شاکر جو ریاضی و ہندسہ کا بڑا قدردان تھا، روم سے واپس ہوا تو ثابت کو ساتھ لیتا آیا، اور معتضد کے دربار مین اس کو منجمین کے زمرہ مین داخل کر دیا، اور اس کے زمانہ سے عراق مین صابئوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا،[۵۳]

ثابت بن قرہ کے بعد اس کے بیٹے سنان بن ثابت نے طب و ہندسہ مین اپنے باپ کی طرح بہت زیادہ ناموری حاصل کی، اور پہلے مقتدر باللہ کا، پھر قاہر باللہ کا طبیب خاص مقرر ہوا، اور مقتدر باللہ نے اس کو افسر الاطباء مقرر کیا،[۵۴]

سنان بن ثابت کے بیٹے ابراہیم بن سنان بن ثابت نے بھی علوم طبیہ بالخصوص علم ہندسہ مین بہت زیادہ شہرت حاصل کی، اور اس علم مین متعدد کتابین لکھین، وہ ۲۹۶ھ مین پیدا ہوا، اور ۳۳۵ھ مین وفات پائی،[۵۵]

حران کا ایک مشہور طبیب ابو اسحق ابراہیم بن زہرون حرانی تھا جس نے بغداد مین ۳۰۹ھ مین وفات پائی،[۵۶]

ابراہیم بن زہرون حرانی کے بیٹے ابوالحسن ثابت بن حرانی نے بھی طب مین بہت زیادہ شہرت

---

[۵۱] اخبار الحکماء قفطی ص ۹۳، ۹۴، [۵۲] طبقات الاطباء جلد اص ۱۶۱، [۵۳] اخبار الحکماء قفطی ص ۸۴، طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۱۵ [۵۴] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۳۰ [۵۵] اخبار الحکماء قفطی ص ۴۲، طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۲۶، [۵۶] ایضاً ص ۲۴۷،

حاصل کی، وہ ۲۸۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۳۳۵ھ میں بمقام بغداد انتقال کیا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کی طبی مہارت کے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں[۱]،

ابراہیم بن ہلال صابی کے چچا ثابت بن ابراہیم نے بھی عضد الدولہ کے زمانہ میں طبی حیثیت سے اس قدر شہرت حاصل کی کہ ایک موقع پر اس کی نباضی کے کمال کو دیکھ کر ایک شخص نے صاف کہدیا کہ نبوت ہے طب نہیں ہے، وہ ۲۸۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۳۶۶ھ میں وفات پائی[۲]،

ان کے علاوہ بعض ہندو طبیب بھی بغداد میں آئے، اور اپنے آثار علمیہ چھوڑ گئے، چنانچہ منکہ ہندستان سے خاص طور پر ہارون رشید کے علاج کے لئے آیا، اور ایک ہندوستانی طبیب شاناق نے زہرون کے متعلق جو کتاب لکھی تھی، اس کا ترجمہ ہندی زبان سے فارسی زبان میں کیا[۳]،

خلفاے اسلام کے درباروں میں ان غیر مسلم اطبار نے طبی ضرورتوں سے جو رسوخ و اقتدار حاصل کیا، اُس سے قدرتی طور پر دو عمدہ نتیجے نکلے،

۱۔ ایک تو یہ کہ انہی غیر مسلم اطبا کے ذریعہ سے یونانی علوم و فنون کا ترجمہ ہوا، اور اوّل اوّل طبی کتابوں کے ترجمے ہوئے، چنانچہ سب سے پہلے خالد بن یزید نے کیمیا و طب کی کتابوں کے ترجمے کرائے، اس کے بعد مروانی دور حکومت میں ماسرجویہ یہودی نے اہرن قس کی قرابادین کا ترجمہ کیا، پھر منصور کے عہد میں جورجیس نے طبی کتابوں کے ترجمے کئے، اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں، انگورہ، عموریہ، اور روم کے تمام شہروں پر فاتحانہ اقتدار حاصل ہوا، اور وہاں طب کی بہت سی قدیم کتابیں ملیں تو ہارون رشید نے اُن کے ترجمہ کی خدمت یوحنا ماسویہ سے متعلق کی[۴]،

۲۔ دوسرا یہ کہ شفاخانوں کا نظام جس کی بنیاد سب سے پہلے خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ڈالی

---

[۱] طبقات الاطبار جلد اول ص ۲۲۰ [۲] اخبار الحکمار قفطی، ص ۷۷ [۳] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۳۳ [۴] اخبار الحکمار قفطی ص ۲۴۹،

تھی، بہت زیادہ وسیع و مکمل ہو گیا، اور متعدد شفا خانے قائم ہو گئے، عباسی دور میں خلیفہ ہارون رشید کے حکم سے جبرئیل بن بختیشوع نے ایک شفاخانہ قائم کیا، اور یوحنا بن ماسویہ کو جو اس کا سب سے بڑا شاگرد تھا، اس کا منتظم مقرر کیا[۵۱]، اسی زمانہ میں ایک اور شفاخانہ خاندانِ برامکہ نے قائم کیا تھا جس کا افسر ایک ہندو طبیب ابن دہن نامی تھا[۵۲]، مقتدر باللہ نے ۳۰۶ھ میں سنان بن ثابت حرانی کے مشورہ سے ایک خاص شفاخانہ قائم کیا، جس کا نام شفاخانہ مقتدری تھا[۵۳]

قیدیوں اور دیہاتیوں کے علاج کی طرف بھی اسی زمانہ میں توجہ ہوئی، اور ان کے لئے اطباء اور ڈاکٹر مقرر کئے گئے، چنانچہ ایک سال جب بکثرت وبائی امراض پھیلے، تو علی بن عیسیٰ نے جو مقتدر کا وزیر تھا، سنان بن ثابت کو لکھا، کہ قیدیوں کی حالت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے، اور اُن کے لئے مخصوص اطباء کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے جو روزانہ تمام جیلخانوں میں دوائیں ساتھ لے کر جائیں، اور ان کا علاج کریں، سنان بن ثابت نے اس حکم کی تعمیل کی، تو اس نے دوسرا فرمان لکھا کہ دیہاتیوں کے علاج کا کوئی انتظام نہیں ہے، اُن کے لئے بھی مخصوص اطباء کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے، جو اپنے ساتھ دوائیں لے کر جائیں، اور دیہاتوں میں گھوم گھوم کر دیہاتیوں کا علاج کریں، چنانچہ سنان بن ثابت نے اس حکم کی بھی تعمیل کی[۵۴]

اس سلسلے میں مقتدر کے زمانہ میں سب سے بڑی ترقی یہ ہوئی، کہ طبیبوں کے امتحان کا طریقہ قائم ہوا، چنانچہ ایک بار ۳۱۹ھ میں جب مقتدر کو معلوم ہوا کہ ایک طبیب کی غلطی سے ایک آدمی مرگیا ہے تو اس نے اپنے محتسب کو حکم دیا کہ ہر طبیب کو علاج کرنے کی اجازت نہ دی جائے صرف وہی طبیب علاج کرسکتے ہیں جو سنان بن ثابت کے امتحان میں پورے اتریں، چنانچہ امتحان کے لئے جو اطباء جمع کئے گئے ان کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ تھی، ان کے علاوہ جو مشہور یا شاہی اطباء تھے وہ امتحان سے مستثنیٰ تھے[۵۵]

طبیبوں کے ساتھ عطاروں کی اصلاح و انتخاب کی بھی ضرورت تھی، اور عباسی دور میں اس طرف

---

[۵۱] اخبار الحکماء قفطی ص ۲۵۰، ۲۵۱ [۵۲] فہرست ابن ندیم ص ۲۴۲ [۵۳] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۳۳ [۵۴] ایضاً ص ۱۳۲ [۵۵] ایضاً ص ۱۳۰

سب سے پہلے مامون رشید کے زمانہ مین توجہ مبذول ہوئی، اور یوسف لقوہ نے مامون رشید سے شکایت کی کہ عطارون سے جو دوائین مانگی جاتی ہین، خواہ اُن کے پاس ہون یا نہ ہون، مگر وہ یہی کہتے ہین کہ یہ دوا ہمارے یہان ہے اور اپنے یہان سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھاکر دیدیتے ہین، امیر المومنین اگر چاہین، تو خود اس کا تجربہ کر سکتے ہین بغداد کے قریب ایک گاوُن تھا جس کا نام سقطیا تھا، مامون نے کچھ لوگون کو عطارون کے پاس بھیجا کہ سقطیا کے متعلق ان سے دریافت کرین کہ اُن کے پاس ہے یا نہین، تمام عطارون نے کہا کہ ہے، اُن قیمت لے کر سب نے مختلف دوائین دیدین، اور یہ تمام لوگ مختلف دوائین لے کر بیٹھے، تو مامون نے یوسف لقوہ کے اس مشورہ کو پسند کیا، اسی نظیر کو پیش نظر رکھ کر زکریا طیفوری نے معتصم کے زمانہ مین افشین کو اس طرف توجہ دلائی، اور اس نے اس قسم کے مبہم نام بتا کر چند آدمیون کو عطارون کے پاس بھیجا، بعض عطارون نے تو اپنی لاعلمی ظاہر کی لیکن بعض نے قیمت لے کر اپنی دوکان سے کوئی نہ کوئی دوا اٹھاکر دیدی اب افشین نے تمام عطارون کو طلب کیا، اور جن عطارون نے لاعلمی ظاہر کی تھی، اُن کو قائم رکھا، اور بقیہ عطارون کو اپنے لشکر گاہ سے الگ کرکے اس کا عام اعلان کر دیا اور معتصم کو لکھا کہ اس کے پاس وہی عطار اور طبیب بھیجے جائین، جو متدین ہون، چنانچہ معتصم نے اس کو پسند کیا، اور اس کے پاس متدین اطبا بھیجے،[۱]

یہ تمام اطبا ایک خاص نظام کے ماتحت طبی خدمات انجام دیتے تھے،

۱- ان مین چند مخصوص اطبا خلفا و امرا کے ملازم تھے، اور تنخواہین پاتے تھے،

۲- چند اطبا فوج مین ملازم تھے، اور فوج کے ساتھ سفر کرتے تھے،

۳- ان کے علاوہ جو اطبا تھے، وہ پرائیوٹ پریکٹس کرتے تھے، پہلے تو ان پر کوئی قید و بند نہ تھی، بلکہ ہر مرض کا علاج کرتے تھے لیکن جب سنان بن ثابت نے ان کا امتحان لیا تو ہر طبیب کو صرف اسی مرض

---

[۱] اخبار الحکما، قفطی ص ۱۲۹

کے علاج کرنے کی اجازت دی، جس کی وہ قابلیت رکھتا تھا[۵]

منصور کے زمانہ سے لے کر مقتدر کے زمانہ تک یہ اسلامی طب کی مختصر تاریخ ہے، اور مقتدر کے زمانہ تک اگرچہ صرف بغداد مین اطبار کی اس قدر کثرت ہوگئی تھی، کہ مشہور اور شاہی اطبار کے مستثنیٰ کرنے کے بعد جو اطبار سنان بن ثابت کے سامنے امتحان کے لئے پیش ہوئے، اُن کی تعداد آٹھ سو سے زائد تھی، تاہم چونکہ ہم کو ان اطبار کے نام اور حالات معلوم نہیں ہین، اس لئے ہم نہیں بتا سکتے کہ اس زمانہ مین کس قدر مسلمان اطبار موجود تھے، اس زمانہ کے مشہور اطبار کے جو حالات تذکرون مین مذکور ہین، وہ سب کے سب عیسائی، صابی اور یہودی ہین، ان مین کسی مشہور مسلمان طبیب کا نام ہم کو نہین ملتا، تاہم اس مین شبہہ نہین کہ اس زمانہ مین طب کی تعلیم نصاب درس کا لازمی جزو ہو گئی تھی، اس لئے مسلمانون مین جو لوگ مشہور فلسفی گذرے ہین، سب نے علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی، مسلمانون مین پہلا شخص جو فلسفی کے لقب سے مشہور ہوا، وہ یعقوب کندی تھا، اور اس کے تذکرہ مین علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبار مین لکھا ہے، کہ وہ علم طب کا عالم تھا، اور فارابی کی نسبت تصریح کی ہے، کہ وہ علوم طبیہ مین بڑی مہارت رکھتا تھا، البتہ اوس نے عملاً کبھی طبابت نہین کی، لیکن عملی طور پر مسلمانون مین اب تک کوئی مشہور طبیب نہیں پیدا ہوا تھا، طبی حیثیت سے اس زمانہ مین سب سے پہلے زکریا رازی نے شہرت حاصل کی، جو باختلاف روایت ۲۳۶ھ، ۲۴۰ھ، ۲۵۰ھ، ۲۵۱ھ مین پیدا ہوا، اور باختلاف روایت ۳۲۰ھ، ۳۲۱ھ، ۳۲۲ھ یا ۳۶۶ھ مین وفات پائی، وہ ابتدا مین عود بجاتا تھا، پھر اس کو چھوڑ کر فلسفہ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوا، اور ابن خلکان کا بیان ہے، کہ اس نے جس وقت طب کی تعلیم شروع کی، اوس کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکا تھا،

طبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے طبابت کو مستقل پیشہ اختیار کر لیا اور پہلے رے کے شفاخانہ کا

۵؎ طبقات الاطبار جلد اول ص ۲۲۲،

پھر خلیفہ مکتفی کے زمانہ مین بغداد کے شفا خانے کا افسر مقرر ہوا[۱] اور عمر بھر اسی فن کی تکمیل مین مصروف رہا، یہان تک کہ اس فن کا امام ہو گیا، چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہین کہ وہ علم طب مین اپنے وقت کا امام تھا، اور اس زمانہ مین اس کی طرف انگلیون سے اشارہ کیا جاتا تھا، وہ فن طب مین کامل اور اس کے اصول و فوائد کا ماہر تھا، اور علم طب حاصل کرنے کے لئے لوگ اس کے پاس سفر کر کے آتے تھے، وہ خود بیان کرتا ہے کہ میرے پاس چین کا ایک شخص آیا، اور ایک سال تک مقیم رہا، اس مدت مین اس نے عربی زبان اور عربی خط سیکھا، یہانتک کہ پانچ مہینہ مین نہایت فصیح اور زود نویس ہو گیا، جب اوس نے اپنے وطن کو واپس جانا چاہا، تو ایک مہینہ پیشتر مجھ سے کہا کہ مین چاہتا ہون کہ آپ جالینوس کی سولہ کتابون کا املا کرا دیجئے تاکہ مین اُن کو لکھ لون، مین نے کہا کہ وقت بہت کم ہے اور تم اپنے زمانہ قیام مین اس کا تھوڑا سا حصہ بھی نہین لکھ سکتے، اوس نے کہا آپ جس قدر جلد ممکن ہو املا کرائیے مین اس سے بھی زیادہ تیزی سے لکھتا جاؤن گا، مین نے اپنے بعض شاگردون کو بھی اپنے ساتھ لیا، اور جس قدر جلد ممکن ہوا، سب مل کر املا کرانے لگے، اور وہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے لکھنے لگا، جب ہم نے مقابلہ کیا، تو ہم نے اس کی تصدیق کی، مین نے اس کے متعلق اس سے سوال کیا تو اوس نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک خط ہے جس کو مجموع کہتے ہین، اور یہ وہی خط ہے جس کو آپ دیکھ رہے ہین، جب ہم کسی طویل تحریر کو تھوڑی سی مدت مین لکھنا چاہتے ہین تو پہلے اوس خط مین لکھتے ہین، پھر اگر ضرورت ہوتی ہے تو اوس کو معمولی خط مین نقل کر لیتے ہین[۲]

علامہ ابن خلدون لکھتے ہین کہ اس فن مین اسلام مین بھی ایسے ائمہ پیدا ہوئے جو ذروۂ کمال سے بھی آگے نکل گئے، مثلاً رازی، مجوسی اور ابن سینا[۳]

علامہ ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبا مین لکھتے ہین کہ وہ فن طب کے مشکل مسائل پر ہمیشہ غور و فکر کرتا رہتا تھا، اور اس کے حقایق و اسرار کھولا کرتا تھا، اور اس مین اس قدر مشغول رہتا تھا کہ ہمہ وقت

---

[۱] ابن خلکان جلد ۲ ص ۸، [۲] فہرست ابن ندیم ص ۲۵ [۳] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۱۴

اجتہاد کیا کرتا تھا، اور علماء نے اپنی کتابون مین جو کچھ لکھا ہے، اس سے واقفیت حاصل کرتا رہتا تھا، اوس نے خود اپنی بعض کتابون مین لکھا ہے کہ میرا ایک شریف دوست تھا، جو راتون کو مجھ سے بقراط اور جالینوس کی کتابون کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا، رازی کو فنِ طب مین جو مہارت حاصل ہوئی، مریضون کے علاج مین اوس نے جو انفرادی شان پیدا کی، اُن کے حالات پر اوس نے طبی پیشینگوئیون سے جو استدلال کیا، دواؤن کے اوصاف و خواص کا جہان تک اور اطباء کا علم نہ پہنچ سکا تھا، اوس نے جو تجربہ کیا، اُن سب کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات ہین، جو اس کی بہت سی کتابون مین درج ہین، اوران سب کو اس نے اپنی کتاب حاوی کے ایک علیحدہ باب مین اور اپنی کتاب سر الطب مین بیان کر دیا ہے،

اس کے بعد رازی کی طبی مہارت کے متعلق ادھون نے دو حکایتین نقل کی ہین، اوران حکایتون کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ رازی کے متعلق اس قسم کی اور بھی بہت سی حکایتین ہین، اوران کا بہت بڑا حصہ مین نے کتاب حکایات الاطبار مین بیان کر دیا ہے، رازی کی طبی مہارت کا خلاصہ صرف ایک فقرے مین بیان کیا جا سکتا ہے، جو بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فن طب مردہ ہو گیا تھا، جالینوس نے اس کو زندہ کیا، وہ پراگندہ تھا، رازی نے اس کو ایک شیرازہ مین منسلک کیا، وہ ناقص تھا، ابن سینا نے اس کی تکمیل کی، طب کے ان پراگندہ مسائل کا سب سے بڑا مجموعہ اس کی کتاب حاوی ہے، جس مین اوس نے امراض اور ان کے طریقۂ علاج کے متعلق قدماء کی اور ان کے بعد اپنے زمانہ تک کے اطباء کی کتابون مین جو کچھ تھا، سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اور ہر قول کو اوس کے قائل کی طرف منسوب کیا ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانون مین طب کا سلسلہ اطبائے اسکندریہ کے ذریعہ سے پھیلا، جن کو اسکندرانی کہتے ہین، یہ سات طبیب تھے، جھون نے اسکندریہ مین ایک طبی درسگاہ قائم کی تھی

اور صرف جالینوس کی سولہ کتابین ان کے نصاب تعلیم مین داخل تھین، جن کو آسانی سے یاد کرنے اور سمجھنے کے لئے انھون نے اُن کے خلاصے کرلئے تھے، اس کے بعد انھون نے ان کتابون کی شرح کی تھی، یحییٰ نحوی انہی اطبا مین شامل تھا، جو اسلام کے ابتدائی زمانہ تک زندہ رہا، لیکن ان اطبار کے علاوہ اور بھی بہت سے طبیب تھے، جو اطباے اسکندریہ کے معاصر یا ان کے زمانہ سے قریب تھے، اور ان کی کتابین اسلام کے زمانہ تک موجود تھین، رازی کا سب سے بڑا طبی کارنامہ جو یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ اوس نے طب کے پراگندہ مسائل کو ایک جگہ جمع کر دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوس نے صرف جالینوس کی ۱۶ کتابون اور اطباے اسکندریہ کی شرحون پر قناعت نہیں کی، بلکہ اُن کے علاوہ اُن کے معاصر اطبار کی کتابون کا بھی مطالعہ کیا، اور اُن کے مطالب اپنی کتاب حاوی مین نقل کئے،[۱]

موجودہ دور مین اہلِ مغرب نے بھی فنِ طب میں اس کی بلند پایگی کو تسلیم کیا، یہانتک کہ ۱۹۱۳ء مین بمقام لندن بین الاقوامی کانگریس مین رازی کے سوانح اور کارنامون کے متعلق ایک خاص کانفرنس قائم ہوئی، اور اس کا ذکر شاندار مدحیہ الفاظ مین کیا گیا،

۱۹۳۰ء مین پیرس مین رازی کی ہزار سالہ برسی منائی گئی، جس مین ایک مضمون پڑھا گیا جس کا عنوان تھا، "عربی طب و تاریخ مین اور فرانس کی طب پر اس کا اثر" اور اس مضمون مین رازی کو بہت بڑا طبیب تسلیم کیا گیا، اس کے علاوہ اس کی بہت سی طبی کتابون کا ترجمہ یورپین زبانون مین کیا گیا، اور وہان کے نصاب تعلیم مین داخل رہین، اسی زمانہ کا ایک اور مسلمان طبیب احمد بن ابی الاشعث ہے جو ابتدا مین طبی حیثیت سے مشہور نہ تھا، بلکہ ایک سرکاری عہدہ دار تھا، لیکن کسی جرم مین ماخوذ ہوا، اور اپنے وطن سے بھاگ کر موصل مین آیا، یہان ناصر الدولہ کا ایک لڑکا بیمار تھا، جس کو اطبار کے علاج سے شفا نہیں ہوتی تھی بلکہ مرض اور ترقی کرتا جاتا تھا، احمد نے ناصر الدولہ تک رسائی حاصل کی، اور لڑکے کی ماں سے کہا کہ

---

[۱] طبقات الاطبار جلد اول ص ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹،

مین اس کا علاج کرون گا، اسی کے ساتھ ان غلطیون کو بھی ظاہر کیا، جو دوا طبار نے طریق علاج مین کی تھین چنانچہ لڑکے کی مان کا اس کی طرف میلان ہوا اور اس کے علاج سے اس کو شفا ہو گئی، اب وہ نوازش شاہانہ سے سرفراز ہوا، اور آخر عمر تک موصل مین مقیم رہ کر ۳۰۰ھ مین وفات پائی، وہ اگرچہ طبی حیثیت سے بہت زیادہ مشہور نہین ہے، تاہم اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جالینوس کی تمام کتابون کی شرح لکھی، اور جالینوس کی سولہ کتابون کو ابواب و فصول مین تقسیم کیا، اس سے پہلے کسی نے اس قسم کی تقسیم نہین کی تھی، اس لئے جو لوگ جالینوس کی کتابون کا مطالعہ کرتے تھے، ان کو اس سے بڑا نفع حاصل ہوا، اور ان کو معلوم ہو گیا کہ اس کی کتابون کے مختلف حصے کن اغراض و مقاصد پر مشتمل ہین[۱]

محمد بن زکریا رازی کے بعد شیخ بو علی سینا ۳۷۰ھ مین پیدا ہوا، اور ۴۲۸ھ مین وفات پائی، اور طب و فلسفہ دونون مین یکسان شہرت حاصل کی، اگرچہ شیخ کے بیان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوس نے علم طب کو بذاتِ خود حاصل کیا تھا، لیکن علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس نے ایک عیسائی طبیب ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ مسیحی جرجانی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی[۲] ابوسہل کے علاوہ، وہ اس زمانے کے ایک اور مشہور طبیب ابومنصور الحسن بن نوح القمری کے حلقۂ درس مین بھی شامل ہوا، اور اس سے طبی تعلیم حاصل کی؛[۳]

تاہم اس مین شبہہ نہین کہ شیخ کی طبی مہارت اور طبی شہرت زیادہ تر کثرتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے، چنانچہ ایک بار نوح بن منصور سامانی جو بخارا کا بادشاہ تھا، ایک ایسے مرض مین مبتلا ہوا، کہ تمام اطبار اوس کے علاج مین ناکامیاب رہے، لیکن کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے اطبا مین شیخ کو بھی شہرت حاصل ہو چکی تھی اس لئے انھون نے نوح کے سامنے شیخ کا تذکرہ کیا، اور اس کے بلانے کی درخواست کی تو شیخ آکر ان اطبار کے ساتھ اس کے معالجہ مین شریک ہوا، اور اس کو شفا حاصل ہو گئی، اور اس تقریب سے

---

[۱] طبقات الاطبار جلد اول ص ۲۴۶ [۲] ر صفحہ ۳۲۷ [۳] ر صفحہ ۳۲۷ ،

اس کے متوسلین مین داخل ہوگیا، اور اسی سلسلے میں اس نے نوح کے کتب خانے مین داخل ہونے اور طبی کتابوں
کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی، اتفاق سے کتب خانے مین آگ لگ گئی، اور تمام کتابین
جل گئین، اب اس کتب خانہ کے علوم کا عالم صرف شیخ رہ گیا، اس بناپر شیخ کے مخالفین کا خیال ہو
کہ خود شیخ ہی نے اس کتب خانہ مین آگ لگا دی تاکہ ان علوم کو اپنی طرف منسوب کرلے اور یہ ظاہر کرے
کہ وہ ان علوم کا سب سے بڑا عالم ہے، بہرحال واقعہ جو کچھ بھی ہو، لیکن زکریا رازی کے بعد
شیخ نے طب مین اس سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ نہایت
حیرت انگیز ہے، زکریا رازی کی طرح شیخ بھی کثیر التصنیفات ہے، لیکن اس کی کتابون کی جو
فہرست تذکرون مین منقول ہے، اس مین زیادہ تر فلسفہ وحکمت کی کتابین ہین، طبی کتابین
بہت کم ہین، اس کے بہ خلاف رازی کی کتابون کا حصہ زیادہ تر طبی تصنیفات پر مشتمل ہے،
اور طب کے ہر موضوع پر اس نے رسالے اور کتابین لکھی ہین، اس کے ساتھ شیخ کو فلسفہ، طب
اور دوسرے علوم کی تدوین اور ترتیب مین جو شہرت اور اہمیت حاصل ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے
کہ اس نے ان علوم مین بہت سے ایجادات واختراعات کئے ہین، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ
اس نے ان علوم کی تمام شاخون کو باقاعدہ منظم اور مرتب کر دیا، اور مبتدی، منتہی، اور متوسط ہر طبقہ
کے لئے کتابین لکھدین، اس لئے اس کی کتابین نصاب تعلیم کا بہترین جزو ہوگئین، اور درس و تدریس
کی وجہ سے اُن کی عام اشاعت ہوگئی، اور شیخ کی قانون مدتون یورپ کے بڑی بڑی طبی مدرسوں مین زیر درس رہی،
شیخ کے ذاتی بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی سرمایۂ افتخار فلسفہ تھا، فن طب نہ تھا،
وہ ایک معجب، خود پسند اور مغرور شخص تھا، اور بڑے بڑے اطبار وحکما پر ذاتی حملے کیا کرتا تھا، لیکن
اس کا یہ حملہ صرف ان کی فلسفہ دانی پر ہوتا تھا، ان کی طبی مہارت کا وہ بھی قائل تھا، زکریا
رازی کی نسبت وہ کہا کرتا تھا، کہ وہ ایک مصنوعی اور طفیلی شخص ہے اس کا کام صرف بول وبراز کا

دیکھنا ہے"، اس فقرے مین اوس نے اس کی طبی مہارت کا تو دبی زبان سے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کی فلسفیانہ مہارت کا منکر ہے، اس لئے شہرزوری نے تاریخ الحکما رمین اس قول کو نقل کرکے لکھا ہو کہ ابن سینا نے بالکل سچ کہا کیونکہ معالجاتِ طبیہ مین تو وہ ذروۂ کمال تک پہنچ گیا تھا، لیکن طب کے علاوہ اور علوم مین اوس نے صرف لغو باتین کین،

شیخ کا ایک ممتاز معاصر ابوالفرج بن الطیب ایک عیسائی طبیب تھا، جو شفاخانہ عضدیہ میں طب کی تعلیم دیتا تھا، فن طب کے ساتھ فلسفہ مین بھی مہارت رکھتا تھا، اور ارسطو کی بہت سی فلسفیانہ کتابون کی شرح لکھی تھی، شیخ اس کی طبی تصنیفات کا تو مداح تھا، لیکن فلسفیانہ حیثیت سے اس کا قائل نہ تھا، ایک رسالہ خاص اس کی تردید مین لکھا تھا، اور اس مین اس کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شیخ ابوالفرج بن الطیب کی طبی تصنیفات ہم کو ملین، اور ہم نے ان کو صحیح و پسندیدہ پایا، لیکن منطق وطبعیات وغیرہ مین اس کی تصنیفات کی حالت بالکل برعکس نکلی،[۵۱] لیکن بہرحال شیخ کے زمانہ سے مسلمانون مین فن طب کی عام اشاعت ہوئی اور چھٹی اور ساتوین صدی ہجری تک بکثرت مسلمان اطبا پیدا ہوگئے، جن کے حالات علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبار مین تفصیل کے ساتھ لکھے ہین، لیکن ان مین دو شخص خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہین کہ انھون نے مفرد دواؤں کی تحقیقات مین موجودہ زمانہ کے طریقہ پر اپنی عمرین صرف کردین،

یونان مین جو اطبار پیدا ہوئے، ان مین ایک خاص طبیب دیسقوریدس تھا جس نے بہت سے شہرون کا سفر کرکے جنگلون، جزیرون اور سمندرون کی تمام جڑی بوٹیون، اور مفرد دواؤن کا سراغ لگایا تھا، ان کی تصویرین لی تھین، اور اُن کے افعال وخواص پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام کتاب الحشائش تھا،[۵۲] جعفر متوکل کے عہد خلافت مین اصطفن بن بسیل نے یونانی زبان سے اس کا ایک

---

[۵۱] طبقات الاطبا جلد اول ص ۲۳۹ [۵۲] فہرست ابن ندیم ص ۴۰۸،

ناقص ترجمہ عربی زبان مین کیا، اور ایک مدت تک اطبا مفرد دواؤن کی تحقیقات مین اسی کتاب سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس کے علاوہ یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنے دور وزارت مین ایک شخص کو ہندوستان مین اس غرض سے روانہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی جڑی بوٹیون کو خود ہندوستان سے لائے[1] تاہم تیغ کے زمانے تک کسی مسلمان طبیب نے ادویہ مفردہ کی تحقیقات کی طرف خاص توجہ نہین کی تھی لیکن تیغ کے بعد رشید الدین صوری نے فن طب کی اس خاص شاخ مین نہایت امتیاز حاصل کیا، اور عمر بھر ادویۂ مفردہ کی تحقیقات کرتا رہا، وہ ۵۷۳ھ مین پیدا ہوا، اور ۶۳۹ھ مین وفات پائی، اس کی تحقیقات کا طریقہ یہ تھا کہ جن مقامات پر جڑی بوٹیان زیادہ پیدا ہوتی تھین، وہان خود جا کر اُن کو اپنی آنکھون سے دیکھتا تھا، ساتھ مین ایک مصور ہوتا تھا جس کے پاس مختلف قسم کے رنگ ہوتے تھے، وہ ان جڑی بوٹیون کو دیکھ کر مصور کو دکھاتا تھا، اور وہ اُن کے رنگ، پتی کی مقدار، شاخ، اور جڑ کو اچھی طرح دیکھ کر ان ہی کے مطابق ان کی تصویر کھینچتا تھا، صرف اسی پر قناعت نہین کرتا تھا، بلکہ مصور کو ان جڑی بوٹیون کو پہلے اُن کی ابتدائی نشو و نما کے زمانہ مین دکھاتا تھا، اور وہ ان کی تصویر کھینچ لیتا تھا، پھر جب اُن کی نشو و نما مکمل ہو جاتی تھی، اور ان مین تخم پیدا ہو جاتے تھے، تو مصور اس حالت کی الگ تصویر کھینچتا تھا، پھر جب وہ خشک ہو جاتی تھین تو اس حالت کی تصویر الگ لی جاتی تھی، اس طرح ایک ہی جڑی بوٹی کی تحقیقات جن مختلف صورتون مین ممکن تھی، ہو جاتی تھی،

اُس نے ان تحقیقات کے نتائج کو ایک مستقل کتاب مین درج کیا تھا، جس کو ملک المعظم عیسیٰ بن ابو بکر کے زمانہ مین اس کے نام پر لکھا تھا، اور اس مین نہایت استقصار کے ساتھ تمام مفرد دواؤن کے نام اور خواص لکھے تھے، اور بہت سی ایسی دواؤن کے نام کا بھی اضافہ کیا تھا، جن کا ذکر قدما کی کتابون مین موجود نہ تھا، ایک اور کتاب بھی لکھی تھی، جس مین ادویہ مفردہ کے متعلق تاج بلغاری کی کتاب کا رد کیا تھا،[2] (باقی)

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۳۴۴ [2] طبقات الاطبار جلد دوم از ص ۲۱۶ تا ۲۱۹،

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

"سودا کے معاصر شعراء میں اشرف علی فغان مشہور اور بلند پایہ شاعر تھے، ان کے حالات اور کلام کا انتخاب تو نئے پرانے تمام تذکروں میں ملتا ہے، لیکن ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا تھا، اس کے قلمی نسخے بھی کمیاب تھے، ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے نے بڑی تلاش و جستجو سے اس کے تین نسخے فراہم کرکے ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا تھا، اور فغان کے حالات اور ان کے کلام پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا تھا، یہ دیوان انجمن ترقی اردو نے طبع کرایا تھا لیکن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ دلی کے گذشتہ فسادمیں انجمن ترقی اردو کے بیش قیمت کتب خانہ اور اس کے ذخیرہ کتب کے ساتھ یہ دیوان بھی تلف ہوگیا، اور اب دوبارہ شاید ہی اس کی تصحیح کی نوبت آسکے، لائق مرتب نے مقدمہ میں حالات اور کلام پر تبصرہ کے ساتھ قلمی نسخوں کے متعلق بھی ضروری اور مفید معلومات لکھے تھے، یہ حصہ تو اصل کے ساتھ ضائع ہوگیا لیکن فغان کے سوانح اور کلام پر تبصرہ کی ایک نقل اتفاق سے ان کے پاس رہ گئی تھی، اس کو بطور یادگار ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، "م"

نام و نسب مرزا اشرف علی خان نام اور فغان تخلص تھا، شاہ جہان آباد میں پیدا ہوئے، سنہ ولادت معلوم نہ ہوسکا، مگر احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے، اس لئے اس کے سنہ ولادت سے ان کی پیدائش کی تاریخ بھی

متعین کی جا سکتی ہے، احمد شاہ کا سنہ پیدایش ۱۱۴۱ھ ہے، رضاعی بھائی ہونے کی حیثیت سے اشرف علی خان ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سال بڑے ہوں گے، اس لئے ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۴۱ھ تک کسی سال مین ان کی پیدایش ہوئی ہوگی،

والد کا نام مرزا علی خان نکتہ تھا[۵۱]، نکتہ شاید تخلص ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اشرف علی خان کے پدر بزرگوار بھی شاعر تھے، اُن کا خاندان دنیادی وجاہت کے لحاظ سے ممتاز تھا، اور تیموری دربار سے گہرا تعلق رکھتا تھا، ماں نے احمد شاہ کو دودھ پلایا، اس لئے خود کوکہ، کوکہ خان[۵۲]، کوکلتاش[۵۳] یا کوکلتاش خان[۵۴] اور کہلائے، چچا ایرج خان مرشد آباد مین شاہی ملازم[۵۵] تھا بدوہان کے حاکم تھے[۵۶]،

فغان کے تعلیمی حالات کا ذکر کسی تذکرہ مین نہین، محمد حسین آزاد نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ابتدائے عمر سے شعر گوئی کا شوق ہوا، طبیعت ایسی مناسب واقع ہوئی تھی، کہ جبھی سے اس کام مین نام پیدا کیا[۵۷] شاعری مین یہ شاید کئی استادون سے مستفید ہوئے، ان کے دوست اور معاصر میر تقی میر نے لکھا ہے کہ وہ قزلباش خان امید کے شاگرد تھے[۵۸]، مصحفی[۵۹]، اور لطف[۶۰] نے ان کو ندیم کا شاگرد بتایا ہے، نساخ نے بھی ان کو علی قلی خان ندیم ہی کا شاگرد بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ بعضے صاحب تذکرہ نے جو اُن کو قزلباش خان امید کا شاگرد لکھا ہے، غلطی کی ہے[۶۱]،

---

۵۱ گلشن ہند میرزا علی لطف مرتبہ مولانا شبلی و مولوی عبدالحق ص ۱۳۰ ۵۲ مخزن نکات مصنفہ شیخ محمد قیام الدین قائم ص ۴۲، انجمن ترقی اردو ۵۳ مجموعۂ نغز مصنفہ میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی جلد دوم ص ۳، ۵۴ گلشن بے خار از مصطفےٰ خان شیفتہ ص ۲۲۰ ۵۵ گلشن ہند ص ۱۳۰ ۵۶ آب حیات ۵۷ آب حیات از محمد حسین آزاد ص ۱۱۳ ۵۸ نکات الشعراء مؤلفہ میر تقی میر، مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی ص ۸، ۵۹ تذکرہ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب ص ۱۶۰ ۶۰ گلشن ہند ص ۱۳۰ ۶۱ سخن شعراء مؤلفہ عبدالغفور خان نساخ نولکشور پریس ص ۳۶۹،

فغاں نے ندیم سے اپنے رشتہ شاگردی کا اظہار جا بجا کیا ہے،

کیا فغاں سے پوچھتے ہو کون تھا حضرت ندیم ۔ پیر تھا، مرشد تھا، ہادی تھا، میرا استاد تھا

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں ۔ دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہو گیا

دشت جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا ۔ اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

کتنا کوئی فغاں کی طرف سے ندیم کو ۔ اب دل تو جا چکا بھلا استاد کیا کریں [۱]

مگر ایک قطعہ میں فغاں نے امید کا بھی نام لیا ہے،

شاہد حال ہے یہ مصرع امید فغاں ۔ کا ہیکو بولتے ہیں، مردم آگاہ غلط

اول عشق میں ناحق مجھے اخراج کیا ۔ بعد آیا تو عبث فائدہ مابعد غلط

اب مجھے دیوے اذیت تو سزا ہے میری ۔ کردہ این مرتبہ ہم بندۂ درگاہ غلط

اس قطعہ سے امید اور فغاں کے ذہنی تعلقات کی غمازی ہوتی ہے، مولانا عبد الحی نے گل رعنا میں لکھا ہے کہ "ممکن ہے کہ پہلے امید سے اصلاح لیتے ہوں، پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں، یا فارسی میں اُن کے شاگرد ہوں [۲]" ممکن نہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فغاں نے فارسی میں امید سے اصلاح لی جیسا کہ شفیق کے تذکرۂ چمنستان شعرا میں ہے۔

---

[۱] ندیم، نام مراد علی قلی خاں تھا، وطن شاہجہان آباد تھا، دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد آئے، اور نواب میر جعفر خاں کی ملازمت میں داخل ہوئے، اسی کے عہد میں ان کا انتقال ہوا، پہلے مرثیہ و سلام کہا کرتے تھے لیکن پھر ریختہ کہنے لگے میر حسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

مردے بود بکمال قابلیت شعر فارسی و مرثیہ و ریختہ بخوبی می گفت۔

ان کے مختصر حالات تذکرۂ ہندی مجموعۂ نغز، گلزار ابراہیم اور تذکرۂ میر حسن میں ملیں گے،

[۲] گل رعنا، ص

"در شعر فارسی اصلاح سخن از قزلباش خان امید می گرفت"[۱]

فغان نے اپنے قطعات مین بیتاب اور حشمت کے بھی نام لئے ہین؛

سُن کے اس مطلع بیتاب کو کہتا ہو فغان کھینچے تیغ میری جان کہ تیار ہون مین

۱؎ چمنستان شعرا ص۱۵۔ قزلباش خان امید، اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کے رہنے والے تھے، جوانی میں ترک وطن کر کے اصفہان آئے، اور میرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے، اورنگ زیب کے زمانہ مین ہندوستان آئے، اور شاہی ملازمت مین داخل ہو کر بہادر شاہ کے وقت مین قزلباش خان خطاب اور ہزاری منصب پایا، چنانچہ خود کہتے ہین،

مثل بلبل ہمیشہ نالانم این بود منصب ہزاری ما

معز الدین کے وقت مین کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور گئے، اور جب امیر الامرا سید حسین دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا، تو یہ اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر، کرناٹک کے داروغہ ہوئے، یہان بھی زمانہ نے ساتھ نہ دیا، تو حیدر آباد کے ناظم مبارز خان کی سرکار مین آکر ملازمت کی، جب نظام الملک آصفجاہ نے مبارز خان پر فتح پائی، تو یہ بھی قید ہوئے، مگر انھون نے آصف جاہ کی خدمت مین ایک غزل پیش کی، جو آصف جاہ کو ایسی پسند آئی، کہ امید کو نہ صرف قید سے آزاد کیا، بلکہ کرناٹک کے علاقہ منی مرکب کی قلعہ داری مرحمت کی، کچھ دنون کے بعد امید حج کرنے کو گئے، وہان سے واپس ہوئے تو آصف جاہ کے مقرب خاص بن کر ۱۱۳۵ھ مین دہلی آئے، آصف جاہ جب مرہٹوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھوپال گئے، تو امید بھی ہمرکاب تھے، نادر شاہ کے حملہ کے زمانہ مین آصف جاہ کو دہلی بلایا گیا، تو وہ بھی ساتھ آئے، پھر دہلی کی محبت سے ایسے مغلوب ہوئے کہ بقیہ عمر یہیں گذاری اور ۱۱۵۹ھ مین انتقال کیا، آٹھ ہزار فارسی اشعار کا ایک دیوان چھوڑا، کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے تھے، فن موسیقی کے بھی ماہر تھے، (مآثر الکرام دفتر ثانی مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۲۱۰، گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو ص ۱۸، ۱۹، ۲۰)

قتل کر لیجے مجکو تو سزاوار ہون مین ہان میاں تشنۂ آب دم تلوار ہون مین[۵۱]

غل اٹھا مصرعۂ حشمت کا فغان زندان مین پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ[۵۲]

معلوم نہین فغان نے ان دونون کے نام محض تحسین کے جذبہ مین یا کسی فیض کے امتنان و تشکر مین لئے ہین،

۵۱ بیتاب: نام محمد اسمٰعیل، مصطفےٰ خان یکرنگ کے شاگرد تھے، گردیزی نے لکھا ہے، کہ "نکتہ سنج معنی یاب محمد اسمٰعیل بیتاب پایۂ سخنش بلند حرفش دل پسند است" لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہین، کہ سحاب گوہر پاش سخن در یاے معراج این فن است، خود را از تلامذہ مصطفےٰ خان یکرنگ می پندارد، و تلاش ہائے فراوان بالفاظ تازہ و مضامین نو می دارد" اس۔ گھوڑے سے گر کر ایسے زخمی ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے،

۵۲ حشمت کا پورا شعر یہ ہے

نگہت گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

حشمت تخلص اور نام محتشم علی خان تھا، باپ کا نام میر باقی اور بڑے بھائی کا میر ولایت اللہ خان تھا، ان کا خاندان بدخشان سے ہندوستان آیا، نسباً سید تھے، لیکن پیشہ سپہگری کا تھا، دہلی مین مغل پورہ میں رہتے تھے، اپنے زمانہ کے ممتاز شاعر تھے، محمد شاہ کے عہد مین انتقال ہوا، گردیزی مین ہے، "سخنش دلپسند است و فکرش بلند، بکمال خوش خلقی، و فراخ حوصلگی زیست می کرد، ...... دیوانش نقیر سیر کردہ وچشمے آب داد و تھا کہ در ان تلاش معنی تازہ کردہ، و الفاظ رنگین بروے کار آوردہ، احیاناً ریختہ می گفت" میر تقی میر ان کے بارے مین لکھتے ہین، کہ شاعر خوب فارسی و ریختہ فہمیدہ سنجیدہ با ہمہ عجز و انکسار پیش می آید، چنسے بود کہ در دل ہمہ کس جائے خالیست...... بر فقیر شفقت و عنایت بسیاری کند...... گلشن ہند مین ہے، "از مشاہیر شعرا و دُہلی است شعر فارسی را نیکو می گفت، و ترکیب بند ریختہ از وے بسیار شہرت دارد، باعتبار اظہار و آسودگی دل نشین مردم افتادہ است...... ارتحالش در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ است"

فغان کے حالاتِ زندگی فغان بچپن سے جوانی کے عالم تک احمد شاہ کے ساتھ رہے، احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد اس کے ندیم خاص ہوئے، احمد شاہ اُن کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بے حد مداح تھا، اس لئے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب عطا کیا[۵۱] اشرف علی خان کی حیثیت محض لطیفہ گو کی نہ تھی، بلکہ وہ ایک معزز درباری امیر تھے، شیخ محمد قیام الدین قائم مخزن نکات (نوشتہ ۱۱۶۸ھ) میں لکھتے ہیں :-

"درزمان سلطنت مرزا احمد بمنصب پنجہزاری مفتخر و مباہی گشت"[۵۲]

تذکرہ ریختہ گویان مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی (نوشتہ ۱۱۶۶ھ) میں ہے،

"اشرف علی فغان تخلص از عمدۂ منصب داران عہدِ سعادت میداشت"[۵۳]

اس کی تصدیق میر تقی میر کے بیان سے بھی ہوتی ہے،

"فغان تخلص کوکۂ بادشاہ احمد شاہ، داخل ذیل نجیبۂ امرایان است"[۵۴]

لچھمی نرائن شفیق نے چمنستانِ شعراء (نوشتہ ۱۱۷۵ھ) میں لکھا ہے، :-

"از امرایان درگاہ احمد شاہ بادشاہ بود،

میر قدرت اللہ قاسم نے بھی انھیں "بسیار عمدہ معاش"[۵۶] اور شیفتہ نے "از اہل ثروت بودہ" لکھا ہے[۵۷]

مگر اشرف علی فغان کو امارت و ثروت کی بہار زیادہ دنوں تک دیکھنا نصیب نہ ہوا، ان کی زندگی کا زمانہ وہ تھا، جب شاہجہان آباد پر مصیبت والم کی گھٹائیں برس رہی تھیں، محمد شاہ کے

---

۵۱ گلشنِ ہند ص ۱۴۰، ۵۲ مخزنِ نکات ص ۴۲، ۵۳ تذکرۂ ریختہ گویان مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب انجمن ترقی اردو، ص ۱۲۱ ۵۴ نکات الشعراء، مؤلفہ میر تقی میر، مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی ص ۸، ۵۵ چمنستان شعراء، انجمن ترقی اردو، ص ۴۸۲ ۵۶ مجموعہ نغز ص ۲ ۵۷ گلشن بے خار ص ۲۲۰، مطبوعہ اردو اخبار پریس، دہلی،

عہد کی طوائف الملوکی اور خانہ جنگی مرہٹوں کی سرکشی اور شورہ پشتی اور نادر شاہ کی غارت گری اور خونریزی سے تیموری حکومت کی بنیادیں کھوکھلی پڑ گئی تھیں، اکبر اور عالمگیر کی پر جلال اور پر شوکت سلطنت کا زوال اپنے عروج پر تھا، محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت پر ضرور بیٹھا لیکن وہ محض اپنے اجداد کی سلطنت کی پامالی اور بیخ کنی کے مناظر دیکھنے کو بیٹھا تھا، سلطنت میں ایک لوٹ مچی ہوئی تھی، نادر شاہ کے بعد احمد شاہ درانی کی نظریں ہندوستان جنت نشان پر لگی ہوئی تھیں، وہ تیموری سلطنت کے چراغ سحری کو اپنی طوفانی فوجوں کے تند جھونکوں سے بجھا دینا چاہتا تھا، مگر قدرت نے یہ انجام اس کے ہاتھوں سے نہ لکھا تھا، وہ آیا اور چلا گیا، تیموریوں میں درانیوں کے حملوں کو روکنے کی تاب نہ تھی، اس لئے ملتان اور لاہور کے دو صوبے دے کر احمد شاہ نے تھوڑے دنوں کے لئے اپنے کو بچا لیا، لیکن تنہا درانیوں کے حملے ہی کی مصیبت نہ تھی، درانی جاٹے بھی نہ پائے تھی کہ روہیلوں اور مرہٹوں کی معاندانہ کارروائیوں سے سلطنت کا شیرازہ درہم بکھر گیا، خود دربار میں امرائے واعیان سلطنت میں اتفاق نہ تھا، ان کی ریشہ دوانیوں سے رہی سہی قوت بالکل جاتی رہی، بادشاہ بے جان اور عمائد حکومت کے ہاتھوں مجبور تھا، آخر کار ۱۱۶۷ھ میں احمد شاہ تخت سے اتار کر قید خانہ میں بٹھا دیا گیا، اور دوسرا بے بس اور لاچار بادشاہ عالمگیر ثانی کے لقب سے زینت تخت و تاج بنایا گیا،

ان ہنگاموں میں احمد شاہ کے درباری، امیر، ندیم خاص اور رضاعی بھائی اشرف علی خان فغان کو بھلا کہاں چین نصیب ہو سکتا تھا، دربار قتل و خون کا مرکز اور شاہجہان آباد کی گلیاں ماتم کدہ بنی ہوئی تھیں، دولت اور عزت دونوں کی غارتگری ہو رہی تھی، فغان دلی کی بربادی نہ دیکھ سکے اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے،

یہ کہنا مشکل ہے کہ احمد شاہ کی معزولی کے فوراً ہی بعد یا کچھ دنوں رہکر فغان نے دلی چھوڑی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ احمد شاہ کی معزولی اور قید کے بعد دلی چھوڑ دی، فغان کے معاصر مصحفی اپنے

تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ

"در ایامیکہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد برآمدہ طرف پورب گذر افگند"[۹۱]

تفرقہ شاہ" سے احمد شاہ کی قید ہی مراد ہوگی، لیکن مجموعہ نغز (نوشتہ ۱۲۲۱ھ) میں ہے:-

"بنابر افراط و تفریطے کہ در ہنگامہ آرائی افاغنہ ابدالی بحضرت دہلی رو داد بدیار شرقیہ شتافتہ، رحل اقامت انداخت"[۹۲]

"شاید اسی استناد پر محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جب احمد شاہ دُرانی کے حملوں نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا اور دلی میں دربار میں طور بے طور دیکھا، تو فغان دلی چھوڑ کر باہر چلے گئے یہی بات گل رعنا میں بھی کہی گئی ہے، لیکن جب ہم احمد شاہ دُرانی کے حملوں کی تاریخوں کو پیش نظر رکھتے ہیں تو ان بیانات میں کچھ الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے، احمد شاہ درانی کا پہلا حملہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء میں ہوا، دوسرا احمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۶۱ھ (مطابق ۱۷۴۸ء) میں ہوا، اس حملہ میں لاہور کے قریب مغل اور دُرانی متصادم ہوئے لیکن احمد شاہ نے ملتان اور لاہور کے دو صوبے دیکر یہ بلا دفع کی احمد شاہ کے زمانے میں دُرانیوں کا پھر کوئی حملہ نہ ہوا، وہ ۱۱۷۲ھ (مطابق ۱۷۵۹ء) میں ہندوستان پھر آئے، اور مرہٹوں کی قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی، کہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت پھر نہ سنبھل سکی، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ فغان نے درانیوں کے حملہ کی طوائف الملوکی میں دلی چھوڑی تو انھوں نے یا تو ۱۱۶۱ھ یا ۱۱۷۲ھ کے بعد دلی چھوڑی ہوگی، اگر ۱۱۶۱ھ کے بعد [illegible] معزولی کے پانچ برس بعد تک وہیں قیام پذیر رہے، جس کو یقین کرنا ذرا مشکل ہے، چنانچہ مصحفی کا یہ بیان کہ فغان نے احمد شاہ کی قید کے بعد دہلی چھوڑی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اتفاق سے فغان نے اپنے دیوان میں ایک جگہ خود اس کے متعلق اشارہ کیا ہے، دہلی چھوڑنے کے بعد وہ اپنا دردناک حال لکھتے ہیں

---

۹۱ تذکرہ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی انجمن ترقی اردو ص ۱۶۰، ۹۲ مجموعۂ نغز حصہ دوم ص ۲۶۲،

لکھے شرحِ غم گر دلِ دردناک — تو اپنی زبان کلک کرتی ہے چاک
میرے شعلۂ آہ پر کر نگاہ — بہاتی ہے چشموں سے اشکِ سیاہ
نپٹ سخت ہے ماجرا درد کا — دلِ سرد کا اور رُخِ زرد کا
بیاں سے بجا ہے کہ خاموش ہوں — کسی سے نہ یہ راز اپنا کہوں
ولیکن چھپانا اسے بے حجاب — کہ یہ راز روشن ہے جوں آفتاب
سنو اے عزیزاں حکایت کے تئیں — گرفتارِ غم کی روایت کے تئیں

اور یہ حکایت فغاں کے محبوب آقا اور رضاعی بھائی احمد شاہ کی ہے، جس سے اُن کی محبت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی،

جہاں میں مرا ایک دلدار تھا — اوسی سے مجھے تو سروکار تھا
نہ کچھ کام تھا مجکو گلزار سے — نہ واقف تھا ہرگز گل و خار سے
نہ سمجھوں تھا بلبل کے فریاد کو — نہ جانوں تھا میں جور صیاد کو
نہ معلوم تھا مجکو فرہاد بھی — سنا تھا نہ میں قیسِ ناشاد بھی
اگر ان کا کچھ درد پاتا تھا میں — تو کا ہے کو خاطر میں لاتا تھا میں
مجھے دردمندوں سے کیا کام تھا — سدا وصل کے بیچ آرام تھا
جب اس بار پر دھیان کرتا تھا میں — تو یوسف کو قربان کرتا تھا میں
اسی کو میں کہتا تھا ہے ماہتاب — وہی تھا میرا انجم آفتاب
میں پوجوں تھا نت اس صنم کے تئیں — نہ سجدہ کروں تھا حرم کے تئیں
وہی ماہ تھا، اور وہی شاہ تھا — غرض کچھ ہی تھا میرا اللہ تھا

شاہ مذکور سے فغاں کے اختلاط و محبت کی شدت ملاحظہ ہو،

سدا سیر تھے مجکو گلزار کے | کہیں طبع خوش ہو میرے یار کے
اگر اتفاقاً وہ نازک مزاج | چلے تھے وہاں سے تو میں علاج
یہ کہتا تھا رو رو ستم گار کے | نہ چھوڑ اس مزے میں تو گلزار کو
ارے دیکھ خوش چشم نرگس کا حال | کہ حیرت سے رہ گئی ہے آنکھیں نکال
ارے اے مری جان اس وقت میں | ارے تیرے قربان اس وقت میں
ترا ہنس کے کہنا میں گھر جاؤنگا | مرا رو کے کہنا میں مر جاؤنگا
یہی مجھ میں اس میں تھا راز و نیاز | کوئی اس میں محمود کوئی ایاز

مگر یہ ساری نشاط انگیز یاں اس وقت کافور ہوگئیں جب کہ

فلک نے یکایک ستم یہ کیا | دل شاد کو داغ حرماں دیا

شاید اس سے احمد شاہ کی معزولی ہی مراد ہے، اس کے بعد فغاں کا کیا حال ہوا، وہ خود ہی لکھتے ہیں :-

نہ پہنچا کوئی وہاں میری داد کو | چلا تب تو میں مرشد آباد کو

آخری شعر سے صاف ظاہر ہے کہ دہلی سے نکلنے کے بعد فغاں مرشد آباد گئے، مگر مصحفی رقمطراز ہیں

"درایامیکہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد برآمد، بہ طرف پورب گذرانید و معرفت میر محمد نعیم خان کہ ہم مکتب ایشان بود بہ ملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ یکے از مقربان گردانید"[۱]

فغان کے مذکورہ بالا شعر کے بعد یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے، کہ وہ دہلی سے نکلے، تو سیدھے نواب شجاع الدولہ کے یہاں پہنچے، نواب موصوف اپنے باپ صفدر جنگ کے جانشین ۱۱۶۷ھ ہجری یعنی احمد شاہ کی معزولی کے سال میں ہوئے، ظاہر ہے کہ فغان کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا ہوگا، کہ اپنے شفیق اور جان نثار

---

[۱] تذکرہ ہندی ص ۱۶۰

رضاعی بھائی کے قید خانہ جاتے ہی وہ ایک دوسرے فرمانروا کی آستان بوسی کے لئے پہنچ جاتے، اس بےبسی کے عالم میں دہلی کو چھوڑا ہوگا، تو بزرگون کے پاس مرشدآباد چلے گئے ہون گے، اس زمانہ مین دہلی اور اودھ کے بعد شاعری کی بزم عظیم آباد اور مرشدآباد مین جمتی تھی، مگر مرشدآباد مین زمانہ نے فغان کا ساتھ نہ دیا، وہ وہان سے واپس ہوئے، تذکرۂ گلشن ہند مین ہے کہ وہ پھر شاہجہان آباد آئے، اوس کی اصل عبارت ملاحظہ ہو،

"دلی سے مرشدآباد میں اپنے چچا کے پاس کہ محمد ایرج خان کرکے مشہور تھے، وارد ہوئے لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنون مین پھر شاہجہان آباد چلے گئے، بعد کئی برس کے عظیم آباد مین آئے اور طور بود و باش کے وہان ٹھہرائے"۔[51]

اس واپسی کے بعد معلوم نہین ان کا قیام دہلی مین کتنے دنون رہا، صاحب گلشن ہند کے "کئی برس" کی مدت مین درانیون کے آخری حملہ (۱۱۷۴ھ) کا سال شامل کرلیا جائے، تو میر قدرت اللہ قاسم اور ان کے ہم نوا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا عبدالحی کا یہ بیان کہ درانیون نے جب دلی کو تہ وبالا کر دیا، تو فغان نے پریشان ہوکر دلی کو خیرآباد کہا، صحیح ہوسکتا ہے، مگر نواب علی حسن خان نے اپنی صبح گلشن مین معلوم نہین، کس سند پر لکھا ہے کہ فغان ۱۱۷۰ھ مین عظیم آباد پہونچ گئے تھے، ان کی اصلی عبارت ملاحظہ ہو،

"ہمینکہ از وطن برید و درا ودھ رسید، رفاقت نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر گزیدگر آخر ساز مصاحبت کوک نگردید، پس از آنجا در سنہ سبعین و مائتہ والف صوب عظیم آباد رسید"[52]

اگر ہم اس تاریخ کو صحیح مان لین تو یہ قیاس غلط ہوگا، کہ فغان جب دوسری بار شاہجہان آباد واپس آئے، تو پھر درانیون کے آخری حملہ ۱۱۷۴ھ کے بعد نکلے، اور اگر غلط سمجھین، تو پھر بہت ممکن ہے کہ انھون نے دوسری بار درانیوں کے حملہ کے بعد ہی دہلی چھوڑی،

---

[51] گلشن ہند ص ۱۳۱ [52] ر صفحہ ۱۳،

بہرحال دوسری بار دہلی سے نکلنے کے بعد فغاں نواب شجاع الدولہ کے دربار میں پہنچے، صاحب گلشن ہند نے ان کے نواب موصوف کے یہاں پہنچنے کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے، شاید اختصار سے کام لیا ہے مصطفےٰ علی خان کے یہاں تو یہ اختصار اور بھی بڑھ جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"ازین (یعنی شاہجہان آباد سے) نقل و حرکت بہ عظیم آباد سکونت اختیار کردہ"[۵۱]

مخزن نکات میں شیخ قائم کا بیان اور بھی ژولیدہ ہے،

"درایں ایام درد ارالامان ہندوستان گردسیمہ آفات و شاہراہ بتیاب است بپاس آبروئے خویش بنگالہ گزید و ہمانجا رخت اقامت انداخت"[۵۲]

مگر فغان کا اودھ پہنچنا اور نواب شجاع الدولہ کی ملازمت سے منسلک ہونا یقینی ہے، نواب موصوف نے ان کو نہایت اعزاز و کرام سے اپنے یہاں رکھا، اور اُن سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے، ایک روز اسی بے تکلفی میں انھوں نے گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا دیا، فغان کو نواب کا یہ مذاق پسند نہ آیا، اور اُن کی صحبت سے کنارہ کش ہو گئے،

مصحفی لکھتے ہیں :-

"درہماں نزدے روزے نواب وزیر دستش را در عالم اختلاط بہ فلس سوختند، آب درد یدہ گردانید، و ہیچ نہ گفت، و آخر بہمیں حرکت آزردہ شدہ بطرف عظیم آباد رفت"،[۵۳]

مگر محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دن اختلاط میں ان کا کپڑا نواب صاحب کے ہاتھ سے جل گیا، اور رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے، وہاں جا کر انھوں نے زیادہ عزت پائی،[۵۴] کپڑا جلنے کی روایت کسی تذکرہ میں میری نظر سے نہیں گذری، مولانا عبد الحیٔ بھی گل رعنا میں آزاد کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ معلوم نہیں، کپڑا جلنے کی روایت کہاں سے لی ہے، مصحفی نے ہاتھ جلنے کا ذکر

---

[۵۱] گلشن بیخار ص ۲۲۰ [۵۲] مخزن نکات ص ۴۲ [۵۳] تذکرہ ہندی [۵۴] آب حیات ص ۱۱۴

کیا ہے، اور یہی صحیح ہے[۵۱]

فغاں فیض آباد سے چلے تو عظیم آباد پہنچے، یہاں راجہ شتاب رائے کا دربار علمی قدردانی اور فیاضی کے لئے مشہور تھا، شتاب رائے نے فغان کو اپنے یہاں بلاکر اپنے دربار کی زینت بڑھائی، صبح گلشن میں ہے :-

"راجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بہار با وصافش بے بردہ بنا ومت خودش کشید"[۵۲]

شتاب رائے مغلیہ حکمرانوں کا نمک خوار تھا، اُس نے جذبۂ وفاداری میں اپنے ایک آقا کے رضاعی بھائی کی وہ پوری تعظیم و تکریم کی، جس کے فغان مستحق تھے، اس کے علاوہ خود بہت ہی علم پرور اور ہنر دوست تھا، فغان کے کمال ذاتی، شیرین کلامی، اور علم مجلسی کے سبب نہایت عزیز رکھنے لگا،

نواب علی حسن خان صاحب اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ یہیں فغان کو راجہ شتاب رائے کی وساطت سے شاہ عالم کی طرف سے ظریف الملک کا خطاب ملا :-

"راجہ شتاب رائے ...... از حضور شاہ عالم بادشاہ خطاب ظریف الملکی وچندے

بطریق التمغا بوی دہانید، ازان زمان اشرف علی خان عظیم آباد را بوطن برگزید"[۵۳]

نواب صاحب کو لکھتے وقت شاید غلط فہمی ہوئی، کیونکہ اوپر ہم مستند اور معاصر تذکرہ نویسوں کے بیانات پڑھ چکے ہیں کہ یہ خطاب احمد شاہ نے دیا،

بعض تذکروں میں ہے کہ راجہ شتاب رائے کی قدردانی میں فغان نے باقی عمر خوشحالی سے بسر کی، لیکن محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد فغان کے تعلقات راجہ صاحب سے قائم نہ رہے، اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ دُرانی نے سلطنت پر حملے کئے، ایک دن اس کی دست درازی اور بے اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا، خدا جانے طنز سے یا سادہ مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب

---

۵۱ گل رعنا ص ۱۱۸ ۵۲ صبح گلشن ص ۳۱۱ ۵۳ ایضاً ص ۳۱۱،

ملکۂ زمانی کو احمد شاہ درانی کیونکر لے گیا، انھیں یہ بات ناگوار ہوئی، افسردہ ہو کر بولے کہ جو راج

جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا، اسی طرح وہ لے گیا، اُس دن سے دربار مین جانا چھوڑ دیا،[۵۱]

آزاد کو معلوم نہین یہ روایت کہان سے ملی؟ اس کے بعد آزاد کا بیان ہے کہ فغان نے حکام فرنگ کے

یہان رسائی پیدا کی، اور اُن کے فیض سے باقی عمر فارغ البالی اور خوش حالی مین گذاری، اس کی تائید

مجموعۂ نغز کی مندرجۂ ذیل عبارت سے ہوتی ہے،

"و بہ حسنِ سلیقہ کہ داشت بسراں فرنگ در ساخت و در ہمان نواح رشتۂ زندگانی وے در گسست

و بجوار رحمتِ حق در پیوست"[۵۲]

گلشنِ ہند اور سخن شعرا مین فغان کا سنہ وفات ۱۱۸۶ء لکھا ہے، مگر گلشن بیخار مین ۱۱۹۶ھ

درج ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، آبِ حیات، اور گل رعنا مین ۱۱۸۶ھ ہی ہے عظیم آباد

مین مدفون ہین، مدفن کی جگہ معلوم نہ ہو سکی،

فغان کا مذہب | فغاں مذہباً شیعہ تھے، دیوان کا آغاز حضرت علیؑ کی مدح سے کیا ہے، اس کے بعد

حضرت امام موسیٰ رضا کی شان مین ایک قصیدہ لکھا ہے، اس مین بھی حضرت علیؓ سے اپنی محبت کا اظہار

جا بجا کیا ہے، مثلاً

پہنچا یو تو خاک فغاں کی وہاں صبا — مشہد ہے جس طرف کو میرزا بوتراب کا

مہر علی ہے دل مین نہ کر خوفِ روزِ حشر — توڑے چلا ہے ساتھ فغاں زادِ راہ کا

مگر فغاں ہر ملت کے لوگون سے یکسان تعلقات رکھتے تھے، میرا اپنی خودداری کے باوجود جو

نخوت و غرور کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، اُن کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، وہ لکھتے ہین :-

"بندہ بخدمت او بسیار مربوطم"[۵۳]

---

[۵۱] آبِ حیات ص ۱۱۵ [۵۲] مجموعۂ نغز ص ۲۰، حصۂ دوم [۵۳] نکات الشعرا ص ۸۰،

میر کا فغان سے گہرا ارتباط رکھنا ان کے اخلاق و ملنساری کی واضح دلیل ہے، علی ابراہیم نے بھی اپنے تذکرہ مین لکھا ہے، کہ

"با راقم آثم ربطے داشت"[51]

میر حسن بھی لکھتے ہین کہ

"خوش اختلاط بود و باہر کس خوش طبعی داشت"[52]

انداز طبیعت | ان کے ملنے والے ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی سے بہت لطف اٹھاتے تھے، اور کے مشہور تذکرہ گلشن ہند کے مصنف کا بیان ہے، کہ

"آٹھ پہر ان کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا، کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، مربی گری ظرافت کی ندیم تھے جہان پناہ کے، چنانچہ ظریف الملک کوکے خان بہادر حضور سے بادشاہ کا خطاب پایا تھا، اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا"[53]

میر صاحب بھی رقم طراز ہین کہ

"طبع او مائل لطیفہ بسیار است چنانچہ ناگرمل راکہ دیوان تن و دخیل بادشاہ بگھی کی منڈی کا سانڈ گفتہ ہر کہ دیدہ دیدہ باشد فہمیدہ باشد و حکیم معصوم را در دربار معلے گاؤ گجراتی نام کردہ، ہر کہ حکیم صاحب را بیند داند"[54]

تمام تذکرہ نویسون نے ان کی ظرافت اور خوش طبعی کا ذکر کیا ہے، سید فتح علی حسینی گردیزی لکھتے ہیں کہ

"وضع ظریفانہ دارد"[55]

چمنستان شعرا مین ہے :-

---

[51] تذکرہ گلزار ابراہیم ص ۱۸۴ [52] تذکرہ میر حسن ص ۱۳۲ [53] گلشن ہند ص ۲۰۰ [54] نکات الشعراء ص ۸۰ [55] تذکرہ ریختہ گویان ص ۱۲۰

" و اکثر گاه چمنستان قلوب را از نسیم لطیفہ گوئی و ظرافت معطر امی نمود"[۵۱]

میر حسن کا بیان ہے کہ

"از ہنگامہ آرایان زمان و ظرفائے دوران خوش طبع و شیرین بیان اشرف علی خان المتخلص بہ فغان کوکۂ احمد شاہ بادشاہ غفران پناہ خان ظریف طبع و خوش اختلاط بود، با ہر کس خوش طبعی داشت شاعر مر بوط بطور خود لطائف و ظرائف او مشہور است"[۵۲]

مجموعۂ نغز میں ہے،

"نہایت یار باش و خلیق ظریف الطبع لطیف مزاج سراسر سرور، سر بسر ابتہاج بود"[۵۳]

نساخ نے بھی سخن شعرا میں لکھا ہے کہ "بڑے ظریف تھے"[۵۴] محمد حسین آزاد نے گل افشانی کی ہے کہ "ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیزی اور طراری کو ان کے مزاج سے وہ لگاؤ تھا، جو بارود اور حرارت کو۔ ۔ ۔ لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی زبان میں ایسی تھی جیسی تلوار میں جوہر" اس کے بعد ایک لطیفہ نقل کیا ہے، جو اگرچہ بہت مشہور ہے لیکن محض ناظرین کے تفنن طبع کے لئے آزاد ہی کی زبان میں ہم اس کو سناتے ہیں، فغان نے ایک دن راجہ شتاب رائے کے دربار میں ایک غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا لالیان، جالیان، سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی، راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے، ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب! سب قافیے آپ نے باندھے، مگر تالیاں رہ گئیں انھوں نے ٹال دیا، اور کچھ جواب نہ دیا، راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب سنتے ہو؟ جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیہ کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے، مہاراج نے کہا ہاں کچھ کہنا تو چاہئے، انھوں نے اسی وقت پڑھا،

جگنو میاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو　　سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

---

۵۱ چمنستان شعرا، از لچھمی نرائن شفیق ص ۱۸۴ ۵۲ تذکرہ میر حسن ص ۱۴۲ ۵۳ مجموعۂ نغز ۲ ص ۵۴ ۵۴ سخن شعرا ص ۳۶۹

تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے [1]

نواب علی حسن خان نے بھی اپنے تذکرہ صبحِ گلشن مین فغان کی بذلہ سنجی کی تعریف ان الفاظ مین کی ہے :-

"بسکہ مزاجش مزاح و ظرافت رامی پسندید، از کلام طیبت انگیز احدی از اعالی و اسافل نمی رنجید گویند ہرگاہ ، مکانش برفعت و وسعت معمور و مرتب گردید ، و بزم نشاط چید" [2]

اس بزم نشاط کا ایک لطیفہ نواب صاحب موصوف نے بھی نقل کیا ہے ، جو ذرا غیر سنجیدہ ہے اس لئے ہم اس کو نظر انداز کر دیتے ہین ، (باقی)

---

[1] آب حیات صفحہ ۱۱۵ ، [2] صبحِ گلشن ، صفحہ ۳۱۹ ،

اعلان

اب تک ہم نے باوجود مشکلات کے مطبوعات دار المصنفین اور معارف کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہین کیا تھا ، اور دار المصنفین کی قدیم وضعداری کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کنٹرول پیپر کی کمیابی اور بیرونی کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باعث اب معارف کی قیمت مین اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے ، اس لئے جنوری ۱۹۴۸ء سے معارف کی سالانہ قیمت بجائے صہ کے ۶ کر دی گئی ہے ، غیر مستطیع طلبہ اور قومی انجمنون کے لئے رعایتی قیمت صرف صہ ہوگی ، امید ہے کہ دار المصنفین کے ہمدردون اور معارف کے قدردانون پر یہ خفیف اضافہ گران نہ ہوگا ، اور وہ آیندہ کا وی پی وصول کرتے وقت اس اضافہ کو یاد رکھین گے ،

منیجر معارف

فتاویٰ عالمگیری

اور

اس کے چند اور مؤلفین

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

(۳)

اخلاق و عادات | شاہ صاحب اخلاق و عادات میں اسلاف کی یادگار تھے، مزاج میں سادگی اور طبیعت میں عفائی اور بے تکلفی تھی نشست و برخاست، گفتگو و ملاقات، تعزیت و تہنیت، لین دین، خرید و فروخت، تواضع و خاکساری، امداد و اعانت غرض اپنی زندگی کے ہر کام میں وہ نمونۂ عمل تھے اور ان کا کوئی کام حکمت، ادائے سنت یا خدمت خلق کے جذبہ سے خالی نہیں ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

کار عاقلاں و حکیماں آنست کہ استیفاے لذت فقط مقصود نباشد بلکہ باید کہ آن درضمن دفع حاجتے یا اقامت فضیلتے، یا ادائے سنت واقع شود، (انفاس ص۵۸)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر | کسی شخص کو سنت یا تعامل کے خلاف کوئی کام کرتے دیکھتے تھے تو بڑی نرمی اور شفقت سے منع کرتے تھے، انفاس میں ہے:

اگر نصیحت میخواستند بنہایت رفق و لین او انمودند (ص۵۸)

جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی نصیحت لوگوں پر بہت جلد اثر انداز ہو جاتی تھی،

آپ کے ایک ملنے والے کو جو علم و فضل سے بھی بہرہ ور تھے، فضول گوئی کی عادت تھی شاہ صاحب نے ایک دن ان سے بڑی شفقت سے فرمایا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق چاہتے

ہو تو اس عادت کو ترک کر دو، ورنہ اس دربار سے فیض نہیں پہنچ سکتا، آپ کی یہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی، اور انھوں نے وہ عادت چھوڑ دی،

اگر کسی کو نیک بات کی تلقین کرتے تو اس میں ملائمت کے ساتھ ساتھ مخاطب کی صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

امر معروف و نہی منکر و مسائل خصوصہ بشرط ظن قبول برفق ولین میکردند، ص۵۸

عام فائدہ کے لیے جمعہ کے دن وعظ بھی فرمایا کرتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس میں اجنبی بھی شرکت کرتے تھے[۱]، زیادہ تر مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین اور آخر میں تفسیر وعظ کا معمول تھا[۲]،

آپکے احباب ملنے آتے تو رخصت کرتے وقت ان کے سامنے یہ شعر بطور وصیت پڑھا کرتے تھے

اسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

خانہ داری کی ضروری خرید و فروخت خود کرتے، با وجود تنگی کے زندگی بھر کبھی قرض نہیں لیا اور تعیش و تنعم کے لیے جو لوگ قرض لیتے تھے ان کو بیحد ناپسند کرتے تھے، اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے،

کھانے پینے میں مشتبہات سے بھی گریز کرتے تھے، ایک مرتبہ رمضان میں ان کے استاذ مرزا زاہد نے ان کی دعوت کی، اتفاق سے اسی وقت ایک کبابی آیا، اسے مرزا صاحب سے کچھ کام تھا، جس کے لیے اس نے کباب کا ایک خوان بطور نذر کے پیش کیا، مرزا صاحب قبول نہیں کرتے تھے، لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو ایک شاگرد سے کہا کہ قیمت لگا کر اسے رکھ لو، شاگرد نے کئی روپے کے کبابوں کی قیمت مرلگائی اور کبابی راضی ہو گیا، شاہ صاحب نے مرزا صاحب سے آہستہ سے کہا کہ آپ رشوت سے بچنا چاہتے ہیں مگر کئی روپے کے کباب مرمیں دے دینا علت سے خالی نہیں ہے، اگر غرض نہ ہوتی تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا،

---

[۱] انفاس ص۵، [۲] انفاس ص۱۹۶، [۳] انفاس ص۸۶،

شاہ صاحب کے اس کہنے پر مرزا صاحب نے شاگرد کو بلوا کر ڈانٹا، اور کتابوں کی پوری قیمت دلوائی[۵۷] اس کے بعد ان کتابوں سے افطار کیا، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق جستہ جستہ بہت کچھ لکھا ہے، ایک جگہ جامع طور پر لکھتے ہیں :-

حضرت ایشان باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بحدّ ہم متصف بودند عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در ہر امر توسط دوست می داشتند، (انفاس ص۸۵)،

شاہی دربار اور امراء سے احتراز | شاہ صاحب امراء اور سلاطین سے ہمیشہ محترز رہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ "والد صاحب نے امراء کے پاس جانے اور ان سے ملاقات کرنے کی رسم بالکل اٹھا دی تھی لیکن اگر ان میں سے خود کوئی آجاتا تھا تو اس سے وہ کج خلقی بھی نہیں برتتے تھے، بلکہ اعزاز و اکرام سے پیش آتے تھے اور اگر وہ نصیحت کی خواہش کرتے تھے تو نہایت ہی رفق و تلطف سے دو چار کلمۂ خیر کہہ دیا کرتے تھے" (انفاس ص۸۵)

اوپر ذکر آچکا ہے کہ فتاوی کی تالیف کے سلسلہ میں شاہی ملازمت کو کس کشمکش کے بعد قبول کیا تھا، اور جب اس سے تعلق منقطع ہوا تو کس قدر مسرور ہوئے اور شکرانہ ادا کیا، اس کے بعد جب شاہ عالمگیر نے زمین دینی چاہی تو اسے بھی قبول نہیں کیا،

عالمگیر ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ماننے والوں میں ایک صاحب عالمگیر کے درباری تھے، انھوں نے کسی موقع سے اس کے سامنے شاہ صاحب کے فضائل و مناقب کا ذکر کیا، عالمگیر نے ان سے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، انھوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ

بخانۂ ملوک و اغنیاء رفتن طریقہ ایشان نیست، (انفاس ص۶۹)

عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک دوسرے مخلص کے ذریعہ ملاقات کا پیام بھیجا، لیکن شاہ صاحب

---

[۵۷] انفاس ص۳۳

نے اسے بھی قبول نہیں کیا، ہر چند انھوں نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے، جب وہ بالکل مایوس ہوگئے تو شاہ صاحب سے عرض کیا، کم از کم آپ ایک رقعہ ہی لکھ دیجئے، تاکہ کوتاہی نہ سمجھی جائے، شاہ صاحب نے ایک کاغذ جس میں آپ کا جوتہ لپٹا ہوا رکھا تھا، لیا اور اس پر یہ عبارت لکھکر بادشاہ کے پاس بھیج دی:

"اجماع اہل اللہ است برآنکہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر وحق سبحانہ میفرماید۔

وما متاع الحیٰوۃ الدنیا الا قلیل جز اقل شمار سیدہ اگر بالفرض بن خواہید داد جزء

لایتجزیٰ خواہد بود برائے ایں جزء لایتجزیٰ نام خود را از دیوان خدائے تعالیٰ چرا برآرم زیرا کہ

دربعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد

نام او از دیوان حق سبحانہ برمی آرند[۱]

یہ خط اس بادشاہ کو لکھا گیا ہے جو شاہان تیموریہ میں سب سے زیادہ دیندار اور مذہب کا دلدادہ تھا، اور جس کے ذریعہ "فتاویٰ عالمگیری" جیسا دینی اور اہم کام انجام پایا تھا، اسی طرح ایک مرتبہ عالمگیر کے پوتے عظیم الشان نے ملاقات کی خواہش کی اور شاہ صاحب کے پاس لکھا کہ "اگر آپ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس بہانہ سے مجھے بھی شرف نیاز حاصل ہوجاتا"، شاہ صاحب نے جواب میں لکھ بھیجا کہ

ان اللہ لاینظر الی صورکم واعمالکم	"اللہ تعالیٰ صورت اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا،
وانما ینظر الی قلوبکم ونیاتکم	اسکی نگاہ قلوب اور نیتوں پر پڑتی ہے" میں
بامثال این امور فریفتہ نمی شوم	اس قسم کی چیزوں پر فریفتہ نہیں ہوتا،

شاہ صاحب کے زمانہ ۱۰۵۴ھ سے ۱۱۳۱ھ میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے اور کئی

---

[۱] انفاس العارفین ص ۶۹، شاہ صاحب کے مکتوبات میں بھی یہ خط کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے،

سلاطین بدلے جنھوں نے دعا و برکت کے بہانے شاہ صاحب کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے ہمیشہ گریز کیا اور ان معاملات سے بہت کم دلچسپی لی،

جب معز الدین جہاندار شاہ پر فرخ سیر نے چڑھائی کی تو معز الدین نے دعا سے فتح کیلئے شاہ صاحب کی خدمت میں آنا چاہا، لیکن آپ نے اپنے درباری احباب کے ذریعہ یہ کہلا کر اسے روک دیا کہ

"اس کا آنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اگر سچ بولوں گا تو وہ ناخوش ہوگا اور اگر جھوٹ بولوں تو فقیروں کا یہ شیوہ نہیں ہے"[1]

اسی طرح فرخ سیر اور سادات بارہہ میں جب ان بن ہوئی تو شاہ صاحب کے سامنے بھی یہ جھگڑا پیش ہوا، آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ "برائے من ایں راہم چنین بگذارید" یعنی میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اسکے حال میں چھوڑ دو! چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ " والد صاحب جب تک زندہ رہے فرخ سیر کی پر کوئی آنچ نہیں آئی، لیکن ان کی وفات کے پچاس ہی دن کے بعد فرخ سیر کی بساط حکومت الٹ دی گئی اور وہ قید کر لیا گیا،[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شاہ صاحب فرخ سیر کو کسی حد تک پسند کرتے تھے یا اس کے بعد جو فتنہ و فساد ملک میں شروع ہونے والا تھا اسے اپنی زندگی میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے،

عبادت اور ذکر و اشتغال ذکر و فکر طاعت و عبادت صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے شاہ صاحب کی زندگی نمونہ تھی، انھوں نے فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات میں بھی اپنا جو معمول بنا لیا تھا، ان پر ہمیشہ مستقیم رہے، اور عذر شرعی کے علاوہ انھیں کبھی ترک نہیں کیا، ان کی زندگی کا اصول تھا کہ الاستقامۃ خیر من الکرامۃ " (احکام الٰہی پر) استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے،" انھوں نے شیخ محمد جیو کو ایک خط میں لکھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزیں عطا کی ہیں،[3] تم بھی ان پر قائم رہو، ان میں سے

---

[1] انفاس ص۱۸۱، [2] ایضاً [3] وہ پانچ چیزیں یہ ہیں الذکر والتقوی علی کل حال، والیصال النفع للخلق
(باقی حاشیہ صفحہ ۴۳ پر)

ایک یہ ہے کہ الذکر والتقویٰ علی کل حال یعنی ہر حال میں ذکر وتقویٰ پر استقامت، اسلیے آپکی زندگی کا کوئی لمحہ ذکر وتقویٰ پر استقامت سے خالی نہیں تھا، ذیل کے واقعات سے اس کا اندازہ ہو سکیے گا۔

ہمیشہ نماز باجماعت پڑھتے تھے. عذر شرعی کے علاوہ کبھی اسے ترک نہیں کیا، نماز کی پابندی کا حال یہ تھا کہ جس شب آپ کا انتقال ہوا تو نفس بازپسیں سے کچھ دیر پہلے دریافت کیا صبح صادق ہوئی یا نہیں؟ حاضرین نے نفی میں جواب دیا، آپنے فرمایا کہ میرا رخ قبلہ کی طرف کردو، لوگوں نے اس کی تعمیل کی اور آپ نے اشارہ سے نماز ادا کی، اسی طرح وفات سے چند مہینہ پہلے رمضان کا مہینہ آگیا، آپ بتقاضاے عمر اور علالت کی وجہ سے کمزور ہوچکے تھے، اور آپکے لیے شرعی رخصت بھی موجود تھی لیکن آپنے اس سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا اور پورے روزے رکھے، آپ کی اہل خانہ نے افطار کے لیے اصرار کیا تو فرمایا کہ "بس یہی تو ہوتا ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہوجاتا ہوں تو یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، بیہوش رہنے کا تو عادی ہوچکا ہوں"[1]، شاہ صاحب کے خاص خاص معمولات یہ تھے:

تہجد، اشراق اور چاشت کا خاص اہتمام تھا، لیکن تہجد میں رکعتوں کی تعیین نہیں تھی، بلکہ حضور ذہن اور نشاط کے ساتھ جتنی رکعتیں ہوجاتی تھیں پڑھ لیا کرتے تھے، نماز مغرب کے بعد دو رکعت نفل والدین اور اپنے بڑے بھائی کے ایصال ثواب کے لیے پڑھتے تھے،

تلاوت قرآن روزانہ کا معمول تھا اور اسے بڑی خوش الحانی، سوز وگداز اور تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے، دن میں ایک ہزار بار درود شریف اور ایک ہزار بار نفی واثبات، بارہ ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد کرتے تھے، اور گیارہ بار سورہ مزمل اور گیارہ سو بار یا مغنی غنا ظاہری کے لیے پڑھتے تھے، درود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) من غیر تفرقۃ وعدم تفضیل نفسہ علی احد من الخلق والتواضع لامر اللہ ولخلق اللہ،
ہر حالت میں ذکر وتقویٰ (مومن وکافر، حیوان وانسان) کی تفریق کے بغیر مخلوق کی نفع رسانی اور اپنے نفس کو افضل نہ سمجھنا، اور خدا کے حکم کے آگے جھکنا اور اسکی مخلوق سے تواضع کے ساتھ پیش آنا[1] انفاس العارفین اور انفاس رحیمیہ،

سے خاص عشق تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

ہرچہ یافتیم بدولت درود و توجہ مجرد یافتیم ۔ (انفاس ص ۸)

حکیمانہ مقولے شاہ صاحب کے ملفوظات اور مکتوبات میں سیکڑوں حکیمانہ جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں، ہم ان میں سے چند فقرے، جن کا تعلق معاملات سے ہے نقل کرتے ہیں، آداب مجلس کے متعلق فرماتے تھے کہ

در مجلس ہرگز نکوہش قومے مکن مگو کہ اہل پورب چنین اند و اہل پنجاب چنیں و افغانان چنیں، شاید دراں میاں مردے باشد از آن قوم یا از اہل حمیت آں قوم بد برد و صحبت منغص شود

عام مجلس میں کسی خاص قوم کو ملامت نہ کرو، یہ نہ کہو کہ اہل پورب ایسے ہیں اور اہل پنجاب ویسے ہیں اور افغان اس طرح کے ہیں، ممکن ہے کہ اس قوم کا کوئی عام آدمی یا کوئی اہل غیرت شخص موجود ہو اور وہ برا ملنے اور مجلس میں بے لطفی پیدا ہو،

ایک مرتبہ فرمایا کہ

ہرگز سخنے مخالف جمہور در مجلس عام بزبان میار اگرچہ فی نفسہ صحیح باشد کہ ایشان بر آں انکار کنند و صحبت منغص شود

جو بات جمہور کے خلاف ہو اسے ہرگز مجلس عام میں نہ کہو اگرچہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو کیونکہ لوگ رد و قدح کرینگے اور مجلس میں تکدر پیدا ہوگا،

فرمایا کہ

در مجلس عام بر کسے رد صریح مکن

مجلس عام میں کسی شخص کی کھلم کھلا تردید نہ کرو

فرمایا کہ

اگر آنانکہ منزلت ایشان از منزلت تو فرو تر است ابتدا بسلام کنند آنرا نعمتی از نعم

جو لوگ تم سے کم مرتبہ کے ہیں وہ اگر پہلے سلام کریں تو اس کو خدا کی نعمت سمجھو اور اس پر

الٰہی شناس و شکر آن بجا آرو و در روے ایشان منبسط شو و تفقد حال ایشان کن لبا می باشد ادنیٰ التفاتے کہ نزدیک تو ہیچ قدر ندارد در چشم ایشان عظیم نماید ..... واگر آن را نیابند محزوں شوند

اس کا شکر ادا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ اور ان کی مزاج پرسی کرو، اسلیے کہ بسا اوقات ایک ادنیٰ التفات جسکی تمھارے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے، ان کے نزدیک اسکی بڑی عظمت ہوتی ہے.... اور اگر وہ تمھاری طرف کی ادنیٰ بے التفاتی سے بھی رنجیدہ ہو جائیں،

فرمایا کہ

اگر ترا با کسے حاجتے باشد پر وتمہید شایستہ کن وتدریج نما در طلب آن حاجت، و نباید کہ سخن مثل سنگ اندازی

اگر تم کو کسی سے کوئی ضرورت پیش آجائے تو عمدہ پیرایہ اور تدریجی طور سے انکا اظہار کرو یہ نہ ہو کہ بات پتھر کی طرح مار دو،

والدین کی خدمت کے بارے میں فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت آسان ہے، اس لیے کہ

ایشان بادنیٰ خاطر جوئی رضامند میشوند و اندکے را بسبب غایت شفقت بسیاری شمروند

والدین تھوڑی سی دلجوئی سے بھی راضی ہوجاتے ہیں اور غلبۂ شفقت کی وجہ سے تھوڑی سی خدمت کو بھی بہت سمجھتے ہیں۔

در مخاطبۂ بزرگان سخن مغلق و موجز و آہستہ گفتن روا نیست

بڑوں سے گفتگو کرنے میں مغلق، مختصر اور آہستہ بات نہیں کرنا چاہیے،

در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن برسم اقویا و عادت ایشان کار کن اگرچہ ضعیف باشی،

بات چیت کرنے، راستہ چلنے اور نشست و برخاست میں قوی لوگوں کی عادت اختیار کرو خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو،

وضع اور لباس کے متعلق فرماتے ہیں:

باید کہ لباس و زی مرد مشعر باشد	آدمی کا لباس اور اسکی وضع ایسی ہونی چاہیے
بصفت کمال وی مثلاً کسے کہ دانشمند	کہ اس سے اس کے صفت کمال کا پتہ چل جائے،
است باید لباس دانشمنداں پوشد	مثلاً اگر کوئی فقیہ یا فلسفی ہے تو اسکو انھیں جیسا
بہ آئین ایشان زندگانی کند و آنکہ	لباس پہننا چاہیے اور انھیں جیسی زندگی گذارنی
فقیر است باید لباس فقیراں پوشد	چاہیے، اگر کوئی درویش ہو تو اسے اہل فقر ہی جیسا
و بہ آئیں ایشان زندگانی کند	لباس اور انھیں جیسا رہن سہن اختیار کرنا چاہیے،

اولاد | شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی زوجہ کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کسکی صاحبزادی اور کس خاندان سے تھیں، ان کے بطن سے ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے، جب شاہ صاحب کا سن ساٹھ برس کا ہوا تو بعض غیبی[1] بشارتوں کی بنا پر انھوں نے دوسری شادی شیخ محمد[2] پھلتی کی صاحبزادی سے کی، ان نیک بخت خاتون[3] کے بطن سے دو صاحبزادے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ[4] پیدا ہوئے، اور

---

[1] اس غیبی بشارت کا تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے انفاس العارفین میں دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں: بر ایشان منکشف ساختند تقدیر بران جاری شدہ کہ ایشان را فرزند دیگر موجود آید ...... و آن مولود بفلان و فلاں مقام خواہد رسید داعیہ تزوج بخاطر ایشان پیدا شد" ص۱۳۳ دوسری جگہ خود شاہ عبدالرحیم صاحب کی زبانی فرماتے ہیں: "میفرمودند دیگر بار بزیارت مرقد منور ایشان (بختیار کاکی) رفتم روح ایشان ظاہر شد فرمودند ترا پسرے پیدا خواہد شد اور اقطب الدین احمد نام کن ...... بعد از زمانے داعیہ تزوج دیگر پیدا شد" (ص۴۴)

[2] شیخ محمد کے اجداد سدھور (بہار) کے رہنے والے تھے، ان کے اجداد میں شیخ احمد نے سکندر لودی کے دربار میں رسوخ حاصل کیا، جب سے ان کو پھلت کے قریب کچھ زمین مل گئی اور وہ سدھور سے پھلت آگئے، یہ خاندان دنیاوی وجاہت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا، خود شیخ محمد بڑے برگزیدہ اور مرتاض بزرگوں میں تھے،

[3] شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ ایک رابعہ صفت اور مریم فطرت خاتون تھیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انکی نسبت توجہ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے تین عورتوں کو بیک وقت توجہ دی، (ص۲۲)، ان کی عبادت و ریاضت کے اور بھی واقعات انفاس العارفین میں ہیں،

[4] شاہ اہل اللہ بھی علم و فضل اور تصوف میں خاندانی روایات کے حامل تھے، انھوں نے شاہ عبدالرحیم صاحب کے مکتوبات کو انفاس رحیمیہ کے نام سے جمع کیا ہے، کتاب کے شروع میں چند سطریں انھوں نے بھی اخلاقیات پر لکھی ہیں، جن سے انکی عظمت اور ولایت کا پتہ چلتا ہے،

ہندوستان میں اسلامی علوم وعرفان کے سرچشمہ بنے،

ملا ابوالواعظ ہرگامی ملا ابوالواعظ مولانا فضل حق خیرآبادی کے پردادا بھائی تھے، ان کا سلسلۂ نسب بارہویں پشت پر شاہ عبدالرحیم صاحب سے مل جاتا ہے، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ اس خانوادے کے یہ دونوں گوہر شب چراغ فتاوی کی تالیف میں شریک تھے،

نام ونسب ابوالواعظ نام یا کنیت تھی، ان کے والد کا نام قاضی صدرالدین تھا، نانہالی سلسلۂ نسب کا تو علم نہیں ہوسکا، دادیہالی شجرہ حضرت فاروق اعظمؓ تک منتہی ہوتا ہے، پورا شجرہ یہ ہے:-

ابوالواعظ بن قاضی صدرالدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عمادالدین بدایونی بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن خطیرالملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاءالدین بن شیرالملک، شیرالملک کے اوپر ایک دو نام میں اختلاف[1] کے علاوہ پورا شجرہ وہی ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات میں درج ہوچکا ہے، شیرالملک کے دو صاحبزادے شمس الدین اور بہاءالدین تھے اور دونوں صاحب علم وفضل اور صاحب وجاہت تھے، اور دونوں ساتھ ہی ہندوستان آئے[2]،

شیخ شمس الدین رہتک کے قاضی ہوئے اور وہیں مقیم ہوگئے، اور شیخ بہاءالدین بدایوں کے قاضی ہوئے اور وہیں متوطن ہوگئے، ان کی اولاد میں شیخ عمادالدین کی شادی قاضی ہرگام (سیتاپور) کی صاحبزادی سے ہوئی، قاضی صاحب کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اس لیے ان کے بعد قاضی عمادالدین ہی ہرگام کے قاضی مقرر ہوئے، اور اس سلسلہ سے وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، ان کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی اسمٰعیل نے عہدۂ قضا سنبھالا، ان کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی صدرالدین یعنی ملا ابوالواعظ کے والد نے ان کی جانشینی کی، قاضی صدرالدین کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں

---

[1] باغی ہندوستان میں ملا ابوالواعظ کا جو شجرہ درج ہے اس میں شیرالملک کے اوپر دو ایک نام شاہ ولی اللہ صاحب کے انفاس العارفین میں دئے ہوئے شجرہ سے مختلف ہیں۔ [2] باغی ہندوستان صد ۱۲۔

تھیں، صاحبزادیوں کی شادی گوپامئو اور لاہرپور وغیرہ میں ہوئی تھی، صاحبزادوں میں ایک ملا عبدالماجد ہیں جن کی اولاد میں کئی متبحر اور ممتاز عالم گذرے ہیں، مولانا فضل حق خیرآبادی بھی انہی کی اولاد میں تھے، دوسرے صاحبزادے ملا ابوالواعظ ہیں، جنھوں نے غالباً عہدۂ قضا کے بجائے درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا،

ملا ابوالواعظ اپنے وقت کے مشاہیر علما میں تھے اور عالمگیر کے اتالیق بھی رہ چکے تھے، مگر عام تذکروں میں ان کے حالات نہیں ملتے، مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام صاحب (متوفی ۱۲۴۴ھ) نے اپنی کتاب آمدنامہ[۱] میں قصبہ ہرگام کے علما کے کچھ حالات لکھے ہیں، جس کے کچھ اقتباس ایک کرم فرما کے ذریعہ مل گئے ہیں[۲] اسی سے ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

درس و تدریس | ملا ابوالواعظ کا محبوب مشغلہ درس و تدریس تھا، ان کے درس میں دور دور سے طلبہ اور علما آکر شریک ہوتے تھے، مولانا فضل امام صاحب نے لکھا ہے کہ

> ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم ملا ابوالواعظ سے درس لینے کے لیے گئے تھے مگر ان کا کوئی وقت خالی نہیں تھا، اس لیے مایوس ہو کر ملا قطب الدین سہالوی کے پاس گئے اور اس چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی،

آمدنامہ میں ایک دوسرا واقعہ ملا قطب الدین سہالوی کا درج ہے کہ

> ملا قطب الدین سہالوی ملا ابوالواعظ کے پاس علمی بحث و مباحثہ کی غرض سے ہرگام پہنچے لیکن ملا ابوالواعظ نے اس سے گریز کیا اور ان سے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں،

---

[۱] یہ کتاب کچھ فارسی قواعد اور چند علما کے حالات پر مشتمل ہے قصبہ ہرگام میں یہ کتاب قلمی موجود ہے اسکے کچھ اقتباس سید نجم الحسن صاحب نے بھیجے ہیں، یہ حالات انھیں سے ماخوذ ہیں [۲] گو یہ اقتباس ہرگام سے سید نجم الحسن صاحب نے بھیجا ہے مگر اس کا اصل ذریعہ جناب عبداللہ خان صاحب شیروانی مترجم الفتوۃ الہندیہ ہیں جنھوں نے اصرار کر کے اسے بھجوایا،

تم نوجوان ہو، اگر مباحثہ میں مجھ پر کوئی کوئی اعتراض وارد ہو، اور میں اس کا میں جواب نہ دے سکا

تو میرے مرنے کے دن قریب آئے، درس و تدریس تک کا ہوش نہیں، اس لیے مجھے کوئی

ندامت نہیں ہوگی اور نہ دوسروں کا کوئی نقصان ہوگا، لیکن اگر آپ کے ساتھ یہ بات پیش

آجائے گی تو پھر طلبہ کے دل سے آپ کا وقار جاتا رہے گا، اور جو آپ کی ذات سے دوسروں

کو فیض پہنچ رہا ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

ملا قطب الدین نے عرض کیا کہ

مرا داعیہ تلمذ است نہ داعیہ برابری اگر استفادہ خواہم کرد کتاب درمیان خواہم نہاد،

اس کے بعد کئی روز تک دونوں بزرگوں کی پرخلوص صحبت رہی،

ملا ابوالواعظ عالمگیر کے استاذ بھی رہ چکے تھے، آمد نامہ میں ہے

از استاذان عالمگیر بادشاہ اند،

وفات | آپ نے ہرگام ہی میں پوری زندگی بسر کی اور وہیں وفات پائی، تاریخ وفات، اور اولاد واخلاف کی تصریح نہیں مل سکی،

علم وفضل | مولانا فضل امام صاحب ان کے علم وفضل کے متعلق لکھتے ہیں،

ملا ابوالواعظ ہرگامی از اساطین علماء وارکین فضلاء بودہ در جمیع علوم دستگاہ بلند وقدرتے تمام داشت،

ملا ابوالواعظ کو باطنی ذوق سے بھی حصہ ملا تھا، آمد نامہ میں ہے،

خوارق عادات وکمالات باطنی ملا بسیار نقل کنند،

علمی یادگاریں | انھوں نے بہت سی علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں ہدایہ مطول اور ملا جلال کے حواشی خاص اہمیت رکھتے ہیں، ملا جلال کے حواشی کے متعلق مولانا فضل امام صاحب لکھتے ہیں کہ

دیدہ ام بنہایت متین نوشتہ بودند واز ان حاشیہ مبلغ علم ملا معلوم می شد،

ایک رسالہ جملہ خبریہ کے متعلق بھی لکھا تھا، اس کے متعلق مولانا فضل امام صاحب فرماتے ہیں،

الحق نہایت خوب است و مرتبہ متین است،

لیکن زمانہ کی دستبرد سے ان کی اکثر کتابیں ضائع ہو گئیں، مولانا فضل امام صاحب ان کتابوں کے ناپید ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

در نیولا از کتب ملا نشانے یافتہ نمی شود اطارت بہا العنقا ام غاب بہا العقل

فتاوی میں شرکت | ان سب کے علاوہ ملا ابو الواعظ کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کی قیمتی یادگار فتاوی عالمگیری کی تالیف میں شرکت ہے، آمد نامہ میں ہے،

در تالیف فتاوی عالمگیری شرکت داشتند،

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس حصہ کی تالیف ان کے سپرد تھی اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ وہ کسی کے معاون کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یا وہ خود کسی حصہ کے ذمہ دار تھے،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل ہے، اسلیے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعۃ الرائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین کے سوانح، انکے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت : للعہ

ہندوستان مین علم حدیث

(بطریق تالیف علوم حدیث)

از

مولوی ابویحیی امام خان صاحب نوشہروی

(۳)

مشارق الانوار کی ترتیب | جامع مشارق نے اپنی تحقیق کے مطابق اس مین صرف صحیحین کی حدیثین جمع کین، اور ترتیب فقہی کے بجائے حروف ہجا کی ترتیب پر مدون کیا، مثلاً مترجم مولانا خرم علی فرماتے ہین

"جن حدیثون کے سرے پر حرف مَن ہے، اول باب مین لایا اور ان کی حدیثون کو دوسرے باب مین اور جن پر حرف لا ہے، ان کو تیسرے باب مین، اور باوجود اس کے پھر حرف تہجی کی رعایت ہے خلاصہ یہ کہ اس مین ترتیب معنوی نہین، ترتیب لفظی ہے"[۵۱]

الجھن یہ رہ جاتی ہے کہ باعتبار حرف ہجا پہلے حرف الف کی احادیث ہونا تھین، نہ وہ کہ جن کا پہلا حرف میم ہے، فرماتے ہین،

"لیکن جامع رحمہ اللہ نے باب اول مین لفظ مَن کو مقصود نہین رکھا، بلکہ مَن کے بعد جو لفظ آئے گا جس کے شروع مین الف ہو، چنانچہ پہلی حدیث ہے :-

"خ ابوھریرۃ مَنْ اٰمَنَ باللّٰہ ورسولہ" الخ[۵۲]

---

[۵۱] مقدمہ مشارق الانوار از مولانا خرم علی بلہوری ص ۶ از سطر ۳ [۵۲] تحفۃ الاخیار ص ۷، باب اول،

"اور دوسری حدیث!

"زید بن خالد الجھنی من آوی ضالۃ فھو ضال مالم یعرفھا"

پہلی حدیث مین مَن کے بعد لفظ آمن کا اور دوسری حدیث مین لفظ آوی کا اعتبار کیا گیا ہے،

اور مولانا خرم نے جو یہ فرمایا کہ "باوجود اس کے پھر حروف تہجی کی رعایت ہے، جیسے لغت کی کتابوں مین ہوتی ہے"، تو واقعی اس کا التزام تمام کتاب مین اسی طرح ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۱و۲ کے بعد سے کہ الف ممدودہ کے بعد الف مقصورہ آتا ہے،

اور یہ جو مولانا خرم علی نے فرمایا کہ "اس مین ترتیب معنوی نہین، ترتیب لفظی ہے" الخ یعنی

"تیسرے یہ کہ مصنف بعض حدیث کو ٹکڑے کرکے اپنی ترتیب کے موافق چند مقام پر لایا ہے، اور یہ کام عالم عارف کو درست ہے، بشرطیکہ معنی مین خلل نہ پڑے، چنانچہ مصنف نے ایسا ہی کیا"

اور یہ کیفیت مشارق کے مطالعہ سے نظر آئے گی،

مؤلف کی تبویب کے مطابق مشارق، ۱۲ ابواب پر منقسم ہے، گیارہواں باب صرف احادیث قدسیہ مین ہے، جس کی ترتیب از سر نو باعتبار بخار رکھی گئی ہے،

ان احادیث قدسیہ کی تعداد ۲۶ ہے، بخاری کی (۸) مسلم کی (۱۴) اور متفق فی الصحیحین (۴) ہین گویا صحیحین مین صرف ۱۴ احادیث قدسیہ ہین،

چودہوان اور آخری باب "فی جوامع الادعیہ" ہے، اس مین نواسی دعائین ہین،

یہ بھی ندرت ہو کہ آنحضرت صلوات اللہ علیہ نے جن احادیث مین لفظ والذی نفسی بیدہ یا والذی نفس محمد بیدہ سے قسم فرمائی، امام صغانی نے صحیحین سے ایسی تمام حدیثین یکجا کردی ہین،

۵۔ الفوائد علی مشارق الانوار، مولانا خرم علی بلہوری م ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء مترجم مشارق الانوار

اولہ:۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی محمد سید المرسلین وعلی

آلہٖ واصحبہٖ اجمعین" (ص ۲) جو تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار سے اس طرح ملحق ہے، کہ ص ا سے ۲ تک مقدمہ ہے، ہر ایک حدیث کے بعد متن ہی میں اس کا ترجمہ اور ترجمہ سے ملا ہوا فائدہ بہ علامت ہے

مقدمہ میں مولانا خرم علی صاحب ہندوستان میں علوم حدیث کی بے بسی یہ فرماتے ہیں،

"ہندوستان میں اس علم حدیث کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر ہے، اکثر علمار کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیجئے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی نہایت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے، اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں، جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے صحیح بھی ہے اور ضعیف بھی،

الحمد للہ کہ بارہ سو انچاس ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں حسب دلخواہ ترجمہ ہوا، اور تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا، حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کتاب کو مقبول کرے اور اہلِ اسلام کو فائدہ بخشے، اور بھول چوک کو معاف فرمائے، آمین" (ص ۲)

مقدمہ کے بعد "فصل اصطلاحات حدیث میں" ہے، مرتب مشارق (امام حسن) نے صرف صحیحین کی روایات ضبط فرمائی ہیں، مولانا خرم علی نے بھی محدثین میں صرف شیخین (امام مسلم و امام بخاری) کے ضروری سوانح پر اکتفا کیا ہے اور صفحہ (۵) سے صاحب مشارق الانوار (امام حسن) کا سراپا ہے، جو اس انداز سے بیان ہوا ہے کہ سرخیل مصنفین نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء) نے بھی اتحاف النبلاء المتقنین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین جیسی نقید المثال کتاب میں صغانی کا ترجمہ اسی مقام سے مستنبط فرمایا[۱]، اور آخر مقدمہ میں تحریض علی العمل بالحدیث کے چند اشعار ہیں۔

---

[۱] اتحاف النبلاء ص ۲۴۳ فی ترجمہ امام حسن الصغانی اللاہوری،

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے ! دردانہ درجِ مصطفےٰ ہے !

نمونۂ فوائد اس حدیث کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیے،

ابوھریرۃ من آمن باللہ و رسولہ واقام الصلوٰۃ وصام رمضان کان حقا علی اللہ ان یدخلہ الجنۃ ھاجر فی سبیل اللہ او جلس فی ارضہ التی ولد فیہا[۵]	صحیح بخاری میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے سچے دل سے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو مانا، اور نماز کو ٹھیک ادا کیا، اور رمضان کا روزہ رکھا، کرم اور فضل کی راہ سے ضرور ہو گیا خدا پر اس کا بہشت میں لیجانا، خواہ اپنا وطن اس نے خدا کی راہ میں جہاد کے واسطے چھوڑا ہو، یا اسی زمین[۴]

[۴] میں بیٹھا رہا ہو جس میں پیدا ہوا

اس حدیث پر حسب ذیل "فائدہ" مکتوب ہے،

" اس حدیث کی پوری روایت بخاری میں ہے کہ اصحاب نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگوں کو خوشخبری سنا دیں کہ بہشت جہاد اور ہجرت پر موقوف نہیں، حضرتؐ نے فرمایا بہشت میں ایک سو بلند درجے ہیں، کہ خدا نے نمازیوں کے واسطے مقرر کئے ہیں، ہر ایک درجے میں اتنا فرق ہے کہ جتنا آسمان اور زمین میں، سو جب تم خدا سے مانگو تو فردوس مانگا کرو کہ فردوس سب بہشتوں کے درمیان ہے، اور سب سے اونچی اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے، اوسی سے بہشت کی سب نہریں نکلی ہیں، یعنی ہر چند جہاد پر بہشت موقوف نہیں، اصل نجات کے واسطے ایمان اور نماز و روزہ کفایت کرتا ہے، لیکن تم ہمت کو پست کرو،

---

[۵] تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار مولانا خرم علی صاحب ص (۷)

کہ صرف نجات پر قناعت کرو، بلکہ ہمت بلند رکھو، جہاد کرو تاکہ فردوس پاؤ جس کے آگے سب بہشتیں پست ہیں"

اس حدیث مین فرشتون اور خدا کی کتابون کا اور تقدیر و قیامت کا ایمان لانا بیان نہین فرمایا، اس واسطے کہ جب آدمی رسول کا ایمان لایا تو ان سبھی ضرور ایمان لاوے گا، کہ تمام قرآن و حدیث مین ان کا بیان موجود ہے، اور نماز روزہ کے ساتھ زکوٰۃ و حج کا ذکر نہین فرمایا، اس واسطے کہ زکوٰۃ و حج صرف مالدار پر فرض ہے، محتاج پر نہین، اور نماز و روزہ سب پر فرض ہے، مالدار ہو یا محتاج، خلاصہ یہ ہے کہ یہان حکم عام بیان فرمانا منظور ہوا، جو سب مسلمانون کو شامل ہے، مصنف نے ایمان کی حدیث مقدم کی، اس واسطے کہ ایمان سب نیکیوں اور عبادت کی جڑ ہے، بدون ایمان کے کوئی عبادت اور نیکی درست نہین" (ص۲۷۱)

حدیث مشارق الانوار اس کا ترجمہ اور یہ فائدہ ان تینوں پر ایک مرتبہ اور نظر ڈالیے محشی نے حدیث مانی الباب کے بکھرے ہوئے ٹکڑون کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس پہ فائدہ سونے پر سہاگہ ہے،

افسوس ہے کہ ہندوستانی شارحین و مفسرین کی محنتون کا اندازہ خود ہم بھی نہین کر سکتے، تو جن لوگون تک اس زبان یا اس ملک کی مذہبی و قومی کتابین نہین پہنچ سکتین ان کا کیا گلہ، مشارق پر یہ فوائد علم حدیث کی بے نظیر شرح ہے، شارح ناقل نہین، صاحب بصیرت ہے، جس طرح ترجمہ تحفۃ الاخیار میں شرح کو سمو دیا ہے، اسی طرح شرح مین احادیث متذکرہ فی الباب کے ساتھ ان ٹکڑون کو جوڑ دیا ہے جو ایک دوسرے سے علٰحدہ ہونے کی وجہ سے بکھرے پڑے تھے،

لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی طالب علم حدیث (محققین) اب تک مولانا خرم علی کے ان فوائد کو کوئی مقام نہ دیکھے، پس ان فوائد ترجمہ تحفۃ الاخیار پر راقم الحروف نے الفوائد علی مشارق الانوار

کا عنوان مقرر کیا!

سرم خوش است وبیانگ بلندی می گویم

کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم

اگر سطور الفوائد (علی مشارق الانوار) کا شمار کیا جائے، تو یہ متن و ترجمہ دونوں سے اضعافاً مضاعفاً ہین،

(۳۰) تبصرۃ الابصار فی تخریج الآثار ملقب بنام تاریخی شوارق المشارق از مولوی الٰہی بخش خان مرحوم بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء)

یہ مشارق الانوار کی ترتیب فقہی ہے، طابع (مشارق۔) مولوی محمد عبد الرحمان بن حاجی محمد روشن خان فرماتے ہین :۔

"مصنف مغفور نے ترتیب احادیث اس مشارق الانوار کی الفاظ صدر پر رکھی، تا ناظرین کو حدیثون کے یاد کرنے مین آسانی ہو، مگر بہ ترتیب فقہی جس حکم کی حدیث مطلوب ہو، نکالنا اس کا دشوار تھا، لہٰذا اس امیدوار رحمتِ منان محمد عبد الرحمان بن حاجی محمد روشن خان غفر لہما کے ذہن مین آیا، کہ اب کی بار کوئی ایسی نئی ترکیب ایجاد کیجئے، کہ یہ دشواری آسان ہوجائے اور حسب ترتیب فقہ ہر حدیث مطلوب نکل آئے، کہ یہ بڑے فائدے کی بات ہے"

"پس جناب مخدومی مولوی الٰہی بخش صاحب عم فیضہم سے اس امر مین استصواب چاہا تو انھون نے کہ خصوص ایسے امور مشکلہ کے حل مین ذہن عالی و فکر بلند سے ایجاد جدید نہایت مفید فرماتے ہین، میرے اصرار پر اس جدول کو ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء مین لکھنا شروع کیا"

اس نسخہ مین یہ جدول شائع ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑی مشکلین آسان ہوگئی ہین،

مولانا ابو طاہر بہاری م ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء مرتب تبصرۃ الابصار ہندوستان کے علماے فحول مین سے تھے،

مولانا الٰہی بخش خان کا ذکر انھون نے اپنی کتاب مین تفصیل سے کیا ہے فرماتے ہین :-

"آپ علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے، جس فن و علم کو بیان فرماتے، معلوم ہوتا کہ خاص اسی فن کے ماہر و مجدد ہین، کتابین اس قدر یاد تھیں، کہ طلبہ کو مقاماتِ مشکلہ بلا مطالعہ ایسا حل کرکے بتلاتے کہ آسان تر معلوم ہوتا، نہایت حلیم، خلیق و کم سخن اور متواضع تھے، اپنے دشمنون سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے، اور اچھا سلوک کرتے،

"آپ نے ابتدائی درسیات مولانا علیم الدین صاحب نگرنہسوی متوفی ۲۰ رمحرم ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء سے پڑھین اور بقیہ درسیات مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی محدث رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء سے پڑھکر سند و اجازت حاصل فرمائی، بعد فراغ ایک شخص کی طلبی پر حضرت نے آپ کو سنبھل پور رائے پور (دکن) بھیج دیا، اور فرمایا، کہ لائق و فائق مدرس کو آپ کے پاس روانہ کرتا ہون، ایک عرصہ تک رہے، جب مکان تشریف لائے تو بہتیرے حضرات اس دور کی مسافت سے مانع آئے، اور مدرسہ اہلِ حدیث دانا پور ضلع پٹنہ مین مدرس ہوئے چار سال بعد پھر سنبھل پور سے باصرار طلبی ہونے پر مجبوراً تشریف لے گئے، بعد واپسی سید شاہ منظر حسین صاحب رئیس بہار کے لڑکے کی تعلیم کے واسطے رہے،"

"علم اصول و حدیث مین خاص مہارت تھی، ماتحت احادیث تفریعات فقہیہ و تطبیق و توفیق کے ساتھ پڑھانا معمول تھا، نہایت محققانہ کلام ہوتا، مقلدانہ تقریر سے سخت نفرت تھی، حق گو ایسے تھے کہ مسائلِ دینیہ مین کسی کا لحاظ نہ فرماتے، اور جو باتین آپ کے نزدیک حق و ثابت ہوتی، بیان فرما دیتے، کبھی لومۃ ولائم کا خیال دل مین نہ لاتے،"

اہلِ بہار کو آپ کی ذات سے بہت فیض پہنچا، اشاعت سنت و تردید بدعت ہمیشہ شغلہ رہا، کامل صحاح ستہ بیس مرتبہ سے زیادہ مرتبہ پڑھائی، ادب مین یہ کمال حاصل تھا کہ برجستہ

عربی مین نظم ونثر فرماتے، اور مسودہ مین محو واثبات نہ ہوتا، جیسا کہ المکاتیب سے ظاہر ہے"

"آپ کے تلامذہ سے مولوی مولا بخش خاں صاحب بڑاکر کامی (آپ کے برادر حقیقی م ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء)

مولوی عبد المجید خان صاحب رئیس گلنی (بہاری) مولوی شیخ محمد ابراہیم بن حاجی شیخ مرحوم

داناپوری، مولوی محمد سعید خان صاحب داناپوری، مولوی ابوالحسنات عبد الغفور صاحب داناپوری،

خاکسار ابوطاہر بہاری، مولوی عبد الواحد خان صاحب الحمیرام پوری ہین"

آپ کی تالیفات نافعہ سے شرح قصیدہ فرزدق تمیمی شرح حدیث[۵۱] ام زرعہ، شرق القرینین[۵۲] لہداۃ

الزوجین، سعادۃ الدارین فی اطاعۃ الوالدین، زجر العاصی عن قرب المعاصی، شریعت کا درہ،

نجاۃ[۵۳] المومنین فی حفظ الاربعین، سوط الرحمن وغیرہ (۲۰) سے زائد رسائل ہین جن مین سے

اکثر مختلف مطابع مین بوجہ کمال مفید ہونے کے مکرر طبع ہو چکے ہین تبصرۃ الابصار فی

تخریج الآثار مشتمل بر تبویب مشارق الانوار: ابویحیٰ، ۱۳۳۲ھ مین۔۔ نماز صبح کے وقت بہ

حالت سجدہ بہار ضلع پٹنہ مین انتقال فرمایا، تاریخ وفات مولوی الٰہی بخش مرحوم[۵۴] ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء

ممدوح نے مولانا ولایت علی مرحوم م ۱۲۶۹ھ ۱۸۵۲ء صادقپوری کے بعض فارسی رسالون کا اردو ترجمہ کیا،

میان صاحب سے استفادہ کے زمانہ مین صاحب عون المعبود، علامہ ابو الطیب شمس الحق ڈیانوی

(م ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء) مولانا رحیم آبادی (عبد العزیز م ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ء) ان کے ہم سبق تھے، صاحب ترجمہ کے حقیقی بھائی

مولوی مولا بخش خان (م ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء) بھی صاحب علم ومسند اور میان صاحب سے مستفیض تھے، اولاد میں دو

---

۵۱ و ۵۲ لیکن یہ دونون نام ایک ہی کتاب کے ہین، جو مطبع احمدی لاہور ۱۳۳۴ھ مین چھپی، ضخامت ص ۳۹،

(دیدہ مولف) ۵۳ اربعین حدیث پر ہے، پورا نام ہدایۃ المسلمین بشرح نجاۃ المومنین فی حفظ الاربعین، مطبوعہ

نولکشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور، ۱۳۲۰ھ ہجری صفحات ۲۸، مترجمہ بہ اردو، تمام احادیث اتباع

سنت ومذمت بدعت پر ہین۔ ۵۴ اخبار اہلحدیث ج ۱۷ نمبر ۶ ۴،

صاحبزادون کا علم ہے (۱) یعقوب حسن خان صاحب جن کے لئے زجر العاصی لکھی (۲) اور یوسف حسن خان فارسی شاعری میں دخل تھا، کتاب الدرر المنثور فی تراجم اہل صادقپور مین ان کی ایک نظم چھپی ہے،

(۳۱) مشکوٰۃ الانوار لتسہیل مشارق الانوار: مولوی عبد الغفور غزنوی امرتسری (م ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) (اردو) مطبوعہ مطبع الفاروقی دہلی،

اس میں مشارق الانوار کی تبویب و ترتیب علی نہج المشکوٰۃ ہے، مولانا غزنوی موصوف نے تمام مشارق کو کتابۃً بھی فہرست مدونہ کے مطابق بدل دیا ہے، البتہ نمبرون مین تبدیلی نہیں کی، مثلاً سب سے پہلی حدیث (تسہیل) مین الاعمال بالنیات لائے ہین، مگر یہ نمبر اصل نسخہ کا نمبر ۱۲۵ ہے، الغرض مولوی عبد الغفور کا مقصد صرف ترتیب علی نہج المشکوٰۃ المصابیح ہے، جیسا کہ فرماتے ہین:-

"لہذا اس امیدوار رحمت رحمان ابو ادریس عبد الغفور بن محمد بن عبد اللہ الغزنوی غفر اللہ لہم کو نہایت مناسب بلکہ واجب معلوم ہوا، کہ اس کتاب کو ترتیب معنوی پر بنالیا جاوے تاکہ سب مسلمان بھائی اس سے بآسانی تمام فائدہ اٹھا سکین، اور جس حکم کی احادیث مطلوب ہون، بآسانی نکال سکیں، چنانچہ مشکوٰۃ وغیرہ مین تو مین نے اپنے چچا مولوی عبد اللہ (م ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء) بن عبد اللہ الغزنوی (م ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء) رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس بارہ مین مشورہ کیا، تو انھون نے اس بات کو بہت پسند کیا، اوران کو اللہ تعالیٰ نے ذہن عالی اور فکر بلند دیا تھا جس کی صفت مین بیان نہین کرسکتا ہون، اور آپ نے مجھ کو یہ ترکیب سکھلائی کہ اس کے ابواب موافق مشکوٰۃ کے ہونے چاہئین، اور ہر باب مین تین فصلیں ہون فصل اول مین بخاری اور مسلم دونون کی حدیثیں ہوں، اور دوسری فصل مین حدیث بخاری کی، اور تیسری فصل مین فقط مسلم کی حدیثین ہون، اور جس باب مین تینون مین سے کوئی فصل نہ ہو، اس مین اس طرح رکھنا چاہئے، کہ اس [illegible]

فصل نہیں ہے چنانچہ مشکوٰۃ والے کا بھی یہی قاعدہ ہے، تو جیسا آپ نے ارشاد کیا، اوسی کے مطابق مین نے یہ کتاب بنائی، تو گویا یہ کتاب ایک چھوٹی مشکوٰۃ بن گئی ہے، بلکہ مشکوٰۃ پر بھی فوقیت لے گئی، اس واسطے کہ یہ کتاب مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثون کی صحت پر اتفاق ہے، اس مین کوئی حدیث ایسی نہین، جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس مین ہر قسم کی حدیثین مذکور ہین، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔۔۔۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء مین حسب دلخواہ یہ کتاب تمام ہوئی، اور مشکوٰۃ الانوار تسہیل مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا،" (ص ۲۳۲ و ۲۳۶)

اس مین بعض حواشی بھی ہین، مگر شاذ، ترجمہ، وفوائد مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء) کے ہین جس کا ذکر شرح نمبر ۲۹ پر کیا گیا ہے،

صاحب مرتب ہندوستان کے مشہور عارف باللہ عبد اللہ صاحب غزنوی امرتسری (م ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء) کے پوتے اور صلحاے اُمت سے ہین، امرتسر مین ترویج کتاب و سُنت کے لئے مطبع انوار الاسلام قائم فرمایا، مشکوٰۃ المصابیح مترجم و محشی اور قرآن مجید مترجم و محشی چھپوائے، الروض الریاحین ترجمہ ریاض الصالحین مولوی احمد الدین ساکن کوم ضلع لودھیانہ (م ؟ ســــــہ) اسی مطبع مین چھپا ہے، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کے چند رسائل اسباب النزول وجلاء الافہام وغیرہ طبع کرائے، اور شیخین کی تصانیف سے اسی خاندان نے علماے ہند کو متعارف کیا، یہ نکتہ سب سے پہلے صاحب الہلال مولانا ابو الکلام نے بیان فرمایا، کوئی ایسی کتاب اس مطبع مین نہ چھپی، جس کی غرض محض تجارت ہو، بلکہ صرف وہ کتابین چھپوائین، جن کا مقصد اشاعت کتاب و سُنت تھا، مولوی عبد الغفور غزنوی نے ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء مین بعمر ۶۵ سال انتقال فرمایا،[۱]

امام حسن صغانی کی دوسری تالیفات | امام حسن کی تصانیف مین موضوعات کا ذکر اوپر گذرا ہے اس

---

[۱] ایک فروگذاشت کا ذکر ضروری ہے مشارق الانوار کی ایک اور اردو شرح کا تذکرہ نظر سے گذرا، یہ غالباً مولانا محمود حسن نانوتوی کی ہے، مگر شرف مطالعہ کا اتفاق نہ ہو سکا،

ان کے دو رسالے ہین، یہ دونون رسالے کتب خانہ خدیویہ مصر مین (قلمی) موجود ہین[۵۱] اور طبع بھی ہو چکے ہین[۵۲] مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے ان کا تذکرہ الفوائد البہیہ مین کیا ہے، جس میں ان دونون رسالون کا ذکر آیا ہے[۵۳]،

۳- الدر الملتقط فی تبیین الغلط و نفی اللغط، یہ رسالہ موضوعات (نمبر ا و ۲) سے علحدہ معلوم ہوتا ہے کہ "در دے موضوعات کتاب الشہاب و انجم جمع نمودہ"[۵۴] نیز فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر مین بھی الدر الملتقط کا اندراج باب کتب موضوعات سے علحدہ کیا گیا ہے،

۴- کشف الحجاب عن احادیث الشہاب اور یہ الدر الملتقط (نمبر ۴) سے علحدہ ہے،

۵- شرح صحیح بخاری (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ۲۸)

۶- الشمس المنیرہ من الصحاح الماثورۃ (" " ")

۷- زبدۃ المناسک، (اتحاف النبلاء ۳۴۳)

۸- در السحابہ فی وفیات الصحابہ (فن رجال) (سبحۃ المرجان ص ۲۸)

۹- شرح در السحابۃ (" ") (" ")

۱۰- مجمع البحرین، یہ بارہ جلدون مین ہے،

۱۱- التکملۃ (علی الصحاح) صحاح مین جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اس میں پورا کیا گیا ہے[۵۶]،

اسی طرح فن لغت مین ذیل کے چند اور رسالے ہین،

---

۵۱ فہرس دار الکتب العربیہ الموجودۃ فی الدار لغایت ۱۹۲۱ مخطوطہ: ۲، مجامیع ص ۹۰ ومخطوطہ ۹، ۵۲ فہرس تجارتی ابنائے محمد بن غلام رسول بمبئی ۵۳ الفوائد البہیہ ص ۳۰ ۵۴ اتحاف النبلاء ص ۸۴ ۵۵ فہرس دار الکتب العربیہ الموجودۃ فی الدار لغایت ۱۹۲۱،

۵۶ البلغۃ فی اصول اللغۃ للنواب (نقلاً عنہ وترجمۃ منہ) ص ۹۹ و ۸۸،

(۱۲) اسماء الاسد (۱۳) اسماء الذئب (۱۴) الاضداد[۱] (۱۵) الشوارد (۱۶) کتاب الافتعال،

متفرق کتابین :-

(۱۷) الفرائض[۲] (۱۸) العروض[۳] (۱۹) درجات العلم والعلماء[۴] (۲۰) کتاب المفعول[۵] (۲۱) شرح ابیات المفصل[۶] (۲۲) بغیۃ الصدیان (۲۳) العباب الزاخر واللباب الفاخر،[۷]

" وصنف کتاب العباب فی اللغۃ فاعترتہ "المنیۃ قبل ان یکمل ثلاث احرف ببغداد فی شہور خمسین ستمائۃ" (سبحۃ المرجان ص۲۸)

علامہ بلگرامی فرماتے ہین کہ العباب سپرد قلم فرمارہے تھے، ہنوز تیسرا حرف بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ

کوس رحلت بکوفت دست اجل

بغداد مین مقیم تھے، اور وہین پیک اجل آپہنچا، رحمہ اللہ تعالی،

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۸۳ [۲] ایضاً [۳] اتحاف النبلاء ص ۲۴۳ [۴] کشف الظنون ص ۳ [۵] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۶۳ ، [۶] سبحۃ المرجان ص ۲۸ ،

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور اُن کے منتخب اشعار، اردو مین شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے، جس مین آب حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، دکنی سے لے کر حالی تک کے حالات ،

قیمت :- ہے، ضخامت :- ۵۴۰ صفحے،

"منیجر"

استفسار و جواب

اسلام میں مجلس شوریٰ کا نظام

مولوی ابوالقاسم صاحب
قصبہ بحری آباد ضلع غازیپور (یوپی)

"کیا اسلام میں مجلس شوریٰ کا کوئی نظام بنایا گیا ہے اور اگر کسی مسئلہ میں کتاب و سنت کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو اور ارکانِ مجلس اور امام یا خلیفۂ وقت میں دیانتداری سے اختلاف رائے ہو جائے تو کیا اسلام کے رو سے امام کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جمہور کی رائے کو نظرانداز کرکے اپنی ذاتی بصیرت اور رائے کے مطابق فیصلہ کردے، اگر اس کو یہ حق حاصل ہو تو دلائل شرعیہ سے اس کو واضح کیا جائے"[1]

معارف:- گرامی نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، اس سے پہلے بھی آپ کے مکتوب ملتے گئے مگر افسوس ہے کہ جواب دینے سے قاصر رہا، اصل یہ ہے کہ اس استفسار کے جواب میں لب کشائی سے گریز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا، یہ زمانہ فتنہ کا ہے، مسلمانوں کی اکثریت کی بنیاد پر جو حکومتیں قائم ہیں، ان کو صحیح اسلامی حکومت سے موسوم کئے جانے کا جذبہ بڑھ رہا ہے، اس لئے خطرہ گذرتا ہے کہ کہیں خلیفہ کے اختیارات اور مجلس شوریٰ سے اس کے تعلق پر قیاس کرکے آمرانہ نظام حکومت کے لئے ثبوت نہ بہم پہنچائے جائیں، اور یہ مباحث جب لگا ہوں کے سامنے آئیں تو ان کی اصل روح کو چھوڑ کر غلط انداز سے عوام کی ذہنی تربیت کی راہ نہ نکالی جائے، اس لئے موجودہ دور میں ایسے

---

[1] افسوس ہے کہ جناب مستفسر کا وہ مکتوب گرامی جو استفسار کے سلسلہ میں آیا تھا، اور جس کے جواب میں یہ سطریں لکھی گئیں کاغذوں میں دب کر کہیں رہ گیا، اس لئے استفسار کے مفہوم کا متن بھی ہمیں خود لکھنا پڑا ہے، "س"

مسائل جہان تک نگاہون سے اوجھل رہیں، زیادہ مفید ہے لیکن آپکے بار بار کے اصرار سے اس سلسلہ مین چند اشارات ذیل مین پیش ہین لیکن یہ خیال شریف مین رہے کہ ان مین سے کوئی بات بھی اپنی دوسری باتون سے علحدہ ہوکر صحیح نہین رہ سکتی، یہ مسئلہ ذیل کی چند تصریحات سے واضح ہوسکتا ہے:-

(الف) یہ صحیح ہے کہ اسلام مین مسائل کے فیصلہ کا معیار عمومیت کے ساتھ محض تعداد کی اکثریت محض پر مبنی نہین، اس لئے کسی مسئلہ کا فیصلہ محض تعداد کی قلت وکثرت کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسلام مین اس کا اصل معیار اس مسئلہ کا کتاب وسنت اور حق کے مطابق ہونا ہے، اور یہی ہر مسئلہ کے فیصلہ کی اصل میزان ہے،

(ب) دوسری طرف اسلام میں خلیفہ وامام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے تمام مسائل مین جن میں قرآن مجید کی کوئی نص یا حدیث کی کوئی صریح روایت یا اجماع امت سے کوئی پچھلا متفقہ فیصلہ موجود نہ ہو، تو وہ مجلسِ شوریٰ طلب کرکے اس سے ہدایت حاصل کرے، پھر یہی راہِ عمل ان تمام وقتی وسیاسی مسائل کے لئے ہے، جو مصالح امت کے لحاظ سے ضروری ہون، خواہ وہ عام سیاسی امور ہون، یا کوئی وقتی جنگی صورتِ حال، ان مین سے کسی صورت مین خلیفہ وامام کے لئے مناسب نہین کہ وہ محض اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کرکے کوئی قدم اُٹھائے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کی یہ صفت بیان فرمائی ہے،

وامرھم شوریٰ بینھم (آل عمران) اور اُن کے کام آپس کے مشورہ سے ہوتے ہین"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا،

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت اور کام مین اُن سے مشورہ لین پھر جب تو

فتوکل علی اللہ، (آل عمران) قصد کرچکا تو اللہ پر بھروسہ کر،

یعنی باہمی مشورہ کے بعد جو رائے بہتر قرار پائے، اس پر ہمت وعزیمت کے ساتھ عمل کیا جائے"

(ج) لیکن اسلام نے مجلسِ شوریٰ کے لئے کوئی متعین نظام مقرر نہین کیا ہے، بلکہ اس مین امت

کے لئے زمان و مکان کے لحاظ سے آزادی دی گئی ہو کہ اربابِ حل وعقد اس کے لئے خود کوئی وسیلہ اختیار کرلین

اسی لئے خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین مختلف موقعون کے لحاظ سے مختلف صورتین اختیار کی گئین، عمل کی یہ آزادی

ہمین آج بھی حاصل ہو سکتی ہے، کہ اپنے مصالح کے لحاظ سے خود کوئی نظام اور قاعدہ بنالین، جو کتاب وسنت

اور سلف کے طریق کی روشنی اور اسی روح کے مطابق ہو جس پر اسلام کے صدر اول مین عمل درآمد جاری رہا،

(۱) مجلسِ شوریٰ کے متعلق مذکورۂ بالا تینون امور بنیاد و اساس کا درجہ رکھتے ہین، ان مین سے پہلی بات

یہ کہ اسلام مین مسائل کے فیصلہ کا معیار تعداد کی کثرت وقلت نہین، بہ ظاہر موجودہ زمانہ مین عام جمہوری اصول

کے خلاف معلوم ہوتی ہے، مگر یہ محض بادی النظر مین سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب اصل معیار کسی

مسئلہ کا کتاب وسنت اور حق کے مطابق ہونا ہے، تو یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ اسلامی نظام مین جو مجلسِ شوریٰ

ہو گی اس کے ارکان کے ذہن دین کے سانچے مین ڈھلے ہون گے، ان کی دینداری سے ایسی توقع ممکن

نہین ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو دین کی روح کے مخالف جانتے ہوئے اس کے منظور کئے جانے پر اصرار کرین کہ امت

کے اکابر کبھی کسی باطل پر متفق ہو ہی نہیں سکتے، دوسری طرف اگر کوئی خلیفہ جان بوجھ کر کتاب وسنت

کے خلاف راہ اختیار کرے گا، تو کھلی ہوئی بات ہے، کہ اس مین اس کی پیروی نہ کیجائے گی، کہ "انما

الطاعۃ فی المعروف" اور "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" اسلام کے جانے بوجھے اصول

ہین، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی حکومت، اس کے ارکان کے اطوار، اخلاق اور طرزِ سیاست کا اندازہ موجودہ

حکومتون کے نظام اور اُن کے معیار سے لگایا ہی نہین جا سکتا،

(۲) اسلام مین مجلسِ شوریٰ کو مسلمانون کی سیاسی واجتماعی زندگی مین نمایاں درجہ حاصل رہا ہے،

چنانچہ اسلام کے صدر اول مین مذکورہ بالا دونون آیاتِ کریمہ کی روشنی مین ملکی وغیر ملکی معاملات کے لئے باہمی

مشاورت اسلامی حکومت کے لئے ایک بنیادی شعار رہی، اور اس پر عمل درآمد جاری رہا، خود آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مسائل مین جن مین وحی والہام سے کوئی راہ بتائی نہ گئی ہوتی، آپ اربابِ صلاح سے

مشورہ فرماتے تھے، اور بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ آپ کی راے گرامی سے کسی اور صحابی کی راے موافق ہوئی تو آپ نے اس کے موافق عمل فرمایا، چنانچہ بدر کے قیدیوں کا جب معاملہ آیا، تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق وحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا، حضرت صدیق اکبرؓ کی راے آپ کی راے گرامی سے مطابق ہوئی، اور آپنے اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیا،

ارباب علم کا خیال ہے کہ آپنے اس موقع پر صرف دو صحابیوں سے اس لئے مشورہ فرمایا کہ اس وقت وشاورہم فی الامر کا حکم ربانی نازل نہیں ہوا تھا، یہ آیت پاک غزوۂ احد میں نازل ہوئی، جب آپ سے آیت میں "عزم" کا جو ذکر آیا ہے، اس کی تصریح پوچھی گئی، تو آپنے ارشاد فرمایا "مشاورۃ اہل الرّاے ثم اتباعہم" یعنی ارباب راے سے مشورہ کرنا پھر اس کا اتباع کرنا، یہ ظاہر ہے کہ یہ "مشورہ" امت کے تمام افراد سے بیک وقت ممکن نہیں، اس لئے اس مشورہ کے اہل، وہ ارباب حل وعقد ہوں گے، جن پر امت اسلام کو کامل اعتماد ہوگا، اور وہ اپنی دیانت، تقوی اور اصابت راے سے اس کے اہل سمجھے جائیں گے، گویا دوسرے لفظوں میں انھیں عوام مسلمین کا اعتماد و نمایندگی حاصل ہوگی،

پھر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب مجلس شوریٰ میں ارباب حل وعقد جمع ہوں گے، اور وہ اپنی دینی بصیرت سے کسی مسئلہ میں کوئی فیصلہ کریں گے، تو اُن کی تعدادی اکثریت ناقابل لحاظ بھی نہیں رہ سکتی، اس لئے امام یا خلیفہ کی واحد یا اقلیت رکھنے والی جماعت کی رایوں کے برخلاف صاحب صلاحیت افراد کی رایوں کی جس طرف کثرت ہوگی، وہ زیادہ قرین صحت وصواب سمجھی جائے گی، لیکن یہ خیال رہے کہ اس اقلیت و اکثریت میں تعداد محض کے علاوہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے اوصاف ومحامد کا لحاظ بھی رکھنا پڑے گا، اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد گرامی سے حقیقت زیادہ واضح ہوسکتی ہے،

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا، کہ یارسول اللہ اگر فیصلہ کرنے میں کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے متعلق کوئی وحی نہ آئی ہو، اور نہ سنت رسول کا علم ہو، تو

ایسی صورت میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں، اس کے جواب میں آپنے فرمایا،

تجعلونہ شوریٰ بین اھل الفقہ والعابدین من المومنین و لا تقض فیہ برایٔ خاصۃ	(طبرانی اوسط)	اس مسئلہ کو ارباب فقہ، اور عبادت گذار مسلمانوں کے سامنے پیش کرو، اس میں خاص اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو،

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ارشاد ہوا،

واستشر فی امرک الذین یخافون اللہ عزّ وجل، (مستدرک وبیہقی)	اور اپنے کام میں اُن سے مشورہ چاہو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں،

اور اللہ سے ڈرنے والے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وہی ہیں جن کو علم و معرفت حاصل ہے، انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (الآیہ) اللہ سے علماء ہی ڈرتے ہیں، لفظ علماء یہاں اصطلاحی معنوں میں نہیں ہے بلکہ مراد اہلِ علم سے ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلسوں میں اجتماعوں میں بلکہ نماز کی جماعتوں میں بھی اس بات کا لحاظ فرماتے تھے، کہ اہلِ عقل و فہم آپ کے قریب تر رہیں تاکہ وہ بات کو سمجھ سکیں، اولوا الاحلام والنّہیٰ کے الفاظ اس موقع پر احادیث میں آئے ہیں،

قرآن مجید میں اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے،

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اُولی الامر منکم	اللہ کی اطاعت کرو، اور اللہ کے رسولؐ اور اولو الامر کی اطاعت کرو،

اس اولو الامر کی تشریح دوسری آیت میں یہ ہے،

واذا جاءھم امر من الامن اوِ الخوف اذاعوا بہ ولو ردّوہ	اور جب اون کے پاس امن و خوف کی کوئی خبر آتی ہے، تو اوس کو پھیلا دیتے ہیں، اور اگر

اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ، (نساء - ۱۱)

اوس کو رسول اور اپنے مین سے اولوالامر تک ۔۔۔۔ پہنچا دین تو اس کی تحقیق وہ کر لیتے جو بات کا پتہ لگا سکتے ہین،

اس سے معلوم ہوا کہ اولوالامر جو حقائق و مسائل کا استنباط کرین اون کی بھی اطاعت مصالح اسلامیہ مین کی جائے،

اس لئے جو صورت آپ نے لکھی ہے، اس مین امام کے لئے ضروری ہوگا، کہ پہلے وہ اپنے شرح صدر کو ارباب حل وعقد کے سامنے رکھے، انھیں اپنا ہمنوا بنائے، اگر اس مین اس کو کامیابی نہ ہو اور لوگ اپنی دینی بصیرت و معاملہ فہمی سے اپنی اس رائے پر جمے رہین، جو اگرچہ امام کی رائے سے مختلف ہے مگر وہ باہم متفق یا بیشتر افراد ہمنوا ہین، تو پھر امام کے لئے مناسب ہوگا، کہ وہ اپنی رائے کو ان کی رایون کے تابع کر دے، اور اس کی مثالین عہد رسالت و خلافت راشدہ کے دورون مین بھی گذر چکی ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جہان تک امور دینیہ کا تعلق تھا، آپ کو صلاح و مشورہ کی حاجت نہ تھی کہ آپ کا سرچشمۂ علم، وحی ربانی و ملکۂ نبوت تھا، البتہ دنیاوی امور مین جن مین جنگی و سیاسی مصالح و ضروریات بھی داخل تھے، آپ صحابۂ کرام سے صلاح و مشورہ فرماتے، اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، کبھی ایسا بھی پیش آیا، کہ آپنے اپنی رائے کے مطابق عمل کو ترک کر کے دوسرون کے مشورہ پر عمل فرمایا، جیسا کہ بدر کے موقع پر جب آپ نے ایک مقام پر قیام فرمانا چاہا، اور وہاں اُتر پڑے، تو حضرت حباب بن منذر بن جموح رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! اس مقام کو وحی کے مطابق اختیار فرمایا ہے، تو اس سے ہم آگے پیچھے نہین ہٹ سکتے، یا حضرت نے اپنی رائے سے اس کو منتخب فرمایا ہے، اور لڑائی مین جنگی چالین ہوتی ہین" آپ نے فرمایا کہ "نہین محض ذاتی رائے، اور جنگی چال ہی کے طور پر ہے" تو پھر حضرت حباب رضی نے ایک دوسرے مقام کے لئے مشورہ دیا، اور آپنے اپنی رائے کو ترک کر کے اس کو قبول فرما لیا،

اگرچہ اس موقع پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ حضرت حبابؓ سے گفتگو کے بعد بھی آپ کی پچھلی رائے اپنی جگہ قائم رہی، اور اس کے باوجود آپنے اس کو ترک کر کے ان کی رائے قبول کر لی، بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ اس گفتگو کے بعد خود آپ کی رائے بھی تبدیل ہو گئی، ہو تاہم اس موقع پر ہمارے لئے وہ ارشادِ گرامی راہنما ہے جو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، کہ ولا تقض فیہ برایٔ خاصۃ اور اس لئے دورِ حاضر مین امام و خلیفہ کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے، کہ اوس کو اپنی رائے ترک کر کے عام ازین کہ وہ ذاتی طور پر متفق ہو یا نہ ہو، اربابِ حل و عقد کی کثرتِ رائے کا اتباع کرنا مناسب ہے،

(۳) باقی رہا اسلام مین شوریٰ کے نظام کے متعلق کسی متعین طریق کا مقرر نہ ہونا، تو دراصل اس مین اُمت کی فلاح و بہبودہی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، تاکہ اس مین وسعت باقی رہے، اور اُمت کے مختلف حالات و مقتضیات کے لحاظ سے نظام مین ردوبدل کی آسانی برقرار رہے، کیونکہ ایسے جزئی قوانین کا انضباط ممکن نہ تھا، جن پر ہر زمانہ اور مقام مین یکسان عمل کیا جاتا، اور اگر کوئی خاص نظام متعین کر دیا جاتا تو خطرہ تھا کہ لوگ اس کو دینی حکم سمجھ کر ہر زمانہ مین اسی کو لئے رہتے، اگرچہ اس پر عمل کرنا امت کے مصالح کے خلاف ہوتا، اس لئے یہ محض اصولی بات کہہ دی گئی، کہ "مشاورہ" ایک دینی حکم ہے، اور اس پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے زمانہ مین عمل کرنے کی تربیت اُمت کو دی، چنانچہ ہجرت کے وقت سے فتح مکہ تک آپ کا طریقِ عمل یہ رہا، کہ آپ مسجدِ نبویؐ مین اہم مسائل پیش فرماتے، مسلمانون کا سوادِ اعظم وہان موجود ہوتا، جن مین اربابِ حل وعقد بھی ہوتے، اور آپ مسائل پر مشورہ فرما لیتے، پھر جب مسلمانون کی تعداد مین اضافہ ہوا، دور دور کے مختلف مقامات اسلامی سلطنت کے ماتحت آئے، تو مختلف قبائل اور گروہ کے اربابِ حل وعقد پر اعتماد کیا گیا، اور وہ اپنی اصابتِ رائے سے اہم امور کا فیصلہ کرتے رہے، چنانچہ خلافتِ صدیقی و فاروقی مین متعدد مسائل کا فیصلہ ایسی مجلسون کے انعقاد سے ہوتا رہا، یہانتک کہ زراعت اور مالگذاری یا جنگ کے معاملات مین اہلِ ذمہ اور عام اہلِ تجربہ سے مشورہ کیا گیا ہے،

اس موقع پر تشریعِ اسلام کی اصطلاح فنی میں دو لفظ خاص طور کے لحاظ سے قابل ہیں،

ایک اجماع اور دوسرا جمہور، اجماع کے طول طویل مباحث کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ اسلام کے اصول کتاب و سنت کے تحت میں کسی جزئی مسئلہ کے فیصلہ کے لئے جس کا ذکر نص میں نہ ہو، کسی زمانہ کے علمائے امت کسی ایک پہلو پر تمامتر یا بالاکثریت قولاً یا عملاً متفق ہو جائیں،

جمہور کے معنی یہ ہیں کہ جس جانب علی العموم اکثر علماء ہوں، اس کی نسبت یہ خیال کیا جائے گا، کہ یہ رائے زیادہ صحیح ہے، ایسے ہی موقعوں پر ہمارے فقہاء لکھتے ہیں، وعلیہ الجمھور، مختلف مسائل میں صحابۂ کرام اور ائمۂ اعلام کے نام گنا کر کہا جاتا ہے کہ جمہور صحابہ جمہور ائمہ یا جمہور امت کی یہ رائے ہے، اور اس کے مقابلہ میں ایک فرد یا قلیل التعداد افراد کی رائے کو شاذ کہا جاتا ہے، جس کے اتباع سے منع فرمایا گیا، احادیث میں جماعت کا ساتھ دینے کا حکم ہے جیسے ید اللّٰہ علی الجماعۃ اور اتبعوا السواد الاعظم اور من شذ عن الجماعۃ وغیرہ احادیث اسی طرف اشارہ کرتی ہیں جامع ترمذی میں اکثر مسائل میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نام لے کر کہا گیا ہے، وبہ قال غیر واحد من الصحابۃ او العلماء

مگر یہ جمہوریت اور جماعت عوام افراد کی نہیں ہے بلکہ اہلِ علم و اہلِ عقل کی ہے،

مباحث بالا کا حاصل یہ ہے کہ

۱۔ ایسے مسائل میں جو منصوص نہیں مشورہ ضروری ہے،

۲۔ اہلِ شوریٰ اہلِ علم و عقل ہوں جن کو اصول سے مسائل کے استنباط کا سلیقہ ہو،

۳۔ غیر دینی مسائل میں عام اہلِ تجربہ سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے،

۴۔ اگر اہلِ علم و تجربہ کی رائے میں اختلاف ہو تو اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے،

بہر حال یہ سرسری امور ہیں، جو عرض کئے گئے، ضرورت ہے کہ اہلِ علم مجلسِ شوریٰ کے نظام پر غور و فکر کریں، اور کتاب و سُنت، ورآثار و سیر کی روشنی میں اوس کے جزئیات کو مرتب و مدون کریں، والسّلام

کیا ناقص مسلمانوں کی نسبت اسلام کی جانب صحیح نہیں؟

جناب محمود اکبر خاں صاحب
ڈھوک شرفا، کیمل پور، ضلع اٹک
مکرمی محترمی :- سلام مسنون

نومبر ۱۹۴۲ء کے معارف میں استفسار و جواب کے تحت صفحہ ۹۵، پر یہ مثال بطور دلیل پیش فرمائی ہے،

"کیا کھٹے آموں کو آپ آم نہیں کہیں گے، اور اگر نہیں کہیں گے، تو کیا آپ اس کو املی بتائیں گے، یا یہ کہیں گے کہ ہیں تو آم ہی مگر کھٹے ہیں[۱]"

اسلام کی اصطلاحات کو بیان کرنے سے مدعا اگر صرف اسی قدر ہو کہ طرزِ بیان دلپذیر ہو اور معترض کو خاموش کرنے کی کوشش کی جائے، تو آپ کسی حد تک اس مدعا میں کامیاب رہے؛

---

[۱] حضرت الاستاذ مدظلہ نے افغانستان کے سفرنامہ میں جو "سیر افغانستان" کے نام سے چھپ چکا ہے، عرفِ عام کے مطابق افغانستان کے لئے "اسلامی حکومت" اور "اسلامی ملک" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، اس پر ایک صاحب عبد العزیز کا پوری نے اپنی حمیت دینی سے اعتراض کیا تھا کہ آپ جیسے بزرگوں کی تحریروں میں ایسے ممالک کے لئے جو اسلامی ملک "اور "اسلامی حکومت" کا نمونہ نہیں ہیں، مسلمانوں کے ملک اور مسلمانوں کی حکومت کے بجائے اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کے الفاظ کو دیکھ کر ذہن متشوش ہوتا ہے"، (باقی اگلے صفحہ پر)

کسی حد تک کامل طور پر نہیں"،

لیکن آپ کی پیش کردہ مثال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مثال بھی ویسی ہی بے کار ہے، جیسے کھٹے آم کا باغ لگانا اور پالنا،

اس میں شک نہیں کہ کھٹے آموں کو آم ہی کہیں گے، لیکن جب آم لگانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر غور کریں گے، تو اس شخص کا فعل عبث ہی دکھائی دیگا، جو کھٹے آموں کا باغ لگائے، حاشا وکلا، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عبث کام نہیں کرتے،

جب اس آم میں جو اس وقت نباری آم (غیر مسلم) کے نام سے موسوم ہوتا ہے، اور ملیح آبادی آم (مسلم) میں اعتقاد وعمل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، پھر اگر ایسے آموں کو اس کی جانب نسبت دیجائے، تو اس کی بدنامی اور توہین نہ ہوگی،

فرمایئے اگر آپ کے باغ میں تمام آم کھٹے ہوں تو لوگ آپ کی اس صنعت کی اور انتخاب کی نسبت کیا رائے قائم کریں گے،

جن لوگوں کے اعتقاد وعمل کافرانہ (مشرکانہ) ہوں، اُن کو ایسے عقائد واعمال پر مطمئن کرنے کی سعی کرنا، اور دنیا جہاں کے بے محل، وغلط دلائل تلاش کرکے پیش کرنا صحیح اور درست روا نہ ہے اور شرعًا محبوب مشغلہ، اُمید ہے کہ آپ میری اس سیدھی اور صاف بات کو غور سے سمجھنے کی کوشش فرمائیگے،

والسلام، جواب کا طالب،

(بقیہ حاشیہ صفحہ) قبلہ موصوف نے معترض کے جذبۂ دینی کی قدر کرتے ہوئے اس کا تشفی بخش جواب مرحمت فرمایا تھا، (دیکھو معارف نومبر ۱۹۲۲ء) اور آخر میں بطور تمثیل کے تحریر کیا تھا، کہ کیا آپ کھٹے آموں (ناقص مسلمان) کو آم نہ کہیں گے، اگر آم نہ کہیں گے تو کیا ان کو املی بتائیں گے، یا یہ کہیں گے، کہ ہیں تو آم ہی مگر کھٹے ہیں، معترض نے اسی تمثیل پر اعتراض کیا ہے،

معارف:- حضرت سید صاحب قبلہ بھوپال مین تشریف رکھتے ہین، اور آپ کا اعتراض کوئی ایسا دقیق اور عجیب پیدنہین ہے، کہ موصوف کو اس کے جواب کی زحمت دیجائے، آپ کا جذبۂ دینی لائق ستائیش لیکن آپ کی برہمی غلط فہمی کا نتیجہ ہے،

آپ نے کھٹے اور میٹھے آمون کی تمثیل سے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے، کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ صحیح اور کامل اسلام کے مقابلہ مین ناقص اسلام کی حمایت کیجائے، یا کافرانہ اور مشرکانہ اعمال والون کی حوصلہ افزائی کیجائے،" اگر ایسا ہوتا تو کھٹے اور میٹھے آمون کا فرق ہی کیون کیا جاتا، تمثیل کا صرف یہ مقصد ہو کہ کامل اسلام اور ناقص اسلام اور کامل مسلمان، اور ناقص مسلمان دونون کی نسبت اسلام کی جانب صحیح ہے، کیا ناخلف اولاد ابنیت کی نسبت سے خارج ہوجاتی ہے، اور آپ کا یہ ارشاد تو سراسر مغالطہ ہے، کہ "جب آم لگانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر غور کرین گے، تو اس شخص کا فعل عبث دکھائی دے گا، جو کھٹے آمون کا باغ لگائے، حاشا وکلا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عبث کام نہین کرتے"،

معارف مین تو باغ لگانے نہ لگانے کا کوئی ذکر ہی نہین ہے، یہ تو تمامتر آپ کی اختراع ہے، اس مین تو صرف کھٹے اور میٹھے آمون کی تمثیل ہے، اس سے کھٹے کا باغ لگانے کی حمایت کہان سے نکلتی ہے، یہ تو آپ کو خود تسلیم ہے کہ شجرِ اسلام کا باغبان خود باری تعالیٰ ہے، اس لئے کسی انسان کے باغ لگانے کا کیا سوال ہوسکتا ہے"،

غالبًا یہ آپ کو معلوم ہوگا کہ تمثیل صرف مفہوم کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اور اس کی تمام جزئیات کا مثل لہٗ کے مطابق ہونا ضروری نہین ہے، پھر کیا میٹھے آم کے تخم سے مختلف اسباب کی بنا پر کبھی کھٹے آم نہین پیدا ہوتے، یہ تو ہر شخص کا تجربہ ہے کہ اگر اچھے تخم کے درخت کی پوری داشت اور نگرانی نہ کیجائے تو کچھ دنون کے بعد اس کے پھل کا رنگ اور ذائقہ بدل جاتا ہے،

دنیا کا کوئی نظام بھی خواہ وہ دنیاوی ہو یا الٰہی مادی ہو یا روحانی واخلاقی مرورِ زمانہ سے اپنی

اصلی حالت مین قائم نہین رہتا، اور زمانہ کے ہاتھون اس مین کچھ نہ کچھ تصرفات ہوجاتے ہین، جن کی نگرانی اور حفاظت کے لئے محافظین کی ضرورت ہوتی ہے، کہ وہ اس کو بیرونی اثرات سے پاک وصاف کرتے رہین یہی حال اسلام کا بھی ہے، بلاشبہ اسلام کی ہدایت اور اس کی تعلیمات ابدی ہین، لیکن خود ان کو اصلی اور صحیح شکل مین قائم رکھنے کے لئے اور اس سے اچھے پھل پیدا کرنے کے لئے مجددین اور مصلحین کی ضرورت ہوتی ہے جس سے کوئی بھی انکار نہین کرسکتا، اور جب اس فریضہ سے غفلت کیجائے گی، تو اسلام کی تعلیمات مسخ ہوتی رہین گی، اور اس کی پیداوار مسلمان بھی ناقص پیدا ہون گے، اس لئے کھٹے اور میٹھے آمون کے درخت لگانے کا کوئی سوال ہی نہین، بلکہ اگر اسلام کی پوری نگہداشت نہ کیجائے، تو مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر خود بخود ناقص مسلمان پیدا ہونگے، جیسا کہ آج کل ہے،

"اس تمثیل سے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کی حمایت اور حوصلہ افزائی بھی مقصد نہین" اور نہ یہ مقصد ہے کہ ناقص اسلام یا ناقص مسلمانون پر قناعت کرلی جائے، جیسا کہ خود کھٹے آم کی تمثیل سے ظاہر ہے، لیکن کسی مسلمان کی جانب کفر و شرک کی نسبت کرنے مین بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، فاسق اور گنہگار تک تو کہنے مین مضائقہ نہین لیکن جب تک کسی مسلمان سے صریح کفر کا صدور نہ ہو اس وقت تک اس کو کافر کہدینا بڑی جسارت ہے، بعض اکابر نے تو یہان تک احتیاط کی ہے، کہ اگر کسی مسلمان مین ننانوے جہتین کفر کی نکلتی ہون، اور صرف ایک جہت اسلام کی ہو، تو اسے کافر نہ کہنا چاہئے،

اس سلسلے مین ایک اصولی سوال یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کا صرف ایک ہی درجہ ہے یا مختلف مدارج ہین، یعنی وہی مسلمان مسلمان کہلائے گا، جو ابوبکرؓ و عمرؓ وغیرہ اکابر صحابہ کا مثنیٰ اور اسلام کا مکمل نمونہ ہو، یا ناقص و گنہگار مسلمان بھی مسلمان ہی کہلائین گے، اگر ایک ہی معیار ہے، تو تمام صحابہ کرام بھی ایمان و عمل کے لحاظ سے ایک درجہ کے نہ تھے، تو عام مسلمانون کا کیا ذکر، ان بعض آیات اور بے شمار احادیث کا کیا جواب دیا جائے گا، جن مین گنہگار مسلمان کو مسلمان ہی کہا گیا ہے، اور ان پر مغفرت اور

نجات کے دروازے بند نہین کئے گئے ہین، اور ان کو معمولی معمولی اعمال پر بڑے بڑے اجر کی امید دلائی گئی ہے، اس مختصر جواب مین ان حدیثون کے نقل کرنے کی گنجایش نہین ہے، اور وہ اصحاب علم کی نگاہ مین ہون گی، یہ بھی احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ عہد رسالت کے بعد کے ساتھ مسلمانون کی عملی حالت کمزور پڑتی جائے گی، لیکن کسی مسلمان کا تھوڑا عمل بھی بیکار نہ جائے گا، اس لئے کسی مسلمان کو کافر و مشرک کہنے مین بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اسی کے ساتھ ناقص مسلمانون کو کامل بنانے کی بھی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے، یہی اسلام کا اصل مقصود اور ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے، "م"

حیاتِ شبلی

(حصہ اول)

مؤلفہ مولینا سید سلیمان ندوی

یہ نوسو صفحون کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانحمری ہی نہین، بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ مین بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہین جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، شروع مین ایک دیباچہ ہے جس مین جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم اور اُن کے متقدمین و معاصر علما، کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس مین دیار مشرق مین علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے لکھا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علما، کے حالات بھی آگئے ہین، اس کے علاوہ کتاب مین مولانا کے باقیات صالحات یعنی دار المصنفین، ندوۃ العلما، مدرستہ الاصلاح سرائے میر، اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتون کے ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہین، کاغذ و طباعت اعلیٰ ضخامت ۹۲۰ صفحے قیمت غیر مجلد ہے، مجلد لعہ "منیجر"

ادبیات

نعت

از جناب مائل خیر آبادی

زبان پر محمد کا نام آگیا ہے ہمیں آج لطفِ تمام آگیا ہے

وہاں کی زمین خاک سر پاک سمجھو جہاں ذکر خیر الانام آگیا ہے

فرشتے جلو میں ادب سے کھڑے ہیں یہ محشر میں کس کا غلام آگیا ہے

قدم کیا رسولِ معظم کے آئے جہاں میں مکمل نظام آگیا ہے

یہی بس ہے مائل ہمیں روزِ محشر وہ کہدیں ہمارا غلام آگیا ہے

غزل

از جناب شاہین اشرف حجازی

مجھے نام ہی تمہارا ہے قرار جیتے جی کا کہ یہی ہے اک سہارا میری سانس زندگی کا

میں فقیر ہوں ٹھکانا نہیں کچھ مری خوشی کا کہ ہے دو جہاں سے بڑھ کر مجھے لطف زندگی کا

تمہیں کس طرح بھلا دوں یہ مجھے تمہیں بتا دو کہ ہے تم یہ خود ہی روشن میرا حال بے کسی کا

ہے سبھی سے یاس مجھکو ہے تجھی سے آس مجھکو کہ مجھے نہیں سہارا ہے ترے سوا کسی کا

جو ہجوم یاس پایا تو ہمیں پکار اٹھنا

یہی کام رہ گیا ہے بس اب اپنی زندگی کا

مطبوعات جدید

شرح میر درد از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰، صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ مکتبہ ادب لال کنوان دہلی،

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی شہرت زیادہ تر شاعر کی حیثیت سے ہے لیکن درحقیقت وہ ایک صاحب نسبت بزرگ اور صاحب دل صوفی تھے، ان کی شاعری ان کے باطنی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھی، ان کا کلام نہایت سادہ اور سلیس ہے، لیکن تصوف کے معارف وحقائق سے لبریز ہے، اس لئے جو لوگ اس بادہ کی لذت شناس نہیں ان کو جابجا سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے، خواجہ صاحب نے اس کی شرح لکھ کر ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے، اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ خواجہ صاحب اس کوچہ سے بھی آشنا ہیں، ہم نے اس شرح کو اکثر مقامات سے دیکھا، اور صحیح پایا، یہ اس سرزمین سے نسبت کا فیض ہے، جو صدیوں تصوف کا گہوارہ رہ چکی ہے، اور جہاں آج بھی بہت سے اکابر مشائخ وصوفیاے کرام آسودہ خواب ہیں، مصنف میں زبان کی فصاحت و پاکیزگی اتنی رچی ہوئی ہے، کہ ان کے قلم کی کوئی تراوش اس سے خالی نہیں ہوتی، چنانچہ اس شرح میں بھی زبان کی لطافت نمایاں ہے، یہ شرح اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

ہندوستان کی سیاسی الجھنیں، مترجمہ جناب شاہین فاروقی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۷ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت:۔ عہ/۱۲ پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن

کانگریس کے اجلاس کوکناڈا (۱۹۲۳ء) کا مولانا محمد علی مرحوم کا خطبہ صدارت بڑا معرکۃ الآرا تھا، اس میں اس دور کے ہندوستان کے تمام سیاسی مسائل پر جن میں ہندو مسلمانوں کے اختلافات بھی ہیں

نہایت مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور اُن کا حل پیش کیا گیا ہے، اصل خطبہ انگریزی زبان مین ہے، اور اس مین مولانا مرحوم کے زور بیان اور ادب و انشا، کی تمام خوبیان موجود ہین، جناب شاہین فاروقی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، گو اتنی طویل مدت مین بڑا انقلاب ہو چکا ہے، سیاست کی دنیا ہی بدل گئی ہے، ہندستان آزاد ہو چکا ہے اس لئے اس خطبہ کی بہت سی باتین قصۂ پارینہ بن چکی ہین، لیکن ہندو مسلم مسائل اور ان کے اتحاد کے بارہ مین آج بھی اس خطبہ سے مدد مل سکتی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے لیکن اس پر جو مقدمہ اور کتاب پر جا بجا جو نوٹ ہین، وہ نہ صرف اس ترجمہ کے مقصد کے منافی بلکہ نہایت نامناسب ہین، آج کل سیاسی تغیرات کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے، کہ چند مہینے پہلے تک جو سیاست تھی وہ اب بالکل بدل گئی ہے، اور برابر بدلتی جائے گی، ان حالات مین جو خیالات مقدمہ مین ظاہر کئے گئے ہین ان کی اب قطعاً کوئی گنجایش نہین، "امن کی راہ کی" تلاش مین "فریب کاری" کی بدامنی کی دعوت کس قدر متضاد ہے،

ان پڑھ ہندوستان مترجمہ جناب سید ملا فخر الدین صاحب بی اے بی ٹی، لکچرار عثمانیہ ٹرننگ کالج حیدر آباد، تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ کتابت بہتر، قیمت درج نہین، پتہ ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن،

ہندوستان مین جہالت اتنی عام ہے، کہ اس کی پوری تعلیم کے لئے ایک مدت درکار ہے، اس کا وقتی علاج صرف تعلیم بالغان ہے، جس کے ذریعہ بقدر خواندگی تعلیم عام ہو سکتی ہے، ہندوستان مین جا بجا اس کے کامیاب تجربے کئے گئے ہین، پروفیسر فرینک سی لاخ جنھین تعلیم بالغان کا وسیع تجربہ ہے، اور ہندوستان کے تجربات سے بھی ان کو پوری واقفیت ہے، اس موضوع پر یہ جامع کتاب لکھی تھی، اس مین تعلیم بالغان کی اہمیت و ضرورت، ہندوستان مین اس کے تجربات و نتائج، اس کے نصاب تعلیم کے طریقون، اور ان تمام تعلیمی اور عملی وسائل و ذرائع کو جو تعلیم بالغان کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہین، نہایت بسط و شرح

کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ کتاب اس موضوع سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

غدر دہلی کے افسانون کا سلسلہ، مرتبہ شمس العلما جناب خواجہ حسن نظامی، ۱۲ حصے، قیمت مجموعی گیارہ روپئے، پتہ دفتر لوح محفوظ، اردو لائبریری دہلی،

خواجہ حسن نظامی صاحب کے مرتب کردہ غدر دہلی کے افسانون کا سلسلہ اتنا مشہور اور مقبول ہے، کہ اس کے لئے کسی نئے تعارف کی ضرورت نہین، یہ سلسلہ اب سے بچیس تیس سال پہلے شروع ہوا تھا، اور اتنا مقبول ہوا کہ اوس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہین، اور ہر اڈیشن مین نئے معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، بعض مستقل کتابون کا بھی اضافہ ہوا، ان مین سے اکثر حصے خواجہ صاحب کی مستقل تالیف ہین جو انھون نے دہلی کے پرانے لوگون سے سن کر لکھے، اور بعض غدر کے زمانہ کے .... روزنامچون خطوط اخبارات، اور سرکاری کاغذات و بیانات سے ماخوذ ہین، یہ کل ۱۲ حصے ہین، بیگمات کے آنسو، انگریزون کے قصے، محاصرہ دہلی کے خطوط، بہادر شاہ کا مقدمہ، غدر کے فرمان، غدر دہلی کے اخبار، غالب کا روزنامچہ، دہلی کی جان کنی، بہادر شاہ کا روزنامچہ غدر کی صبح و شام، دہلی کی آخری شمع، دلی کی سزا، گیارھوان حصہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا مشہور معروف دلی کا آخری مشاعرہ ہے،

نکتہ چین ہے غم دل، مترجمہ جناب آغا افتخار حسین صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۸۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت فی جلد ہ۴ ہے، پتہ:- نفیس اکیڈمی، عابد روڈ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب برنارڈ شاہ کے مشہور ڈرامے "مین اینڈ سپرمین" کا ترجمہ ہے، جس مین ایک شعبدہ گر اور عشوہ طراز عورت اپنے شاعر مزاج اور بھولے عاشق کو محبت کے فریب مین مبتلا رکھ کر ایک دوسرے خوش مزاج بذلہ سنج اور چرب زبان نوجوان سے جو بظاہر اس سے بھاگتا ہے، لیکن دل مین اس کی محبت چھپائے ہے، شادی کر لیتی ہے اس ڈرامے مین برنارڈ شاہ کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہین، اور اس زمانہ کے بہت سے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی نظریات و مسائل اور جدید دور کی بعض خوشنما اور پر فریب اصطلاحون اور سائنس و آرٹ اور بعض

دوسرے عقائد و خیالات پر نہایت فلسفیانہ انداز مین نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، ترجمہ سلیس اور شگفتہ ہے،

تلقینِ حق از جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۱۰ر، پتہ ادارہ تعلیمات اسلامی نمبر ۱۳/۴ ، امین آباد پارک لکھنؤ،

فاضل مصنف کی نگاہ قدیم مذاہب اور ان کے صحیفون پر بڑی گہری اور وسیع ہے، اس رسالہ مین انھون نے مختلف عقائد کے بارہ مین ان مذاہب کی تعلیمات اور بعید از عقل افسانون کے مقابلہ مین اسلام کے عقائد و تعلیمات، اس کی توحید، دوسرے صحیفون کے مقابلہ مین کلام مجید کی خصوصیات وحی، کلام مجید کے ممتاز اور نمایان مضامین، احکام، اہل مذاہب سے مناظرہ، گذشتہ امتون کے سبق آموز حالات عجائبات عالم مین تفکر کی دعوت اور ان سے استدلال، حیات بعد الممات اور جزا و سزا وغیرہ اسلام کے ارکان خمسہ، توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی حکمتون کو ایسے دلنشین انداز مین بیان کیا ہے جن سے دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے مقابلہ مین اسلام کی تعلیمات کی سادگی دلنشینی صداقت اور برتری کا اندازہ ہوتا ہے، گو یہ کتاب طالب علمون کے لئے لکھی گئی ہے لیکن ہر شخص کے مطالعہ کے لائق ہے،

سفینہ جناب شفیق جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت :- عار پتہ نسیم بک ڈپو، و انوار بک ڈپو لکھنؤ، و سکریٹری بزم ادب جونپور،

مصنف کے کلام کی شہرت محتاج تعارف نہین اُن کے کلام کے کئی مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہین، سفینہ نیا مجموعہ ہے، اس مین غزلیات کے علاوہ مذہبی اخلاقی اور قومی نظمین بھی ہین، اور ان سب مین کلام کی پختگی، خیالات کی پاکیزگی، زبان کی نفاست اور انداز بیان کی دل آویزی نمایان ہے امید ہے کہ یہ مجموعہ اصحاب ذوق مین مقبول ہوگا،

جلد ۶۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۸ء عدد ۲

مضامین

مقالات

استفسار وجواب

وفیات

ادبیات

فدائے انسانیت گاندھی!

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

واحسرتا کہ آج قلم کو امن و سلامتی کے اس داعی اعدل و انصاف کے اس علمبردار، ایثار اخلاص و عمل کے اس پیکر کا ماتم کرنا پڑا جو ساری عمر ملک و قوم کا غم گسار رہا، اور اس کی راہ میں جان عزیز تک قربان کر دی اور کس قدر عبرت کا مقام ہے، کہ اسی بدقسمت ملک و قوم کے ایک فرد کے ہاتھوں اس کے محسنِ اعظم کی شمعِ حیات گل ہوئی جس کی عزت و سربلندی کے لئے اس نے اپنی پوری عمر صرف کر دی، اور اس کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا، لیکن دنیا کے بہت سے اکابر اور محسنین انسانیت اس درجۂ عظمیٰ پر سرفراز ہوئے، پھر یہ جلیل القدر انسان اس خلعتِ امتیاز سے کیوں محروم رہتا، یہ تو اس کی عظمت و جلالت کی آخری اور سب سے بڑی سند ہے،

مادیت کے اس تاریک دور میں جب کہ مہذب انسان انسانیت کی بربادی کے درپے، ایٹم بم کی تیاری میں مشغول، ساری دنیا آگ و خون کے سمندر میں غرق اور امن و سلامتی کو ترستی ہے، اس محسنِ انسانیت نے دنیا کو الفت و محبت اور اخوت و مساوات کا

پیام دیا، اور اخلاق و روحانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، بے تیغ و تفنگ کے اخلاقی قوت سے فتح حاصل کرنا اور دلون کو مسخر کرنا سکھایا، اور عملاً ثابت کر کے دکھا دیا، کہ دنیا مین اصل طاقت اسلحہ کی نہین بلکہ اخلاق کی ہے، اور اسی کے ذریعہ دنیا مین ہندوستان کا سرا اونچا کیا، اوس نے مکر و فریب کی سیاست مین سچائی کی روح پھونکی، وہ مظلومون کا حامی، غریبون کا سہارا، اور بے نواؤن کا آسرا تھا، اس نے غریب بن کر غریبون کی خدمت کی، اور غربت ہی مین اس دنیا سے سدھارا، اُس نے نیکی اور سچائی کے لئے جان دی، عدل و انصاف کے لئے جان دی، اخلاق و شرافت کے لئے جان دی، اس لئے اس کی موت درحقیقت ہندوستان کی عزت و ناموس اور اس کے وقار و عظمت کی موت، اور عالم انسانیت کا حادثہ ہے،

اس کی زندگی مین ہندوستان کی سیاست مین بڑے بڑے انقلاب آئے، نفرت و عداوت کی آندھیان چلین، وحشت و درندگی کے طوفان آٹھے، سفاکی اور خونخواری کے پہاڑ ٹوٹے، لیکن یہ کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم رہا، اور کوئی قوت اسے ہلا نہ سکی، اس استقلال مین جان تک دیدی اور مر کر ثابت کر دیا کہ وہ کسی خاص فرقہ و قوم کا نہین بلکہ پورے ہندوستان کا لیڈر تھا،

اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھا کہ اس نے اپنے ہاتھون سے آزادی کا بیج بویا، اور اس کے نازک پودے کو سیاست کے طوفانی حوادث سے بچا کر پروان چڑھایا، لیکن یہ کتنے حسرت و اندوہ کا مقام ہے، کہ جب اوس کے برگ و بار لانے کا وقت آیا تو باغبان خود اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور اپنے چمن کی بہار نہ دیکھ سکا، ابھی تو آزادی کا صرف دروازہ کھلا تھا، اصل منزل مقصود دور تھی کہ کاروان آزادی کا سالار خود کوچ کر گیا، آزادی ملتے ہی نفرت و عداوت کی ایسی آگ بھڑکی جس نے

ہندوستان کے حاصل اور اصل خرمن ہی کو جلا کر خاکستر کر دیا، یہ ہندوستانیوں کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکہ لگ گیا جو مٹائے نہ مٹے گا، لیکن جانے والا اس جہان سے سرخرو اٹھا، اور دنیا میں ہمیشہ کے لئے نیک نام چھوڑ گیا،

ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ سُنت اللہ ہے کہ سچی قربانی کبھی رائگان نہیں جاتی، قربانی کرنے والے کا مادی وجود تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا نصب العین ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے، اور جو روح زندگی نہ پیدا کر سکی تھی وہ موت پیدا کر دیتی ہے، دنیا کی تاریخ اس کی شاہد ہے، ہندوستان کے فدائی اعظم نے اُس کے لئے سب سے بڑی قربانی پیش کی ہے، یہ اپنا اثر دکھا کر رہے گی، اور ہندوستان کا چمن اس کے خون کی آبیاری سے لہلہائے گا،
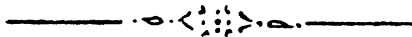
اگر ہماری عقلوں پر پردے نہیں پڑ گئے ہیں، تو گاندھی کی موت ہندوستان کی زندگی بن سکتی ہے، اس وقت بلا تفریق مذہب و ملت ہر ہندوستانی اوس کی یاد میں دلفگار اور تلافی مافات کے لئے بے قرار ہے، ان جذبات سے اس کے مشن کی تکمیل کا کام لیا جا سکتا ہے، گاندھی کی سب سے بڑی محبت اور سب سے بڑی یادگار یہی ہے کہ اس مشن کو مقصد بنا لیا جائے یہی امن و سلامتی کی راہ اور ہندوستان کی فلاح و ترقی کا صحیح راستہ ہے، اور اسی سے اس کی روح مسرور ہوگی، اگر ہم اتنا بھی نہ کر سکے، تو ہماری محبت کے سارے دعوے باطل ہیں،

مقالات

اسلامی طب کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبد السلام ندوی

(۲)

مشرق یعنی عراق و بغداد میں اسلامی طب کو جو ترقیان ہوئین، یہ اُن کی اجمالی تاریخ ہے لیکن اسلام کی ابتدائی دو صدیون تک مغرب یعنی اندلس میں کوئی مسلمان طبیب نہین پیدا ہوا، البتہ تیسری صدی کے آغاز مین سب سے پہلے جس شخص نے اہلِ مغرب کو طب و فلسفہ سے آشنا کیا، وہ ایک بغدادی طبیب اسحاق بن عمران تھا جس کو زیادۃ اللہ بن اغلب التیمی نے اپنے دورِ حکومت (۲۰۱ھ - ۲۲۳ھ) مین بغداد سے بلوایا تھا، اور اوس نے ایک مدت تک قیروان مین قیام کرکے نہایت کامیابی کے ساتھ مطب کیا تھا[1]،

اسحاق بن عمران کا ایک شاگرد اسحاق بن سلیمان اسرائیلی تھا، اور اس کو بھی زیادۃ اللہ بن الاغلب تیمی نے معقول زادِراہ دیکر مصر سے بلوایا، اور اس نے قیروان مین قیام کرکے اسحاق بن عمران کی شاگردی کی، اور طویل عمر پاکر تقریبًا ۳۲۰ھ مین وفات پائی[2]، لیکن اب تک مغرب مین طب و فلسفہ کی عام اشاعت نہین ہوئی تھی، اس لئے جو شخص ان علوم مین مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا، اوس کو مجبورًا مشرق کا سفر کرنا پڑتا تھا چنانچہ اس غرض سے سب سے پہلے دو بھائیون یعنی احمد اور عمر نے ناصر کے دورِ سلطنت مین ۳۳۰ھ مین مشرق کا سفر کیا

[1] طبقات الاطباء جلد دوم ص ۳۶،
[2] ایضًا ص ۳۷،

اور وہان دس سال تک مقیم رہے پھر بغداد مین آئے اور ثابت بن سنان بن ثابت بن قرہ صابی سے جالینوس کی کتابین پڑھین اور خلیفہ مستنصر باللہ کے زمانہ مین ۳۵۱ھ مین پلٹ کر اندلس آئے، اور ان کے دربار مین طبی خدمت پر مامور ہوئے، اور نہایت وسیع پیمانے پر طبی خدمات انجام دیتے رہے، احمد کی نسبت ابن جلجل نے لکھا ہے، کہ بارہ لڑکے اس کے ملازم تھے، اور اسکے سامنے شربت اور معجون تیار کرتے تھے، اور وہ مستنصر کی اجازت سے ان کو غربا اور مریضون کو تقسیم کرتا تھا[1]،

اسی زمانہ مین ایک اور طبیب محمد بن عبدون الجبلی نے ۳۴۷ھ مین مشرق کا سفر کیا، اور بصرہ، فسطاط اور مصر مین قیام کرکے فنِ طب مین مہارت حاصل کی اور ۳۶۰ھ مین اندلس مین واپس آیا، اور حکم کے دربار مین طبی خدمت پر مامور ہوا[2]،

ایک اور طبیب ابوالحکم عمرو بن عبدالرحمان بن احمد بن علی الکرمانی المتوفی ۴۵۸ھ نے بھی مشرق کا سفر کیا، اور حران مین قیام کرکے طب اور ہندسہ کی تعلیم حاصل کی، اور وہان سے پلٹ کر آیا، تو سرقسطہ مین قیام کیا، وہ معالجات کے علاوہ سرجری مین بھی کمال رکھتا تھا[3]،

مغرب مین خاندان زہر ایک مستقل طبی خاندان تھا جس مین ایک مدت تک مسلسل بڑے بڑے اطبا پیدا ہوتے رہے، اس خاندان مین سب سے پہلے ابومروان عبدالملک نے طبی حیثیت سے شہرت حاصل کی، اس نے مشرق کا سفر کیا، اور وہان ایک طویل مدت تک مطب کرتا رہا، اور پہلے بغداد کا پھر مصر کا، پھر قیروان کا رئیس الاطبا مقرر ہوا، مشرق سے پلٹ کر اندلس آیا اور شہر دانیہ مین قیام کیا، پھر دانیہ سے منتقل ہو کر اشبیلیہ مین قیام کیا اور ابن ابی اصیبعہ کی روایت کے مطابق وہین وفات پائی[4]، لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایک مدت تک اگرچہ مغرب طبی معاملات مین مشرق کا زیر بار احسان رہا، تاہم وہان پانچوین صدی تک شیخ بو علی سینا کی طبی تصنیفات کو حسن قبول حاصل نہین ہوا، طب مین شیخ کی سب سے مقبول و مشہور کتاب قانون ہے، لیکن اس کا نسخہ سب سے

لہ طبقات الاطبا جلد دوم ص۴۳، ۲ہ ص۴۶، ۳ہ ص۴۹، ۴ہ ص۹۴، وابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۱۰۱،

پہلے خاندانِ زہر کے ایک مشہور طبیب ابو العلا زہر المتوفی ۵۲۵ھ کے زمانہ مین مغرب مین پہنچا جس کو ایک تاجر عراق سے اندلس مین لایا تھا، اور چونکہ اس سے اس کی بڑی تعریف کی گئی تھی، اس لئے اس نے تقرب حاصل کرنے کی غرض سے اوس کو ابو العلا زہر کی خدمت مین تحفۃً پیش کیا، لیکن ابو العلا نے اس کو سخت ناپسند کیا، اور اس کو اپنے کتب خانے مین داخل کرنے کے قابل نہیں سمجھا، بلکہ اس کے حاشیے کے سادہ کاغذ کو کاٹ کاٹ کر اس پر نسخے لکھنے شروع کر دیئے، [۱]

اس خاندان کی بدولت مغرب مین فن طب کو بہت زیادہ ترقی ہوئی، مشرق مین اگرچہ اس فن نے مغرب سے پہلے ترقی کی تھی، تاہم مشرق مین اب تک کوئی عورت طبیب نہین ہوئی تھی لیکن خاندانِ زہر کی بعض عورتین بھی طب کی ماہر تھین، اور عورتون کا خاص طور پر علاج کرتی تھین، چنانچہ اس خاندان کے ایک مشہور طبیب حفید ابوبکر بن زہر کی بہن، اور اس کی بھانجی بھی طبیب تھین، اور خلیفہ منصور کے گھر کی عورتون کا علاج کرتی تھین، اور اوس کے محل مین جب کسی بچے کی مان کا انتقال ہوجاتا تھا، تو اس کی پرورش کا انتظام بھی انہی دونون کے متعلق ہوتا تھا، [۲]

مغربی اطبار کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو مفرد دواؤن کی تحقیقات سے خاص طور پر دلچسپی تھی، اور اطبائے شام و بغداد نے اس فن کو جس قدر ترقی دی تھی، اطبائے مغرب نے اس کو اس سے بہت زیادہ ترقی دی، ہم اوپر لکھ چکے ہین کہ ادویہ مفردہ کے نام و خواص پر یونان کے ایک حکیم دیسقوریدس نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا ترجمہ جعفر متوکل کے زمانہ مین اصطفن بن بسیل نے یونانی زبان سے عربی مین کیا تھا، لیکن اصطفن نے جن یونانی دواؤن کے نام عربی زبان مین پائے، ان کا ترجمہ تو عربی مین کر دیا، لیکن عربی مین جن یونانی دواؤن کے نام اوس کو معلوم نہ تھے، ان کو بعینہٖ یونانی زبان مین رہنے دیا تھا، اصطفن کا یہی ناقص ترجمہ اندلس مین پہنچا، اور لوگ اس کی مشہور دواؤن سے ناصر عبد الرحمن بن محمد کے زمانہ تک جو

---

[۱] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۶۵، ۵۲ [۲] ص ۷۰،

اندلس کا بادشاہ تھا، فائدہ اٹھاتے رہے، اس کے بعد ارمانیوس شاہ قسطنطنیہ نے ۳۳۷ھ مین ناصر کو ایک خط لکھا، اور خط کے ساتھ بہت سے قیمتی ہدیے بھیجے، جن مین ایک دیسقوریدس کی کتاب بھی تھی، اور اس مین جڑی بوٹیون کی تصویرین بھی بنی ہوئی تھین، لیکن چونکہ یہ کتاب یونانی زبان مین تھی، اس لئے ارمانیوس نے ناصر کو لکھا کہ اس کتاب سے بجز ایک ایسے شخص کی مدد کے جو یونانی زبان اور ان دواؤن سے واقف ہو، فائدہ نہین اٹھایا جاسکتا، اگر آپ کے ملک مین اس قسم کا کوئی شخص ہو تو آپ اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہین لیکن بدقسمتی سے قرطبہ کے عیسائیون مین کوئی شخص ایسا نہ تھا، جو قدیم یونانی زبان سے واقف ہو، اس لئے ناصر نے ارمانیوس کو لکھا کہ ایک ایسے شخص کو بھیجو جو یونانی اور لاطینی زبان سے واقف ہو، تاکہ وہ چند آدمیون کو ان کی تعلیم دیسکے، اور وہ ترجمہ کرنے کے قابل ہوجائین، چنانچہ اوس نے نقولا راہب کو بھیجدیا، اور وہ قرطبہ مین ۳۴۰ھ مین پہنچا، اس وقت قرطبہ مین اطبا کی ایک ایسی جماعت موجود تھی، جو دیسقوریدس کی کتاب کی ان جڑی بوٹیون کی تحقیقات کرنی چاہتی تھی، جن کے نام معلوم نہ تھے، ان مین اس کا سب سے زیادہ شائق حسدای بن بشروط اسرائیلی تھا، اور نقولا راہب کو اس کے ساتھ خاص تعلق تھا، اور اس نے اس کتاب کی نامعلوم الاسم جڑی بوٹیون کی تفسیر کی، اس کے علاوہ محمد المعروف بالشجار، بسباسی، ابوعثمان الخزاز الملقب بالیابسہ، محمد بن سعید الطبیب، عبدالرحمن بن اسحٰق بن ہیثم، اور ابوعبداللہ الصقلی، ایک ہی زمانے مین نقولا راہب کے ساتھ سرگرم تحقیقات تھے، سلیمان بن جلجل اندلسی کو بھی ان مفرد دواؤن کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا، اور وہ مستنصر حکم کے زمانے مین ان سب کا شریک صحبت رہ چکا تھا، اور ان سب کی تحقیقات سے جب وہ سب دوائین معلوم ہوگئین جو شہر قرطبہ مین موجود تھین، اور ان کے نام کا تلفظ صحیح ہوگیا، تو سلیمان بن جلجل نے ۳۷۲ھ مین ہشام بن الحکم المؤید باللہ کے زمانہ مین دیسقوریدس کی کتاب کی مفرد دواؤن کے نامون کی تفسیر کی، اس کے ساتھ خود ایک رسالہ لکھا جس مین ان دواؤن کے نامون کا اضافہ کیا، جو طب مین مستعمل ہین، لیکن دیسقوریدس نے اپنی کتاب مین ان کا ذکر نہین کیا تھا، کیونکہ یا تو اوس نے ان کو

دیکھا ہی نہین تھا، یا وہ اس کے زمانہ مین مستعمل نہ تھین[۵۱] سلیمان بن جلجل اور اس کے ہمعصر اطبار کے علاوہ اور بھی بہت سے اندلسی اطبار مثلاً ابن وافد، ابن سمجون، البکری، غافقی، شریف اور ابوالعباس بن رومیہ مین جن کو ادویہ مفردہ کی تحقیقات سے نہایت دلچسپی تھی، اور انھون نے اس سلسلے میں کارہائے نمایان انجام دیئے ہین، چنانچہ اُن کے متعلق علامہ ابن ابی اصیبعہ نے جو کچھ لکھا ہے، ہم بہ ترتیب اس کا خلاصہ اس موقع پر درج کرتے ہین :۔

ابن وافد ذیحجہ ۳۸۷ھ مین پیدا ہوا، اور ۴۶۰ھ تک زندہ تھا، اوس نے ادویہ مفردہ کے علم مین مہارت حاصل کی، اور اتنی دواؤن کے نام لکھے کہ اس کے زمانہ مین کسی نے نہین لکھے تھے، اوس نے اس فن مین ایک بے نظیر کتاب لکھی، اور ادویہ مفردہ کے متعلق دیسقوریدس اور جالینوس نے جو کتابین لکھی تھین ان سب کو اس کتاب مین جمع کر دیا، اوس نے ادویہ مفردہ کے نامون کی تصحیح، اُن کے اوصاف، قوی اور درجات کی تحدید مین ۲۰ سال صرف کئے، اور اس جانفشانی کے بعد کتاب اس کی خواہش کے مطابق تیار ہوئی[۵۲]

ابن سمجون ادویہ مفردہ کے قوی وافعال کے علم مین ممتاز تھا، اور ادویہ مفردہ کی تحقیقات مین اس کی کتاب اپنی خوبی کے لحاظ سے مشہور تھی،

اوس نے اس کتاب کے لکھنے مین بڑی جانفشانی کی تھی اور ادویہ مفردہ کے متعلق قدمار کی بہت سی رائین جمع کر دی تھین، اس نے یہ کتاب منصور الحاجب محمد بن ابی عامر المتوفی ۳۹۲ھ کے زمانہ مین لکھی تھی[۵۳]،

بکری ادویہ مفردہ، اُن کے قوی ومنافع اور نامون کے علم مین ممتاز تھا، اور اس فن مین اعیان النبات والشجریات الاندلسیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی[۵۴]

غافقی ادویہ مفردہ کے قوی، منافع، خواص اور ان کے نامون کا اپنے زمانے مین بہت بڑا عالم تھا،

---

[۵۱] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۴۸،۴۰ [۵۲] ص ۴۹ [۵۳] ص ۵۲ [۵۴] ص ۵۲،

اور ادویہ مفردہ کے متعلق اوس کی کتاب اپنا نظیر نہین رکھتی، دیسقوریدس اور جالینوس نے ادویہ مفردہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اوس نے اس کتاب مین اوس کو مختصر طور پر جمع کر دیا ہے، پھر ان کے بعد ادویہ مفردہ کے متعلق متاخرین نے جو نئی رائیں قائم کی تھیں، یا یہ کہ ہر طبیب نے الگ الگ جن دواؤں کا پتہ لگایا تھا ان کا بیان کیا ہے، اس بنا پر اوس کی کتاب ادویہ مفردہ کے متعلق تمام اطبار کے اقوال کا مجموعہ تھی[۱]

شریف ادویہ مفردہ کے قوی، منافع اور مناسبات کا عالم تھا، اور اس نے اس فن مین ایک کتاب لکھی تھی

مغرب کے ان اطبار مین جنھون نے علم النباتات کی تحقیقات کو اپنا خاص موضوع بنا لیا تھا، دو شخصون نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی، ایک ابو العباس بن رومیہ جو اشبیلیہ کا رہنے والا، اور علم النباتات ان کے اشخاص، اُن کے قوی، و منافع، اُن کے مختلف اوصاف اور ان کے مقامات کے اختلاف کا بڑا ماہر تھا، وہ ۶۱۳ھ مین دیار مصر مین آیا، اور مصر و شام و عراق مین دو سال تک قیام کر کے اُن جڑی بوٹیوں کو جو مغرب مین نہین ہوتی تھین، یہان کے شہرون مین خود ان مقامات مین دیکھا، جہان وہ اوگتی تھین، الملک العادل ابو بکر بن ایوب نے اوس کی شہرت سنی تو اس کو اسکندریہ سے قاہرہ مین بلا کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا، اور مستقل قیام کی خواہش کی، اوس نے ایک مدت تک اس کے یہان قیام کیا، لیکن چونکہ اس سفر کا اصلی مقصد فریضۂ حج کا ادا کرنا تھا، اس لئے حج کر کے مغرب کو واپس گیا، اور اشبیلیہ مین قیام کیا[۲]

دوسرا ضیاء الدین ابن بیطار جو علم النباتات کا بڑا ماہر تھا، اور جڑی بوٹیون کی تحقیقات کے لئے یونان و روم کے اکثر شہرون کا سفر کیا تھا، اور جو لوگ اس فن کے ماہر تھے، اُن سے مل کر جڑی بوٹیون کا علم حاصل کیا تھا، اور یہ جڑی بوٹیان جن مقامات مین پیدا ہوتی تھین، اون مقامات مین بذاتِ خود جا کر ان کا معائنہ کیا تھا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ مین پہلی بار اوس سے ۶۳۳ھ مین دمشق مین ملا، اور دمشق کے باہر اس کے ساتھ جا کر بہت سی جڑی بوٹیون کو اُن کے نشو و نما کے مقام مین دیکھا، اور اس نے دیسقوریدس

---

[۱] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۵۲، [۲] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۸۱،

کی کتاب کی دواؤن کے نامون کی جو تفسیر کی تھی، اوس کو خود اس سے پڑھا، اور اس طریقہ سے مجھ کو اس کے تبحر علمی کا حال معلوم ہوا، ادویۂ مفردہ کے متعلق دیسقوریدس، جالینوس اور غافقی وغیرہ نے جو کتابین تصنیف کی تھین، وہ ہمارے سامنے رکھی جاتی تھین، تو وہ سب سے پہلے ہر دوا کے وہ یونانی نام اور وہ افعال وخواص بتاتا تھا جس کو دیسقوریدس نے اپنی کتاب مین لکھا تھا، پھر اوس کے وہ خواص وافعال بتاتا تھا جس کو جالینوس نے بتایا تھا، پھر متاخرین کی تحقیقات اور اختلافات کو بیان کرتا تھا اوس کے بعد مین اوس کے ساتھ ان کتابون کا مطالعہ کرتا تھا، تو معلوم ہوتا تھا، کہ اس نے ان کتابون کی کوئی بات نہین چھوڑی ہے، سب سے عجیب تر بات یہ تھی کہ وہ جس دوا کا ذکر کرتا تھا، اس کے متعلق متعین طور پر یہ بتا دیتا تھا کہ اس کا نام دیسقوریدس اور جالینوس کی کتاب کی فلان فصل مین ہے، اور دواؤن کے سلسلۂ ترتیب مین اس کا فلان نمبر ہے

ایک ماہر علم النباتات کی حیثیت سے اوس نے شہرت حاصل کی، تو ملک الکامل محمد بن ابی بکر بن ایوب نے اوس کو ملک مصر کے تمام دوا فروشون اور عطارون کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا، جس کو رئیس العشابین کہتے تھے[۱]

اس تمام تفصیل سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے، وہ یہ ہے،

(۱) اسلام سے پہلے طب کے چار مرکز تھے، جندیسا پور، حران، اسکندریہ اور ہندوستان، بغداد مین مسلمانون نے ان چارون مرکزون کو ایک جگہ جمع کر لیا، اور سب سے یکسان فائدہ اٹھایا، اس لئے اسلامی طب سب سے زیادہ جامع وکمل ہوگئی،

(۲) غالباً مسلمانون سے پہلے ہر ملک مین صرف وہی دوائین استعمال کی جاتی تھین، جو اس ملک مین پیدا ہوتی تھین، لیکن مسلمانون نے ہر ملک کی دواؤن سے فائدہ اٹھایا، سب سے پہلے برامکہ نے ہندوستان کی جڑی بوٹیان بغداد مین منگوائین، پھر رشید الدین صوری نے دمشق کی جڑی بوٹیون کی تحقیقات کی، اس کے بعد اطباے مغرب مین ابن بیطار وغیرہ نے یونان وروم وغیرہ کی جڑی بوٹیون کا پتہ لگایا، اس لئے

---

[۱] طبقات الاطبا جلد دوم ص ۱۳۳،

اسلامی طب نے ہر ملک کی دواؤن سے فائدہ اٹھایا، اور وہ تمام دنیا کے علم الادویہ کا خلاصہ عطر اور نچوڑ بنگیا

چنانچہ اسلامی طب مین جو دوائین مستعمل ہین، اُن کے نامون پر سرسری نظر ڈال لینے سے اس کی تصدیق

ہوسکتی ہے، قسط ہندی، عود ہندی، ساذج ہندی، سناے مکی مصطگی رومی، آلوے بخارا، اجوائن خراسانی،

ثعلب مصری، نمک لاہوری، ریوند چینی، صبر سقوطری، عشبہ مغربی، زہر مہرہ خطائی، زیرۂ کرمانی، گل ارمنی، گلِ ملتانی،

بورہ ارمنی، افنتین رومی، عقیق یمنی، گلنار فارسی، تربد اکبرآبادی، اسگندرومی، صمغ عربی، انار قندھاری،

گل بنفشہ کشمیری، مربۂ آملہ بنارسی وغیرہ کے نامون سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ طب اسلامی نے ہر ملک کی

دواؤن سے فائدہ اٹھایا ہے، اور ہر ملک کی بہترین پیداوار سے دواؤن کا انتخاب کیا ہے،

مفردات کے بعد مرکبات کا درجہ ہے، اور اسلامی اطبار کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ

انھون نے اس مین بھی کمال کا درجہ حاصل کرلیا تھا، احمد بن یونس کے حالات مین لکھا ہے کہ وہ شربت اور

معجون بنانے مین کمال رکھتا تھا، اور اُن کی تیاری کے لئے اس کے یہان ۱۲ ملازم تھے، جو ہمہ وقت اس

کام مین مصروف رہتے تھے، اگرچہ اکثر اس قسم کے مرکبات امرار وسلاطین کے لئے تیار کئے جاتے تھے، لیکن

اُس نے خلیفہ مستنصر سے درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو غربا و مساکین اور عام مریضون کو بھی تقسیم کئے

جائین، چنانچہ اوس نے اوس کی اجازت دی[۱]، بعض اطبار صرف مرکبات سے علاج کرتے تھے، اور ان کا

نسخہ کسی کو نہین بتاتے تھے، ایک امیر کو ضیق النفس کا عارضہ تھا سلیمان ابو بکر بن تاج نے ایک لعوق سے

اس کا علاج کیا، اور وہ ایک ہی دن مین اچھا ہو گیا، وہ درد پشت کا علاج ایک گولی سے کرتا تھا، او

فوراً شفا ہو جاتی تھی، لیکن کسی کو ان کا نسخہ نہین بتاتا تھا[۲]، خلیفہ منصور نے ادویہ مرکبہ کا گویا ایک مستقل

کارخانہ قائم کر دیا تھا جس کے اہتمام کے لئے ایک خاص طبیب مقرر تھا[۳]، وہ ادویہ مرکبہ کی تیاری مین

خاص طور پر ابو جعفر بن غزال پر اعتماد کرتا تھا، اوس نے اپنے دور سلطنت مین شراب کی خرید و فروخت کی

---

[۱] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۴۲، [۲] رر جلد دوم صفحہ ۴۳، [۳] رر صفحہ ۹،

سخت ممانعت کر دی تھی، لیکن اسی زمانے مین اوس نے ابوجعفر بن غزال کو تریاق کبیر کے بنانے کا حکم دیا جس کا ایک جزو شراب تھی، ابوجعفر نے اور تمام دوائین تو فراہم کر لین لیکن اس بندش کی وجہ سے شراب نہ مل سکی، اُس نے منصور کو اس کی اطلاع دی، تو اوس نے کہا کہ مین نے اس وقت تریاق کبیر کے بنانے کا حکم صرف اس غرض سے دیا تھا، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کے یہان شراب موجود تو نہین،[۱]

ادویہ مرکبہ کا سب سے بڑا ماہر محمد بن احمد بن سعید تمیمی تھا، جس نے تریاق فاروق مین بہت سی دواؤن کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کیا تھا، اور بہت سے معجون، نسخے اور سفوف تیار کئے تھے،[۲]

اطبائے مغرب نے اس فن مین جو مہارت حاصل کی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ مشرق سے ایک طبیب قرطبہ مین آیا جس نے ایک ایسی معجون تیار کی تھی، جس کی ایک خوراک پچاس اشرفیون مین فروخت کرتا تھا، اوس نے اس کے ذریعہ سے بڑی دولت کمائی، تو مغرب کے پانچ اطبا نے مل کر پچاس اشرفیان جمع کین، اور اس سے اس معجون کی ایک خوراک خریدی، اور سب نے اس مین سے تھوڑی تھوڑی مقدار لے کر سونگھنا اور چکھنا شروع کیا، اور اس طرح اس کے جو اجزا معلوم ہو سکے، اوس کو ہر ایک نے الگ الگ کاغذ پر لکھ لیا، پھر سب نے اپنی اپنی معلومات کو یکجا کر کے لکھا، اس کے بعد اُس مشرقی طبیب کے پاس گئے، اور اس واقعہ کو بیان کر کے کہا کہ ہم نے اس طریقہ سے اس معجون کے جن اجزا کا پتہ لگایا ہے، اگر وہ صحیح ہین تو ہم اپنے تجربہ مین کامیاب ہو گئے، ورنہ آپ ہم کو اس کے علم مین اپنا شریک بنائے"، اوس نے اُن کے نسخہ کو دیکھا تو کہا کہ معجون کے تمام اجزا کا پتہ تو تم نے صحیح لگایا ہے، البتہ اُن کے وزن مین غلطی کی ہے، اب اُس نے اُن کو اپنا شریک بنا لیا، اور اس معجون کا تمام اندلس مین رواج ہو گیا،[۳]

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ فن کیمیا سازی کو جس کو ہوس پرستون نے کسب زر کا ذریعہ بنا لیا، فن دوا سازی سے گہرا تعلق ہے، اور غالباً اوس کی ایجاد اس غرض سے ہوئی تھی کہ تحلیل و ترکیب

---

[۱] طبقات الاطباء جلد دوم ص ۵۰، [۲] ص ۸۶، [۳] ص ۴۲

کے ذریعہ سے دواؤن کے افعال وخواص کا پتہ لگایا جائے، اوران مین تغیرات پیدا کرکے نئے نئے افعال وخواص پیدا کئے جائین،

جندیسا پور، حران، اور اسکندریہ میں طب کے جو تین اسکول قائم ہوگئے تھے، ان مین خاص طور پر مصر مین طب، کیمیا اورطبعیات کو ترقی ہوئی تھی، اس لئے خالد بن یزید کو طب اور کیمیا کا شوق پیدا ہوا، تو اوس نے مصری کے اطباء وحکما کے ذریعہ سے طب اور کیمیا کی تعلیم حاصل کی، اوران کے ذریعہ سے اس فن کی کتابون کا ترجمہ کرایا، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ مصر مین کیمیا اور طبعیات کو اسی لیے بہت زیادہ ترقی ہوئی کہ ان کو علم طب کی ترقی سے خاص تعلق تھا مسلمانون مین فنِ طب کا بہت بڑا امام زکریا رازی تھا، جو بہت بڑا کیمیا ساز بھی تھا، اگرچہ اوس کے حالات مین سونا چاندی بنانے کے بہت سے قصے منقول ہین لیکن غالبًا اوس نے فنِ دواسازی ہی کی تکمیل کے لئے اس کی طرف توجہ کی ہوگی،

جرجی زیدان نے اپنی کتاب آداب اللغۃ العربیہ کی دوسری جلد مین جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے، کہ کیمیا کو فنِ دواسازی سے گہرا تعلق ہے، وہ لکھتا ہے، کہ فن دواسازی، کیمیا، اور جڑی بوٹیون کی تحقیقات پر جو علمِ طب کی ایک شاخ ہے مسلمانون کا بہت بڑا احسان ہے، انھون نے خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور مین اس کی طرف توجہ کی، اور یورپین لوگون نے اپنی ترقی کے آخری دور مین فنِ دواسازی کی تاریخ کا مطالعہ کیا، تو ان کو معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اہلِ عرب ہی نے اس فن کی بنیادین قائم کین، اور سب سے پہلے دواؤن اور جڑی بوٹیون کو ہر جگہ سے جمع کیا، اور خود بہت سی نئی دوائین ایجاد کین، سب سے پہلے ان ہی نے موجودہ طرز پر قرابا دینین لکھین، اور اس طرز پر عطارون کی دکانین قائم کین، لیکن عطاری کے فن مین اُن کی ترقیون کی وجہ یہ ہے کہ انھون نے فنِ کیمیا و نباتات مین بہت زیادہ ترقی کرلی تھی، اور اس مین کوئی اختلاف نہین ہے کہ سب سے پہلے اہلِ عرب ہی نے اپنے تجربات سے جدید کیمیا سازی کی بنیاد قائم کی، اور سب سے پہلے خالد بن یزید نے اس فن کو عربی زبان مین اسکندریہ کے اسکول سے منتقل کیا، اور

اوس سے جعفر صادق المتوفی ۱۴۸ھ نے اس فن کو سیکھا، اس کے بعد جابر بن حیان، یعقوب کندی، اور ابوبکر رازی پیدا ہوئے، جنھون نے بہت سے مرکبات کیمیاوی ایجاد کئے، جن پر جدید فنِ کیمیا سازی کی بنیاد قائم ہے، اس کے بعد اہلِ عرب کے بہت سے کیمیاوی اکتشافات کا ذکر کیا ہے، اور ایک تصویر درج کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اہلِ عرب کیونکر جڑی بوٹیون کا عرق کھینچتے تھے، اس کے بعد لکھا ہے کہ اور بھی بہت سے کیمیاوی مرکبات و مکتشفات ہین، جو اگرچہ ہم کو معلوم نہ ہوسکے تاہم مؤرخین کے بیانات سے اُن کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ابن اثیر نے بعض دواؤن کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے اہلِ عرب نے ۲۶۹ھ کے واقعہ زنج مین کام لیا تھا، اور ان دواؤن کی خاصیت یہ تھی، کہ جب وہ لکڑی پر لگادی جاتی تھین، تو اُن پر آگ کا اثر نہین ہوتا تھا، لیکن اوس نے ان دواؤن کا نام نہین بتایا، کیمیاسازی کے سلسلے مین بارود بھی داخل ہے، جس کو مسلمانون نے بنایا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کیمیاوی اعمال مثلاً تقطیر، ترشیح تصعید، تبلور، اور تذویب ان کی ایجاد ہین،

مسلمانون کی طبی ترقی کی تاریخ مین یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، کہ انھون نے علم تشریح مین کس قدر مہارت حاصل کی؟

یونانی اطبار مین جالینوس آدمیون اور بندرون کے اجسام کی تشریح کرتا تھا[۱]، اور عباسی دور کے اطبار مین یوحنا بن ماسویہ نے بھی اس کی تقلید کرنی چاہی تھی، چنانچہ اس کے حال مین لکھا ہے کہ اوس نے ایک بندر پال رکھی تھی جس کا نام اوس نے حاحم رکھا تھا، اور اوس کو اپنے پاس سے کبھی جدا کرنا پسند نہین کرتا تھا، ایک بار شاہ نوبہ نے خلیفہ معتصم کی خدمت مین بہت سے ہدیے بھیجے، جن مین ایک قوی ہیکل بندر بھی تھا، معتصم نے اس کو ایک غلام کے ذریعہ یوحنا کے پاس بھیجدیا، کہ اپنی بندریا حاحم کے ساتھ اس کی شادی کردو، یوحنا کو یہ بات ناگوار ہوئی، اور اوس نے غلام سے کہا کہ امیرالمومنین سے کہدو کہ مین نے اس بندریا کو اُس مقصد کے لئے نہین پالا ہے جو امیرالمومنین کے خیال مین ہے، بلکہ مین اس کے اعضار کی تشریح کرکے

[۱] اخبار الحکما رقفطی ص ۲۵۵،

جالینوس کی طرح اس موضوع پر ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا، لیکن چونکہ یہ بندر یا نہایت لاغر تھی، اور اس کے عروق اور اوردہ اور اعصاب نہایت باریک تھے، اس لئے میرا خیال تھا کہ اس کی تشریح سے ان کا حال واضح طور پر نہ معلوم ہو سکے گا، اسی غرض سے مین نے اوس کو چھوڑ رکھا تھا کہ وہ بڑی ہو کر فربہ ہو جائے لیکن جب یہ قوی ہیکل بندر مجھ کو مل گیا ہے، تو اب مین امیر المومنین کے لئے اس فن مین ایک ایسی کتاب لکھدون گا کہ اب تک اسلام مین ایسی کتاب نہین لکھی گئی ہے، چنانچہ اوس نے اس بندر کی تشریح کرکے اس موضوع پر ایک ایسی کتاب لکھدی جس کو اوس کے دوستون اور دشمنون دونون نے پسند کیا،[۱]

قفطی نے اخبار الحکماء مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، لیکن اوس نے پہلے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نہایت خوش خلق اور بدصورت تھا، اوس کے برخلاف اس کی بی بی نہایت بدخلق اور خوبصورت تھی، ان دونون سے ایک لڑکا پیدا ہوا تو وہ ان دونون کی برائیون کا مجموعہ تھا، یعنی بدخلق بھی تھا اور بدصورت بھی تھا، ایک موقع پر یوحنا بن ماسویہ کے سامنے اس کا ذکر آیا، تو اوس نے کہا کہ میں خود ایک نہایت ذہین اور طباع شخص تھا، لیکن میری ایک بی بی حسین تو بہت زیادہ تھی مگر اسی کے ساتھ اس قدر احمق تھی کہ کوئی بات نہین سمجھتی تھی، اس سے جو لڑکا پیدا ہوا وہ بھی نہایت احمق تھا، اور ہمارے محاسن کا اوس پر کوئی اثر نہین پڑا تھا، اگر بادشاہ غیر ضروری باتون مین مشغول رہنے کا عادی نہ ہوتا، تو مین اپنے لڑکے کو زندہ چیر پھاڑ ڈالتا، جیسا کہ جالینوس آدمیون اور بندرون کو چیرتا پھاڑتا تھا، اور اس طریقہ سے اوس کی حماقت و بلادت کے اسباب معلوم کر لیتا، اور اپنی کتاب مین اس کے جسم کی ترکیب اور عروق، اوردہ اور اعصاب کے متعلق ایسی معلومات جمع کر دیتا جو اہل دنیا کے لئے مفید ہوتین،[۲]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ عباسی دور مین یوحنا بن ماسویہ نے فن تشریح کی طرف خاص

---

[۱] طبقات الاطباء جلد اول ص ۱۷۸، [۲] اخبار الحکماء قفطی ص ۲۵۵، ۲۵۶،

توجہ کی تھی، اور اس فن مین ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی تھی لیکن خود مسلمانون نے اس فن کو مزید ترقی نہین دی، کیونکہ وہ لاشون کی چیر پھاڑ کو پسند نہین کرتے تھے، البتہ سرجری مین اُن کے کارنامون کو نظر انداز نہین کیا جا سکتا، سب سے پہلے مشرق میں اس کی ابتدا ہوئی، اور محمد بن زکریا رازی نے اُس کی طرف خاص توجہ کی، اور اسی کے زمانہ مین یہ فن ممالک اسلامیہ مین پھیلا، لیکن محمد بن زکریا نے اپنی تصنیفات مین صرف سرجری کے عملی طریقے بتائے تھے، خود اُن پر عمل نہین کرتا تھا، بلکہ یہ کام جراحون سے متعلق تھا، اس کے بعد علی ابن عباس المجوسی پیدا ہوا، جس نے پتھری نکالنے کے عملی طریقے کی تشریح کی، پھر شیخ بو علی سینا نے جراحی اور سرجری کے بہت سے عملی طریقے بتائے، لیکن خود ان پر عمل نہین کیا، اس طریقہ پر اگرچہ مشرق مین اس فن کی ابتدا ہو چکی تھی، تاہم اس کی اصلی ترقی مغرب مین ہوئی، اور بہت سے اطبار پیدا ہو گئے، جو عملاً فنِ جراحی مین کمال رکھتے تھے، ان مین خالد بن یزید اور ابن ملوکہ تو عیسائی تھے، جو عملاً جراحی کا کام کرتے تھے[۵۱] لیکن ان کے علاوہ چند مسلمان بھی تھے، جن مین ایک یحییٰ بن اسحٰق تھا، جو عملاً جراحی کا کام کرتا تھا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کے حالات مین اس کی تصریح کی ہے، اور اس کے بعض عملی کام بھی بیان کئے ہین[۵۲]، دوسرا ابوالحکم عمرو بن عبدالرحمٰن بن احمد علی الکرمانی المتوفی ۴۵۸ھ تھا جس کی نسبت علامہ ابن ابی اصیبعہ نے یہ الفاظ لکھے ہین،

وَلہٗ عنایتہ بالطب ومجربات	اس کا رجحان طب کی طرف ہے، اور
فاضلۃ فیہ ونفوذ مشہور	طب مین اس کے عمدہ تجربات ہین،
فی الکی والقطع والشق و	اور عملی طور پر داغنے، کاٹنے، اور
البط وغیر ذالک من اعمال	چیر پھاڑ میں اوس کو عام شہرت
الصناعۃ الطبیۃ[۵۳]	حاصل ہے،

---

۵۱ طبقات الاطبا جلد دوم ص ۴۱، ۵۲ ص ۴۳، ۵۳ ر ص ۴۳۔

لیکن اس فن مین سب سے زیادہ شہرت خلف بن عباس زہراوی نے حاصل کی جس نے اس فن پر ایک مستقل رسالہ لکھا، اور اس مین سرجری کے کئی سوالات کی تصویرین دین، اور انکے استعمال کے طریقے بتائے وہ اس رسالہ کی تمہید مین لکھتا ہے، "کہ ہاتھ کے علمی کام ہمارے شہر مین اور ہمارے زمانے مین معدوم ہوگئے ہین، اور عنقریب ان کا علم مٹ جائے گا، صرف اس کے تھوڑے سے نشانات قدماء کی کتابون مین باقی رہ گئے ہین، جن مین اس قدر تحریفات ہوگئی ہین، کہ اُن کے مطالب کا سمجھنا مشکل ہوگیا ہے، اسلئے مین نے مناسب سمجھا کہ اس فن کو زندہ کرون اور شرح و بیان اور اختصار کے ساتھ اس رسالہ کو لکھون اور داغنے اور ہاتھ سے کام لینے کی نئی نئی صورتین درج کرون، جس سے بیان کی وضاحت مین اضافہ ہوگا"،

اس رسالہ کا نام "التصریف لمن عجز عن التالیف" ہے، اور خوش قسمتی سے ۱۹۰۸ء مین مطبع نامی لکھنؤ مین آلات کی تصویر کے ساتھ چھپ گیا ہے، موجودہ زمانہ مین مصر کے ایک ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے "آلات الطب والجراحۃ والکحالہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جن مین ان تمام آلات کی تشریح کی ہے، جو مسلمانون نے ایجاد کئے تھے، اور رسالے کے اخیر مین اُن سب کی تصویرین درج کی ہین، اور اُن آلات کے سوا جن کا ذکر زہراوی نے اپنی کتاب مین کیا ہے، چند آلات کا اضافہ کیا ہے، اسلامی طب کی یہ مختصر تاریخ اُن اطباء کے حالات سے ماخوذ ہے، جن کا ذکر علامہ جمال الدین قفطی، علامہ شہرزوری اور علامہ ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے، انہین سب سے زیادہ جامعیت و استقصاء کے ساتھ ان اطباء کے حالات علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھے ہین، لیکن وہ بھی ساتوین صدی کے اطباء تک محدود ہے، اس کے بعد جہان تک ہم کو معلوم ہے، کسی مورخ نے اطباء کے حالات نہین لکھے، اس لئے ہم یہ نہین بتا سکتے کہ اس کے بعد اسلامی طب کی تاریخ مین کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے؟ اس سلسلے مین اُن تبدیلیون اور ترقیون کی تفصیل نہایت اہمیت رکھتی ہے، جو ہندوستان مین اسلامی دورِ حکومت مین اسلامی طب مین پیدا ہوئین،

اگرچہ عباسیون ہی کے دورِ حکومت مین اسلامی طب پر ویدک اثر پڑنے لگا تھا لیکن یہ معلوم نہین ہوتا کہ خود ہندوستان مین ویدک نے اسلامی طب پر کیا اثر ڈالا، ؟ اور خود اسلامی طب کا کیا اثر قبول کیا؟ تاہم اس مین شبہ نہین کہ اب تک اسلامی طب کا جو سلسلہ چلا آتا تھا، ہندوستان کی آب و ہوا کے لحاظ سے اس مین تغیر پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اور علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون مین لکھا ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ مین اس کا احساس پیدا ہوا" اور خواص خان ایک درباری امیر نے عرض کی کہ جہان پناہ یونانی طب ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہین ہے، حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی مین منتقل کیا جائے، چنانچہ میان بھوہ بن خواص خان نے اس کام کو انجام دیا، اور کتاب کا نام معدن الشفاء سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے اکبری عہد سے پہلے اختیارات قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا" اب علمی حیثیت سے طبی کتابون کی زبان بدل گئی، پہلے طب کی تمام کتابین عربی زبان مین لکھی جاتی تھین، لیکن مسلمانون کے دورِ حکومت مین فارسی زبان مین لکھی جانے لگین، اور اس وقت فارسی زبان مین جو علم طب ہے، اور خصوصًا خاندانی اطباء کے سفینون اور مجربات نامون مین جو سیکڑون نسخے اور دوائین ہین، ہندوستان زا ہین اسی طریقے سے بیدون نے مسلمانون کے سیکڑون نسخے، دوائین اور اصول علاج اپنے ہان لئے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا طرزِ علاج رائج کیا، جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا، ویدک کا یہ وہ اثر تھا جو اسلامی طب نے خود ہندوستان مین قبول کیا، لیکن خود اس نے بھی ویدک پر مختلف اثرات ڈالے، پہلے ویدون مین وہ دوائین رائج تھین جو ہندوستان مین پیدا ہوتی تھین، طب اسلامی نے تمام ملکون مین جو دوائین، جڑی بوٹیان زیرِ تجربہ آچکی تھین، اُن کو ہندوستان مین رواج دیا، اس طرح مفردات کے ذخیرے کو بیحد بڑھا دیا، مفردات کے علاوہ دواؤن کی ترکیب مین عرق معجون قیروطی، اور سفوف وغیرہ کے مختلف طریقون کو پھیلایا،

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (علیگ)

(۲)

فغان کی ہجویں: شاعری کے میدان مین فغان کی ظرافت اور بھی تیز بلکہ بہت زیادہ تیز ہو جاتی ہے، پیش نظر دیوان مین ان کی دس ہجویں ہین جو انھون نے وقتاً فوقتاً مختلف اشخاص کی کہی ہین، ان مین بعض تو ایسی ہین جو اعتدال کی حد سے اتنی آگے بڑھ گئی ہین، کہ وہ فحاشی اور گالی گلوج کہی جا سکتی ہین،

عام طور سے اردو مین ہجو گوئی کا معیار بہت ہی پست ہے، بلکہ یہ ادب اردو کے رُخ گلگون کا بہت ہی بدنما داغ ہے، ہجو گوئی کا مقصد اردو شعراء خصوصاً قدماء کے یہان وہ نہین، جو فرانس مین ربیلے مولییر والٹیر اور اناطول، فرانس یا انگلستان مین ڈرائیڈن پوپ اور بائرن یا عرب مین ابن قدامہ آبی عمر ابن العلاء اور ابن رشیق کے یہان ہین، بلکہ وہ ہے جو ایرانی شاعری مین سوزنی، عبید ذاکانی، اور قتوحی کے یہان ہین، یعنی یہ کہ بغض و عناد یا تمسخر مین ذاتی تضحیک بدلیل جوش انتقام مین سب وشتم، اور حسد مین طنز و تشنیع کرنا، عربی شعراء مثلاً ابن قدامہ اور ابن رشیق کے نزدیک جسمانی یا آبائی عیوب کا ذکر کرنا، تہمت لگانا، اور بدزبانی کرنا، ہجوگوئی نہین، بلکہ موزون گالی گلوج ہے، اس لحاظ سے اردو کے قدیم ہجوگو شعراء کے یہان صرف گالی گلوج بلکہ ایسی فحاشیان ہین جن کو پڑھ کر حیا کی گردن جھک جاتی ہے،

،ہجو گوئی کے میدان مین سودا ہین، وہ طبیعتاً نہایت نازک مزاج واقع ہوئے تھے، پھر ان کی رگون مین سپاہیانہ خون رواں تھا، اس دوآتشہ نے اُن کی ظرافت اتنی تیز کر دی تھی، کہ اُن کی ہجوون مین متانت، سنجیدگی اور سلامت کا کہین پتہ باقی نہ رہا، اُن کے یہان پھبتیان کسنا کھلی کھلی گالیان دینا، حسب نسب کی دھجیان اڑانا کوئی غیر معمولی بات نہین، پھر معلوم نہین سودا کا رنگ اس قدر کیون جما کہ ان کے معاصرون مین جس کسی نے ہجو کہی، اسی انداز کو اختیار کیا، اور رفتہ رفتہ ہجو کے معنی، تعریض، تنقیص، تضحیک، تذلیل، سب وشتم، گالی گلوچ اور بیہودہ گوئی وغیرہ سب کچھ تصور کیا جانے لگا،

چنانچہ فغان کے یہان بھی یہ ساری خصوصیات موجود ہین، مثلاً میر معصوم کی ہجو مین لکھتے ہین،

ایک ہین آشنا میرے مجہول ... خود نما بو الفضول و نا معقول

بھتیجے ہین یہ اسد خان کے ... متبنّٰی ہین خان دوران کے

یا یہ شایستہ خان کے پوتے ہین ... خانخانان کے پوتے سوتے ہین

یا یہ کہ نانی تھی ان کی نور جہان ... ان کا نانا تھا شیر افگن خان

آبائی عیوب کا ذکر کر کے جسمانی نقائص پر حملہ کرتے ہین،

سر کہان ہے تلا ہے ہانڈی کا ... حلق جیسے گلا ہے ہانڈی کا

بھوین آپس مین اس طرح رلیان ... جس نمط لڑ رہی ہون چھپکلیان

چشم تو ہے بہ رنگ دیدۂ بوم ... نہ دکھاوے خدا یہ صحبت شوم

کان پھیلے ہین جون پر شپرک ... ہے بنا گوش جون سیر شبرگ

ناک تو اس طرح سے ہے اینٹھی ... جیسے جوتے پہ مینڈ کی بیٹھی

آگے پڑھتے ہوئے آنکھین بند کر لینی پڑتی ہین، دو ایک ہجوون مین تو ابتذال، رکاکت، اور فحاشی اس درجہ تک پہنچ گئی ہین، کہ سودا بھی ان کے سامنے ماند پڑ جاتے ہین،

مگراس زمانہ مین ہجو گوئی کا جو عام معیار ہے، اس لحاظ سے فغاں کی بعض ہجوین اعلیٰ معیار پر اترتی ہین، دہلی چھوڑکر جب مرشدآباد چلے، تو راستہ مین الہ آباد ٹھہرے، وہان کی سرزمین اور اس کے لوگون سے خوش نہ ہوئے، جل کر اُن کی ہجو لکھی جو خوب ہے،

کہان سے کہاں چرخ لایا مجھے | عجب شہر ابھونڈا دکھایا مجھے
یہ وہ شہر جس کو کہیں ہین پر آگ | مرا بس چلے آج دوں اس کو آگ
جہان تک تری ہے وہاں سیل ہے | نظر آئی خشکی تو کھپریل ہے
لکھون خاک نقشہ میں اس شہر کا | کہ یہ تو ہے بیت الخلا دہر کا

.... | ....

.... | ....

لکھون وضع گرمردم شہر کی | کم ہو جائے حرمت ابھی دہر کی
عجب دہر ہے جس مین یہ شہر ہے | مصیبت ہے زندان ہے قہر ہے
بچائے خدا اس بلا سے شتاب | نہ ہوگا جہنم مین اتنا عذاب
اگر ہوگا تو یار ہون گے کئی | وہاں میرے غمخوار ہون گے کئی
وہ پہونچین گے آخر مرے درد کو | دکھاؤن گا اپنے رُخِ زرد کو
کہون گا کہ مین عاشق زار ہون | میری داد دینا گرفتار ہون

وہان کے ارباب علم اور اصحاب کمال کی جو خبر لی ہے، وہ ملاحظہ ہو،

یوں ہیں ہنستے ہنستے یہ آیا خیال | بھلا دیکھیے یہان کے صاحب کمال
انھین شاعری مین ہے کتنا شعور | کوئی ریختہ پڑھیے ان کے حضور
پڑھا ریختہ مین تو خاموش تھے | زبان سے انھین کیا فقط گوش تھے

وہاں کے پیر مرشد اور شاعر کامل شاہ عبد الرحمٰن الہ آبادی کی جو دُرگت بنائی ہے وہ بھی سُن لیجئے :-

اگر کوئی جا اُن کو دشنام دے کہیں تجھ کو اللہ آرام دے

کہیں آپ کو مرشدِ کائنات تبرک ہے یاں پیر صاحب کی ذات

شاہ صاحب شعر و شاعری میں جو درک رکھتے ہیں، پہلے اُن ہی کی زبان سے سُنئے،

سنو جس کی پھولی گلستان ہے وہ سعدی میرا بوڑھا دربان ہے

نظیری مجھے دیکھ خاموش ہو اوسے خانخانان فراموش ہو

رکھے تھا اگرچہ وہ دستِ سخا تو میں بھی تو رکھتا ہوں دستِ دعا

اب اس کے آگے سنئے،

کئی شعر ہیں یاد استاد کے تصدق ہوں میں آپ کی یاد کے

سو کہتے ہیں وہ میری مضمون ہیں تب ہی اس فصاحت کے موزون ہیں

اگر کوئی بولا کہ فرمائیے نئے شعر کچھ اپنے پڑھ جائیے

تو اس مثنوی کو پڑھیں ہیں بکا کہ تا شاہدی دیوین اہلِ جوار

کریما بہ بخشاے برحالِ ما کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

کبھی کاٹ کر ایک ٹکہ بنا پھرے ہیں یہ پڑھتے ہوے جابجا

الٰہی بہ اعزاز آن پنج تن کہ ہستند فخرِ زمین و زمن

مگر فغاں کا اصلی شاعرانہ کمال ان کی غزلوں سے ظاہر ہے، عمر میں تو وہ میر سودا، اور درد سے چھوٹے تھے، لیکن موجودہ دور کے بعض اربابِ نظر نے اُن کا شمار شعراے متقدمین کیا ہے، آزاد نے اُن کو اردو شاعری کے دورِ دُوم میں رکھا ہے، جس میں حاتم اور سراج الدین خان

آرزو ہین، اور مولانا عبدالحی نے قدما کے دورِ سوم مین شامل کیا ہے جس مین شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، میر محمد شاکر ناجی، محمد حسین کلیم اور مصطفےٰ خان یکرنگ وغیرہ ہین، مگر قیام الدین قائم نے فغان کو اپنے مجوزہ طبقہ سوم مین یعنی مظہر جانجانان، میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، میر سوز اور انعام اللہ خان یقین وغیرہ کے ساتھ رکھا ہے، اور یہی صحیح تقسیم ہے، کیونکہ پیشِ نظر دیوان مین بعض خصوصیات ایسی پائی جاتی ہین، جن کی بنا پر ان کو متقدمین کے بجائے شعرائے متوسطین کے دورِ اول کی صف مین جگہ دینی چاہئے، موخر الذکر دور کے شعرار کے کارنامے یہ ہین، کہ انھون نے ایہام گوئی کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور صحت کی کوشش کی، فارسی کی دلپذیر ترکیبیں اور پسندیدہ محاورے اردو مین رائج کئے، الفاظ کی بندشون کو چست اور لطیف بنایا، اور پرانے عاشقانہ مضامین کو روزمرہ بول چال مین خوبصورتی سے ادا کیا، اور یہ تمام باتین فغان کے یہان موجود ہین،

فغان کا موجودہ دیوان تو ایہام گوئی کے خلاف سراسر جہاد ہے، ایہام گوئی کے خلاف سب سے پہلے مرزا مظہر جانجانان نے علمِ بغاوت بلند کرکے "اس خس وخاشاک سے اردو شاعری کو پاک کیا" لیکن مرزا مظہر اردو مین اشعار کہنا اپنے لئے طرۂ امتیاز نہ سمجھتے تھے، اس لئے اردو شاعری کو واقعۃً جس نے ایہام گوئی کی برائیون سے صاف کیا، وہ انکے شاگردِ رشید انعام اللہ خان یقین تھے، فغان مرزا مظہر سے تو بہت چھوٹے لیکن یقین کے ہم عمر تھے، اب معلوم نہین، فغان نے مرزا مظہر کے زیرِ اثر ہوکر یا یقین کی تقلید مین یا اپنی طبیعت کی اُپج سے ایہام گوئی کی صنعت چھوڑ دی، مگر کسی کی تقلید مین شعر کہنا وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے، وہ خود کہہ گئے ہین،

کیون کرین غیر کے مضمون کو فغان ہم موزون
تازگی ہوے سخن مین یہ کمال اپنا ہے

بہرحال حقیقت جو کچھ ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جس زمانہ مین یقین ریختہ گوئی کو ایہام گوئی

سے پاک کر رہے تھے، اسی زمانہ مین فغان نے بھی اس صنعت سے بہت زیادہ احتراز کیا ہے، چنانچہ بقول مخدومی مولانا عبدالسلام صاحب ندوی وہ مصلحین اردو شاعری کی صف اوّل مین جگہ پانے کے قابل ہین۔

جہان تک زبان کی صفائی اور صحت کا تعلق ہے، فغان نے وہی زبان استعمال کی ہے، جو مرزا مظہر سودا، میر اور درد کے یہان ہے۔ قدما رکے الفاظ ان کے یہان نہین ملتے ہین، اور جو متروکات سودا اور میر کے یہان بکثرت استعمال ہوئے ہین، فغان کے یہان مشکل سے کہین کہین ملین گے، پورے دیوان مین صرف کسو، نت، جون، سان اور ٹک چند بار استعمال ہوئے ہین، ان مین کسو تو صرف ایک ہی جگہ آیا ہے، کبھو کا تو استعمال ہی نہین کیا ہے[۱] اس کی جگہ پر کبھی ہے،

کبھی نہ گل سے محبت نہ بو سے ہو اخلاص　　　تجھے بھی دہر مین ظالم کسو سے ہو اخلاص

البتہ ولی کی طرح[۲] تئین کا استعمال جابجا کیا ہے، بلکہ دو غزلین تو اسی ردیف مین لکھی ہین، جن کے بعض اشعار یہ ہین،

شعلہ ہماری آہ کا ہوتا چلا بلند　　　نزدیک ہے کہ آگ لگے آسمان کے تئین

خلوت مین وہ ہو جام ہو مطرب ہو اور شراب　　　یہ دن خدا دکھا دے ہمارے فغان کے تئین

---

[۱] معارف جلد ۹ نمبر ۴ [۲] دیوان کے پیشِ نظر قلمی نسخہ کی غزلون مین تو کبھو نظر نہین آیا، لیکن مجموعہ نغز مین فغان کے حسب ذیل اشعار منقول ہین، جن مین کبھو کا استعمال ہوا ہے،

مجسا گرفتہ دل بھی کبھو شاد ہوئے گا　　　یہ خانمان خراب بھی آباد ہوئے گا

اس سال ہم قفس مرے آزاد ہو گئے　　　مجھ پر بھی مہربان کبھو صیاد ہوئے گا

نہ کھولیے ترے بند قبا تو کیا کیجے　　　دلِ گرفتہ کو ظالم کبھو تو وا کیجے

[۳] ولی کا ایک مقطع ہے :-

پیدا ہوا ہے جگ مین ولی صاحب سخن　　　میری طرف سون جا کے کہو انوری کے تئین

شمع رو خلوت مین مت دو پروانے کے تئین | اے تیرے قربان مین کیا کم ہون جل جانے کے تئین
مے نہین مینا نہین، ساغر نہین ساقی نہین | جی مین آتا ہے لگا دون آگ پیمانے کے تئین

اسی طرح ایک قطعہ ہے، جس مین "چالیان" "کالیان" اور "نکالیان" جیسے الفاظ قدماء کی یاد تازہ کرتے ہین[۵۱] :-

دیکھا کہ یہ تو چھوڑنا ممکن نہین مجھے | چلنے لگا وہ شوخ میر اتب یہ چالیان
ایذا ہر ایک طرح سے دیتو غرض مجھے | کچھ بس نہ چل سکا تو یہ طرحین نکالیان
ہم نے شب فراق مین سنتا ہے اے فغان | کیا خاک سو کے حسرتیں دل کی نکالیان
یہ تھا خیال خواب مین دیکھیں گے روز وصل | آنکھین جو کھل گئین وہی راتین ہین کالیان

مگر یہ الفاظ متوسطین کے دور اول میں متروک نہین ہوئے تھے، بلکہ مذکورۂ بالا دونون ردیف اور قافیے اس زمانہ مین بہت پسندیدہ تھے، میر[۵۲]، سودا[۵۳]، یقین[۵۴] اور بیدار[۵۵] نے بھی اس ردیف اور قافیے مین غزلین لکھی ہین،

---

۵۱ حاتم کا ایک مطلع ہے :-

جب سے تیری ادائین عالم کو بھائیان ہین | تب سے جہان میں تونے دھومین مچائیان ہین

۵۲ میر :- مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ ہمین نہین، | کیا جانئے کہ میر گئے ہم کدھر کے تئین
کیا جانتے تھے ایسے دن آجائیں گے شتاب | روتے گذرتیان ہین راتین ساریان

۵۳ سودا: جب ہون پر یار کے مستی کی دھڑیان دیکھیان | جون زحل کی ساعتین اس دل پہ کڑیان دیکھیان

۵۴ یقین :- کم نہین ہم پوچھتے کعبہ سے میخانہ کے تئین | سجدہ ہم کرتے ہین جون محراب پیمانے کے تئین
گالی بھی پی گئے ہین مارین بھی کھائیان ہین | ہم نے تیری جفائین کیا کیا اٹھائیان ہین

۵۵ بیدار: جانین مشتاقوں کی لب تک آئیان | بس بے ظالم تیری بے پروائیان
یارب جو خار غم مین جلا دی انھون کے تئین | جو غنچہ طرب ہیں کھلا دے انھون کے تئین

فغاں نے فعل امر کے استعمال مین قدما ہی کی روش پسند کی ہے، اور یہ چیز شعرائے متوسطین کے دور سوم تک جاری رہی، اس کے علاوہ فغاں کی غزلون مین ایسے موزون ہین کہ موجودہ مذاق کے مطابق بھی ان مین قبح کے بجائے حسن پیدا ہو گیا ہے، مثلاً

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہین | لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہین
باد صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو | مجھ سا گرفتہ دل نظر آوے اگر کہین
اتنا ہجوم خوش نہین آتا ہے اشک کا | عالم کو موت ڈبو ئیوا ے چشم تر کہین

مجھ سے گرفتہ دل کو خدا شاد کیجیو | اس خانماں خراب کو آباد کیجیو
اس باغباں کو میری اسیری کا کیا الم | اے عندلیب تو تو مجھے یاد کیجیو

پھر اس قسم کے متروکات فغاں کے یہان بہت ہی کم ہین، عام طور سے دیوان شروع سے اخیر تک سلاست اور فصاحت سے بھرا ہوا ہے، اور اس لحاظ سے وہ اپنے ہمعصر شعرا مین بہت ممتاز ہین،

ان کے معاصر انعام اللہ خان یقین کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انھون نے ریختہ کو بہت ہی شستہ بنایا، مصحفی یقین کے بارے مین لکھتے ہین :-

"در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ این جوان بود بعد از ان تتبعش بہ دیگران رسیدہ"،

اسی طرح یقین کے ذکر مین تذکرہ فتح علی شاہ مین ہے :

"بے اغراق ریختہ گوئی بر طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ"

صاحب گل رعنا بھی اپنی خوش عقیدگی کے جوش مین رقمطراز ہین، کہ اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہون یا مرزا ہون کسی کا چراغ ان کے سامنے نہین جل سکتا تھا،

گمان خوبوں کے باوجود یقین کے یہان بعض الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہین جو اس زمانہ مین متروک ہوچکے تھے، مثلاً جگہ کے بجائے جاگہہ[۵۱] رکھنا کے بجائے راکھنا[۵۲]، لگنا کے بجائے لاگنا[۵۳]، سے کے بجائے ستی، اور سیتی[۵۴] جینا کے بجائے جیونا[۵۵]، جاننا کے بجائے بوجھنا[۵۶] ادھر کے بجائے ایدھر[۵۷] اور ادھر کے بجائے کیدھر[۵۸] استعمال کئے گئے ہین، اس کے برخلاف فغان کے یہان یہ متروکات بالکل نہین پائے جاتے، اگران کے دیوان پر نظر ڈالی جائے، تو متروکات کی جگہ نئے ترشے ہوئے الفاظ ملین گے،

فغان نے قلعہ معلی کی چہار دیواری مین پرورش پائی تھی، اس لئے فطری طور پر ان کی زبان مین اردوے معلی کی گھلاوٹ ہے، اور اس لحاظ سے وہ اپنے تمام معاصرین مین ممتاز ہین، یقین کی ایک مشہور غزل ہے،

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے	اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے
قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہو ضرور	آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

---

[۵۱] تیری جاگہہ اگر پتھر بھی ہوتا آب ہو جاتا | پھٹی چھاتی کو میری دیکھ کوہِ طور رو دیتا

[۵۲] کسو کا کبھو راکھا کرو دل، تم کو لازم ہی | وگرنہ دلربا ؤں کا لقب دلدار کیون ہوتا

[۵۳] اشک سے لاگے ہے پروانہ کے جیسے تن کو آگ | لگیوا ے فانوس ایسی تیری پیراہن کو آگ

[۵۴] منھ پھیر نالہ سے، آنسو سے نہ موڑ آنکھین | اتنا بھی یقین مت ہو اپنے ستی بیگانہ

[۵۵] ہاتھ سیتی جا چکا جب یار تب آئی بہار | پی کے مے تنہا کوئی دھومین مچاوے کس طرح

[۵۶] عشق کے بھی کارخانے کی عدالت دیکھ لی | بوالہوس جیوین، مرین ہم اے محبت واہ واہ

[۵۷] کم نہین ہم بوجھتے کعبہ سے میخانہ کے تئین | سجدہ ہم کرتے ہین جون محراب پیمانے تئین

[۵۸] دیوان یقین ص . . . .

[۵۹] دلون پر برق سی گرتی تھی جب ہم نالہ کرتے تھے | گئین کیدھر نہین معلوم ان آہون کی تاثیرین

جو کوئی عرض حال کرے تجھ ستی مرا　　اوّل بیان دا قتہ کر بلا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے　　زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے
ہوتا ہے خاکِ راہِ دفا بیگمان یقین
ہے دل مین یہ کہ شرطِ محبت ادا کرے

فغاں نے اسی قافیے اور ردیف مین جو طبع آزمائی کی ہے، وہ بھی ملاحظہ ہو:

یار اگر جفا کرے چاہئے دل وفا کرے　　یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے
یار طرف نظر رہی اشک سے چشم بھر رہی　　جیب و کنار تر رہی خونِ جگر بہا کرے
کوچۂ یار پاک ہو جان کہین ہلاک ہو　　کاش یہ چشم خاک ہو در پہ تیرے اوڑا کرے
جو کوئی عشق باز ہو چاہئے وہ گداز ہو　　شعلۂ دل فراز ہو شمع صفت جلا کرے
تو تو فغاں ہے بیر دیر پاتے ہین تجھسے لطف سیر　　کون جئے گا تجھ بغیر تو نہ مرے خدا کرے

یقین کا شاعرانہ کمال اپنی جگہ پر لیکن زبان کی جو صفائی اور روانی فغاں کے یہان ہے، وہ یقین کے یہان نہین، دونون کے ملتے جلتے مضامین کے کچھ مفرد اشعار بھی ملاحظہ ہون۔

یقین　اس طرح رونے مین آنکھون کا خدا حافظ یقین　　دیکھئے یہ خانماں اس رو مین ڈوبے یا ترے
فغاں　اتنی ہی آہ و زاری کرتے اگر رہین گے　　جیتے کہاں بچیں گے آخر تو مر رہین گے
یقین　بہار آئی ہے کیا کیا چاک جیب پیرہن کرتے　　جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب تو کیا دیوانپن کرتے
فغاں　بہار آئی میرے پاؤن مین پھر زنجیر پڑتی ہے　　مبارک ہو جنون گھر کو تیرے آباد کرتا ہون
یقین　آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ یقین　　گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

سلہ ۵ اس غزل کا پہلا، دوسرا، اور چوتھا، شعر، سودا کی طرف بھی منسوب ہے،
(دیکھو کلیات سودا ص ۲۷ ، نولکشور پریس لکھنؤ)

فغان۔ مجھ سے ہیں سکے تھمانہ ہر گز یہ طفل اشک | تخت جگر کو گود میں جب تک کہ بھر نہ لے

یقین۔ آپ سے جب تلک نہ تھا واقف کہاں تھا یکو | دیکھتے ہی آئینہ میں منہ سکندر ہو گیا

فغان۔ دل میں فغاں کے ہم نے نکس دوئی نہ دیکھا | آئینہ سکندر کیا اوس کے روبرو ہو

اس زمانہ کے عام مذاق کے مطابق یقین کے کلام میں بعض جگہ تعقید[1] عجیب و غریب ترکیب[2] اور قافیے میں ناہمواری بھی پائی جاتی ہے لیکن فغاں کا دیوان ان معائب سے پاک ہے "البتہ" نے کے استعمال میں فغاں نے معلوم نہیں کونسا نحوی طریقہ اختیار کیا ہے کہ کہیں بالکل نہیں استعمال ہوا ہے، جس سے زبان میں کچھ ثقل پیدا ہو گیا ہے، مثلاً

اے شیخ میں کل سے نہیں دیکھا ہے صنم کو | اس وقت خدائی سے بھی بیزار بیٹھا ہوں

رفو کرے تھے جسے تو ہزار محنت سے | میں تار تار کر اس کو اڑا دیا ناصح

تب کہا میں دل سوکر کچھ فکر عقبیٰ ای عزیز | کیوں نہیں ہوتا تو مداح شہ دلدل سوار

ایک جگہ "انھوں" کے استعمال سے بھی ثقل پایا جاتا ہے،

جو میری تحقیق میں آیا سو اب کرتا ہوں عرض | رائے تو ان کی غلط ہے بد انھوں کا ہے شعار

مگر کہیں کہیں تو صفائی اور روانی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بعض غزلوں پر بقول استاذی مولانا عبدالسلام صاحب ندوی داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، مثلاً

مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے | آمرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے

کج کلہ، تیغ بکف ہیں برابرو، بے باک | یا الٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے

---

[1] مثلاً کہاں تھکتے ہیں چڑھ منہ پر زبان نا زنگین کے | کہ ہیں ہم صبر کے بے خرچ مفلس ہیں دل دین کے

[2] مثلاً شکن مشتاق دل میرا ہوا ہو سخت سودائی | جہاں یہ دیکھتا ہے تنگ وہاں کرتا ہے بینائی

[3] زور، شور کے قافیے کے ساتھ چھوڑ، اور کروڑ بھی استعمال کیا ہے، دیکھو دیوان یقین ص ۹۱، انجمن ترقی اردو،

یا مثلاً :-

ساغر ہو اور مینا، صہبا ہو اور سبو ہو
جم جم رہے یہ صحبت دنیا ہو اور تو ہو

منظور عشق یہ ہے عشاق پا شکستہ
محتاج در بدر ہو آوارہ کو بکو ہو

یا مثلاً :-

اے عندلیب زمزمہ کرلے پکار کے
آئی خزاں چمن مین چلے دن بہار کے

ساقی مجھے تو ساغر نرگس مین دے شراب
کھلتی نہیں ہے چشم تو مارے خمار کے

یا مثلاً :-

ظالم تجھے قسم ہے جو اس کو جلا نہ دے
یہ دل بھی دل نہ ہووے جو تجکو دعا نہ دے

تیرے ہی دل سے پوچھے اس غم کو ہاں فغاں
الفت بُری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

فغاں کے یہاں شعراء متوسطین کی طرح بعض ترکیبیں تو بہت سبک، دلپذیر اور دلکش ہین، مثلاً کاروانِ اشک، طفلِ اشک، دامنِ صحرا، داغِ جنون، خاکپاے چراغ، آتشکدۂ دل، تشنۂ عشق گرفتہ دل، صفِ مژگان وغیرہ مگر کہین کہین، موجودہ ذوق کے مطابق گران ہوگئی ہین، مثلاً

برنگِ طائرِ بسمل موئے یہ کشتۂ عشق
کسی نے غم نہ کیا خاک و خون طپیدون کا

دہین کو دیکھ تیرے ہونٹ چاٹتے رہ گئے
بھرا نہ قند سے مونہہ چاشنی چشیدون کا

ایسی ترکیبین اس زمانہ کے شعراء کے یہاں عام ہین، اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور مین اردو شاعری کو اس قابل بنایا جارہا تھا، کہ اس کے ذریعہ سے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار اچھی طرح ہو، فارسی اس کے سامنے تھی، اس لئے اس زبان کی ترکیبین اور محاورے بکثرت مستعمل کئے جانے لگے، ان مین سے اکثر تو اردو شاعری کے رُخِ زیبا کی زینت بن گئے لیکن بعض کھپ نہ سکے، انھی مین فغاں کی مذکورۂ بالا ترکیبیں ہین، اسی طرح فارسی محاورات کو اردو مین رائج کرنے کی کوشش مین ایک جگہ ایسا محاورہ

استعمال ہو گیا ہے، جو آج غیر فصیح معلوم ہوتا ہے،

یار برباد تو دیتا ہے مرے خون کو لیک ۔۔۔ نہ اڑے چھینٹ نہیں گوشۂ دامان کی طرف

فغان نے فارسی کے محاورہ برباد دادن سے برباد دینا استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن اردو

مین برباد کرنا رائج ہوا،

مگر اس قسم کے غیر فصیح محاورے شاید ایک آدھ ہی ہین، ورنہ عام طور سے تمام محاورات موجودہ

مذاق کے مطابق ہین،

الفاظ کی بندش | فغان کے یہان شعرائے متوسطین کی طرح الفاظ کی بندش بھی چست اور لطیف ہے مثلاً

پامال عشق کوچۂ الفت سے کیا چلے ۔۔۔ چلنے مین ہم یہان سے اگر نقش پا چلے

لخت جگر کو دیکھ کے کہتے ہین طفل اشک ۔۔۔ گر چل سکے تو ساتھ ہمارے چلا چلے

رسوائے خاص و عام ہون جاؤن جہان لئے ۔۔۔ اس داغدار دل کو بھرون مین کہان لئے

واہون برنگ گل جو سخندان ملے کہین ۔۔۔ غنچہ صفت خموش ہون مونہہ مین زبان لئے

اس قافلہ کے بیچ صدائے جرس نہین ۔۔۔ جاتی ہے سیل اشک عجب کاروان لئے

کیونکر کوئی زیارت زخم جگر کرے ۔۔۔ پردے اٹھے نہین ہین دل داغدار کے

طاق نسیان پہ نہ رکھ شیشۂ دل کو ظالم ۔۔۔ یہ نہ ہو کر کہ مرا آبلۂ دل پھوٹے

کر دیا وقف مرے کلبۂ احزان کو فغان ۔۔۔ خوان یغما کے یہ معنی ہین جو جا ہی لوٹے

بندش پر ردیف کے اثر کی مثال ملاحظہ ہو،

عاشق کا دل تجھے گر مطلوب ہے تو یہ ہے ۔۔۔ گزشتہ ہی تو یہ ہے اور خوب ہے تو یہ ہے

پردہ اگر دوئی کا اٹھ جاوے تو دکھا دون ۔۔۔ معشوق ہے تو یہ ہے محبوب ہی تو یہ ہے

اب کیا علاج کیجئے خانہ خراب دل کا ۔۔۔ ہوشیار ہے تو یہ ہے مجذوب ہی تو یہ ہے

بختِ جگر فغان نے اب نامہ بر کیا ہے   پیغام ہے تو یہ ہے مکتوب ہے تو یہ ہو

الفاظ کی بندش کی چستی سے کہین کہین بقول مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کلام مین موسیقیت اور کہین کہین تشابہ پیدا ہو گیا ہے، پہلے موسیقیت کی مثالین ملاحظہ ہون،

نے شعلہ و نے برق و نہ اخگر نہ شرر ہون   مین عاشقِ دل سوختہ ہون تفتہ جگر ہون

زاہد کو حرم دیر برہمن کو مبارک   مین کشتۂ الفت نہ ادھر ہون نہ اُدھر ہون

قاتل کے دمِ تیغ سے یہ بوالعجبی ہے   بسمل کی زبان پر طپش تشنہ لبی ہے

آنکھین ترے پاؤن سے لگین عین سعادت   دامن کو ترے ہاتھ لگے بے ادبی ہے

دشمن ہے محتسب دلِ خانہ خراب کا   چھوٹے نہ اُس کے ہاتھ سے شیشہ شراب کا

جاری ہے میرے گوشۂ دامان سے سیل اشک   تر اس قدر ہے کا ہکو دامن سحاب کا

اس دل کو الٰہی کیون آسیب نہ پہنچے   مین ٹھیس سے ڈرتا ہون کہ شیشہ کی گھڑی ہے

صنعت کے یہ معنی ہین کہ ٹوٹے کو بنا دے   دل توڑنا یہ کون فنِ شیشہ گری ہے

ہون عاشقِ دل سوختہ جون سرو چراغان   اس نخل کی ٹہنی نہ ہری ہے نہ بھری ہے

کیون پھونکتا رہتا ہے فغان داغِ جگر کو   بجھ جائے گا آپ ہی یہ چراغِ سحری ہے

اس کے بعد تشابہ کی مثالین ملاحظہ ہون،

کسی کے پاس دیکھوں یار کو مین سہہ نہین سکتا   رہون تو رہ نہین سکتا کہون تو کہہ نہین سکتا

یہ موجِ اشک میری صورتِ زنجیر رکھتی ہے   چلون تو چل نہین سکتا بہون تو بہہ نہین سکتا

تجھے ہر صبح ہنسنا تھا تجھے ہر شام تنا دی تھی   مجھے ہر روز جلنا تھا مجھے ہر رات رونا تھا

تجھ سے رقیب ہنستے یہ بھی خدا کی قدرت   ہم یون رہین ترستے یہ بھی خدا کی قدرت

دل دودن مین روتے روتے یہ بھی نصیب ہے   جی لے تو ہنستے ہنستے یہ بھی خدا کی قدرت

فغاں کے الفاظ کی بندش کی داد موجودہ دور کے ارباب کمال نے بھی دی ہے، محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے، مولانا عبد السلام ندوی رقمطراز ہیں، "کہ اُن کی بندش کی چستی اُن کی زبان کی سلاست اور روانی کو اور دوبالا کر دیتی ہے" پھر لکھتے ہیں کہ بندش کی چستی نے بعض جگہ فغاں کی ترکیبوں میں نہایت تناسب اور توازن پیدا کر دیا ہے، اس نے کلام میں روانی کے ساتھ موسیقیت بھی پیدا ہو گئی ہے، جو کانوں کو نہایت خوش آیند معلوم ہوتی ہے،

بقول مصنف گل رعنا متوسطین شعرار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ "جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھے چلے آتے تھے، اُن کو بہ تبدیل الفاظ اور تبغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے، کہ بار بار پڑھئے اور مزے لیجئے، یہ خصوصیت فغاں کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، پیش نظر دیوان کی تمام غزلیں اس کی بین مثالیں ہیں، فغاں کی شاعری میں مضامین کی بلندی یا خیالات کی ندرت نہیں بلکہ اس میں عشق و عاشقی کے وہی پرانے قصے ہیں جن میں صرف زبان کی صفائی کا لطف ہے، اس کا اندازہ ناظرین اُن کے اشعار سے کر سکتے ہیں، (باقی)

اسلام کا معاشیاتی نظام

از

جناب مولوی حید زمان صاحب صدیقی تنشگری،

موجودہ معاشی نظریات کا پس منظر انسانون کے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں اقتصادی مسئلہ کو کافی اہمیت حاصل ہے، اسی لئے موجودہ نظام ہائے حکومت میں اس مسئلہ کو اولین درجہ دیا گیا ہے، اور ہر حکومت اپنی اقتصادی عظمت و برتری کی خاطر گوناگون وسائل و ذرائع عمل مین لارہی ہے، اور زبان سے یہ دعوی بھی بار بار دہرایا جارہا ہے، کہ ہمارے حدود مملکت میں کسی انسان کو تنگدست اور بھوکا نہ رہنے دیا جائے، اور ملک کے تمام باشندون کو امن و خوشحالی کے ساتھ مساویانہ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں مہیا ہونی چاہئین،

مگر اس حقیقت سے کس کو انکار ہوگا کہ حقیقی امن و خوشحالی صرف اس کا نام نہیں کہ دولت و زر کے انبار جمع ہو جائین اور حکومت کے خزانے سونے اور چاندی سے بھرپور ہوں، ورنہ اس معیار سے موجودہ حکومتین سرمایہ و دولت کے اعتبار سے تاریخ کے کسی دور سے پیچھے نہین ہین، بلکہ ازمنۂ سابقہ سے اعلی و برتر ہین موجودہ سائنس کے حیرت انگیز اکتشافات نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا ہے، داعیاتِ نفس کے جملہ وسائل مہیا ہین، عشق و محبت کی ہوسناکیون کی تکمیل مین کوئی امر مانع نہین حسن و جمال کی رنگینیوں سے فضائے عالم معمور ہے عیش و عشرت، زینت و تجمل، آرام و راحت و آسایش کے وسائل کی بہتات ہے، مگر کوئی عقلمند انسان اس بات سے انکار نہین کرسکتا، کہ جس شے کا نام امن و سکون ہے، وہ عنقا ہے، دنیا کے ہر حصہ مین شورش و بدامنی کے طوفان اٹھ رہے ہین جنھی

اور اضطراب کی بجلیاں کوندرہی ہیں، اور فتنہ و فساد کے شعلوں نے خرمنِ امن کو خاکستر بنا دیا ہے کسی تنفس کو
ایک لمحہ کے لئے بھی سکون حاصل نہیں،

ان حالات سے ہم ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ عالم انسانی بہت بڑے انقلاب کے دروازہ پر کھڑا ہے
زمانہ نئی کروٹ بدلنا چاہتا ہے اور حیاتِ انسانی ایک نئی حرکت کا آغاز کرنے والی ہے، مگر انسان
کو اس وقت اس کا یقین ہوگا، جب وہ اس ہمہ گیر انقلاب کی عبوری منازل کے بعد ایک نئی کائنات
کا مشاہدہ کرے گا،

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي	ہم ان کو نفس و آفاق میں اپنی نشانیاں
أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ	دکھائیں گے، یہاں تک کہ اُن کو حق و صداقت
(حم سجدہ ۵)	کا یقین ہو جائے گا،

یہ قانونِ قدرت ہے اور تاریخ کے ہر دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے، کہ جب کسی قوم نے لذات و شہوات
میں غرق ہو کر نوامیسِ فطرت کی توہین کی، اور اس کی ظالمانہ قوتوں نے مخلوقِ خدا کو رنج و الم میں ڈال دیا
تو قدرت کی انتقامی قوتوں نے اس بدکردار قوم کے ناپاک وجود سے اپنی مقدس زمین کو پاک کر دیا، اور
اس کے بعد کسی دوسری صالح قوم کو اس زمین پر بسایا، كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ، آج

اس دور میں اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ دنیا مادہ پرستی میں حدِ اعتدال سے بہت بڑھ چکی ہے
اور مادی ترقی میں دنیا منتہائے کمال کو پہنچ چکی ہے، مگر اس کے باوجود انسان کا جو قدم بھی آگے کی جانب
اٹھتا ہے، اس میں عالم انسانی کے لئے ہزاروں ہلاکت خیزیاں موجود ہوتی ہیں، کیا ان حالات میں
کوئی عقلمند انسان اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے، کہ صرف سیم و زر کے خزائن ہی انسانوں میں امن و مساوات
پیدا کر سکتے ہیں، اگر ایسا نہیں تو ہمیں سوچنا ہوگا، کہ ہمارے سماجی نظام میں کونسا نقص پایا جاتا ہے جس کی
بنا پر ہماری ترقی کا ہر قدم ہلاکت و بربادی کو دعوت دے رہا ہے،

اگر دولت سے مقصود دل کی آسودگی اور امن و خوشحالی نہیں، بلکہ نفس دولت ہی ہے، یا دولت صرف آتشیں اسلحہ کی نمایش اور قومی و نسلی رفعت و استیلار کا ذریعہ ہے، تو بدقسمت انسان قیامت تک چین کی نیند نہیں سو سکتا، اور قیام امن کی کوئی کوشش بار آور نہ ہوگی، جہان تک واقعات کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج صرف وطنی اور نسلی قومیتون کی عظمت و برتری کے لئے سرمایۂ دولت کے انبار لگائے جا رہے ہین، اور ہر ملک نے ان مکروہ مقاصد کی تکمیل کے لئے دوسرے ممالک مین اپنی تجارت کا وسیع جال پھیلا رکھا ہے، کہ ان خزائن کے ذریعہ ہوائی جہاز، ٹینک، ایٹم بم، اور دوسرے ہلاکت آفرین اسلحہ تیار ہو سکین، اور اپنی فوجی طاقت کو ناقابلِ تسخیر حد تک مضبوط اور مستحکم بنا دیا جائے اقوامِ حاضرہ کا یہ طرزِ عمل اُن کے حسد اور رشک و رقابت کی چنگاریون کو بھڑکانے مین تیل کا کام دے رہا ہے اور کچھ نہین کہا جا سکتا کہ اس آگ کے شعلے کب اور کس وقت امنِ عالم کو جلا کر خاکستر کر دین،

اس مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے، ایک ہی بات سمجھ مین آتی ہے، وہ یہ کہ موجودہ اقوام کے اقتصادی نظریات کی اندرونی بنیاد جغرافی اور نسلی قومیت کے عصباتی جذبات پر ہے، اور یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب تک ان اقوام کے بنیادی تصورات مین تبدیلی نہ ہوگی، اس وقت تک آنے والے خطرات کا سدِباب نہیں ہو سکتا، اور یہ تبدیلی صرف اسی صورت مین ممکن ہے کہ اقوامِ حاضرہ جغرافی اور نسلی قومیتون کے تنگ دائرے سے نکل کر ہمہ گیر اخوتِ انسانی کے وسیع دائرہ مین قدم رکھین، اس زمانہ مین انسان کی حقیقی نجات کے راستہ مین سب سے بڑی رکاوٹ اخلاقی اقدار اور ہمہ گیر اخوتِ انسانی کی علی الرغم انسانون کی خود ساختہ عصباتی تقسیم ہے، اور نہ صرف اُن کے اقتصادی نظام مین بلکہ پورے فلسفۂ اجتماع ( ) مین اس جاہلی عصبیت کا زہر سرایت کئے ہوئے تھے، اُن کی تہذیب، آرٹ، معاشری طور و طریق اور سیاسی و معاشی نظریئے سب کے سب اس اصل پر مبنی ہین، کہ ایک ملک کے باشندے یا ایک نسل کے افراد ایک ایسی قومیت کی تعمیر کرتے ہین، جو دوسرے بنی نوعِ انسان سے کلیۃً الگ ہے، اور اس کے اجتماعی تقاضے

اور مفاد قومیتوں کے مفاد سے کسی وقت ہم آہنگ نہیں ہو سکتے،

ظاہر ہے کہ ہر جغرافی قومیت جب تک اپنے آپ کو دوسرے انسان سے بالکل الگ تھلگ وحدت (unity) تصور کرتی رہے گی، اور اس کی ہیئت اجتماعیہ کا سنگِ بنیاد وطنی تصور پر ہوگا، اس وقت تک متضاد اور متخالف قومیتوں میں بھی اتحاد نہیں ہو سکتا، اور اُن کے قومی مفادات میں کبھی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب اجتماع انسانی کی بنیاد موجودہ طبقاتی (Sectional) تصورات کے بجائے شرفِ انسانی اور اس کے ہمہ گیر اصول و نظریات پر رکھی جائے، جب تک یہ بنیادی تبدیلی پیدا نہ ہوگی، اس وقت تک قوموں کے مفاد میں باہم ٹکر جاری رہے گی،

اقوامِ حاضرہ کے اقتصادی نظریے اسی خود ساختہ اور غیر فطری تقسیم پر مبنی ہیں، یہی وجہ ہے کہ سیم و زر کے خزانے انسانوں کی فلاح و بہبود کے بجائے اُن کی ہلاکت و بربادی کے کام میں لائے جا رہے ہیں، اور اُن کے غیر فطری رجحانات نے اُن کی مدنیت کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں،

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت	ہم نے بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کیں
معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن	جو اپنی معیشت میں مغرور و متکبر ہو گئی تھیں،
من بعدھم الا قلیلا وکنا نحن	اب یہ ہیں اُن کے مکانات کہ ان کی ہلاکت
الوارثین،	کے بعد بہت کم آباد ہو سکتے ہیں، اور درحقیقت
(قصص)	حقیقی مالک و وارث تو ہم ہی ہیں،

اسلام کا اقتصادی نظریہ، اسلام کے نظریۂ زندگی اور فلسفۂ اجتماع کا دائرہ پورے روئے زمین کی وسعت میں پھیلا ہوا ہے، جس میں مرزبوم، قبیلہ و نسل اور رنگ و زبان کے امتیازی خطوط کی کوئی گنجایش نہیں، اسلام کے وسیع اور عالمگیر اصول و نظریے دنیا کے تمام انسانوں میں ایک وسیع روحانی اور نظریاتی اخوت پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور اس مقصد میں وہ احمر و اسود، آقا و غلام اور عرب و عجم کی کوئی تمیز روا نہیں رکھتے

یعنی اسلام کا دستور اخلاق و معاشرت، نظریۂ سیاست، اور فلسفۂ معاشیات، اس کے تمام تصورات وطنی اور نسلی قیود سے بالاتر اور انسانیتِ مطلقہ سے متعلق ہین، اس لئے اسلامی اصول و نظریات ہی عالمِ انسانی مین ہمہ گیر رشتۂ مودت پیدا کرنے مین کامیاب ہو سکتے ہین، اور اسلام کا نصب العین یہی ہے کہ تمام عالمِ انسانی کو ایک ایسی ہمہ گیر وحدت مین جذب کر دیا جائے جس کی بنیاد شرفِ انسانی اور ایمان و عمل پر ہے،

کونوا عباد اللہ اخوانا،	تم سب اللہ کے فرمانبردار بندے اور باہم
(بخاری)	بھائی بھائی بن جاؤ،
اللّٰھم ربنا و رب کل شیٔ انا	اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار!
شھیدٌ ان العباد کلھم اخوۃ	مین اس بات کی گواہی دیتا ہون کہ انسان
(ابوداؤد و مسند امام احمد)	آپس مین بھائی بھائی ہین،

اسلام مین تمام انسانون کا مایۂ خمیر ایک ہی ہے، اس لئے وہ انسانون کی کسی مصنوعی تقسیم کو پورا نہین کرتا،

الا کلکم من آدم و آدم من طین	تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی
(مشکوٰۃ)	سے پیدا کیا گیا،

اگر آج کی دنیا کا انسان اس کو ماننے مین ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، تو کرے، مگر اس کی خواہشات کے علی الرغم قانونِ قدرت (Law of Nature) اپنا کام بہرحال جاری رکھےگا، اور ایک نہ ایک دن ایسا وقت آکر رہے گا کہ اسلام اپنے نصب العین مین پوری طرح کامیاب ہوگا،

واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون	اللہ اپنے دینِ برحق کو مکمل کرکے رہے گا
(انفال)	اگرچہ کافر اس بات کو ناپسند کرتے ہین،

اسلام کے اقتصادی نظریے ([illegible])

اخلاقی اقدار پر مبنی ہیں، اور ان میں وطنی قبیلوی، نسلی اور لسانی امتیازات کو کسی قسم کا دخل نہیں، اگر ان میں کوئی امتیازی پہلو ہے، تو وہ صرف شرف انسانی اور مابعد الطبعیاتی تصورات کا کسی صحیح اسلامی حکومت کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا، کہ وہ انسانوں کی کسی جماعت پر صرف اس لئے جارحانہ حملہ کرے کہ اس کی قومیت ہماری وطنی قومیت سے الگ ہے، یا اس کی نسل ہماری نسل سے جدا ہے، یا اس کا رنگ ہمارے رنگ سے متفاوت ہے، اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی اس قسم کے حملہ و ہجوم ( ) کی اجازت نہیں دیتا، اور اس کو قتال فی سبیل الطاغوت قرار دیتا ہے، البتہ دینی مقاصد کے لئے جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں کے فرائض مذہبی اور تبلیغ دین کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہے، درحقیقت اسلام ایک آزاد (خودمختار) اسلامی حکومت کا قیام صرف اسی لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کے سوا کسی شکل میں قرآنی نظام اور اسلامی قانون ( ) کا نفاذ و اجرا نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اور کسی مادی مقصد کے لئے اسلام میں حکومت کی کوئی گنجائش نہیں، گویا اسلام میں حکومت ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اصل مقصود نہیں،

الذین ان مکنٰھم فی الارض	وہ لوگ کہ جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ و تمکنت
اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ و	عطا کریں، تو وہ نمازیں ادا کریں زکوٰۃ
امروا بالمعروف ونھوا عن	دیں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا
المنکر ( ) (حج)	فریضہ بھی ادا کریں،

متذکرہ آیت میں غلبہ و تمکنت فی الارض کو نماز، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیود سے مقید کر دیا گیا ہے، اگر قیام حکومت کے بعد اس کے ذریعہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پوری ادائی نہ ہو سکے، اور حکومت کی طاقت نیکی کو ابھارنے اور برائی کو مٹانے میں صرف نہ ہو، تو ایسی حکومت اگرچہ اس کے چلانے والے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، اسلام کی نظر میں صحیح اسلامی حکومت نہ ہو گی، اسلام میں

ہر ایسی جنگ جو اعلائے کلمۃ الحق اور دین کی برتری کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے لڑی جائے خواہ وہ اقتصادی جنگ ہو، یا رشتہ و نسل اور جغرافی قومیت کے غلبہ و استیلا کے لئے یا انتقامی جذبات کے تحت ہو، وہ جاہلیت کی جنگ ہوگی اور اسے کسی حال میں اسلامی جہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا، قرآن حکیم نے صاف الفاظ میں جہادِ اسلامی کی غرض و غایت متعین کر دی ہے،

قاتلوا حتّٰی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ

تم جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے اور طاعت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے،

حضرت عبد اللہ بن عمر نے فتنہ کی تفسیر ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے،

فقال بل تدری ما الفتنۃ ثکلتک امک انما کان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقاتل المشرکین وکان الدخول فی دینھم فتنۃ ولیس کقتالکم علی الملک،

(بخاری کتاب الفتن)

حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا، تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے اس لئے جہاد کرتے تھے کہ ان کے دین میں داخل ہونا فتنہ تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح ملک کے لئے نہیں لڑتے تھے،

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ جاھلیۃ ومن خرج علیٰ امتی یضرب برھا وفاجرھا ولا یتحاشی من مومنھا ولا یفی

جو شخص امیر کی طاعت سے باہر اور جماعت سے الگ ہو جائے، اور پھر اسی حالت میں مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی، اور جو شخص میری امت پر حملہ آور ہو اور نیک و بد کو قتل کرنے لگے، مومن تو بھی بچا ہے اور جن لوگوں سے اس کا عہد ہے

لذی عمل نا فلیس منی ومن قاتل	ان کی پرواہ بھی نہیں کرتے تو وہ میری امت
تحت رایۃ عمیۃ یدعوا الی عصبیۃ	سے ہرگز نہیں، جو شخص کفر کے جھنڈے کے تحت
او یغضب لعصبیۃ، فقتل فقتلہ	عصبیت کی طرف دعوت دے، یا عصبیت کی
جاھلیۃ،	خاطر غضبناک ہو، اور پھر وہ اسی حال میں
(نسائی کتاب المحاربہ)	مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی،

ان تصریحات سے ظاہر ہوا کہ اسلام کا سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر اقوام حاضرہ کے طبقاتی نقطہ ہائے نظر سے بالکل مختلف ہے، اسلام نفس انسانیت کی فلاح و نجات کا طالب ہے، اور وہ کسی طبقہ سے محض رنگ و نسل کی بنا پر جنگ نہیں کرنا چاہتا، اور نہ کسی فرقہ پر محض اس حیثیت سے اقتصادی تفوق و برتری چاہتا ہے، بلکہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو نفس انسانیت کے اعتبار سے ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے، اور نسل و وطن کا اختلاف اس کی وسعت نظر کے سامنے حائل نہیں ہوتا۔

اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے، کہ صرف اسلامی نظریۂ اجتماع و سیاست کی بنیاد ہی پر پائدار اور عالمگیر رشتۂ اخوت پیدا ہو سکتا ہے۔ اور جب تک قوموں میں فرق و طبقات کی سبقت و اولیت کا جنون موجود ہے، اور ان کے سیاسی اور اقتصادی نظریات تنگ نظری کے زہر سے آلودہ ہیں، اس وقت تک ان کی اقتصادی اور طبقاتی جنگ بدستور جاری رہے گی،

اسلامی نظریۂ معیشت کی نوعیت اسلام کا معاشیاتی نظریہ ہر حیثیت سے اقوام حاضرہ کے اقتصادی نظریات سے مختلف اور جداگانہ ہے، اور مستقل نوعیت رکھتا ہے، اسے کسی دوسرے اقتصادی نظریہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، اور نہ کسی دوسرے نظریہ کی اس کی جانب نسبت کی جا سکتی ہے، اسے کسی دوسرے نظریۂ اقتصاد سے کوئی تعلق ہی نہیں،

چونکہ یہ نظریہ ہر حیثیت سے مکمل اور مستقل ہے، اس لئے یہ کسی دوسرے نظریہ سے پیوند نہیں ہو سکتا،

اور اپنا مستقل مقام رکھتا ہے جس مین کسی بیرونی دباؤ کا شائبہ تک موجود نہ ہو،

کہا جاتا ہے کہ نظام اشتراکیت اسلام سے قریبی نسبت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس کا مقصد بھی انسانون مین معاشی اور مجلسی مساوات قائم کرنا ہے، یہ خیال اسلامی نظریۂ معیشت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، ان دونون مین کوئی نسبت نہین، اسلامی نظریۂ زندگی اور فلسفۂ اجتماع احکم الحاکمین نے انبیا علیہم السلام کے توسط سے انسانون کو دیا ہے، جس کی بنیاد اخلاق و روحانیت پر ہے، اور اشتراکی نظریہ انسانون کا خود ساختہ ہے، اور اس کی بنیاد تمام تر مادی ہے، پھر احکم الحاکمین کا علم ازلی و ابدی اور محیط کل ہے اس لئے اس کا بنایا ہوا نظام بھی دائمی اور ہر زمانہ، ہر ملک و قوم اور ہر طبقہ کے لئے ہے، اور اس پر زمانہ کے انقلابات حوادث کا اثر نہیں پڑ نہیں سکتا، اور انسانون کا بنایا ہوا نظام اُن کی محدود نظر کے مطابق ناقص محدود اور وقتی ہے، جو زمانہ کی رفتار و حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے اسلام کا اقتصادی نظام زمانہ کے ہر اقتصادی نظام کے مقابلہ مین زیادہ مکمل جامع اور پائدار ہے،

اسلامی نظام اجتماع کے تمام اجزا باہم مربوط ہین، ضابطۂ اخلاق ہو یا دستور تمدن، مذہب و روحانیت ہو یا معیشت و سیاست، سب مین ایک ہی روح کارفرما ہے، جو ان تمام اجزا مین ہم آہنگی، اور انضباط، پیدا کرتی ہے، نظام اسلامی کا ہر شعبہ جب تک اخلاقی قیود و اقدار کا پابند ہے، اور مابعد الطبیعیاتی تصورات و عقائد کے ماتحت ہے، اس وقت تک وہ اسلامی ہے، اور اگر ایسا نہین ہے، تو ظاہری ڈھانچہ خواہ کتنا ہی خوبصورت کیون نہ ہو، اس پر اسلام کا اطلاق نہین ہو سکتا اب ان اصول کے ماتحت نظام اشتراکیت کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کیا جائے، کہ اس کی تہ مین کون سے عوامل کارفرما ہین،

نظام اشتراکیت کے عوامل عوامل سے مراد وہ تصورات ہین، جو کسی چیز کے وجود کے محرک ہوتے ہین، یہی تصورات اس چیز کے لئے اصل روح کی حیثیت رکھتے ہین، نظام اشتراکیت کو جن تصورات نے

پیدا کیا ہے، یا اس نظام کے ذریعہ جس نوعیت کا انقلاب مقصود ہے اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے،

۱۔ اشتراکی نظام مکمل طور پر انفرادیت محضہ ( ) کی ضد ہے، اور وہ انفرادیت کو کلی طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے، افراد کی شخصی اور ذاتی ملکیت خواہ سرمایہ کی شکل میں ہو یا جائداد کی صورت میں ان سے چھین کر سٹیٹ یا جماعت کی تحویل میں دینا چاہتا ہے، انفرادی جدوجہد اور ذاتی محنت کے حاصلات پر بھی سٹیٹ کو قابض بنانا ہے، اس طرح معاشرت اور معاشیات کو کلیۃً جماعت کے تحت لانا چاہتا ہے

۲۔ نظام عائلی میں تمام اخلاقی پابندیوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے، اور عورت کو ہر مرد سے اختلاط کی پوری آزادی دیتا ہے، اور اس سے جو اولاد پیدا ہو اس کو سٹیٹ کی ملکیت قرار دیتا ہے، گویا نظام عائلی میں سلسلۂ ازدواج کو کلیۃً ختم کر دینا چاہتا ہے،

۳۔ مذہب کے تصورات کو مٹا کر سوسائٹی کی بنیاد معاشی نظریوں پر قائم کرنا چاہتا ہے،

۴۔ ہر قسم کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے، اور اس انتہا پسندی کا نام کمیونزم ہے، اور جب تک یہ کام مکمل نہیں ہوتا، حکومت کے تمام اختیارات ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کے حوالہ کرتا ہے، جسے منزہ عن الخطار تصور کیا جاتا ہے،

۵۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، اور اپنے ماننے والوں سے کسی اخلاقی پابندی کا مطالبہ نہیں کرتا،

اب دیکھنا ہے کہ متذکرہ بالا امور خمسہ کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

اسلام افراد کی ذاتی ملکیت برقرار رکھتا ہے، اگرچہ فرد کو جماعت سے الگ ہونے کی اجازت نہیں دیتا، اس نے فرد اور جماعت کے حدود و دائرے متعین کر دئیے ہیں، کہ فرد کس حد تک اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتا ہے، اور کس مقام پر اس کی انفرادیت جماعت کے مفاد سے متعلق ہو جاتی ہے، اسلام نے جماعتی مفاد اور انفرادیت محضہ کے بین بین ایک معتدل اور درمیانی مسلک اختیار کر لیا ہے،

جو فطرت کے عین مطابق ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرد کی ذاتی صلاحیتیں اسی وقت ابھر سکتی ہیں جبکہ اسے کام کرنے کی پوری آزادی، اور اس کے دل میں اس کام کے لئے کشش موجود ہو، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو جب کہ اسے یقین ہو کہ وہ اپنی محنت کے نتائج سے فائدہ اٹھا سکے گا، اور آمدنی کو اپنی مرضی کے ماتحت صرف کر سکے گا، لیکن اگر کام کرنے والے کو پہلے سے یہ یقین ہو جائے، کہ اس کو صرف صبح و شام کا کھانا اور پہننے کے کپڑے ہی میسر آئیں گے، تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اپنی جان کو مصائب و آلام کی نذر کرے، اور شوق و تندہی کے ساتھ محنت و مشقت اٹھائے لیکن اگر اس کو یقین ہو کہ اس کو اس کی محنت کا پورا صلہ ملے گا، جسے وہ اپنی مرضی سے صرف کر سکے گا، تو اس کا شوق عمل تیز سے تیز تر ہوتا جائیگا اور اس کی قابلیت کے جوہر نمایاں ہوتے چلے جائیں گے،

دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسانی زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے دو حصے ہیں، حیات قبل الموت اور حیات بعد الموت، گویا حیات انسانی ایک غیر منقطع سلسلہ ہے، اور ان دونوں زندگیوں میں ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے، اور اس زندگی کی جد و جہد صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بعد میں آنے والی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، گویا ہماری اس زندگی کی ہر حرکت کو آنے والی زندگی میں پورا دخل ہے، یہ عمل و سعی کی زندگی ہے، اور وہ ثمرات و نتائج کی!!

ظاہر ہے کہ اس تصور کے مطابق دنیاوی زندگی میں جب تک فرد کے تشخص کو برقرار نہ رکھا جائے اور اس کو عمل کی آزادی نہ دی جائے، محاسبۂ اعمال کی کوئی صورت ہی ممکن نہیں ہے، انسانی اعمال میں عبادات و معاملات دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے، اور جس طرح عبادت کی تکمیل اور عدم تکمیل پر ثواب و عقاب کا ترتب یقینی ہے، اسی طرح معاملات میں بھی انسان کی ہر حرکت کا محاسبہ لازمی ہے مگر اسی صورت میں جب کہ اسکی جد و جہد کو انفرادیت سے نکال کر اجتماعیت میں گم نہ کر دیا جائے، اور فرد کی مستقل حیثیت باقی رہنے دی جائے ورنہ محاسبۂ اعمال کا تصور بے معنی ہو کر رہ جائے گا،

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بھی جماعتی زندگی کو بڑی اہمیت دی ہے، اور وہ فرد کو کسی حال میں جماعت سے الگ ہونے کی اجازت نہیں دیتا، اور جب فرد اور جماعت کے مفاد کا سوال آجائے، تو فرد کو جماعت کے مقابلہ میں اپنے مفاد سے دست بردار ہونا چاہئے، بلکہ جماعت کے مفاد کے لئے فرد کی جان بھی جماعت کی ملک بن جاتی ہے، مگر اس کے باوجود اسلام نے فرد کے تشخص اور ذاتی اعمال میں اس کی خود ارادیت (Self Determination) کو برقرار رکھا ہے، اور فرد کی اس حیثیت کے حقوق و حدود بالکل الگ ہیں،

نظام عائلی اسلامی زندگی کا ایک اہم حصہ اور اسلام کے فلسفۂ اجتماع کا ایک مستقل باب ہے، درحقیقت عائلی زندگی کی ترقی پذیر صلاحیتیں ہی سوسائٹی کی فلاح و ترقی کی ضامن ہیں، اور اسی سے اجتماعی زندگی کی شاہراہیں نکلتی ہیں، اسی لئے اسلام نے ازدواج کو زندگی کا ایک جزو لاینفک قرار دیا ہے، اور شوہر اور بیوی کے لئے الگ الگ دوائر عمل متعین کر دئے ہیں، اور ان کی مشترکہ ذمہ داری کو بالوضاحت بیان کر دیا ہے، ولھن مثل الذی علیھن وللرجال علیھن درجۃ (بقرہ)

مسلمانوں کی وحدت ملی کی بنیاد ہی مذہب پر ہے، اور مسلمان صرف مذہب ہی سے دوسری اقوام و ملل سے ممتاز ہیں، مذہب کے سوا مسلمان کا کوئی وجود نہیں،

اسلام میں اس کے نظریۂ حیات کو عمل میں لانے کے لئے خلافت اسلامیہ یا اقتدار حکومت کی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر اسلامی احکام و قوانین کا اجراء و نفاذ ممکن نہیں ہے یعنی حکومت واقعۃً اصل مقصد کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ ہے، خود مقصود بالذات نہیں،

اسی طرح اسلام میں کسی منزہ عن الخطاء اور مختار مطلق ڈکٹیٹر کی گنجائش نہیں جس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات قانون کا حکم رکھتی ہو، اسلام میں خلیفہ خود احکام الٰہی کا تابع ہوتا ہے، اور وہ نائب حق کی حیثیت سے ان احکام کو نافذ کرتا ہے، اسے یہ اختیار نہیں کہ وہ ان احکام میں اپنی

طرف سے کوئی رد و بدل یا ترمیم کر سکے اس کا کام صرف خدائی احکام کو اس کی اصل شکل مین نافذ کرنا ہے، اور وہ ان احکام کا خود بھی اسی طرح پابند ہوتا ہے جس طرح دوسرون کو پابند بنانا چاہتا ہے، اور مسلمانون مین جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت مین سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے، وہی مسند خلافت کے لئے سب سے زیادہ اہل قرار پاتا ہے،

اسلامی نصب العین کے حصول کے لئے جو جد وجہد کی جاتی ہے، خواہ وہ سعی و محنت ہو خواہ جانی و مالی قربانی، اسی کا نام جہاد ہے، اور اس کو اخلاقی بندشون مین جکڑ دیا گیا ہے، اور اس کی حدین مقرر کر دی گئی ہین، اور مختلف حالات کے لئے اس جد وجہد کے الگ الگ ضوابط مقرر ہین، جب تک یہ جد وجہد اسلام کی اخلاقی اور الٰہیاتی تصورات کی پابند رہے گی، جہاد اسلامی کے مقدس نام سے موسوم ہوگی، اور جب اُن سے الگ ہوگی، وہ جہاد نہیں، بلکہ فساد فی الارض یا قتال فی سبیل الطاغوت کے نام سے موسوم ہوگی،

ان تصریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ اشتراکیت اور اسلام مین کوئی نسبت نہین، جو لوگ اس غلط فہمی مین مبتلا ہین، کہ سوشلزم اسلام سے مناسبت رکھتا ہے، وہ ایک بڑی سخت غلطی مین مبتلا ہین درحقیقت موجودہ جاہلی نظامات مین سب سے زیادہ مکروہ اور خطرناک نظام اشتراکیت ہے،

اشتراکیت کی حدِ رسائی اشتراکیت کا مطمحِ نظر انسانون کی معاشی الجھنون کو حل کرنا اور ایک ایسی پر سکون اور آزاد فضا تیار کرنا ہے جس مین کوئی انسان اقتصادی و معاشی اعتبار سے کمزور اور پس ماندہ نہ رہنے پائے، اور کوئی ایک طبقہ ملک کے وسائل معیشت پر تنہا تسلط نہ رکھ سکے، اور ملک کے ذرائع آمدنی سے ملک کا ہر باشندہ مساوی طور پر فائدہ اٹھا سکے، اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی پیداوار اور تمام کارگن تو مین سٹیٹ کی ملکیت قرار دی گئین،

اشتراکیین جن تصورات پر جدید انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتے ہین، وہ محض منفی ہین یعنی عدم ملوکیت عدم ملکیتِ ذاتی، عدم تشخص ذاتی، عدم تصرف ذاتی، خدا اور مذہب کی نفی، اخلاق و روحانیت کی نفی بلکہ آگے

چل کر ہر قسم کی حکومت کی نفی، غرض اس نظام کی تمام دفعات نفی سے شروع ہو کر نفی ہی پر ختم ہوتی ہیں

ع لا سلاطین، لا کلیسا، لا الہٰ،

حالانکہ حیاتِ انسانی بذاتِ خود مثبت چیز ہے اور اس مثبت کے لیے جو نظام مرتب کیا گیا ہے، وہ تمام تر منفیات کا مجموعہ ہے، انسانی زندگی جب خود مثبت ہے تو اوس کی فلاح و ترقی کسی مثبت نظام ہی سے ہو سکتی ہے،

لا و الّا احتساب کائنات ، لا و الّا فتح باب کائنات ،

لا و الّا ساز و برگ امتان ، نفی بے اثبات مرگ امتان (اقبال)

اس سے قطع نظر انسان صرف جسم کا نام نہیں؛ بلکہ اس کی ترکیب میں ایک دوسرا جوہر بھی شامل ہے، جو جسم پر حکومت کرتا ہے، اور جسم کی حس و حرکت کا سرچشمہ ہے، حیاتِ انسانی کے ان دونوں اجزا میں جس طرح کا ناقابلِ انفکاک ربط پایا جاتا ہے، اس کے فلاح کے لئے ایک ایسے نظامِ حیات کی ضرورت ہے، جو اپنی ترکیبی نوعیت کے اعتبار سے حیاتِ انسانی کے اجزائے ترکیبی سے مناسبتِ تامہ رکھتا ہو، اور اس کے اجزا میں بھی اس قسم کا گہرا ربط موجود ہو،

اس لحاظ سے اگر اشتراکی نظام کا تجزیہ کیا جائے، تو اس کا کوئی جزو بھی ایسا نہیں، جو ابعادِ جسم سے اتر کر روحِ انسانی کے مقتضیات کی بھی تکمیل کرتا ہو، اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات تو اس کے پاس تک نہیں پھٹکنے پاتے، اور وہ خدا و مذہب سے پیچھا چھڑانے ہی میں انسان کی نجات تصور کرتا ہے، صرف جسم کی راحت و آسایش اس کا مطمحِ نظر ہے، اور اوس نے حیاتِ انسانی کی وسیع ضرورتوں کو سمیٹ کر ایک ادنیٰ درجہ کی ضرورتِ انسانی کے تابع بنا دیا ہے، گویا انسانی زندگی کا منتہائے کمال یہی ہے کہ اس کے پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن کی کوئی کمی نہ رہ جائے،

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ حقیقی امن و راحت کا تعلق مادی خزائن کی کثرت اور وسائلِ معیشت کی بہتات

سے اتنا نہیں جتنا کہ انسان کے قلب نظر سے ہے، اور جسمانی راحت، دل اور روح کی طمانیت و تسکین کے لئے کافی نہین، بلکہ اس کے لئے کسی اور ہی غذا کی ضرورت ہے، اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آیۃ)

حقیقت یہ ہے کہ جب تک حیاتِ انسانی کے تمام اجزا رین ربط و تسلسل کو قائم نہ رکھا جائے، اور اس کے ہر جزو کو اس کے اصل مقام پر نہ رکھا جائے، اس وقت تک زندگی کے مسائل کسی شکل مین حل نہ ہونگے فسادِ انسانیت کا اصل سبب یہ ہے کہ زندگی کے کسی ایک جزو کو اس قدر اہمیت دیجاتی ہے، کہ دوسرے اجزار کسی ایک جز مین سمٹ کر رہ جاتے ہین یا اُن کو کسی ایک جزو کے تابع بنا دیا جاتا ہے، اور ان کی مستقل حیثیت باقی نہین رہتی نظامِ اشتراکیت مین اقتصادی مسئلہ کو اس قدر اہمیت دیگئی ہے کہ زندگی کے تمام مسائل یا تو سرے سے ختم ہوکر رہ گئے ہین، یا اس کے لئے تابع مہمل کی حیثیت رکھتے ہین،

اسلام کی خصوصیت یہ ہو کہ اس مین تمام حیاتیاتی ضرورتون کی علیٰ قدرِ مراتب رعایت کی گئی ہے اور حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہین جو اسلام کی نظر التفات سے محروم رہ گیا ہو، اور ہر شعبہ کو اسی مقام مقام پر رکھا گیا ہے جس کا وہ مستحق ہے، (باقی)

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی، جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچون کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،

قیمت ۶ر، ضخامت :- ۲۰۰ صفحے،

"منیجر"

کتب خانہ ٹونک کے بعض مخطوطات

از

جناب مولوی ابو الطیب عبد الرشید صاحب لاہور

راقم سطور کو اپنے زمانہ قیام ٹونک مین پہلی بار اس کے کتب خانہ کے دیکھنے اور وہان کی نادر قلمی کتابون کے مطالعہ کا موقع ملا، دوران مطالعہ مین جو قابل ذکر قلمی کتابین نظر سے گذرتی تھین اُن کے متعلق اس خیال سے مختصر کیفیت بطور یادداشت لکھ لیا کرتا تھا، کہ آیندہ کسی وقت اس امر کو مرتب کرکے پیش کیا جائے گا، اسی خیال کے ماتحت آج تقریبًا ۸ سال کے بعد اُس یادداشت کو مضمون کی شکل مین پیش کیا جارہا ہے، جو انشاء اللہ تعالیٰ اہل علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا، اور بعض قلمی کتابون کے متعلق مفید معلومات حاصل ہون گے،

کتابون کے تذکرہ سے پہلے کتب خانہ کی تاریخ کے متعلق حضرت الاستاذ العلام ابو عبد اللہ محمد التسوتی (م ۱۹۴۸ء) اور ٹونک کے دیگر اہل علم حضرات سے کتب خانہ کے متعلق مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، اس کو لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے کتب خانہ کی تاریخ بھی سامنے آجائے گی،

یہ کتب خانہ اپنی قدامت اور نوادر کتب کے ذخیرہ کے لحاظ سے شمالی ہند مثلاً لکھنؤ، رامپور، اور پٹنہ کے شرقی کتب خانون سے کسی طرح کم نہین ہے لیکن ریاست کی بے اعتنائی کے باعث اب تک گوشۂ گمنامی مین پڑا ہوا ہے، اس لئے اکثر اہل علم حضرات کتب خانہ ٹونک اور اس کی بیش بہا علمی نوادرات سے قطعًا ناواقف ہین،

اس کتب خانہ کو سب سے پہلے نواب محمد علی خان بہادر نے اپنے زمانہ نظر بندی مین بنارس مین فراہم کرنا شروع کیا تھا، اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے عبدالرحیم خان صاحب جو بڑے ذی علم اور متقی تھے، کتب خانہ کو بنارس سے منتقل کر کے ٹونک لے آئے اور اپنی حویلی مین رکھا، صاحب زادہ مرحوم نے دیوان شمس الدین (قافلہ) کا کتب خانہ خرید کر اُسے بھی اس کتب خانہ مین شامل کیا، جب تک صاحبزادہ صاحب زندہ رہے، کتب خانہ مین کتابون کا اضافہ فرماتے رہے، اُن کے انتقال کے بعد کتب خانہ ان کے چھوٹے صاحبزادہ عبدالمنعم خان صاحب کے قبضہ مین آیا، وہ بھی اپنے پیش رو بزرگون کی طرح کتب خانہ کی ترقی مین کوشان رہے اُن کے انتقال کے بعد خاندان مین کوئی ایسا علم دوست نہین رہا، جو بزرگون کی اس علمی وراثت کی حفاظت اور نگرانی کرتا، اس لئے ریاست نے اوس کو اپنی نگرانی مین لے لیا اور موجودہ فرمانروائے ٹونک ہز ہائنس سعید الدولہ نواب سر سعادت علی خان بہادر بالقابہ کے عہد مین کتب خانہ صاحب زادہ عبدالرحیم خان بہادر کی حویلی سے منتقل ہو کر ایک عالی شان سرکاری عمارت مین آگیا ہے،

کتب خانہ کی موجودہ حالت نہایت خراب ہے، فہرستین نامکمل اور ناقص ہین، مخطوطات کی علیحدہ کوئی فہرست نہین، مطبوعات اور مخطوطات کے لئے ایک ہی فہرست ہے، مخطوطات پر کوئی تشریحی نوٹ بھی نہین، چنانچہ راقم سطور کو ٹونک لائبریری کی فہرست سے قطعاً کوئی مدد نہین ملی، اور خود ہر کتاب کے متعلق تحقیق کرنی پڑی ہے، اس لئے ریاست کو کتب خانہ کی جانب توجہ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے اس کی ادنی توجہ سے یہ کتبخانہ بھی شمالی ہند کے مشرقی کتب خانون کی طرح شہرت و اہمیت حاصل کر سکتا ہے،

علوم قرآنی | (۱) **تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر**، یہ ابو الفرج عبدالرحمن بن ابی الحسن علی بن محمد بن علی القرشی التیمی البکری البغدادی، الفقیہ الحنبلی الواعظ الملقب بہ جمال الدین الحافظ (م ۵۹۷ھ)

کی تصنیف ہے، کتب خانہ مین اس کا قلمی نسخہ بخط نستعلیق خوشخط موجود ہے، جو سورۂ صافات سے آخر قرآن تک ہے، کتاب کا طرز بیان نہایت صاف اور سادہ ہے جس کو معمولی استعداد کا عربی طالب علم بھی بلا تکلف سمجھ سکتا ہے،

(۲) تیسیر البیان لاحکام القرآن" یہ علامہ جمال الدین محمد بن علی بن عبد اللہ المعروف بابن نور الدین الیمنی کی تصنیف ہے، ابتدا مین یہ عبارت ہے، :-

"الحمد للہ الذی خلق الانسان وعلمہ القرآن" الخ

مصنف نے اس مین صرف اُن آیات کی تفسیر کی ہے جو احکام سے متعلق ہین، ۱۰۳۰ھ مین اس کی تصنیف سے فراغت ہوئی، کتاب پر سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہین ہے لیکن نسخہ قدیم الخط اور صاف لکھا ہوا ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ مین بھی ہے، جو ۱۱۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا نسخہ کتاب خانہ رامپور مین ۱۱۰۷ھ کا نوشتہ محفوظ ہے،

(۳) "کثیر الفوائد فی تصریح وتوضیح امثال القرآن"

موضوع کتاب کتاب کے نام سے ظاہر ہے، امثال القرآن کے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے، چھوٹی تقطیع کے ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، سنہ تصنیف مین نسخہ کے آخر مین یہ عبارت ہے، :-

"وکان الفراغ من تسوید ھذہ النسخۃ الشریفۃ فی یوم الجمعۃ شہر رمضان المبارک سنہ ۱۲۷۰ھ"

(۴) "اسئلۃ القرآن"

یہ کتاب محمد بن ابی بکر عبد القادر الرازی المتوفی ۶۶۶ھ کی تصنیف ہے، جن کی عربی لغت مین "مختار الصحاح" مشہور اور متداول کتاب ہے، یہ نسخہ مختلف رنگ کے نفیس گل بہار کاغذ پر بخط نستعلیق لکھا ہوا ہے، تقطیع متوسط، ضخیم، ابتدا اس طرح ہے، قال الفقیر الی رحمۃ ربہ ومغفرتہ الخ

یہ کتاب اعراب القرآن للعکبری مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر طبع ہو چکی ہے،

۵- تفسیر ایجاز البیان لمعانی القرآن یہ نجم الدین ابو القاسم محمود بن ابی الحسن النیشاپوری القزوینی کی تصنیف ہے، کتاب کا سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا، مصنف نے یہ کتاب شہر خجند میں تصنیف فرمائی ہے، اس کا نسخہ اکثر جگہ سے کرم خوردہ ہے، کتابت قدیم طرز کی اور چھوٹی تقطیع کے ... صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے: الحمد للّٰہ برحمتہ وانزل الخ

۶- غریبُ القرآنُ المُسمّی بنزھۃ الخاطر وسرور النّاظر لِلْعالم اللغوی فخرالدین محمد بن علی النجفی الطریحی،

یہ نسخہ بھی قدیم الخط ہے، مگر نہایت اچھی حالت میں ہے، سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے، یہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، بلکہ امام ابی بکر محمد بن عزیز سجستانی (م ۳۳۰ھ) کی کتاب "غریب القرآن" کو جدید ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے، مقدمہ میں مؤلف اس کی اس طرح تصریح کرتا ہے:

"انّی عثرت بکتاب غریب القرآن المسمّی بنزھۃ القلوب وفرحۃ المکروب تالیف ابی بکر محمد بن عزیز السجستانی وتاملتہ واذا ھو کتاب فائق رائق عجیب غریب الا المطلوب فیہ یعسر تناولہ للقصور فی ترتیبہ والخلل فی تبویبہ فاستخرت اللّٰہ تعالیٰ علیٰ تغییر ذالک الترتیب علیٰ وجہ لہ رضی فشرعت فیہ ورتبتہ علیٰ ابواب الحروف الھجائیۃ، الخ،

۷- تفسیر القرآن للشیخ الاجل الشاہ اھل اللّٰہ بن الشیخ عبدُ الرّحیم الدِّہلوی، یہ عربی میں قدیم مفسرین کے طرز کی تفسیر ہے، عبارت نہایت پاکیزہ شستہ اور صاف ہے، شاہ صاحب نے اس میں اہل تصوف کے مذاق کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے

بیٹھی عمر حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تفسیر مظہری سے بہت کچھ ملتی جلتی ہو، صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، اس مین اختصار ہے، اور قاضی صاحب کی تفسیر مین تفصیل ہے،

راقم سطور نے شاہ اہل اللہ صاحبؒ کے مفصل حالات معلوم کرنے کے لئے مختلف عربی فارسی تذکرون کی ورق گردانی کی، اور خط و کتابت کے ذریعہ اہلِ علم حضرات سے دریافت بھی کیا، مگر کہین سے کامیابی نہو سکی، اور نہ آپ کی تصنیفات کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا،

صرف الیانع الجنی" کے مطالعہ سے اتنا پتہ چل سکا، کہ آپ شاہ ولی اللہؒ کے بھائی ہین، اور احادیث ہدایہ کی تخریج پر آپ کی ایک تصنیف ہو،

اس سے زیادہ حالات شاید الیانع الجنی" کے مؤلف کو بھی نہین معلوم ہو سکے، یانع کے الفاظ یہ ہین:

وکان لولی اللہ اخ یُسمّٰی الشیخ اھل اللہ کَانَ مِنْ اھل اللہ واھل العلم بہ لم یبلغنی مِنْ خبرہٖ فوق انّ لہ کتاباً لطیفاً فی تخریج احادیث الھدایۃ رائیت لہ الابواب الاربعۃ مختصرٌ فیہِ کلمات جامعۃ یکثر نفعھا رحمہ اللہ تعالیٰ الخ"

کتاب کے آخر مین یہ عبارت ہے :-

سُبحانَ ربّک ربِّ العزّۃِ عمّا یصفون وسلامٌ علی المُرسلین والحمدُ للہ ربِّ العالمین اوّلاً واٰخراً الّذی ھدٰنا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدٰنا اللہ وانا الفقیر المفتقر الی اللہ الکریم اھل اللہ بن عبد الرحیم احسن اللہ الیہ والی والدیہ بفضلہ العمیم والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ"

فقہ اور اصولِ فقہ مین بھی آپ کی عربی مین دو معرکۃ الآراء تصنیف ہین، مختصر الہدایہ اور

رسالۂ اصولِ فقہ" پہلی کتاب فقہ حنفی کی مشہور متداول کتاب ہدایہ کا خلاصہ ہے، یہ خلاصہ اس قابلیت کے ساتھ کیا گیا ہے، کہ کتاب کا اصل مضمون نہین چھوٹا ہے، لیکن لاحاصل تطویلات اور فقیہانہ مناقشات کو یکسر قلم انداز کردیا ہے حتی کہ صاحبین اور طرفین کے اختلافی مسائل تک نظر انداز فرما دیئے ہین، حضرت امام ابو حنیفہؒ کے فقہی مسلک کو پیش کیا ہے اور اس کے ذیل مین ہر مسئلہ کی تائید و توثیق مین صحاح اور دوسری مستند کتب احادیث سے حدیثین نقل کی ہین،

غالبًا اسی کتاب کے متعلق مؤلف یانع کو تخریج ہدایہ کا شبہ ہو گیا ہے، راقم کے پاس یہ دونون کتابین صحیح و سالم قلمی موجود ہین، "مختصر الہدایہ" کا نسخہ حضرت مولانا عبد القیوم م ۱۲۹۹ھ بن الشیخ عبد الحی البڈھانوی خلیفہ سید نا سید احمد شہید کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی رئیس بھیکم پور (ادام اللہ فیوضہ العلیہ) کے کتب خانہ مین میری نظر سے گذرا ہے، اس کا ایک ناقص نسخہ مکتوبہ ۹۵۹ھ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد مین فنِ فقہ کے تحت نمبر ۸۱۲ پر موجود ہے، جو کتاب النکاح سے کتاب المزارعۃ تک ہے، ایک محترم دوست سے معلوم ہوا ہے، کہ مختصر الہدایہ کا ایک قلمی نسخہ علامہ ادیب عبد العزیز الاثری المینی صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ابقاہ اللہ تعالیٰ راعیًا للعلم والادب کے پاس بھی ہی،

رسالہ اصول فقہ یہ رسالہ باوجود صغیر الحجم ہونے کے اصول فقہ کا نہایت جامع رسالہ ہے، اور اصول شاشی اور حسامی کی طرح عبارت مین اس قدر ایجاز و اختصار سے کام نہین لیا گیا ہی جس سے کتاب کا مطلب سمجھنا طلبہ پر دشوار ہو جائے، یہ رسالہ عبارت اور طرز بیان کے اعتبار سے متداول اصولی رسالون سے بدرجہا بہتر معلوم ہوتا ہے، اوّل یہ:-

الحمد للہ رب العالمین والصلوات والسلام علی سید المرسلین

محمد وآلہ واصحابہ اجمعین امّا بعد فیقول الفقیر المفتقر الی

رحمۃ اللہ الکریم محمد اھل اللہ بن الشیخ عبد الرحیم غفر اللہ لہ

ولوالدیہ واحسن الیھما والیہ ھذہ امما یجب استحضارہ فی علم

اصول الفقہ الخ

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین محدث بریلی م ۸ رصفر ۱۳۶۳ھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مرحوم نے اس رسالہ کو بنگلور (مدراس) کے زمانۂ قیام میں کسی قلمی نسخہ سے نقل فرمایا تھا، کہیں کہیں معمولی سی بیاض چھوٹی ہوئی ہے، قابل طبع رسالہ ہے،

۸- **المقدمہ فی اصول الترجمہ**، یہ رسالہ بزبان فارسی حکیم الامت سیدنا الشیخ ولی اللہ ابن عبد الرحیمؒ کی تصنیف ہے، گو یہ ۱۲-۱۳ صفحے کا مختصر رسالہ ہے، مگر مضمون کی ندرت اور خصوصیات کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، ترجمۂ قرآن کے فن پر اپنے طرز کا یہ پہلا رسالہ ہے، فن ترجمہ قرآن کی جن خصوصیات کا اس رسالہ میں ذکر کیا گیا ہے، ان کا اپنے ترجمۂ قرآن (فتح الرحمٰن) میں التزام رکھا ہے، یہ رسالہ شاہ صاحب کے ترجمۂ قرآن کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے، جو رسالہ فتح الرحمٰن کے بعض مطبوعہ نسخوں کی ابتدار میں چھپا ہوا ہے، وہ زیر نظر رسالہ کے علاوہ ہے، یہ نسخہ ۲ رجمادی الثانی ۱۲۲۷ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام محمد علی الحسینی السقطی ہے، اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ مولانا سید نور الحق علوی استاذ اورنٹیل کالج لاہور کے یہاں بھی ہے، ان دونوں نسخوں میں کہیں کہیں الفاظ میں زیادتی وکمی کا معمولی سا فرق ہے،

اکتوبر ۱۹۶۲ء کے "برہان" دہلی میں اسی "مقدمہ" کو مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، برہان کا یہ شائع کردہ رسالہ راقم سطور کے ٹونک لائبریری کے نسخہ سے نقل کیا ہوا ہے،

اس نسخہ کے طبع کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس کے دوسرے نسخوں کو تلاش کرکے اُن سے تصحیح ومقابلہ کے بعد شائع کیا جاتا، راقم سطور نے مختلف نسخوں کی مدد سے اس کی تصحیح کرلی ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب اسے شائع کیا جائے گا،

۹- طیبی شرح مشکوٰۃ المصابیح، یہ علامہ حسین بن عبد اللہ بن محمد الطیبی م ۷۴۳ھ کی نہایت معتبر تصنیف اور مشکوٰۃ کی شروح میں سب سے پہلی شرح ہے، یہ نسخہ جا بجا سے ناقص ہے، مگر کتابت نہایت اعلیٰ ہے،

اولہ:- الحمد للہ الذی ھو العزیز الحکیم وھو الرحمٰن الرحیم الخ

اصول حدیث میں بھی آپ نے ایک تصنیف کی ہے، ٹونک میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، طیبی کے ساتھ اگر اس کتاب کو بھی مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مدظلہ طبع کرا دیں تو بہتر ہو،

(۱۰) ضوء المشکوٰۃ حاشیہ مشکوٰۃ یہ ہندوستان کے جلیل القدر ادیب شاعر علامہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی تصنیف ہے، کتاب کا آخری باب "باب ما علی الولاۃ فی التبنیہ" ہے، خطبہ کے بعد لکھتے ہیں،

"وبعد فیقول الفیض السہارنفوری وقد صین من کل شر وعین انی لما انفضت یدی من تعلیقات الجلالین ثنیت عنانی الی حل المشکوٰۃ غیر مکترث بزین ولا شین ولا میال بما یصیب کل ھین ولین مما یقال فیمن ضل وزل ولم یفرق بین العین والغین فشرعتہ متقحاً للاسماء والانساب ومصرحاً المناسبۃ ما فی الباب بالباب وکاشفاً فیہ عما یستعملہ العرب وباحثاً عما یلیق لفنون الادب وموفقا بین المتنافیین ورافعاً للتنافی الظاھر البین علی قدر علمی وفہمی للہ ودی ان اصاب سہمی ولم اقتف الشراح ولم ابحث عن المسائل فان الفقہ کافل لہما ونعم الکافل وسمیتہ بضوء المشکوٰۃ وعسی ان یکون ان تلقی بالقبول واللہ المستعان علی

ما اقول وھو نعم المسئول ھذا والدعاء وجود الخطاء معفو،

(۱۱) حاشیہ مشکوٰۃ (عربی) مصنف کا نام عطاء اللہ بن فضل شیرازی نیشاپوری المعروف بجمال حسنی ہے، طبقات شاہجہانی میں لکھا ہو کہ میر جمال الدین عطاء اللہ نے ہرات میں وفات پائی، صاحب کشف الظنون نے اُن کی وفات سنہ ۱۰۰۰ھ میں لکھی ہے،

یہ نسخہ بخط عربی خوشخط ہے، اوّل ص مطلا ہے اور جدول آسمانی ہے، کتاب کے آخر کی اس عبارت یوں

تمت الحاشیۃ بحمد اللہ وعونہ وحسن توفیقہ فی سنۃ الف وثمانین

زائداً علیہ التسع من الہجرۃ النبویۃ علیہ الصلوٰۃ وعلی آلہ

واصحابہ وازواجہ اجمعین،

"شرعت ھذہ الحاشیۃ فی بلدۃ لاہور حفظہا اللہ من الآفات

فی عہد ابی المظفر محی الدین اورنگزیب والسنۃ من جلوس تسع عشر

سو بظاہر دھوکا ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں مصنف کا انتقال ہوا ہے، تو ایسی حالت میں ۱۰۸۹ھ سنہ تصنیف کس طرح ہو سکتا ہے لیکن درحقیقت یہ سنہ کتابت ہے سنہ تصنیف نہیں،

کتاب کے سرورق پر ہے "وھی خلاصۃ الطیبی"

(۱۲) لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح للشیخ عبد الحق حنفی المحدث الدھلوی (م ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) یہ نسخہ قدیم الخط دو ضخیم جلدوں میں ہے، کاغذ کلر نرسفید ہے پہلی جلد نہایت خوشخط خفیف سی کرم خوردہ، جلد دوم بادامی مجدول شنجرفی وسیاہی پہلے ورق کے ص پر یہ عبارت ہے :-

"حاجی عبد اللہ خلیفہ شیخ عبد الرزاق بن شیخ امام الدین قادری اور یہ مہر ثبت ہے، [شیخ عبد القادر]

(۱۳) جواہر الاصول فی حدیث الرسول، یہ ابو الفیض محمد بن محمد علی الفاسی کی

ملہ اس کا ایک قلمی نسخہ سہارنپور میں ایک محترم دوست کے یہاں میری نظر سے گذرا ہے، جو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نسخہ سے منقول ہے،

تصنیف ہے اوّلہ:-

الحمد لمن اصح حدیث کلام القدیم والصلوٰۃ والسلام علی من احسن کلام حدیثہ القدیم وعلی آلہ وصحابہ سراۃ ھداۃ الصراط المستقیم

آخر کی عبارت ہے:-

استراح بنان الکاتب من تحریرھا وتسطیرھا فی ضحوۃ الخمیس الذی کان السابع والعشر من ذی القعدۃ وقد مضی من الھجرۃ المصطفویۃ علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام

۱۴- لُباب الاصول فی اصول الحدیث، یہ عربی میں اصول حدیث میں مختصر رسالہ ہے، مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا،

۱۵- مدارج الاخبار ومعارج الآثار من مشارق الانوار، ہندوستان میں فن حدیث پر دو کتابیں لکھی گئی ہیں، مشارق الانوار اور کنز العمال، ان دونوں میں اولیت کا فخر مشارق الانوار کو حاصل ہے، اس کتاب میں اول الذکر کتاب کو فقہی تبویب پر مرتب کیا گیا ہے، یہ نسخہ نہایت قدیم الخط ہے، فن حدیث کے تحت نمبر ۱۱۹ پر محفوظ ہے،

۱۶- شمائل ترمذی بحواشی علامہ ابن حجر عسقلانی ومیرک شاہ وغیرہ یہ نسخہ بتقطیع متوسط ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے، سنہ کتابت کی عبارت حسب ذیل ہے،

قد فرغ من تحریر ھذہ النسخۃ الشریفۃ المبارکۃ المسماۃ لشمائل النبویہ المصطفویۃ الفقیر الی اللہ الصمد محمد بن سید پیر محمد فی تاسع عشر من ربیع الاوّل سنۃ الف ومائۃ وتسعۃ من الھجرۃ

اس کے علاوہ شمائل کے اردو قلمی نسخے بھی کتب خانہ میں ہیں جو ۱۰۹۱ھ و ۹۰۹ھ کے نوشتہ ہیں،

(۱۷) اشرف الوسائل فی شرح الشمائل (عربی) مصنف کا نام احمد بن علی الہیثمی الانصاری مصری (المولود ۹۰۹ھ المتوفی ۹۷۳ھ) ہے قاضی زکریا کے شاگرد ہیں، مکہ معظمہ میں ۹۷۳ھ کے بعد انتقال فرمایا، حجر ان کے اجداد میں کسی کا نام یا لقب تھا، اسی نسبت سے ابن حجر کی مشہور ہوئے نسخہ بخط نسخ خوشخط لیکن خفیف کرم خوردہ ہے،

اولہ:- الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وبعد فهذه عجالۃ علقتہا علی مشکل شمائل الامام الحافظ ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ (بفتح المهملۃ فسکون)

مقدمہ میں ہے:-

"لما قرئ علی فی رمضان سنۃ تسع واربعین وتسعمائۃ (۹۴۹) بالمسجد الحرام المکی ح وسمیتها اشرف الوسائل الی فهم الشمائل واسئال اللہ قبولها (آمین)

(۱۸) شرح شمائل، یہ شرح شیخ عبد الرؤف المناوی (م ۱۰۳۲ھ) کی تصنیف، ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ نسخہ ۱۰۳۳ھ کا مکتوبہ ہے، آخر میں یہ عبارت ہے،

تم الشرح المبارک بعد العصر من یوم السبت السادس عشر من شهر رمضان المعظم سنۃ ۱۰۳۲ھ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم علی ید الفقیر محمد بن احمد المطری،

کتاب کے سرورق پر ہے:- هذا الشرح للشیخ عبد الرؤف المناوی المتوفی سنۃ ۱۰۳۲ھ

یہ شرح مولانا عصام الدین الاسفرائنی اور علامہ ابن حجر الہیثمی کی کی شرحون کے بعد شمائل کی تیسری شرح ہے جس مین پہلی دو شرحون کی تہذیب و تنقیح کی گئی ہے، مقدمہ مین لکھتے ہین،

ان ومن تصدی لشرحھا احد المدققین مولانا عصام الدین الاسفرائینی فاتی بما لم یسبق الیہ من کشف النقاب عن اسرارھا الکنۃ من الاحتمالات العقلیۃ فی ھذا الفن الذی ھو من الفنون النقلیۃ مع ما ھو علیہ من الاقتصار حتی علی ذالک من سقطات الاوھام وتلاہ العالم النحریر الشھیر بابن حجر الھیثمی نزیل المکۃ المکرمۃ فاطال واطاب الخ،

(۱۹) شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد الاسفرائینی (م ۹۴۳ھ) کی شرح شمائل کا بھی قلمی نسخہ کتب خانہ مین محفوظ ہے،

(۲۰) الخیر الکثیر اور التفہیمات یہ دونون رسالے ایک مجموعہ مین نہایت پاکیزہ خط مین لکھے ہوئے ہین، مجلس علمی ڈابھیل سورت سے یہ دونون رسالے چھپ کر شائع ہو چکے ہین، حضرت شاہ صاحب کے پہلے مسودہ سے منقول ہونے کے باعث ان کی قدر و قیمت باوجود چھپ جانے کے بہت زیادہ ہے، یہ دونون نسخے ٹونک لائبریری کے گوہر نایاب کہلانے کے مستحق ہین،

مجموعہ کے سرورق پر یہ عبارت ہے،

"تفہیمات حضرت قدوۃ العلماء مولوی شاہ ولی اللہ صاحب منقول از مسودہ اول قلمی خط فارسی کاغذ سفید، در کتب خانہ یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خان بہادر دام اقبالہ والی ٹونک ۱۲۹۰ھ داخل گردید"

اس عبارت کے ذیل میں جو مہرین ثبت ہین، ایک مہر محمد علی خان بہادر کی اس طرح بیج مین ہے

نگہبان دین محمد علی

دوسری مہر وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خان نصرت جنگ کی ہے، اسی مجموعہ میں سات صفحون کا ایک رسالہ مصطلحات الحدیث کا بھی ہے اس پر بھی نواب محمد علی خان کی مہر ہے،

(۲۱) مجموعہ رسائل حجۃ الاسلام سیدنا اسمعیل شہیدؒ، اس مجموعہ میں ایک رسالہ ہے جس میں حضرت شہید نے ہم عصر علمائے شاہجہان آباد (آگرہ) کے فتاوائی پر تنقید فرمائی ہے، مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"پس ازین اجوبہ مفصلہ بعض سوالات است کہ علمائے شاہجہان آباد در اجوبہ آنہا اجمالے مخل بکار بردہ اند و بدین سبب بعض عوام در اوہام باطلہ افتادہ اند ابتغائر لرضوان اللہ برائے دفع شبہ عوام تفصیل پرداختم، دھو حسبی و نعم الوکیل ونعم المولی ونعم النصیر"

دوسرا رسالہ "علم عقائد" مین ہے، اس رسالہ کا آغاز یہ ہے :-

"من العبد الذلیل الراجی لرحمۃ اللہ الجلیل محمد اسماعیل تجاوز عنہ مساویہ" (تاقلی ورکشن؟)

تیسرا رسالہ "اصول حدیث" پر ہے، جس مین احادیث کے اخذ و استنادے سلسلہ مین ائمہ اربعہ کا نقطۂ نظر اور محور فکر واضح فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے ائمہ اربعہ کی فقہ مین جو اختلاف بادی النظر مین نظر آتا ہے، اس کی حقیقی علت سمجھ مین آجاتی ہے، اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد درس حدیث مین کسی مذہب کے پیرو کو اپنے مسلک کی تائید اور تقویت کے لئے متعارض احادیث مین دور از کار تاویلات کرنے کی قطعاً گنجایش باقی نہین رہتی، اس رسالہ سے موجودہ جماعتی نقطۂ نظر کے طریقۂ تعلیم حدیث مین اصلاح ہوسکتی ہے، قابلِ طبع رسالہ ہے،

استفسار و جواب

شاہ نعمت اللہ ولی اور ان کا قصیدۂ پیشینگوئی

(۱)

محمد عاصم صاحب انسپکٹر آبکاری ڈابرا ینڈ کو، شدری والی گنج لکھنؤ "شاہ نعمت اللہ ولی کے مختصر حالات، مثلاً ولادت، وفات، سکونت، خاندان، سلسلۂ طریقت وغیرہ کے بارہ میں معلومات درکار ہین، نیز ان کا مفصل حال کس کتاب مین مل سکتا ہے، شاہ صاحب کا یہ قصیدہ کہان دیکھنے مین آسکتا ہے، اور اس کا صحیح نسخہ کہان ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی اشاعت اب بھی ممنوع ہے؟"

(۲)

جناب رشید احمد صاحب منیمی تسنیم محل راچی شاہ نعمت اللہ ولی کا قصیدہ پیشین گوئی شکست ہندوستان کے عنوان سے روزنامہ قندیل کراچی مین شائع ہوا ہے، اس کا تراشہ روانہ ہے، کیا یہ انہی کا قصیدہ ہے؟ اس کی تحقیق مطلوب ہے،

(۱)

معارف:- شاہ نعمت اللہ ولی کے اس قصیدہ کے متعلق اور دوسرے کئی مقامون سے بھی استفسارات آئے ہین، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان دنون مسلمانون مین ایسی پیشین گوئیون سے سہارا پکڑنے کا میلان بڑھتا جاتا ہے، یہان تک کہ فرضی قصیدے بھی ان کی طرف منسوب کر کے چھاپے جا رہے ہین

بہر حال آپکے سوالوں کا جواب درج ذیل ہے :-

(۱) "نعمت اللہ ولی" کے نام و تخلص سے ایک سے زیادہ اہلِ دل شعرا شہرت رکھتے ہیں، ان میں سے صاحبِ قصیدہ پیشین گوئی نور الدین سید شاہ نعمت اللہ ولی ہیں، ان کا دیوان برٹش میوزیم، بانکی پور اور ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانوں میں موجود ہے، اور ۱۲۷۶ھ میں طہران سے چھپ بھی چکا ہے،

شاہ نعمت اللہؒ کے سوانح عام فارسی تذکروں خصوصاً مجمع الفصحاء، مراۃ الاسرار، ریاض الشعرا، تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیا، تذکرۃ الکرام اور عام تاریخوں میں سے فرشتہ و حبیب السیر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، ان میں اختلافات بھی ہیں، جو نسب نامہ سے سنہ وفات تک کے پورے دور میں موجود ہیں، زیادہ مستند معلومات وہ ہیں، جن کو اُن کے کسی شاگرد نے دیوان میں دیباچہ کے طور پر لکھا ہے، اور مناقب حضرت شاہ نعمت اللہ ولی" کے نام سے عبد العزیز بن شیر ملک ابن محمد واعظی نے ایک مختصر رسالہ بھی لکھا ہے، جو علاء الدین احمد شاہ بہمنی (۸۳۸ھ - ۸۶۲ھ) کے نام سے معنون ہے یعنی یہ رسالہ شاہ صاحب کی وفات کے چند ہی سال کے بعد لکھا گیا ہے، اس کا متن برٹش میوزیم کے ایک مجموعہ نمبر ۱۶۸۳۷ میں موجود ہے اور ان مآخذ سے برٹش میوزیم کی فارسی مخطوطات کے مرتب ریو نے بہت مختصر حالات اجمال و اختصار سے قلمبند کئے ہیں، اور اردو میں جناب ام اے حفیظ نے اُن کے سوانح و کلام پر ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جس میں اس قصیدۂ پیشینگوئی کے اشعار بھی شائع کئے ہیں، یہ رسالہ "شاہ نعمت اللہ ولی" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے، اور راج نرائن سنگھ درگاہ شاہ ارزان، ڈاکخانہ مہندرو پٹنہ کے پتہ سے ۴ر میں مل سکتا ہے،

مناقب شاہ کی تصریح کے مطابق شاہ نعمت اللہ ۷۳۰ھ یا ۷۳۱ھ میں حلب میں پیدا ہوئے، عراق میں نشو و نما پائی، ۲۴ سال کی عمر میں مکہ معظمہ گئے، یہاں سات سال قیام پذیر رہے، اور شیخ عبد اللہ یافعی متوفی ۷۶۸ھ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر راہ سلوک طے کی، اور اُن کے مجاز و خلیفہ بنائے گئے، پھر

سمرقند، ہرات اور یزد میں مقیم رہے، اور ہر جگہ مریدوں کی بڑی تعداد حلقہ ارادت میں داخل ہو گئی پھر ماہان میں جو کرمان سے ۶ فرسخ پر واقع ہے مستقل سکونت اختیار کی، اور اپنی زندگی کے پچیس سال نہیں بسر کئے، اور ۲۲ رجب ۸۳۴ھ کو ایک سو میں یا چار سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے ان کی تصنیفات میں دیوان کے علاوہ تقریباً پانسو چھوٹے بڑے رسائل و مکاتیب ہیں، جو تقریباً سب کے سب مسائل تصوف پر ہیں (فہرست مخطوطات برٹش میوزیم جلد ۲ ص ۴۳۴ و دیگر کتب تذکرہ

شاہ صاحب علیہ الرحمہ صوفی تھے، اور الصوفی لا مذہب لہ کے صحیح مصداق کہے جا سکتے ہیں، انھیں اثنا عشری یا علوی کہنا حقیقت سے دور ہے وہ شیخ عبداللہ یافعی کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی وجہ سے شافعی کہے جا سکتے تھے، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ طریقت کی ارادت کے ساتھ فقہی مذاہب میں سے شیخ کے اختیار کردہ مذہب کی بھی مرید پیروی کرے، لیکن دراصل وہ اس قسم کے کسی انتساب کو قبول نہیں کرتے تھے، شاہنواز خان نے مآثر الامراء میں ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے، وہ ان کے مذہب پر صحیح روشنی ڈال سکتا ہے، کہتے ہیں :- ؎

گویند مرا چہ کیش داری　　اے بیخبران چہ کیش دارم

از شافعی و ابوحنیفہ　　آئینہ خویش پیش دارم

اینہا ہمہ تابعان جد اند　　من مذہب جد خویش دارم

یعنی وہ بجز اسلام کے کسی انتساب کو روا نہ رکھتے تھے،

شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے زہد و تقوی و کشف و کرامت کی شہرت دور دور پھیلی اور وہ مختلف سلاطین کے حلقہ میں بھی احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، ان میں سے دکن کا بہمنی حکمران احمد شاہ بھی تھا، اور اسی کے وسیلہ سے شاہ نعمت اللہ اور ان کے خاندان کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے پیدا ہوا، چنانچہ احمد شاہ بہمنی کی درخواست پر شاہ نعمت اللہ کے پوتے میر نور اللہ دکن میں آئے

احمد شاہ ان کی پیشوائی کے لئے دور تک گیا، اور جس جگہ ان دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں، وہاں ایک گاؤں "نعمت آباد" کے نام سے آباد کرایا، اور انھیں دربار میں مخدوم زادے کی حیثیت سے غیر معمولی عزت و تکریم سے جگہ دی، اور اپنی لڑکی کو ان کے حبالہ عقد میں دیدیا،

پھر شاہ نعمت اللہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ خلیل اللہ اپنے دو صاحبزادوں شاہ حبیب اللہ و شاہ محب اللہ کے ساتھ یہاں وارد ہوئے، اور ان دونوں صاحبزادوں کی شادیاں بھی دکن کے بہمنی شاہی خاندان میں ہوئیں، آگے چل کر میر نور اللہ نے سجادہ نشینی کی خدمت شاہ محب اللہ کو تفویض کردی، اور خود صاحب طبل و حشم ہو کر امیرانہ کروفر کی زندگی اختیار کرلی، پھر عہد جہانگیری میں اس خاندان کے اکابر کو مناصب حاصل ہوئے، اور یہ سرفرازیاں دور عالمگیری میں بھی قائم رہیں، شاہنواز ان کا بیان ہے کہ اس خانوادہ کی اولاد ان کے زمانہ تک دکن میں موجود ہے، (مآثر الامراء ج ۳ ص ۳۳۵ تا ۳۴۲)

شاہ نعمت اللہ کی اولاد کے چند اور سلسلے بھی ہیں، جن کا تعلق ایران سے وابستہ رہا، اور وہ ہماری گفتگو سے علیحدہ ہیں،

شاہ صاحب کے قصیدۂ پیشین گوئی قیامت کی شہرت کی خاص وجہ شاید یہ ہو کہ اس میں مہدی آخر الزمان کے ظہور کا ذکر آیا ہے، اس قصیدہ کے لکھے جانے کے چند ہی سال بعد امیر تیمور کے حملے سے ایشیا کا ایک وسیع علاقہ تھرا اٹھا، اس دور میں امام آخر الزمان کی آمد کا خاص طور پر انتظار کیا گیا، پھر ایک سے زیادہ موقع پر تاریخ کے مختلف دوروں میں لوگوں نے اس قصیدہ کو مدار بنا کر مستقبل کے متعلق خوش آیند توقعات قائم کئے، اور آخری طور پر حضرت سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کے موقع پر بھی اس سے کام لیا گیا، اور ان کی ذات گرامی کو اس قصیدہ کی پیشینگوئی کا مصداق ٹھہرایا گیا، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے،

قدرت کردگار می بینم حالت روزگار می بینم

ہندوستان مین ۱۸۵۷ئہ کی تحریک انقلاب کے بعد مسلمانون پر ابتلا، کا ایک خاص دور گذرا ہے، پھر جب انگریزی حکومت کو پورا تسلط حاصل ہوا تو مسلم عوام نے اپنے مستقبل کی امیدین پیشینگوئیون پر رکھین، اور اس سلسلہ مین اس قصیدہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، پھر اسی زمانہ مین ایک دوسرا قصیدہ شاہ نعمت اللہ کی طرف منسوب ہوکر مسلمانون مین گشت کرنے لگا جس مین انگریزی حکومت کے استیلا، اور اس کے زوال کا تذکرہ خاص طور پر تفصیل سے آیا ہے، لیکن اس قصیدہ کا انتساب شاہ صاحب کی طرف صحیح نہین یہ نہ اُن کے کسی دیوان مین ہے، اور نہ اس کا کوئی قدیم نسخہ کسی کتب خانہ مین پایا جاتا ہے، اس دوسرے قصیدہ کے کچھ اشعار ربع صدی پہلے راقم سطور کی نظر سے کسی کی بیاض مین گذرے تھے، پھر وہ اشعار کہین دیکھنے مین نہ آئے، ممکن ہے اُس زمانہ مین حکومتِ ہند نے اُس کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا ہو، ورنہ اصل قصیدہ جو شاہ نعمت اللہ ولی کا ہے، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے، اور پٹنہ سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس مین بھی موجود ہے، آپ اس کتاب کو منگا کر شاہ صاحب کے مفصل حالات اور اس قصیدہ کے اشعار کا مطالعہ کر سکتے ہین،

(۲)

شاہ نعمت اللہ ولی سے منسوب یہ قصیدہ جس کا تراشہ آپ نے روزنامہ قندیل کراچی سے لے کر بھیجا ہے، غالبًا پاکستان کی تاسیس کے بعد اسی ماحول اور تصورات مین ترتیب پایا ہے، اس کے فرضی ہونے کی بہت سی داخلی شہادتین خود اس قصیدہ کے اشعار مین موجود ہین، نہ صرف اس کا ہر شعر "ہندوستانی فارسی" زبان مین ہے، بلکہ اس مین ایسے بہت سے الفاظ موجود ہین، جو شاہ نعمت اللہ ولی علیہ الرحمہ کے زمانہ مین ان معنون مین استعمال نہین کئے جاتے تھے، یہانتک کہ بعض ملک کے جو نام اس مین آئے ہین، وہ بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے زمانہ مین پائے نہ جاتے تھے، مثلاً جاپان کا ذکر اس مین ایک سے زیادہ موقع پر آیا ہے، حالانکہ جاپان کو "جاپان" سے جو موسوم کیا گیا ہے، وہ مارکو پولو کے سفر چین

(۱۲۹۵ء) کے بعد کا واقعہ ہے، چین میں اس جزیرہ کو "چی پن کو" (Chi-pen-kue) کہتے تھے

اس سے (Chipangai) چپانگو ہوا، پھر یہی لفظ انگریزی میں (Japan) جاپان

کے تلفظ سے ادا کیا گیا، اور جینیوں نے بھی اس کے اس تلفظ کو قبول کر لیا، (جاپان از ڈیوڈ مرے) ظاہر ہے

کہ ہم ادین صدی کا یہ نومولود لفظ اس قدر جلد شہرت نہیں پا سکتا تھا، کہ شاہ نعمت اللہ ولی متوفی

۸۳۴ھ اور اُن کے زمانہ کے لوگ اس سے واقف ہوتے، اور وہ بے تکلف اپنے قصیدے میں "جنگ روس

و جاپان" یا "زلزلہ جاپان" کا ذکر کرتے، اور کہہ سکتے کہ

جاپان فتح یابد بر ملک روسیانہ (؟)

یا:- جاپان تباہ گردد یک نصف تا ثلثانہ (؟)

اس لئے حال کے اس تصنیف کئے ہوئے قصیدہ کے متعلق جو محض سیاسی پروپیگنڈے کے لئے

تیار کیا گیا ہے، یہ تصریح کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں، کہ یہ قدیم زمانہ کے کسی قلمی یا مطبوعہ اصل پر

مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ سراسر خود ساختہ اور فرضی اور جعلی ہے، "س"

وفیات

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم

افسوس ہے کہ گذشتہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے بعارضۂ فالج لندن مین انتقال کیا، مرحوم اپنے علمی کمال مین ہندوستان کے مشاہیر مین تھے، وہ تعلیم کے ماہر اور ریاضیات کے ممتاز فاضل تھے، انھون نے اپنی تعلیم کے زمانہ مین ان فنون مین ہندوستان اور یورپ کی درسگاہون مین جو امتیازات حاصل کئے، وہ اس دور مین کم ہندوستانیون کو حاصل ہوئے تھے، چندونون جامعۂ ازہر مین بھی رہے تھے، اس لئے عربی سے بھی کچھ واقف تھے، ان کی پوری زندگی علم و تعلیم کی خدمت مین گذری، اور وہ نصف صدی سے زیادہ کسی نہ کسی حثیت سے مدرسۃ العلوم اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، کئی مرتبہ وائس چانسلر ہوئے، ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے، برسون مجلس مقننہ کے ممبر رہے، مالیات مین ان کی راے اور مشورون کو خاص اہمیت حاصل تھی، اُن کو اس زمانہ کے بڑے سے بڑے اعزاز حاصل ہوئے، جن سے یونیورسٹی کو بھی فوائد پہنچے، اور اُن کے دور مین اس کو بڑی ترقی ہوئی، اُن کا آخری کارنامہ مڈیکل کالج کا قیام ہے، چند مہینے ہوے جدید تعلیمی نظام کے مطالعہ کے لئے یورپ اور امریکہ گئے تھے، کہ لندن مین پیام اجل آپہنچا،

مرحوم اس دور کی پیداوار تھے، جب مسلمانون پر مغربی تمدن مسلط تھا، اور اس کا سب سے بڑا مرکز علی گڈھ تھا، لیکن انھون نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا، اب تو ضعیفی کی عمر تھی، وہ ہر زمانہ مین نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع مین بھی مسلمان رہے، اُن کی زندگی بڑی سادہ اور

بے تکلف تھی، اُن کی سادگی مین ایک صاحبِ کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی، شخصی طور پر بھی ان سے لوگون کو بڑے فوائد حاصل ہوئے، ان کی ذات سے سینکڑون غریب طالب علمون نے تعلیم حاصل کرلی، اور انھون نے بہتون کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا، ملازمتین اور بڑے بڑے عہدے دلوائے کمزوریون سے کوئی انسان مستثنیٰ نہین، وہ سیاست مین علی گڈھ کی پرانی روایات کے حامل تھے اس لئے ایک طبقہ کو ان کے خیالات اور طریقۂ کار سے اختلاف رہا، لیکن ان کی علمی فضیلت اور ان کے خدمات سے کسی کو انکار نہین، مسلمانون مین جو صاحبِ کمال بھی اُٹھ گیا، اس کا بدل نہ پیدا ہو سکا، مرحوم کی جگہ بھی مشکل سے بھر سکیگی، اللھم اغفرلہ مغفرۃ واسعۃ،

ان کو یونیورسٹی کے انتظامی امور اور دوسری قومی و سیاسی مشغولیتون کی وجہ سے تالیف و تصنیف کا کم موقع مل سکا، اور دو تین مختصر تعلیمی کتابون کے علاوہ اپنے علم کے شایانِ شان کوئی علمی یادگار نہین چھوڑی، "م"

تصوّفِ اسلام

(طبع جدید)

مصنفہ مولانا عبد الماجد دریابادی

مدیر صدق مولانا دریابادی کی مشہور کتاب تصوفِ اسلام کا نیا اڈیشن تیار ہوگیا ہے جس مین بتایا گیا ہے، کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہے اور اس میں اور موجودہ رواجی تصوف مین کتنا فرق ہے اس نئے اڈیشن کے لئے پوری کتاب کے مضامین پر نظر کر کے کتاب کو بالکل نئی حیثیت دیدی گئی ہے، قیمت: - عہ ضخامت ۲۲۲ صفحے

"منیجر"

ادبیات

آہ! داعیِ امن!

از

جناب یحییٰ اعظمی

ابھی کچھ اور دن جیتے وطن مین محترم گاندھی | کہ اس دنیاے پُر آشوب مین تھے مغتنم گاندھی
رُلائے کیون نہ خون چشمِ وطن کو تیرا غم گاندھی | مین گئے اب کہان اس کو ترے لطف و کرم گاندھی

وطن کیونکر سہے گا آہ اس داغِ یتیمی کو
بھلا روئے نہ کیون دنیا تری خوے کریمی کو

یتیمون اور بیواؤن کا غم اب کون کھائے گا | مسلمانون کے غم پر کون اب آنسو بہائے گا
وطن کے غم زدون کو کون اب تسکین دلائے گا | نواکھالی سے چل کر کلکتہ اب کون آئے گا

کرے گا کون آباد آہ اب اُجڑی ہوئی دلی
بنے گی کس کے ہاتھون آہ اب بگڑی ہوئی دلی

جہان آباد ہے گریان کہ اب گاندھی نہیں باقی | ہے چشم بلدہ خون افشان کہ اب گاندھی نہین باقی
وطن ہے کلبۂ احزان کہ اب گاندھی نہین باقی | ہے محزون آج ہر انسان کہ اب گاندھی نہیں باقی

ہے غم مظلوم کا غم کھانے والا ہو گیا رخصت
ہر اک دکھ درد مین کام آنیوالا ہو گیا رخصت

۵۲۰ دِلی

روان ہون کیون نہ اب ہر چشم تر سے خون کے آنسو　　کہ تنہا چھوڑ کر ہم کو سدھارے قوم کے باپو
جدھر دیکھو نظر آتی ہے اک آشفتگی ہر سو　　ہے کس کا سوگ بھارت کو کہ ہیں بکھرے ہوئے گیسو

اُٹھا مغموم ہندوستان کے سر سے آپ کا سایہ
کہ اک بچے کے سر سے اُٹھ گیا ہے باپ کا سایہ

جواہر لال جی کو اب ملے گی روشنی کس سے　　ملے گی اب شبستانِ وطن کو چاندنی کس سے
مٹے گی اب رُخِ انسانیت کی مردنی کس سے　　سُنے گی حرفِ تسکین اب یہ دنیا دنی کس سے

اٹھا وہ خود جو دیتا تھا نویدِ امن دنیا کو
بنایا تھا شعارِ زندگی جس نے اہنسا کو

منور جس سے تھی کل تک ابھی کل بزم انسانی　　دریغا بجھ گئی اک آن میں وہ شمع روحانی
ہزار افسوس ظالم نے نہ تیری قدر پہچانی　　مٹے گا آہ کیونکر یہ وطن کا داغ پیشانی

نوائین ہین زمین سے آسمان تک درد و ماتم کی
وطن تاریک ہے ، ہر سمت چھائی ہے گھٹا غم کی

مٹایا کس شقی نے اُف اہنسا کے پجاری کو　　اخوت کے پیامی امن و رافت کے بھکاری کو
سنے گا کون اب ہم غمزدون کی آہ و زاری کو　　بھرے گا کون درد اب ہماری غم گساری کو

جہانِ آب و گل ہو کیون نہ وقفِ شیون و ماتم
کہ دنیا سے اٹھا انسانیت کا محسن اعظم

وہ ہندو جلوہ گر تھی جس کے دل مین شمع قرآنی　　وہ جس کے سینہ میں تھا پرتو توحید ربانی
رہا جو عمر بھر خدمت گذارِ نوعِ انسانی　　ہویدا جس مین تھی خلق حسن کی جلوہ افشانی

وہ دردِ غم کا محرم اٹھ گیا افسوس دنیا سے

نقیب امنِ عالم اٹھ گیا افسوس دنیا سے

روانہ ہوتے ہیں اس شان سے آخر کہاں باپو[1] ذرا دیکھے کوئی ہیں گلستاں در گلستاں باپو

پکارے گا کسے کل کہہ کے اب ہندوستاں باپو ٹھہر جائیں ذرا شعلے کہ ہیں اس میں نہاں باپو

تمنا ہے میسر آخری دیدار ہو جائے

الٰہی جلد یہ آتش کدہ گلزار ہو جائے

محسنِ انسانیت

از مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل

زنجیرِ غلامی سے کس نے بھارت کو چھڑایا گاندھی نے
صدیوں کے اسیروں کو کس نے آزاد بنایا گاندھی نے

سائنس کی طوفانی لہریں پربت کو بھی جب ٹھکراتی تھیں
ست دھرم کی ٹوٹی نیا کو تب کس نے ترایا گاندھی نے

جب بغض و عداوت کی آندھی قوموں کو اڑائے جاتی تھی
تب شمعِ محبت کو کس نے سینوں میں جلایا گاندھی نے

اس خون کی پیاسی دنیا کو بتلائی اہنسا کی شکتی
اس پاپ کی اندھی نگری کو ست مارگ دکھایا گاندھی نے

بھارت کے لئے وہ مسیحا تھا، اس دیس کا جیون آتما تھا
گو موت سے خود بھی بچ نہ سکا مردوں کو جلایا گاندھی نے

سنسار کی اس نے سیوا کی ست دھرم کی اس نے رکشا کی
جو بوجھ پہاڑوں سے نہ اٹھے وہ بوجھ اٹھایا گاندھی نے

تہذیب و تمدن کے داعی جب ایٹم بم برساتے تھے
اس شور میں بھی راگِ الفت کا دنیا کو سنایا گاندھی نے

ان موہنی آنکھوں کا جادو پتھر کو بھی پگھلا دیتا تھا
روٹھوں کو منایا گاندھی نے بچھڑوں کو ملایا گاندھی نے

توحید پرستوں میں اس نے گیتا کا پرچار کیا
ہندو سکھ عیسائی کو قرآن سنایا گاندھی نے

ہستی کی اس بستی میں تھی مدہوش غفلت خوابیدہ
پیغامِ حیاتِ نو دیکر پھر اس کو جگایا گاندھی نے

بھارت کے اجڑتے گلشن کو آج اپنے لہو سے سینچ گیا

جو کام کسی سے بن نہ پڑا وہ کر کے دکھایا گاندھی نے

[1] باپو کی حیثیت اب لقب کی ہو گئی ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

فلسفہ کلام غالب ۔ از جناب پروفیسر سید شوکت سبزواری ایم، اے تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے۔ پتہ:۔ قومی کتب خانہ بریلی،

فاضل مصنف ایک صاحب علم ونظر اہل قلم ہیں، مذکورہ بالا کتاب میں انھوں نے بڑی دقت نظر سے کلام غالب سے ان کے مختلف جذبات وتاثرات اور افکار وتصورات کی فلسفیانہ تحلیل کی ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ غالب مجتہدانہ دل ودماغ رکھتے تھے، اور بلند خیال بلند نظر اور جدت طراز شاعر تھے، اردو کا کوئی شاعر ان کی پرواز فکر کو نہیں پہنچتا، لیکن وہ کوئی صاحب فکر فلسفی یا کسی خاص تعلیم و پیام کے معلم ومبلغ نہ تھے اس لیے اس معنی میں ان کو فلسفی کہنا صحیح نہیں کہ ان کا کوئی مرکزی تصور یا فلسفیانہ مسلک تھا، لیکن وہ ایک ذہین وطباع انسان تھے، اس زمانہ کے مروجہ الہیاتی فلسفہ، اشراقی تصوف اور ویدانت کے مسائل سے پوری آگاہی بلکہ ان کا ذوق رکھتے تھے، اور انھیں زندگی میں ایسے حوادث سے سابقہ پڑا جن میں اس قسم کے نیم فلسفیانہ اور نیم متصوفانہ جذبات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے، اس لیے ان کے کلام میں زندگی اور کائنات کے حقائق اور مابعد الطبیعاتی تصورات کے متعلق بکثرت فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں، اخلاقیات اور آرٹ وجمال اور نظریہ حسن وغیرہ کے متعلق بھی ان کے خیالات میں ندرت اور بلندی ہے، اسے خواہ جدت واجتہاد فکر کہا جائے یا فلسفہ سے تعبیر کیا جائے، لیکن درحقیقت یہ خیالات کسی فلسفیانہ مسلک کے ماتحت نہیں بلکہ ان کے دل میں وقتاً فوقتاً جو تاثرات پیدا ہوئے، اس کو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں ظاہر کر دیا اسی لیے ان کے

کلام میں تضاد پایا جاتا ہے، لیکن اگر ان خیالات کو غالب کے فلسفہ سے تعبیر نہ کیا جائے، اور صرف جذبات و تاثرات کہا جائے تو یہ تضاد خود بخود رفع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جذبات و تاثرات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے ماتحت بدلتے رہتے ہیں، بہرحال اس کتاب میں مصنف نے مذکورہ بالا امور اور بعض دوسرے مسائل کے متعلق غالب کے خیالات کی نہایت فلسفیانہ تشریح کی ہے، اور آخر میں ان کے مسلک شعری، اس کی فنی حیثیت اور تغزل پر مختصر مگر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے، مصنف کی بیشتر تشریحات غالب کے نازک شاعرانہ فلسفہ سے زیادہ دقیق و عمیق اور غالب سے زیادہ خود مصنف فلسفیانہ دقت نظر کا ثبوت ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب خود ان کی فلسفیانہ تالیف کی حیثیت رکھتی ہے، طرز نگارش دلکش اور ادیبانہ ہے، ایک مقام پر سہو قلم سے شیخ مقتول کی عوارف المعارف لکھ گیا ہے، ص ۱۳ "حضرت شیخ شہاب الدین...... سہروردی صاحب عوارف اور شہاب الدین مقتول دو جدا شخصیتیں ہیں، اول الذکر بزرگ اکابر صوفیہ میں ہیں، اور آخر الذکر حکیم و فلسفی، بعض مقامات پر اسلامی تصوف اور اشراقی فلسفہ اور ویدانت کے مسائل میں خلط مبحث ہو گیا ہے، لیکن یہ خفیف فروگذاشتیں لائق التفات نہیں، مجموعی حیثیت سے اس موضوع پر اردو میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، مصنف کے علم سے اسی کی توقع تھی،

مجموعہ مقالات علمیہ۔ شائع کردہ مجلس ادارت حیدرآباد اکیڈمی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں، پتہ:۔ اکیڈمی مدلور سے ملیگی،

حیدرآباد اکیڈمی کے علمی خدمات کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے، اور اس کے بعض شائع کردہ مقالات پر تبصرہ بھی ہو چکا ہے، زیر نظر کتاب اسکے مختلف علمی، ادبی اور سائنٹفک مقالات کا نیا و مفید مجموعہ ہے، اس میں حسب ذیل مقالے ہیں، "جوہر توانائی" محمد عبدالرحمٰن خانصاحب صدر اکیڈمی، "کائناتی شعاعیں" ڈاکٹر سید مہدی علی "فارسی شاعری میں رمزیہ اشارے" مظہر علی خانصاحب استاد جامعۂ عثمانیہ،

"بعثت نبوی کے وقت کی عالمگیر گتھیاں اور ان کا اسلامی حل"، ڈاکٹر حمید اللہ، اس میں دکھایا گیا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی، اور قومیت، انتقام، انسانی حیات یقین و عمل، دوسرے مذاہب کی تصدیق، دولت و افلاس، اور انفرادیت و اجتماعیت وغیرہ کے متعلق گذشتہ اقوام و مذاہب کے تصورات اور اس کے کیا نقائص تھے، اور اسلام نے اس میں کیا اصلاح کی، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا مضمون "قرآن و فلسفہ"، اس سے پہلے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے، "ہمارے کوکبی نظام کی ساخت"، ڈاکٹر اکبر علی صاحب ناظم رصدگاہ حیدرآباد، "شوکت بخاری" ڈاکٹر سید حکیم اللہ حسینی"، یہ سب مقالے مفید پر از معلومات اور مطالعہ کے لائق ہیں،

فلاح و ترقی کے اصول - مؤلفہ جناب مولوی محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸/ پتہ: ادارۂ صدیقیہ الہ آباد،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے انکی دینی اور اُخروی فلاح کے ساتھ دنیاوی ترقی کا بھی وعدہ فرمایا ہے، لیکن واقعہ اسکے خلاف نظر آتا ہے، مسلمان پستی اور تنزل میں مبتلا ہیں اور غیر مسلم قومیں بام عروج پر پہنچ گئی ہیں، اس سے بعض دماغوں میں اسلامی اصولوں کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں، اس کتاب میں انکا ازالہ کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور آج بھی اسلام ہی کے پاکیزہ اصول دنیاوی ترقی کا بھی ذریعہ ہیں لیکن اولاً اسلام میں ترقی کا مفہوم موجودہ ترقی کے خالص مادی تصور سے مختلف ہے، دوسرے خود مسلمانوں نے ترقی کے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا ہے، اور انکا عمل سراسر اسکے خلاف ہے جسکا لازمی نتیجہ انکا تنزل ہے، انکے مقابلہ میں غیر مسلموں نے دنیاوی ترقی کے بہت سے اسلامی اصولوں کو اختیار کر لیا ہے، اس لیے ع مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور، کے تحت اُنکی ترقی قدرتی امر ہے، لیکن ان قوموں نے ان اصولوں کے علاوہ بہت سے خالص مادی اصول بھی وضع و اختیار کئے ہیں، اس لئے کہ ان کی ترقی متوازن نہیں ہے، جس کی خرابیاں آج ساری دنیا میں نمایاں ہیں، اور ان کے مادی اصولوں سے اسلامی اصولوں کا موازنہ کرکے اول الذکر کے نقصانات اور آخر الذکر کے فوائد دکھائے ہیں،

کتاب کے آخر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رسالہ فروع الایمان کی تلخیص ہے جس میں ستتر اسلامی تعلیمات اور ان کی ضروری تشریح ہے، اس کتاب کا اصل موضوع بحث وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا، لیکن ضمناً اور بہت سے مفید مذہبی معلومات بھی آگئے ہیں،

تعلیم قرآن۔ مولفہ جناب غلام دستگیر صاحب لکچرار نظام کالج و مولوی عبد الرحمن صاحب سعید صدیقی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍

پتہ :- ادارۂ اشاعت اسلامیات، حیدرآباد دکن،

عام طور سے مسلمانوں میں قرآن مجید کے معنی اور مفہوم کی جانب سے اتنی بے توجہی ہے کہ اکثر مسلمان ان سورتوں کے معنی بھی نہیں سمجھتے جن کو روزانہ نمازوں میں تلاوت کرتے ہیں، اگر صرف انہی کو سمجھکر پڑھیں تو بھی کلام مجید کے مقصد و منشا سے ان کو یک گونہ ربط و مناسبت قائم رہے، اور نماز میں بھی خشوع پیدا ہو، اس ضرورت کے پیش نظر لائق مولفین نے تعلیم قرآن لکھی ہے، اس میں سورۂ فاتحہ سے لیکر والضحیٰ تک پارہ عم کی ۲۱ سورتوں کا ترجمہ اور ان کی ضروری تشریح کی گئی ہے، یہ سورتیں عام طور سے نمازوں میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں، ان میں سے بعض مضامین کے اعتبار سے بھی زیادہ اہم ہیں، جن میں قرآنی تعلیمات کی روح آگئی ہے، اس لیے یہ ترجمہ مختلف حیثیتوں سے مفید ہے، ہر سورہ کا لفظی اور بامحاورہ ترجمہ علیحدہ علیحدہ لکھا ہے، اور ان کی ضروری تفسیر بھی کر دی ہے ترجمے شاہ عبد القادر صاحبؒ اور شیخ الہندؒ کے مستند تراجم سے ماخوذ ہیں، مولفین کے پیش نظر زیادہ تر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دینی اصلاح و تربیت ہے، اس لیے تفسیر میں ان کے ذوق، انداز فکر، اور موجودہ اجتماعی مسائل کی زیادہ رعایت رکھی گئی ہے، لیکن اس سے نفس مطالب میں کوئی تغیر نہیں ہونے پایا ہے، اس کی صحت اور افادہ کے لیے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی مندرجہ تصدیق کافی ہے، یہ کتاب عربی سے ناواقف نمازی مسلمانوں

کے مطالعہ کے لائق ہے۔

فلسفۂ نماز - از جناب مولوی شمس الدین صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت

وطباعت بہتر، قیمت ۵ر، پتہ: بک ڈپو انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

نماز اللہ تعالیٰ کے دربار کی حضوری، اس کی عظمت و کبریائی، اور اپنی عبودیت اور بے چارگی کا اعتراف ہے، اس لیے اس کے ارکان کو درباروں کی حاضری کے آداب سے تشبیہ دیجاتی ہے لیکن ان دونوں میں بڑا فرق ہے، بارگاہ خداوندی میں آداب ظاہری کی پابندی کے ساتھ دل کو بھی خوف و خشیت اور عجز و فروتنی کی کیفیت سے معمور رہنا چاہیے، اس کتاب میں ان دونوں پہلوؤں سے اذان، وضو، نماز کے ظاہری ارکان، اس کی قرأت تحمید و تقدیس، دعاؤں اور باطنی کیفیتوں کی صاف اور سادہ طریقہ سے تشریح کی گئی ہے، اس قسم کی تعبیرات ذوقی ہیں، ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق تعبیر کرتا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب عام مسلمانوں کے مذاق اور ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

لمعات - مرتبہ جناب پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت:- ۶ر، پتہ:- جناب مرتب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ملے گی۔

لمعات جناب رضی احمد صاحب بدایونی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے جسے ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر ضیاء احمد صاحب نے مرتب کیا ہے، مصنف مرحوم شاعر کی حیثیت سے کسی خاص شہرت کے مالک نہ تھے، ان کے جاننے والوں اور قدردانوں کا حلقہ محدود تھا، لیکن ان کو شاعری سے فطری مناسبت تھی، اور اس کا ذوق ان کو اپنے اصحاب علم و ادب اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا، ان کی شاعری کا آغاز اور نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوا جب پرانے طرز شاعری کا خاتمہ اور نئے کا آغاز ہو رہا تھا، اس لیے ان کے کلام میں دونوں کے اثرات ہیں، فن کی مہارت، کلام پر قدرت و پختگی اور زبان کی صحت و صفائی قدیم رنگ کی ہے، اور خیالات میں نئے اثرات نمایاں ہیں، گو یہ انتخاب مختصر ہے، لیکن خیالات

کے اعتبار سے ان میں بڑا تنوع ہے، تغزل کی زمزمہ سنجی بھی ہے، فلسفہ و حکمت کی گہرائی بھی، اور تصوف کی مستی و حرارت بھی، لیکن تغزل کی رنگینی میں خیالات کی لطافت و پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، اردو کے چند قصائد اور فارسی کی چند غزلیں بھی ہیں، قصائد خیالات کی رفعت الفاظ کے شکوہ اور زور بیان کے اعتبار سے اساتذہ کے قصائد کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں، دیوان کے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مرتب کے قلم سے طویل تعارف اور تبصرے ہیں، جو مصنف کے کلام پر تبصرہ کے ساتھ ادبی حیثیت سے نفس شاعری پر ناقدانہ مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ مجموعہ مختلف حیثیتوں سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

کاخ بلند از جناب حکیم عبدالکریم صاحب ثمر، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ستے، پتہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، قرآن منزل، ریلوے روڈ، لاہور،

آج کل کے نوجوانوں کی شاعری کی جولانگاہ عموماً حسن و عشق کے سفلہ اور پست جذبات اور اس کی بے جان داستاں سرائی ہے، ان کی ترقی کی سب سے بڑی معراج ملحدانہ اور بے دینی کے خیالات ہیں، ان کے دلوں سے حرارت ملی، اور سوز حیات مفقود ہے، لیکن ہر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں، جناب ثمر کا کلام بھی انہی مستثنیات میں ہے، کاخ بلند ان کے کلام کا اسم بامسمی مجموعہ ہے، اس میں سو کے قریب نظمیں ہیں، اور پورا کلام شاعری کے مفاسد سے پاک، اور خیالات کی بلندی و پاکیزگی، دینی و ملی جذبات اور زندگی کی تپش سے لبریز ہے، مصنف نے خیالات اور طرز ادا دونوں میں اقبال کا تتبع کیا ہے، اور اس حد تک اس میں کامیابی حاصل کی ہے، کہ بعض اشعار پر اقبال کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، یہ معلوم کرکے اور بھی تعجب ہوا کہ مصنف اصل میں پنجابی زبان کے شاعر ہیں اور اردو میں کل دو تین برسوں سے مشق سخن شروع کی ہے، گو ابھی کلام میں خامیاں ہیں لیکن ایسی قلیل مدت میں اتنی مشق بہم پہنچا لینا ان کے مستقبل کے لیے فال نیک ہے،

اگر ان کی مشق سخن جاری رہی تو یہ خامیاں دور ہو جائیں گی، اور جناب اقبال کے طرز شاعری سے خالی نہ ہوگا،

ادب کے مادی نظریے ۔ از جناب ظہیر کاشمیری تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۵ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عیر، پتہ کمال پبلشرز ۲۶ مال روڈ، لاہور،

سوشلزم نے زندگی کی دوسری اقدار کی طرح ادب اور لٹریچر کو بھی خالص مادی قدروں میں محدود کر دیا ہے، اس کے نقطۂ نظر سے صحیح ادب وہی ہے جو انسانی مادی زندگی اور اس کے حیوانی پہلو کا ترجمان ہو، اس کے علاوہ اسکی علمی، ادبی اور اخلاقی پہلو وغیرہ صرف ایوان تعیش کے نقش و نگار ہیں، اس کتاب میں اسی نقطۂ نظر سے ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، پہلے انسانی معاشرہ سے اسکا تعلق دکھایا گیا ہے، پھر اردو نظم و نثر کی پیدائش سے لیکر اسوقت تک اس میں مختلف تمدنی معاشرتی سیاسی اور اقتصادی عوامل کے ماتحت جو تغیرات ہوئے، ان پر اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ میں جستہ جستہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے متفرق واقعات، اس کے اثرات و نتائج اور زندگی کے مختلف زاویوں کے متعلق سوشلزم کے نقطہ نظر بھی آگئے ہیں، ایک باب میں ادب کے اس نظریہ کے بارہ میں لینن کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، آخر میں مغربی ادب پر بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی تغیرات کے اثرات دکھائے گئے ہیں، ادب کے متعلق سوشلزم کے نظریہ کے اس جز سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے، یہ تو بالکل فطری چیز ہے، لیکن خود زندگی مختلف حیثیتیں اور مختلف پہلو رکھتی ہے، اور ان سب کی اہمیت یکساں ہے، انھیں اک قلم نظر انداز کرکے اشرف المخلوقات کی زندگی کے مقصد اور نصب العین کو محض حیوانی خواہشات اور اسکے مظاہر تک محدود کر دینا انسانیت کی توہین ہے، گو ادب کے متعلق مصنف کے بعض خیالات صحیح ہیں لیکن ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے، اور مذہب وغیرہ کے متعلق وہی پرانی عامیانہ باتیں دہرائی گئی ہیں، بعض تاریخی غلطیاں بھی ہیں،

"م"

جلد ٦١ ماہ ربیع الثانی ١٣٦٧ھ مطابق ماہ مارچ ١٩٤٨ء عدد ٣

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

وفیات

ادبیات

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہو کہ اردو ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، دونون نے مل کر اس کو بنایا، اور انہی کی کوششون نے اس کو پروان چڑھایا، اور احسان شناس اردو دونون کی تمدنی نشانیون کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، لیکن یہ کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہو کہ آج اسی صوبہ کی حکومت جہان اردو پل کر جوان ہوئی، اور اس کا رنگ روپ نکھرا، اس کے ساتھ اجنبیون اور پردیسیون سے بھی بدتر سلوک کر رہی ہے، اور ہندو مسلم اتحاد کی اس سب سے بڑی یادگار کو مٹانے کے درپے ہے،

صبح تک تونے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا یادگارِ شمع تھی کل تک جو پروانہ کی خاک

اس بارہ مین ہم اپنے خیالات اس سے پہلے ظاہر کر چکے ہین آج اس سلسلہ مین پاکستان سے بھی کچھ کہنا ہے،

ہندوستان مین اردو کی بے بسی کے بعد قدرۃً پاکستان کی جانب اس کی نگاہین اٹھتی ہین کہ اسی سے اس کی دستگیری کی امید ہو سکتی ہے، پاکستان جس دعویٰ کے ساتھ اور جس نظریہ کے ماتحت قائم ہوا ہے اس کے لحاظ سے اردو کا تحفظ محض اس کا فرض ہی نہین ہے، بلکہ اس کے بغیر اس کے مقاصد کی تکمیل نہین ہو سکتی اور اردو کی خدمت و سرپرستی پاکستان کا احسان نہین ہوگا، بلکہ خود اس کا مفاد اس سے وابستہ اور پاکستان کے مسلمانون کی وحدت بڑی حد تک اردو پر منحصر ہے،

پاکستان کے تمام صوبون کی زبانین مقامی اور ایک دوسری سے مختلف ہین، اردو ہی ایسی زبان ہو جو سب صوبون

مین سمجھی اور مغربی پاکستان کے بعض علاقون اور خاص خاص طبقون مین بولی بھی جاتی ہے، اس لئے یہی وہان کی مشترک زبان ہوسکتی ہے، پاکستان کی تمام زبانون مین سب سے زیادہ اسلامی اثرات مذہب اسلام سے متعلق معلومات اور اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو ہی مین ہے، اس لئے اُن سے واقفیت اور اسلامی کلچر کے تحفظ اور اشاعت کا ذریعہ بھی اردو ہی ہے، اور ہندوستان اور پاکستان کا جو مسلمان اردو سے جس قدر ناواقف ہوگا، اسی قدر وہ عام مسلمانون اور اسلامی کلچر سے بے گانہ رہے گا جس کی مثال بنگال کے مسلمان ہین،

علمی اور تعلیمی پہلو سے بھی پاکستان کی کوئی زبان اردو کا مقابلہ نہین کرسکتی اس حیثیت سے وہ ان سب مین زیادہ سرمایہ دار ہے، دارالترجمہ حیدرآباد کے بدولت اس کا دامن جدید علوم وفنون سے بھی خالی نہین رہا، اُردو جامعۂ عثمانیہ مین ہر فن کی اعلیٰ تعلیم اسی کے ذریعہ ہوتی ہے جس کے کامیاب نتائج سب کے سامنے ہین، اس لئے اردو ہر اعتبار سے ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور مذہبی علمی سیاسی اور تمدنی ہر حیثیت سے پاکستان کے لئے ضروری ہے، یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایک بنی بنائی ہوئی مکمل زبان مل گئی ہے جو اس کی جملہ ضروریات کی کفیل ہوسکتی ہے، اور وہ زبان سازی کی زحمت سے بچ گیا، اس سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی غلطی اور ناشکری ہوگی،

پاکستان کے قریب قریب کل صوبے اردو کی حمایت مین ہین، لیکن بنگال سے اس کی مخالفت کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے، گو وہان کے بہت سے خواص اور ذمہ دار اشخاص اردو کے حامی ہین لیکن عام بنگالی مسلمان ابھی تک اس کے نام سے بھڑکتے ہین، حالانکہ دوسرے صوبون کے مسلمانون سے اُن کی اجنبیت و بے گانگی اور اسلامی تہذیب و معاشرت سے اُن کی دوری کا بڑا سبب اردو سے ان کی ناواقفیت ہے، اس لئے وہ سب سے زیادہ انہی کیلئے ضروری ہے
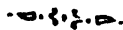
اس کا یہ منشا نہین ہے کہ صوبائی اور مقامی زبانون کی حق تلفی کیجائے، یا ان کو نقصان پہنچایا جائے، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ پاکستان کی صوبائی زبانون کی مقامی اہمیت کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے، سرکاری زبان اردو

کو بنایا جائے، اس کی تعلیم لازمی قرار دی جائے، اور رفتہ رفتہ اس کو اعلیٰ تعلیم کا بھی ذریعہ بنایا جائے،

اردو کی ترقی و اشاعت کے وسائل پر غور کرنے کے لئے ۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ کو پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے لاہور میں اردو کانفرنس ہو رہی ہے، اس میں پاکستان و ہندوستان دونوں کے اصحاب علم و ادب کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے، اس میں مذکورہ بالا مسائل بھی زیر بحث آئیں گے، سرکاری زبان بنانا تو حکومت کا کام ہے، لیکن ہم کو توقع ہے کہ کانفرنس میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ اور اس کی ترقی و اشاعت کے دوسرے وسائل طے کرلئے جائیں گے، اور اسے سرکاری زبان بنانے کے لئے حکومت پر بھی زور ڈالا جائے گا، اور امید ہے کہ وہ اردو کی خدمت و توسیع میں علمی ادبی اور تعلیمی اداروں کی پوری مدد کرے گی،

اس میں شبہہ نہیں کہ جو لوگ عرصہ سے انگریزی میں کام کرنے کے عادی چلے آرہے ہیں، ان کے لئے دفعتہً اس کو چھوڑ کر اردو کو اختیار کرلینا آسان نہیں ہے، اور ابتدا میں ضرور ان کو دقت محسوس ہوگی لیکن اس بارہ میں اتنی عجلت کی ضرورت نہیں کہ انھیں اردو کے سیکھنے، اس سے مانوس ہونے اور اس میں کام کی مشق بہم پہنچانے کا موقع بھی نہ دیا جائے، لیکن انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد اس کی زبان کو بھی دیر سویر بہرحال ختم ہونا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ ہو جانا تو ضروری ہے، کہ حکومت کی زبان اردو ہوگی اور رفتہ رفتہ اس کو تمام شعبوں میں رائج کردیا جائیگا

پنجاب ہمیشہ سے اردو کی خدمت میں پیش پیش رہا ہے، اور شمال ہند میں اردو کا مرکز عرصہ سے لاہور ہو گیا تھا، اور اب تو پنجاب پر اردو کا دوہرا حق ہے، اس لئے یقین ہے کہ اردو کی اس سب سے بڑی خدمت کا سہرا بھی اسی کے سر رہے گا،

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

"مولانا عبدالباری صاحب ندوی (سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ) جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے متعدد خلفاء مین سے ایک ہین، حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مجددانہ کارنامون پر ایک مستقل و مفصل کتاب لکھ رہے ہین، اس کے دو سلسلے سیاسی اور تبلیغی معارف اور الفرقان میں شائع ہو چکے ہین، اب اس کا تیسرا حصہ تعلیمی آج معارف کے ذریعہ شائع کیا جارہا ہے،

یہ حقیقت ہے کہ یورپ کے تعلیمی نظریات کی ہمہ گیری نے اسلامی تعلیمی نظریہ کو نہ صرف عام مدارس بلکہ ہمارے دینی مدارس والون کے دلون سے بھی بھلا دیا ہے، انتہا یہ ہے کہ وہ مدرسے بھی جو صرف دین کی خدمت کے لئے قائم تھے، اور جن سے سالہا سال تک دین کی خدمت انجام پاتی رہی، وہ بھی دانستہ یا نادانستہ اوس سے دور سے دور تر ہوتے چلے جارہے ہین، اور وہ خوش ہین، کہ وہ زمانہ کی ضرورت پوری کرتے جارہے ہین،

صاحب مقالہ نے مضمون کے اندر کئی جگہ بنظر شفقت دارالعلوم ندوہ کا ذکر کیا ہے اور اون

تنقید کی ہے ہم کو اپنے عیوب کے تسلیم کرنے مین کبھی ہچک محسوس نہیں کرنی چاہئے بے شبہہ دار العلوم

ندوہ کے طلبہ مین اس قسم کی کمزوریان ہین منتظمین مدرسہ ہمیشہ اس کی کوشش کرتے رہتے ہین کہ وہ

ان کمزوریون پر فتح پائیں، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ جہان ہم اپنے مدرسون سے اُن کو دور

کرنا چاہتے ہین، اُن کو اپنے گھرون سے بھی دور کرین، اور اپنے تعلیمی زاویۂ نظر کو بدلنے کی بھی کوشش

کرین، تاکہ مسلمان والدین اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کو سمجھ سکین،

آج ملک مین انگریزی سلطنت کے خاتمہ سے انقلاب کا نیا دور شروع ہو رہا ہے، یہی وقت ہے

کہ مسلمان اپنے تعلیمی نظریہ کو پورے طور سے سمجھین، امید ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کے

مسلمان اس مضمون کو بغور پڑھین گے، اور اس سے آیندہ کے لئے فائدہ اٹھائین گے،"

"س"

حضرت مجدد وقت (مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ) کی جامع تجدیدات پر بنام جامع المجددین جو مستقل کتاب راقم احقر

کے زیر تحریر بلکہ قریب تکمیل ہے، یہ اسی کا ایک اور باب ہے، اس سے پہلے ایک باب" قومیات و سیاسیات حاضرہ"

کا اسی معارف[1] مین اور ایک تجدید تبلیغ کا رسالہ الفرقان[2] (لکھنو) مین شائع ہو چکا ہے،

جن اہل علم و بصیرت حضرات کی نظر حدیث تجدید کے مغز و مدعا پر ہے، وہ جان سکتے ہین، کہ وقت کی سب سے

بڑی دینی و اسلامی خدمت "تجدید یافتہ" پیغام اسلام کی اشاعت ہے، یون تو ختم نبوت کے بعد سے برابر تجدید دین

و بعثت مجددین کا سلسلہ صدی بصدی اسی طرح جاری ہے، جس طرح ختم نبوت سے قبل انبیار علیہم السلام کی بعثت

کا جاری تھا، نیز ختم نبوت کے بعد ہی سے تعلیمات دین مین طرح طرح کے مفاسد کی راہ یابی ہر ماہ بعد کی صدی

مین ماقبل سے جس طرح بڑھتی گئی ہے وہ بھی معلوم و مسلم ہے، اور اب تو طول و عرض و عمق دین کے سارے اجزا

مین یہ مفاسد اس طرح سرایت کر گئے ہین، کہ مشکل سے عقائد و اعمال کا کوئی گوشہ در رشیہ ان سے محفوظ

---

[1] دسمبر ۱۹۴۶ء وجنوری و فروری ۱۹۴۷ء کے تین نمبرون مین شائع ہوا، [2] ماہ شعبان و رمضان،

رہا ہوگا، اس لئے لازماً اب تجدید دین کے لئے ایسے ہی جامع مجدد دین کی بعثت کا وقت تھا، جن کی تجدیدات ساری گمراہیون کی تسدیدات کو جامع ہون،

حضرت مجدد وقت کی اس جامعیت کا اندازہ حضرت کی کم وبیش ایک ہزار تصانیف کی وسعت اور اُن کے مطالعہ سے بخوبی فرمایا جاسکتا ہے، دین کے سارے ایمانی وعملی ابواب واحکام کا کوئی چھوٹا بڑا جزء جو ذرا بھی اصلاح طلب یا محتاج تجدید رہا ہو، ایسا نظر آئے گا جو حضرت علیہ الرحمہ کی جامع نظر سے نظرانداز ہوا ہو، اہلِ حضرات کو متوجہ نہ پاکر اس نااہل نے اپنی بری بھلی فہم وبساط کے موافق ہزار ہا ہزار صفحات کو چند صفحون مین سمیٹنے کی سعی مین بھی پیش نظر رکھا ہے، کہ حضرت کی جامعیت تجدید کے کم از کم نمایان خد وخال اس مرقع مین نظر آجائین جس کا بہت کچھ اندازہ خود حاضر وقت باب (تجدید تعلیم) اور اس کے قبل کے مذکورہ بالا شائع شدہ ابواب سے فرمایا جاسکتا ہے، قومیات وسیاسیات، تبلیغ وتعلیم وغیرہ کے یون تو ہر شعبہ مین مسلمانون کی مختلف جماعتین اپنی اپنی راہ کے مطابق کام کر رہی ہین، اور اسلام ہی کا نام لے کر کر رہی ہین، لیکن چونکہ اکثر صورتون مین اسلام کے اصلی اصول وتعلیمات اپنی بے غبار اور صاف ستھری تجدید یافتہ شکل مین سامنے نہین، اس لئے قدرۃً فکر وعمل کے تیر زیادہ تر نشانہ کے باہر گرتے ہین، صدی بصدی تجدید دین کی یہی بڑی حکمت ومصلحت تھی، کہ دنیا کا آخری دین ہر صدی کے نوپیدا مفاسد سے پاک ہوکر اپنے جمال وکمال کے ساتھ تر وتازہ صورت مین دنیا کے سامنے برابر موجود رہے، تاکہ کم از کم مخلص اہلِ طلب واہلِ دین تو دین کی طلب وخدمت مین نادانی سے ترکستان کی راہ پر نہ چل پڑین،

لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ بعض حضرات پر (جس کا بڑا سبب حجاب معاصرت معلوم ہوتا ہے) حضرت مجدد وقت کے لئے جامعیت اور بعثت کا لفظ استعمال کرنا گران ہے، حالانکہ بعثت کا لفظ خود تجدید کی مشہور حدیث مین استعمال فرمایا گیا ہے، اور "جامعیت" ایک ایسا واقعہ ہے جو حضرت کے اصلاحی وتجدیدی کارنامون کی ہمہ گیری کو پڑھ کر جیسا ابھی عرض کیا گیا، ہر آنکھ والا خود اپنی آنکھ سے دیکھ لے سکتا ہے، البتہ اس کا کوئی

علاج نہین کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہون لیکن سوجھتا کچھ بھی نہین

حدیہ کہ صاحب الفرقان جیسے محترم و مخلص صاحب علم و عمل کے نزدیک تو "حضرت کی اصلاحات و ہدایات کو آپ کے منصب مجددیت کی بنا پر پیش کرنا اُن کی افادیت کے دائرہ کو بہت محدود کر دیتا ہے" اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ حدیث تجدید کو اب منسوخ قرار دے دیا جائے، اور اگر کسی کا مجدد ہونا آفتاب نصف النہار کی طرح نظر آرہا ہو، تو بھی اُس کی مجددیت کا نام زبان پر نہ لانا چاہئے، ع

این سخن را چہ جواب است تو خود می دانی

رہا یہ کہ "کسی بزرگ کی اچھی سے اچھی تعلیمات اور سیدھی سے سیدھی اصلاحات کو بھی اگر اس کے اہل زمانہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ ان بزرگ کے لئے کوئی خاص منصب تسلیم کرانا چاہین، تو اس کا دائرہ قبول بہت ہی محدود ہوگا"، تو طلب حق کی راہ سے اس حجاب معاصرت کو ہٹانے کی سعی کرنی چاہئے، خصوصاً اہل حق کو نہ یہ کہ الٹے "چشمۂ آفتاب" ہی کا نام لینا گناہ قرار دیدیا جائے"

البتہ یہ بالکل سچ ہے کہ "مجددیت کوئی ایسا منصب نہین، جسے منوایا ہی جائے"، اور بلاشبہہ یہ بھی ضروری نہین کہ کسی دور کا مجدد دین کے ہر شعبہ مین جو کچھ کہے وہ سب واجب التسلیم ہی ہو، یہ شان تو صرف نبوت کی ہے" اس وسوسہ کا محترم موصوف جیسے اہل علم کی طرف سے تو قطعاً راقم کو وسوسہ تک نہ تھا، ہان عوام یا معاندیہ اعتراض کر سکتے، یا پیدا کر سکتے تھے، اسی لئے "قومیات و سیاسیات" والے مضمون کے سلسلہ مین معارف[1] مین پہلی دفعہ ہی حضرت کی مجددیت کی طرف متوجہ کرتے وقت اس بے بنیاد وسوسہ یا اعتراض کی نسبت عرض کر دیا گیا تھا کہ

نبی و مجدد مین ایک فرق یہ ہے کہ نبی وقت پر ایمان نفس نجات و مغفرت کے لئے لازم ہو،

---

[1] ماہ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۴۲۱،

بخلاف اس کے مجدد وقت کی یافت و پیروی پر نجات موقوف نہیں وہ تو انشاء اللہ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نفس ایمان کے بعد بھی مر پٹ کر حاصل ہی ہو جائے گا، لیکن دین کے اصل و پاک سرچشمہ تک پہنچنا، اس کی کامل و بے غبار تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل کی دینی و دنیوی برکات کا پوری طرح حاصل ہونا اس کے لئے بلاشبہہ مجدد وقت کا پانا، اور اس کا دامن تھامنا لابدی ہے، ورنہ پھر بعثت مجددین اور تجدید دین کے کوئی معنی نہیں، بیشک مجدد نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا، بشری لغزشیں اس سے بھی ہوں گی لیکن دیگر علماء و محققین کے مقابلہ میں نسبتہً کم، اس لئے مجدد وقت کی تجدید کا قبول و اتباع اسلم و احوط ہر حال میں ہوگا اس کے علاوہ اسی سلسلہ میں مجدد کی یافت و اتباع کے کچھ اور فوائد و مصالح بھی عرض کئے گئے ہیں، اگر محترم موصوف ان کو ایک نظر مکرر ملاحظہ فرمالیں تو غالباً یہ نہ فرمائیں گے کہ مولینا موصوف (راقم احقر) نے مجددیت کے مسئلہ و منصب کو بنیاد بنانے میں جو دینی مصلحتیں سمجھی ہوں ہم اُن کے ادراک سے قاصر ہیں، کیونکہ مجددیت کا مسئلہ اگر غور فرمائیں تو اتنی بڑی دینی مصلحت پر مبنی ہے، کہ اس کے بغیر ختم نبوت کے عقیدہ ہی کو سنبھالنا مشکل ہے، دینی مفاسد تو (معمولی عقائد و اعمال کا کیا ذکر) کفر و شرک تک کے روز افزوں ہیں، پھر آخر نبوت کی ضرورت کیسے ختم ہوگئی، اِ ایسی ہی باتوں کو سہارا بکڑ کر تو خود امت مسلمہ میں بہت سے متنبی اٹھ کھڑے ہوئے، ان چیزوں کی مزید تفصیل انشاء اللہ اصل کتاب کے مقدمہ میں ملے گی، سر دست اگر یہ اشارات بھی نامقبول ہیں، تو اس کے سوا کچھ عرض کرنا نہیں کہ ع

محبوب من است انچہ بنزدیک تو زشت است

بہرحال حضرت علیہ الرحمہ کی تعلیمات و تجدیدات سے یوں تو الحمد للہ مختلف طبقات کے اہل سعادت کی ایک کثیر تعداد فیضیاب ہے لیکن نسبتہً جدید طبقہ نام کے علاوہ حضرت کے اصلی اصلاحی کام سے بہت ہی کم آشنا ہے، حالانکہ ایک طرف وقت کے حالات نے مسلمانوں کی دنیوی قیادت و رہنمائی کی عنان

بالکلیہ اسی طبقہ کے ہاتھ مین پہنچا دی ہے، دوسری طرف انھی حالات نے خود دنیا ہی کی راہ سے اس طبقہ کے اندر دین کی ایک طلب بیدار کر دی ہے، اس لئے اگر ان کی رسائی دین کی صحیح فکر و عمل تک ہو جائے تو انشا اللہ ان ہی کے ہاتھون دنیا مین دین بچ سکتی ہے،

راقم ہذا نے بھی جامع المجددین نام کی کتاب مین اس خیال کو خاص کر پیش نظر رکھا ہے اور اس لئے جا بجا بعض باتون کی تفصیل مین خود اپنی طرف سے تطویل تک مین تامل نہین کیا گیا، تاہم اپنی نا اہلی کا پورا ادراک ہے اور اصل مین اس خدمت کے بڑے اہل حضرت سید لطائفہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، حضرت گیلانی مولانا سید مناظر احسن، اور حضرت دریابادی (مولانا عبدالماجد) جیسے حضرات تھے، کہ ایک طرف مجدد وقت کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہین، اور دوسری طرف خود جدید طبقہ مین مقبول و مسلم مشاہیر اہل قلم کا درجہ رکھتے ہین، پھر ان حضرات پر حضرت علیہ الرحمہ کے ساتھ عقیدتمندانہ و خادمانہ تعلق و نسبت کی بنا پر اس خدمت کا حق بھی زیادہ عائد ہے،

اور حضرت دریابادی صدق کی وساطت سے اس حق کو کچھ نہ کچھ ادا بھی فرماتے رہتے ہین، جس کی بدولت کم ازکم صدق خوان طبقہ حضرت علیہ الرحمہ سے تھوڑا بہت روشناس ہو گیا ہے، گو سمندر کے چند قطرات ہی کی حد تک سہی، حضرت سید الطائفہ نے بھی جدید طبقہ ہی کو خصوصاً پیش نظر رکھ کر اشرف السوانح[۵۱] کو جدید قالب مین ڈھالنا شروع کر دیا تھا، مگر پھر بھوپال کے تعلق اور دیگر مصروفیات نے شاید حق تقدم حاصل کر لیا، کاش مکرر توجہ فرما سکتے، ابنحام[۵۲] اسلام کے ایک بڑے سرگرم رکن سے یہ معلوم کر کے دل باغ باغ

۵۱ یہ استانۂ اشرفی کے امیر خسرو حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ کی مرتب فرمودہ عاشقانہ و والہانہ ساتھ ہی مستند و مکمل تین جلدون مین سوانح حیات ہے جو حضرت علیہ الرحمہ کی حیات مبارکہ ہی مین شائع ہو گئی تھی، اور جس کا استناد اس سے بڑھ کر کیا ہوگا، کہ خود حضرت کی نظر توثیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے،

۵۲ یہ رسالہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی یادگار مین لاہور سے نکلنے والا تھا، مگر ۱۵ اگست کے بعد کے حالات کی بدولت دیکھئے کب نکلتا ہے؛

ہو گیا کہ انھون نے اپنی سرگرمی سے ہمارے حضرت گیلانی سے بھی غالباً حکیم الامت کا جادۂ اعتدال" کے نام سے ایک مضمون حاصل کر لیا ہے، اگر مولانا گیلانی کے قلم کی عنان ادھر پھر جائے، تو وہ اہلیت و سرعت دونون کی ایسی جامع ہے کہ ایک آدھ سال ہی مین دوسرون کی طرف سے بھی اس فرض کفایہ کو پورا فرما دے سکتی ہے،

آخر مین ان معروضات کے ساتھ وہی درخواست ہے، جو پہلے اسی معارف اور پھر الفرقان مین پیش کیجا چکی ہے، کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے سمندر کی اوپر گہرائی کو مختلف ابواب کے اُن کو زون مین بیش کرنے سے اس نااہل و نادان سے جو کوتاہیان اور غلطیان ہوئی ہون، ان پر اگر مطلع و متنبہ فرمایا جائے تو بڑا احسان ہوگا اور کتاب کی اشاعت مین انشاء اللہ اس کا ازالہ ہو سکے گا، بلکہ مزید درخواست یہ ہے کہ جو حضرات محض مجدد کے نام سے ناراض ہو کر استفادہ کے دروازہ کو اپنے اوپر بند کر لینا چاہتے ہون، وہ مجدد مانے بغیر ہی اعتقاد و عناد دونون سے خالی الذہن ہو کر حضرت کی تجدیدات نہ سہی اصلاحات پر غور فرمائین اور اُن مین جو مسامحات نظر آئین، اُن سے بھی مطلع فرمائین تاکہ اُن کا بھی ازالہ ہو سکے، کیونکہ معصوم تو بہر حال حضرت نہ تھے، اور اپنی تصنیفات کی اصلاح کے لئے خود ترجیح الراجح کا ایک مستقل باب کھول رکھا تھا، معارف مین "قومیات و سیاسیات" کا جو باب شائع ہوا ہو اُس کو حضرت کے بہت سے ایسے اکابر خلفاء اور اہلِ عقیدت نے جو حضرت ہی کی طرح لیگ یا کانگریس کے اکھاڑون سے عملاً کنارہ کش تھے بالاستیعاب اور توجہ سے ملاحظہ فرما کر الحمد للہ بڑی حد تک اپنی تصویب و توثیق سے ہمت بخشی ہے البتہ بعض حضرات نے کچھ جزئی ترمیمات کا مشورہ دے کر شکر گذار فرمایا ہے جس سے انشاء اللہ اصل کتاب مین استفادہ ہوگا، والاجر عند اللہ۔

تعلیم کا مطلب فرنگی دجل کے اس دور کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اکثر سیاہ کو سفید اور زنگی کو کافور کا نام دے کر پروپگنڈے کا ڈھول اس زور سے پیٹا گیا ہے، کہ اس کے مقابل دوسری آواز کان پڑی سنائی نہین دیتی، یہی برعکس نام نہند زنگی کافور کا معاملہ تعلیم کے ساتھ ہوا ہے، کہ یہ لفظ سنکر بے ساختہ

ذہن اسی نام نہاد نظام تعلیم کی طرف جاتا ہے جس کا جال کروروں، اربون کے مصارف سے اسکولون، کالجون اور یونیورسٹیون کی سر بفلک عمارتون کے اندر ساری دنیا مین پھیلا دیا گیا ہے حتی کہ تعلیم یافتہ سے مراد اب اسی تعلیم کا حامل اسفار ہوتا ہے، اس لئے حضرت مجدد وقت کی تعلیمی تجدیدات و اصلاحات کا محل و مقام سمجھنے کے لئے ذرا خود تعلیم کا صحیح مطلب سمجھ لینا مقدم ہے،

تعلیم کے صحیح معنی "متعلم کو اس کے مقصد وجود اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے علم عطا کرنا ہین" لیکن تعلیم جدید نے انسان کو اپنے اور کائنات کے وجود کا جو علم و تصور عطا کیا ہے، وہ یہ کہ سارا کارخانۂ عالم بس ایک خودرو جنگل ہے، جس کا کوئی باغبان نہین، جس نے برگ و بار اشجار و اثمار کو کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھ کر قصد و ارادہ کے ساتھ لگایا ہو، اس جنگل مین طرح طرح کے خودرو جانور چرند و پرند بھی بھرے ہین جن مین سے ایک انسان بھی ہے، البتہ وہ سب سے اعلیٰ درجہ کا حیوان (Higher animal) یا سب سے بڑھیا جانور ہے، مگر ہے جانور ہی، اور اس جنگل کے دیگر خودرو نباتات و حیوانات کی طرح اس کو بھی کسی دیدہ و دانستہ مقصد سے نہین پیدا کیا گیا ہے، اس لئے اس کے حق مین تعلیم کے یہ معنی بھی بالکل بے معنی ہین، کہ وہ نام ہے اس کے کسی خاص مقصد اور تکمیل مقصد کی علم آموزی کا،

انسان اور کائنات کے متعلق اس علم و تصور کی منطق کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، کہ جنگل کے دوسرے جانورون کی طرح یہ بھی زندگی کی ساری تگ و دو اور کشمکش، کھانے پینے رہنے سہنے اور جینے جنانے (یا توالد و تناسل) کی نذر کردے، البتہ چونکہ یہ اعلیٰ درجہ کا جانور ہے، اس لئے اس کی بود و ماند کے سامان بھی قدرۃً اعلیٰ درجہ کے ہون گے، جانور اگر بھٹ مین رہتے ہین، تو یہ بنگلہ مین رہے، وہ اگر چر چگ کر کھاتے ہین، تو یہ میز کرسی پر کھائے وہ اگر توالد و تناسل کے وظائف سیدھے سادے فطری طریقون سے انجام دیتے ہین، تو یہ اُن کو کوک شاستر کا آرٹ بنا دے،

غرض جب انسان من حیث انسان کا نہ کوئی جداگانہ مقصد و مقام ہے، نہ ماضی نہ مستقبل یعنی نہ ماضی کی طرف اس کی آفرینش مین کسی کی مرضی و مشیت یا قصد و ارادہ کو دخل جس کی بنا پر اس کے وجود کا کوئی خاص مقصد و مراد یا مطلب و معنی ہون، نہ مستقبل مین اس کی موجودہ زندگی کا کوئی حساب کتاب یا جزاء و سزا، تو اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے، کہ وہ آغاز و انجام سے یکسر بے پروا ہو کر تمام تر اسی سامنے کی مادی و فانی زندگی کے ماکولات و مشروبات، شہوات و رغبات، جاہ و جلال، آرایش و نمایش، کبریائی و سربلندی کے انفرادی و اجتماعی مقابلہ و مسابقت مین سرتاپا غرق رہے، اور اسی کو تعلیم و تہذیب، ترقی و تمدن کا کمال جانے،

ساتھ ہی چونکہ اس اعلیٰ درجہ کے جانور (انسان) مین اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت بھی ہے، اس لئے بالآخر ادنیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کرکے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن جاتا ہے، اور اس بے لگام عقل و ذہانت کی بدولت ایک طرف ذہنی و دماغی عیاشیون کا شکار ہوتا ہے، اور دوسری طرف طرح طرح کی ایجادات و اختراعات سے حیوانی و جسمانی راحت و زینت، تعلّی و ترفع کے سامان مہیا کرتا ہے، پھر قدرۃً اسی میدان مین افراد و اقوام سب کی دوڑ شروع ہوتی ہے، اور ایک دوسرے کو ڈھکیل کر آگے نکل جانے مین بھی اسی اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت سے مطلب برآری کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی مکاریون اور چالاکیون سے کام لیتا ہے اور ان کو سیاسیات و معاشیات وغیرہ کی ظاہر فریب و خوشنما اصلاحات مین تعبیر کرکے زندگی کا نام ہی کافور نہین رکھدیتا بلکہ ایسا مسحور کردیتا ہے، کہ سیاہ واقعاً سفید دکھلائی دینے لگتا ہے، وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا،

لازماً ایسی بے سروپا تعلیم، جس کے تصور مین نہ زندگی کا کوئی سر ہے نہ پیر، نہ ماضی نہ مستقبل، نہ مبدء نہ معاد، وہ قدرۃً محض حیوانی یا مادی زندگی کے تعیش و تفوق کے لئے فرد فرد، قوم قوم اور ملک ملک کو ایک دوسرے کے مقابلہ مین نبرد آزما کردیتی اور انسانی بستیون مین جنگل کے قانون کے سوا کوئی قانون کارفرما نہین رہ جاتا، البتہ جنگل کے جانور سینگ اور پنجے مارتے، یا دانت سے نوچتے پھاڑتے ہین، وہ بھی ایک نے

بہت سے بہت دو چار کو کھا چبا ڈالا لیکن یہ اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ جانور اپنی عقل و تعلیم کے زور سے ایٹم بم کے ایک ہی وار مین شہر کے شہر بوڑھون، بچون، عورتون، بیمارون کی تمیز کے بغیر نیست و نابود کر ڈالتا ہے، اس شتر بے مہار تعلیم کی بدولت ساری زمین شر و فساد سے بھر گئی ہے، جنگون اور خانہ جنگیون نے کسی گوشہ مین امن و امان کا نشان نہیں چھوڑا، جنگ عظیم اور پھر جنگ عالمگیر کے برپا کئے ہوے انفرادی و اجتماعی مصائب ابھی ختم نہین ہوئے، بلکہ روز افزون ہین، کہ تیسری جنگ عالم سوز کے فریق دانت نکال کر نمودار ہو گئے ہین، اور ہاتھ طبل جنگ پر ہے،

ابھی حال ہی مین امریکہ کے ایک وظیفہ یاب امیر البحر کا مضمون شائع ہوا ہے کہ مختلف قومون نے دور دراز فاصلون تک تباہی اور بربادی پھیلانے والے ایسے آلات حرب بنائے ہین، جو روے زمین سے انسانی وحیوانی اور نباتی زندگی کا آخری نام و نشان تک مٹا ڈالین گے" (پاینیر ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء ص ۱۱) اور یہ ساری برکت انھی بڑے نام والے علوم جدیدہ حیاتیات (بیالوجی) جو ثومیات (بیکٹریالوجی) موسمیات (کلائماٹولوجی) وغیرہ کی ہے، جن پر عصر جدید کی تعلیم و ترقی کو سب سے زیادہ فخر ہے،

خود ہمارے ملک ہندوستان مین اسی تعلیم جدید کے سوا قانون کی حاصل کردہ آزادی کی برکات نے چند ہفتے کے اندر ہی کشت و خون کی آزادی کا جو ناقابلِ بیان بازار گرم کر رکھا ہے، وہ آنکھون کے سامنے ہے، سیکڑون ہزارون نہین لاکھون انسان جان و ایمان، جان و مال، عزت و آبرو، وطن و دیار سے محروم کئے جا چکے، سفر و حضر مین کہین امان نہین، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے اور کیا کیا دیکھنا پڑے گا،

تعلیم جدید کا مبلغ پرواز اگر کشت و خون، شر و فساد کے اس وبال و نکال تک بفرضِ محال نوبت نہ بھی آئے، تب بھی تعلیم جدید کا رتا ص (ریکالم)، اپنے بے آغاز و بے انجام تصور تعلیم کی رو سے قدرۃً صرف نفسانی وحیوانی زندگی، لذت و مسرت جاہ و مال کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے، علم و تعلیم کے اس "مبلغ پرواز" کا ایک دلچسپ تجربہ خود حضرت علیہ الرحمہ نے اپنا نقل فرمایا ہے کسی مقام پر حضرت کی،

"ایک انگریز جنٹ سے اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی، وہان گفتگو مین اوس نے پوچھا کہ ہم نے سنا آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے، تو آپ کو کتنا روپیہ ملا، حضرت فرماتے ہین کہ مین نے دل مین کہا کہ واہ واہ بس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمح نظر، جب مین نے کہا کہ کچھ نہین ملا تو بڑے تعجب سے پوچھا، کہ اتنی بڑی کتاب لکھی، اور کچھ بھی نہ ملا تو پھر کیا فائدہ اتنی محنت ہی کیون کی ،۔۔۔۔۔ خیر مین نے اس کے مذاق کے مطابق اس کو سمجھایا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے، ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانون کے اعتقاد مین ایک دوسری زندگی بھی ہے، وہان ایسے کامون کا عوض ملنے کی ہم کو توقع ہے"

یہ تو صاحب کے مبلغ علم کی سمجھ مین کیا آتا، البتہ آگے جب حضرت نے فرمایا کہ

"دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے کہ مین نے یہ تفسیر اپنے بھائی مسلمانون کے فائدہ کے لئے لکھی ہے جب اپنے بھائیون کے ہاتھ مین دیکھتا ہون تو خوشی ہوتی ہے، کہ میری قوم کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے، چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کی تھی، اس کے نظر مین میری بڑی وقعت ہوئی، غرض جو روپیہ پیسہ اور جاہ کو مقصود سمجھے گا، وہ ضرور ایسے شخص کو کہے گا، کہ بڑا بے وقوف ہے کہ محض دین کے لئے اپنا جاہ و مال سب برباد کر دیا،

(وعظ طریق القلندر ص ۲۵ و ۲۶)

لاکھوں کروڑون کے سامانون او فلک بوس ایوانون کے اندر بڑے بڑے دعوون کے ساتھ آج کل جو تعلیم دیجاتی ہے، بھلا بتلائے کہ اس کا مبلغ پرواز اس فانی و مادی زندگی کے جاہ و مال لذت مسرت کے سوا کیا ہے، بہت بلند اڑے تو انفرادی سے آگے اجتماعی، یا قومی و ملکی، یا زرے زبانی دعوون مین اور بھی اونچے اڑے، تو ساری انسانیت کے لئے انھین چند روزہ حیوانی منافع و نفسانی لذات کو مطمح نظر بنا لیا، جب فرد قوم یا انسان زیادہ سے زیادہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے، اور دیگر حیوانات کی

طرح کھا پی کر مر جانے کے سوا اوس کا کوئی اور انجام نہین، تو پھر اس کی تعلیم مین زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی لذات و فوائد فراہم کرنے سے آگے نظر آخر جا ہی کیسے سکتی ہے، خواہ اس کا نتیجہ بالآخر اعلیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کرکے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن کر خود اس دنیاوی زندگی کی خودکشی اور اس کے امن و امان بلکہ ساری آبادی کی بربادی کی صورت مین ظاہر ہوا،

سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے تصور مین انسان نہ نرا اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے، نہ اسلام کا تعلیمی تصور اوس کی عارضی و ضمنی حیوانیت کو ترقی دے کر اس کو اعلیٰ درجہ کا شیطان بنانا چاہتا ہے، انسان انسان ہے، اور اس کی تعلیم کا مقصد اس کو انسان کامل بنانا ہے، اسلام کی نگاہ مین انسان کی اصلی انسانیت نفخت فیہ من روحی والی الٰہی روحانیت ہے، اس روحانیت کے مطالبات اتنے اعلیٰ و نامحدود ہین، کہ ان کی سمائی دنیا کی ادنیٰ و محدود زندگی مین ناممکن ہے، وہ اس زندگی کو آغاز و انجام سے ناآشنا، یا ماضی و مستقبل سے غیر مربوط لایعنی و عبث قرار نہین دیتا، بلکہ اس فانی و محدود کا دامن ایک غیر فانی و غیر محدود ذات و انجام سے بندھا ہوا ہے، واللہ خیر و ابقیٰ والآخرۃ خیر و ابقیٰ اور دینی تعلیم کا مقصد دنیاوی زندگی کو اسی خیر و ابقیٰ کے شایان شان بنانا ہے، نہ کہ انجام و منزل سے آنکھین بند کرکے خود راستہ ہی کو منزل بنا لینا، اور اس طرح خوردن برائے زیستن، اور پھر زیستن برائے خوردن کے چکر مین جان دیدینا، جس کو راقم نے اس گندی زندگی کے مناسب گندی مثال مین طعام خانہ اور پاخانہ کے درمیان چکر کاٹنے کی زندگی کہا کرتا ہے، کہ کھانا اور ہگنا، اور پھر کھانا اور پھر ہگنا، اور یہی کرتے کرتے جانورون کی طرح مر جانا، اور کبھی یہ سوال تک نہ پیدا ہونا کہ کھانا پینا سب کچھ ہمارے لئے، تو ہم آخر کس لئے؟ دین اور تعلیم دین دراصل اسی سوال کا جواب ہے، کہ ہمارا حقیقی مقام و مطلب [illegible] اس کائنات مین کیا ہے، یا بالفاظ دیگر تمام علوم و فنون *place in nature*۔ کا موضوع انسان کی اس دنیوی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ کی مادی و حیوانی ضروریات و حاجات کو

پورا کرنا ہے، اور علم دین کا موضوع (بلکہ دین کی نگاہ میں علم نام ہی اس کا ہے جس کا موضوع) خود اس زندگی کا مقصد و منتہی متعین کرتا ہے، اور دینی تعلیم کا مقصد اسی مقصد و منتہی تک پہنچانا ہے، انّ لکم نہایۃً فانتھوا الی نہایتکم،

اصل میں تو یہ گفتگو اور زیادہ تفصیل و تطویل کی طالب ہے، جو انشاء اللہ مستقلاً اپنے موقع پر ہوگی یہان مختصراً اہلِ بصیرت کے لئے چند اشارات عرض ہیں،

۱- انسان اور کائنات کی فطرت و ساخت میں ایک اعتبار سے بڑا تضاد ہے، انسان کی الٰہی یا روحانی فطرت خیرِ مطلق، بقاے دوام اور نامحدودیت کی طالب ہے، حتی کہ لباس و طعام مسکن و قیام کی خالص نفسانی و حیوانی لذات و حاجات تک جن میں دیگر حیوانات اپنی جبلت کی بندھی ہوئی راہ پر کھا پی کر مرجاتے ہیں، ان میں بھی انسان کسی ایک نقطہ پر چین نہیں لیتا، نہ کسی نقص و شر کو باقی رہنے دینا چاہتا، بلکہ کامل سے کامل تر اور خوب سے خوب تر کی دھن میں لگا تار رہتا ہے، کہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہان اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہان

لیکن کائنات کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے، کہ یہان کی ہر شئے محدود و فانی، اور ہر چیز کے ساتھ شر توام ہے، جو خود اس بات کی فطری دلیل ہے، کہ انسان کی یہ زندگی کسی اور زندگی کی طالب ہے، جہان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہیئے، کہ انسان کی مشیت نامحدود ہو جائے، جو یہ چاہے وہ ہو، جو مانگے، وہ پائے، ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون اور یہ زندگی اُسی نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے، نہ کہ خود منزلِ مقصود، اور راستہ کی کامیابی یہی ہے کہ نظر کسی وقت بھی منزل سے روگردان نہ ہو، نہ کوئی قدم بے راہ پڑے،

۲- اب اگر انسان کا کوئی عقلمند قافلہ منزل کو فراموش کر کے راستہ یا مسافرخانہ ہی کی راحت و لذت کے مقابلہ و مسابقت میں لڑ لڑ کر جان دیتا ہے، تو اس کی منزل معلوم، راستہ بہرحال راستہ ہے،

اس مین منزل کی کامل آسودگی کی فکر حماقت کے سوا کیا ہے، اس طرح انسانون کے مختلف افراد اور قافلے (و اقوام) اپنی فطرت کے نامحدود مطالبات کا سارا زور اگر اس دنیا کے جاہ و مال کے محدود مطلوبات و لذات پر لگا دین، تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بڑی اور کتون کی جنگ اور خودکشی کے سوا کیا نکل سکتا ہے

نسوا اللہ فانسا ھم انفسھم،

پس یہ دو باتین اگر سمجھ مین آجائین، تو اسلامی تعلیم کی اس بنیاد کو سمجھ لینے مین بھی کوئی دشواری نہ ہوگی، کہ اس کا اصلی مقصود مستقبل کی اُس "خیر و ابقیٰ" زندگی کی فلاح و کامیابی ہے، جو انسانی فطرت کے اعلیٰ و حقیقی مطالبات کی کامل آسودگی کا مظہر ہوگی، اور موجودہ زندگی کی حیثیت مقصود کی نہین، بلکہ وسائل کی ہے، اور اس وسیلہ کو مقصود بنانا ویسی ہی خودفریبی و نادانی ہے، جیسے بخیل آدمی خود مال کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے عزت و راحت سب کچھ بلکہ جان تک گنوا دیتا ہے، اور نتیجہ الٹا یہ ہوتا ہے، کہ روپیہ پیسہ جس عزت و راحت کا وسیلہ تھا، اسی سے محروم رہتا ہے، ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون،

یہی خسر خدا، یہ آخرت کو فراموش کرکے جاہ و مال پر جان دینے والی تعلیم کا آنکھوں کے سامنے ہے کہ خود دنیا بھی اس کی بدولت آخر کار جہنم بن کر رہی، افراد و اقوام سب اسی جاہ و مال کی آتش رقابت مین بھسم ہوتے جاتے ہین، اور قلب کا آرام و اطمینان یا دل کا سکھ چین نہ حکومت و وزارت کی کرسیون کو نصیب، نہ صنعت و تجارت کے کارخانون اور کوٹھیون مین ہے کیسے سینہ مین ھل من مزید کی بھٹی دہک رہی ہے، ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا

راز یہی ہے کہ جب مطلوب قلیل و محدود ہو، اور طلب کثیر و نامحدود ہو تو اہل طلب میں رقابت و مزاحمت ناگزیر ہے، دنیا کا حال یہی ہے کہ یہ اور اس کی ہر شے جاہ و مال، حکومت و تجارت، لذت و راحت، سب ہی انسان کے نامحدود مطالبات کے مقابلہ مین نہایت محدود، اس لئے اگر سارا زور

ان ہی کی مطلوبیت پر صرف کر دیا جائے، اور تعلیم یہ ہو کہ اس فانی و محدود زندگی کے ان فانی و محدود مسلوبات کے سوا نہ آگے کوئی "خیر و ابقی" مطلوب ہے، نہ خیر و ابقی زندگی، بس جو کچھ ہے، یہی محدود و ناقص دنیا، اور یہی ناقص و فانی زندگی جس کو جو کچھ لینا ہے، یہیں لیلے، تو یہ جنگ و فساد جنگی کا علانیہ اعلان و مبارزت نامہ نہیں تو اور کیا ہے،! اور اسی راستہ پر چل کر بالآخر اگر ساری زمین قومی و بین الاقوامی کارزار کا میدان بن گئی، تو تاسف جتنا ہو، لیکن تعجب کی کیا بات ہے،

پھر اس اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے، کہ اُلٹے دین کی تعلیم ہی کو شر و فساد کی جڑ متہم کر دیا گیا، جو اس محدود و فانی دنیا کی محدود و فانی مطلوبات و لذات سے انسان کی نظر کو اونچا کر کے اس کی اصلی فکر و عمل کی عنان کو باقی و نا محدود کی طرف موڑ دینا چاہتی ہے، کیونکہ خدا و آخرت ہی ایک ایسا غیر فانی و غیر محدود مطلوب ہے، جو ایک طرف انسان کی غیر محدود طلب کی تمام و کمال تشفی و آسودگی کا ضامن ہو سکتا ہے، اور دوسری طرف اس دنیا کے فانی و محدود حیوانی و مادی مطلوبات و لذات سے نظر کو اونچا کر کے جاہ و مال تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کی باہمی عداوت و رقابت اور روز روز کے فساد و خونریزی سے نجات بخش سکتا ہے، اس لئے کہ خدا و آخرت دنیاوی دولت و حکومت کی طرح کوئی ایسی حقیقت نہیں کہ اگر ایک حصہ پر کسی ایک کا قبضہ ہو جائے، تو دوسرے کے لئے اس سے بھی زیادہ بلکہ زیادہ سے زیادہ کی گنجایش نہ رہے، تو پھر لڑائی جھگڑے کی گنجایش کہاں،! نہ دین نے دنیاوی حکومت و تجارت لذت و راحت، جاہ و مال مین تفوق و برتری کے لئے جنگ و جدال کی اجازت دی ہے، بلکہ اس کی جنگ تو صرف انہی لوگون سے ہے، جو انسان کو اس کے مطلوب و مقصود خدا و آخرت کی راہ سے روک یا کج راہ کر کے تمام تر مادی و نفسانی لذات و مطلوبات مین فنا کر کے انسان کو انسان کے بجائے حیوان بنا دینا چاہتے ہین، اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَیَبْغُوْنَھَا عِوَجًا وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ،

باقی جو لوگ دین کا نام لے کر دنیا ہی کے مقاصد کے لئے لڑتے مرتے اور زمین مین فساد برپا کرتے ہین، وہ دین کی نگاہ مین خالص دنیا پرستون سے بھی بڑھ کر مجرم ہین، کہ خدا کی باتون کو کوڑیون کے دام فروخت کرتے ہین، (یشترون بآیات اللہ ثمناً قلیلاً) اور اگر کوئی زہر کا نام تریاق رکھ کر پینا پلانا شروع کردے، تو نتیجہ زہر ہی کا برآمد ہوگا، تریاق کا کیا قصور، دین سچ پوچھئے تو زیادہ تر صرف اپنے دوست نما دشمنون ہی کے ہاتھون بدنام ہوا اور ہو رہا ہے"!

غرض دیکھا جائے تو ہمارے موجودہ انفرادی و اجتماعی مصائب و مفاسد مین سب سے زیادہ حصہ اسی موجودہ نظام تعلیم ہی کا ہے، جس نے خدا و آخرت کی مطلوبیت و مقصودیت کو عملاً زندگی سے خارج کرکے صرف جاہ و مال حکومت و تجارت اور نفسانی و حیوانی لذت و راحت کو انسان کا مطمح نظر اور مبلغ پرواز بنا دیا ہے، محرومیت قلب کی نوبت یہان تک پہنچی ہے، کہ افراد کی بیدینی و الحاد پسندی سے گذر کر اب حکومتیں اپنا سب سے بڑا دانشمندانہ کارنامہ یہ قرار دیتی ہے، کہ اپنے بیدین یا لادینی (Secular) ہونے کا فخریہ اعلان و تبلیغ کرتی رہین، جو اپنے دین کو پہلے ہی سے کھو چکے ہین، وہ گمراہی مین جتنی دور بھی نکل جائین، چندان تعجب نہ تھا، غم و غصہ تو اپنے حال پر ہے، جو زندہ و پایندہ دین کی شاہراہ پر (صراط مستقیم) پر کھڑے ہو کر لوگون کو اس کی طرف بلانے کے بجائے خود اُن کی آواز مین آواز ملانے اور راہبری کا منصب چھوڑ کر گمراہون کے پیچھے چل پڑے ہین، فَمَا ذا بعد الحق الا الضلال،

اس گم کردہ راہ دنیا کے از سر نو راہ پر آنے کی فقط ایک ہی صورت ہے، کہ قدرت کی طرف سے راہنمائی کی مشعل جس امت کے ہاتھ مین دی گئی ہے، پہلے وہ خود خداشناسی و آخرت طلبی کی شاہراہ پر آگے ہو اور اس کی فقط ایک ہی صورت ہے، کہ خداشناسی و آخرت طلبی کی تعلیم و تربیت اور ساتھ ہی تبلیغ کا ایسا جامع و محیط نظام اختیار کیا جائے، جو امت مبعوثہ کے عوام و خواص

زن و مرد، پڑھے اور ان پڑھے سب کو حاوی وحیط ہو، حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کے ہاتھون اللہ تعالیٰ نے دین کی تعلیم وتبلیغ دونون کی ایسی ہی جامع وحاوی تجدید فرمادی ہے، کہ اس کے قبول وعمل کے بعد نہ کوئی طبقہ انشاء اللہ محروم رہ سکتا ہے، نہ کوئی فرد،، نظام تبلیغ کی اصلاح وتجدید کی اس جامعیت کا اندازہ اہل نظر الفرقان کے مضمون، تجدید تبلیغ سے فرما سکتے ہین، اور تجدید تعلیم کی اصلاحی جامعیت کا اندازہ اوراقِ ذیل سے فرمایا جائے، لیکن ثمرات باغبانی کی کسی بہتر سے بہتر خالی کتاب کے پڑھ لینے سے حاصل نہین ہوسکتے، وہ تو اصول وقاعدہ کے موافق باغ لگانے ہی سے حاصل ہون گے، ان اصول وقواعد کی تفصیل وتجدید آگے ملاحظہ ہو،

اوپر تعلیم الدین، اصلاح انقلاب، اور بہشتی زیور کے مضامین کی تفصیل سے اتنا بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کا پیش نہاد جامع وکامل دین کی جامع وکامل اصلاح وتجدید تھی، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت کے ہاتھون اوس کو بوجہ اتم پورا فرما کر امت پر اتمام حجت فرمادیا، خود حضرت بطور تحدیث نعمت فرمایا کرتے تھے، کہ الحمدللہ دین وطریق صدیون کے لئے صاف وبے غبار ہوگیا، اب بڑا سوال یہ ہے کہ اس تجدید یافتہ کامل وجامع دین کی تعلیم وتبلیغ امت کے سارے طبقات، عوام وخواص ذکور واناث مین کیونکر ہو، جیسا کہ اوپر اصلاح انقلاب مین معلوم ہوا، مسلمانون کے دینی وروحانی امراض کے بنیادی اسباب حضرت علیہ الرحمہ کی تشخیص کی رو سے دو ہین، بڑا اور پہلا سبب قلتِ علم یعنی علوم واحکام دین سے بے خبری ہے، ظاہر ہے کہ آدمی اپنے بُرے بھلے کو اگر جاننے کی طرح جان لے، تو جان بوجھ کر اپنے نفع وضرر سے کون بے پروا ہو سکتا ہے، سقراط نے تو اسی بنا پر تعلیم اخلاق کا اصل الاصول یہی قرار دیا تھا، کہ "علم ہی نیکی ہے" غرض دین کی تعلیم وتبلیغ کے نظام مین بھی ایسی جامع وہمہ گیر اصلاح وتجدید کی حاجت تھی، کہ اگر اس کے مطابق انتظام کر لیا جائے، تو کسی طبقہ اور کسی فرد کے لئے بھی بجز اپنی کوتاہی، وکم نصیبی کے محرومی کا کوئی جائز عذر نہ رہ جائے لہٰذا تجدید دین ہی

کا ایک جزیہ تھا، کہ دین کو لوگون تک پہنچانے یا اس کی تعلیم و تبلیغ کی صورتون اور انتظامات مین ضروری اصلاح و تجدید کے ساتھ اُن کو آسان سے آسان تر کر دیا جائے، پھر بھی اگر لوگ متوجہ نہ ہون تو (فانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین)

تعلیم و تبلیغ کی ان اصلاحی و تجدیدی صورتون اور تدبیرون کا کچھ ذکر اصلاح انقلاب کی ابتدا مین گذر چکا ہے، اس کے علاوہ ایک مستقل رسالہ اسی موضوع پر حقوق العلم کے نام سے اور کئی وعظ آداب و تبلیغ الدعوۃ الی اللہ وغیرہ کے نام سے ہین، آگے اُن پر مختصر گفتگو ہے،

علم دین کے دو درجے فرض عین و فرض کفایہ

جس طرح دنیوی تعلیم کے دو معیار یا درجات قرار دیئے جاتے ہین، ایک لازم (کمپلسری) جس سے کسی فرد کو مستغنی و مستثنیٰ نہین سمجھا جاتا، اور دوسرا اوس کے اوپر کا درجہ جس مین خاص خاص ضرورتون کے لحاظ سے مختلف علوم و فنون داخل ہوتے ہین، اسی طرح دینی تعلیم کی بھی ایک مقدار لازم و واجب ہے جس سے کسی دینی زندگی بسر کرنے والے کا استغنا و استثنا جائز نہین، یعنی زندگی کے مختلف شعبون کے وہ ضروری شرعی احکام جن سے کم و بیش سب کو سابقہ پڑتا ہے اس کی نسبت ارشاد ہے،

"علم دین کی دو مقدارین ہین، ایک یہ کہ ضروری عقائد کی تصحیح کیجائے، فرض عبادتون کے ضروری ارکان و شرائط و احکام معلوم ہون، معاملات و معاشرات مین جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے، ان کے ضروری احکام معلوم ہون، مثلاً نماز کن چیزون سے فاسد ہو جاتی ہے، قصر کتنے سفر مین ہے، زکوٰۃ کن اموال مین واجب ہے، نکاح کن عورتون سے حرام ہے، رضاعت سے کون کون رشتے حرام ہو جاتے ہین، اجرت ٹھہرانے مین کون صورتین جائز ہین، کون ناجائز، لباس کون حلال ہے، کون حرام،

ے تبلیغ کا حصہ الفرقان مین ملاحظہ ہو،

نوکریان کون جائز ہین، کون ناجائز (اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز مین مبتلا ہو مگر ناجائز کو ناجائز سمجھے گا، اور دو جرمون کا مرتکب نہ ہوگا، ایک تو ناجائز کا ارتکاب دوسرے اس کو جائز سمجھنا) اگر کوئی صاحب حکومت ہے تو اس کو فیصلۂ مقدمات کے شرعی قوانین کا علم بھی ہونا چاہئے، گو ان کے نافذ کرنے پر قادر نہ ہو، مگر جاننا اس لئے واجب ہے کہ شرعی فیصلون کے ناحق اور غیر شرعی کے حق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے"

اس زمانہ مین مسلمان حاکمون کو غیر اسلامی قوانین کے تحت فیصلے کرنا پڑتے ہین، اُن کے لئے یہ امر کتنا ضروری ہے، کہ کم از کم اپنے اعتقاد ہی کو درست رکھ سکین، تاکہ نفعل و نستغفر کے درجے سے تو نہ گر جائین۔

"ماکولات و مشروبات مین کیا جائز ہے، یا ناجائز اسباب تفریح مین کس کا استعمال درست ہے کس کا نادرست" باطنی اخلاق مین محمود و مذموم کا امتیاز، ریا و کبر، ظلم و غضب، حرص و طمع وغیرہ کی حقیقت اور ان کے علاج کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ اپنے اندر ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو سکے، اور ہونے کی صورت مین ان کے ازالہ کی تدبیر کر سکے، اور کوتاہی پر استغفار کرے"

"غرض علم دین کی یہ مقدار عام طور پر ضروری ہے، کیونکہ بدون اس کے حق تعالیٰ کی ناراضی اور معصیت مین مبتلا ہونا پڑے گا"

"وہ مسلمان جو آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلاتے ہین، اپنے دینی احکام کی مقدار واجب تک سے ان کی لاعلمی کا یہ حال ہے، کہ حضرت فرماتے ہین، کہ حقیقی بھانجے کی لڑکی سے نکاح حلال جاننے والا مین نے خود دیکھا ہے، باقی نوکری، لباس اور اسباب تفریح مین تو ایسے صاحبون کے نزدیک کوئی چیز ممنوع ہے ہی نہین، اور اخلاق مین بجز تفاخر مسلمانون کی تحقیر اور حرص دنیا کے جس کا نیا لقب ترقی ہے، اور کچھ سیکھا ہی نہین ہے"

"دوسری مقدار یہ ہے کہ اپنی ضروریات سے تجاوز کرکے مجموعۂ قوم کی ضرورتوں پر لحاظ کرکے نیز دوسری قوموں کے شبہات اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے، اس پر نظر کرکے ایک ایسا وافی ذخیرہ معلومات دینیہ مع اس کے متعلقات ولواحق اور آلات وخوادم علوم کے جمع کیا جائے، جو مذکورہ ضرورتوں کے لئے کافی ہو"[1]

"پہلی مقدار فرض عین تھی، اور یہ دوسری فرض کفایہ ہے، فرض عین کا حکم یہ ہے، کہ ہر ہر فرد انفرادی طور پر اس کا مکلف ہے، جو اس میں کوتاہی کرے گا، گناہگار ہوگا، اور فرض کفایہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ہر مقام میں ایک ایسی جماعت موجود ہے، کہ ان ضرورتوں کو پورا کرسکے، تو سب مسلمان گناہ سے بچے رہیں گے، ورنہ سب مسلمان گناہ میں شریک ہوں گے"

بقدر واجب علم دین کے حصول کی آسان تدبیر

اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ علم دین کی جس مقدار کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے، وہ اتنے کم وقت کی طالب ہے، کہ حریص سے حریص طالب دنیا

---

[1] ایک نامی گرامی درس گاہ خاص طور پر یہی مقصد لے کر اٹھی تھی، لیکن افسوس کہ ایک طرف تو اس کی باقاعدہ تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں، سارا سرمایہ سُنی سنائی، یا سطحی واخباری باتیں ہیں، باضابطہ درس میں وہی فرسودہ ونا تمام نصاب کا چرخہ چلایا جارہا ہے، یا نری زبان کی حد تک معمولی انگریزی شریک کردی گئی ہے، جس سے حال وقال میں ایک طرف فرنگیت کے رجحانات کو تقویت ہوتی ہے، دوسری طرف دنیا طلبی کا ایک ارزاں راستہ اسی دینی درسگاہ سے ہو کر بھی نکل آتا ہے، ان مفاسد ومضار کو خود ذمہ دارا کابر نے بھی محسوس فرمایا، مگر آگے آئی آیت، متعدد بار عرض کیا گیا، کہ اگر اصل مقصد جدید علوم عقلیہ کی صحیح ومستند کتابوں کی تعلیم اور اُن سے پیدا ہونے والے شبہات کے مقابلہ کے لئے طلبہ کو تیار کرنا ہے، تو جامعہ عثمانیہ کی بدولت ایسی مستند کتابیں خود اردو میں منتقل ہوگئی ہیں، جن کی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے، اور انگریزی کو ایسی صورت دیجا سکتی ہے جس سے ایسی کتابوں کے خود انگریزی میں مطالعہ کی استعداد پیدا ہوسکے" (باقی آیندہ ص ۱۸۵ پر)

کی دنیا طلبی یا آج کل کی نام نہاد ترقی مین کسی درجہ مین بھی مانع و مخل نہین ہو سکتی، راقم احقر تجربہ کی بنا پر عرض کرتا ہے، کہ ساری عمر مین صرف دو تین مہینے وہ بھی پورا وقت نہین، صرف دو تین گھنٹے روزانہ اگر جی لگا کر دیدیئے جائین، تو اس فرض عین کی ادائی کے لئے بالکل کافی ہین، یعنی دنیا وی علوم کے طالب اور ترقی کے خواہان اگر اپنی دس بارہ سال کی طالب علمانہ زندگی مین صرف ایک سال کی بڑی تعطیل کے صرف دو تین گھنٹے روزانہ حضرت کی تجاویز کے مطابق حضرت ہی کی کتابون کے ذریعہ علم دین کی طلب مین صرف کر دین، تو آجکل کے نام نہاد سند سے بھاگنے والے مولویون کے مقابلہ مین نہ صرف دین کے مسائل و معلومات کی حد تک بلکہ انشاء اللہ فہم دین اور تعلق مع اللہ مین بھی کمتر نہین، برتر ہی رہین گے،

ابھی عین اس تحریر کے دوران مین ایک تازہ تجربہ ہوا ہے، کہ ایک طالب صادق تین مہینے کی نیت سے احقر کے پاس آکر مقیم ہو گئے ہین، صبح دو گھنٹے کے لئے مدرسہ فرقانیہ کلام مجید کی تصحیح کے لئے جاتے ہین، تیسرے پہر ایک بچے کو بڑھاتے ہین، باقی وقت احقر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق حضرت کی کتابون کا مطالعہ کرتے ہین، اور عصر و مغرب کے مابین راقم کے پاس بیٹھکر اس مطالعہ مین اگر کچھ شبہات رہ جاتے ہین، ان کو صاف کر لیتے ہین اور اسی سلسلے مین کچھ گفتگو ہو جاتی ہے، ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے، کہ ایک طرف

(باقی حاشیہ ص ۱۸۴) مزید برآن ایک خاص دور کے بعض حالات و باقیات کی بنا پر کچھ ایسی سمیت اس درسگاہ مین سرایت کر گئی ہے، کہ اب تک خود اس کے طلبہ کے اعمال ہی مین نہین عقائد مین بھی سستی باقی ہے، تو دوسرون کو یہ کیا چستی بخشیں گے، نفس دینی احکام کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ حضرت مجدد نے جس مقدار کو عامی کے لئے واجب ٹھیرایا ہے اس کی توقع وہان کے عالم سے بھی بمشکل کیجا سکتی ہے، بلکہ فقہی مسائل کا تو ایک گونہ قلب مین احتقار و استخفاف ہوتا ہے، مستثنیات کا اعتبار نہین ورنہ عام حالت یہی ہے، جو وہین کے اساتذہ کی شہادت اور خود اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ذاتی طور سے بھی سالہا سال تک عرض کیا گیا اور یہان حسب موقع اس لئے عرض کیا کہ کاش ان باتون کی اصلاح کی طرف اب بھی کسی کو توجہ ہو سکتی، تو حضرت مجدد کی تعلیمی تجدید و اصلاح کا ایک بڑا کام ہو جاتا،

بحمد اللہ پارۂ عم نصف سے زائد صحت مخارج کے ساتھ حفظ کر چکے ہین، جس سے قرأت نماز بقدر واجب صحیح ہو گئی، جو ہمارے سندی مولویوں مین بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ کتنوں کی ہوتی ہے، دوسری طرف تعلیم الدین بہشتی زیور، اور بہشتی گوہر کے ضروری حصے ذاتی مطالعہ اور احقر سے رفع شبہات کے ساتھ قریب ختم ہین، کچھ ملفوظات بھی روزانہ پڑھ لینے کی ہدایت ہے، اس کے بعد چالیس مواعظ، یہ پورا نصاب انشاء اللہ تین مہینے کے اندر ہی پورا ہو جائے گا، اسی دوران مین ضروری مسائل و معلومات کے ساتھ حضرت کی کتابون خصوصًا ملفوظات کی برکت سے دماغ دین کی فہم اور دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا بھی کچھ نہ کچھ لذت آشنا ہو چلا ہے،

اب انگریزی اسکولون، کالجون مین پڑھنے پڑھانیوالے جو طلبہ و اساتذہ اپنی صرف ایک سال کی ایک تعطیل اور عام مسلمان ساری زندگی مین دو تین مہینے بھی ایک ساتھ یا حسب فرصت متفرق اوقات مین آخرت کی ابدی زندگی و فلاح کے لئے نہین دے سکتے، وہ اپنے ہی گریبان مین سر ڈال کر سوچین، کہ ایسی صورت مین کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہنے، اور خدا و رسول کو سچا جاننے، اور ان پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہین، یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ تھا،

اصل مطلب یہ ہو کہ جو علم دین فرض عین یا ہر شخص کے لئے فردًا فردًا واجب و لازم ہے، اس کے معنی یہ بالکل نہین کہ ہر شخص کا پورا اور اصطلاحی عالم ہونا لازم ہے، کہ دنیوی یا معاشی مشاغل مین خلل کا عذر و اندیشہ ہو، البتہ سارے مسلمانون کے ذمے،

"یہ انتظام ضروری ہے کہ ایک معتدبہ جماعت ایسی بھی ہو، جو ہر طرح علوم دینیہ مین کامل و محقق ہو اور عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل مین اور ساری عمر اُن کی خدمت و اشاعت مین صرف کرین جس کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہو، قرآن مجید اس آیت مین اسی جماعت کا ذکر ہے، ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون

بالمعروف وینھون عن المنکر، اور حدیثون مین اصحاب صفہ کی یہی مثال ہے"

باقی عام مسلمان اسی جماعت سے تقریراً و تحریراً اپنی دینی ضرورتون کو رفع کیا کرین، جو پڑھنے کے قابل ہین، جیسے بچے یا جو قدرے معاش سے فارغ ہین، اُن کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس جماعت سے سبقاً سبقاً کچھ رسائل عقائد و مسائل کے پڑھ لین، پھر نئے پیش آنے والے واقعات کے متعلق وقتاً فوقتاً اس جماعت سے پوچھتے رہین، اس طرح تھوڑے زمانہ مین بڑا ذخیرہ معلومات کا جمع ہو جاتا ہے، اور جو کسی سبب سے اس طرح نہین پڑھ سکتے وہ کم از کم ہفتہ مین ایک روز گھنٹہ دو گھنٹے نکال کر ایک معین وقت پر کسی سمجھ دار ذی علم سے درخواست کرین، کہ ایسے رسائل پڑھ کر سُنا اور سمجھا دیا کرے، اور ضرورت کے وقت پوچھتے رہنا، یہ تمام عوام، بلکہ علماء کے لئے بھی (جو باتین ان کو معلوم ہو) واجب ہے، پھر ان طریقون سے زبانی یا کتاب کے ذریعہ جب خود احکام پر مطلع ہو لین، تو اپنے اپنے گھر کی مستورات کو پڑھاتے یا سُناتے رہین"

دینی علم کی مقدار واجب کے لئے پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری نہین، سماعت وصحبت سے یعنی کتابین سُن سُنا کر یا اہلِ علم کی صحبت و دینی تربیت سے بآسانی اس مقدار واجب کو حاصل کیا جا سکتا ہے،

کی مرض شناسی اصلی سوال اس مذکورۂ بالا جماعت کے انتظام معاش کا ہے، جن کے لئے علوم دینیہ مین کامل و محقق ہونا ضروری تجویز فرمایا گیا ہے، اور اس لئے عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل مین اور پھر تمام عمر ان کی اشاعت و خدمتِ دین مین صرف کرنا" ضروری ہے، ظاہر ہے، کہ اس طرح ساری عمر خدمتِ دین کی راہ مین نذر کر دینے کے بعد اُن کو کسبِ معاش کا موقع کیسے مل سکتا ہے، اس مشکل کا قدرتی و صحیح اور ساتھ ہی سب سے مفید و آسان حل تو وہی ہے، جس کی طرف ترغیباً و ترہیباً ہر طرح حضرت علیہ الرحمہ نے کثرت سے جا بجا اپنی کتابون اور مواعظ وغیرہ سب مین متوجہ فرمایا ہے کہ امراء کا

طبقہ جو بقدر کفایت معاش کی فکر سے آزاد ہے، اس کے ذمہ زیادہ حق تھا، کہ اپنی اولاد کو اس خدمت کے لئے وقف کرتے، پھر اولاد میں بھی جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم ہو نہ کہ جو سب سے کودن ہو، (ص حقوق العلم) اور جو ہزاروں روپیہ ہندوستان سے لے کر ولایت تک ان کی دنیوی تعلیم پر صرف کرتے ہین، اسی کی آمدنی (کسی جائداد یا کاروبار مین لگاکر) ان کی رئیسانہ و امیرانہ نہ سہی تو متوسط درجہ کی ساری ضرورتون کو کافی ہوسکتی تھی، پھر چونکہ یہ اولاد آسودہ حال گھرانون کی ہوتی، اس لئے قدرۃً ان مین بالعموم وہ دنائت و تنگ نظری وغیرہ بھی نہ ہوتی، جو غریبون مین متوارث ہوتی ہے، اور جس کا راسخ اثر علوم دینیہ کی تعلیم سے بھی دور نہین ہوتا، مگر ظلم یہ ہے کہ امراء خود اپنی اس کوتاہی پر تو نادم نہین ہوتے، کہ جو خدمت دراصل اُن کے کرنے کی تھی، وہ بیچارے غریب غربا کرتے ہین، بلکہ اگر ان غریب گھرانون کے علماء مین کچھ موروثی اثر سے اخلاقی خرابیان رہجاتی ہین، تو ان کی بنا پر الٹے علماء کی ساری جماعت پر لعن وطعن کرتے ہین، یہی نہین، بلکہ ان خرابیون کو نہایت جسارت کے ساتھ نفس دینی و عربی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہین، حالانکہ واقعہ بقول حضرت علیہ الرحمہ کے یہ ہے کہ:-

"اُن غرباء کو انگریزی تعلیم دیجاتی تو اس سے بھی بدتر حال ہوتا، اور امراء و شرفاء کے بچون کو اگر دینی تعلیم کے لئے وقف کیا جاتا، تو ان کے اخلاق و عادات اس سے ہزارون درجہ بہتر ہوتے، جو انگریزی پڑھ کر ہوتے ہین"؛

بات یہ ہے کہ ایک تو امراء پر امارت کے باوجود بالعموم دنیا طلبی کا غلبہ غرباء سے بھی زائد ہے، دوسرے علم دین کی جو وقعت قلب مین ہوتی چاہئے وہ نہین، اس لئے وہ امراء تک:-

"جو دینی مکتب و مدارس قائم کرتے ہین، اسلامی و قومی خیر خواہی کا دعویٰ بھی کرتے ہین، مگر اس کام کے لئے اپنی اولاد کو کبھی نہین تجویز کرتے، اولاد کے لئے ڈپٹی کلکٹری منصفی، سب ججی، و بیرسٹری ہی تجویز ہوتی ہے، اور مولویت کے لئے جس کو بزعم خود ذلیل

کام سمجھتے ہین، ذلیل لوگون کو منتخب کیا جاتا ہے، غور کا مقام ہے کہ جس کام کے لئے غریب لوگ منتخب کئے جائین، اس کی وقعت اُن کے قلب مین کیا ہوگی، اگر یہ کام ضروری و باوقعت ہے، اور اس کا اہتمام کرنا قومی و اسلامی خیرخواہی ہے، تو اس شرف کے لئے خود اپنی اولاد کو کیون نہین تجویز نہین فرمایا جاتا،

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جو کام معزز طبقہ کے ہاتھون مین ہوتا ہے وہ عام نظرون مین بھی معزز و ضروری سمجھا جاتا ہے، لہذا امراء کے ذمہ بہ نسبت غرباء کے زیادہ حق ہے، کہ وہ اپنی اولاد کو اس خدمت کے لئے وقف کر دین، پھر اولاد مین بھی جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم ہو نہ کہ جو سب سے کودن ہو" (ص ۸۰)

علماء و مشایخ کی مہلک خود فراموشی امراء تو خیر امراء ہی ہین، اب تو بڑے بڑے خاندانی علماء و مشائخ تک جو نسلہا در نسل سے علوم دین کے حامل و خادم چلے آرہے ہین، وہ بھی انگریزی دانوان کے مقابلے مین خود اپنے اور اپنے دینی علوم کو عملاً ذلیل و حقیر خیال کرتے، اور اولاد کو دھڑا دھڑ اسکولون کالجون مین پہنچاتے چلے جارہے ہین، اور جب امراء و علماء کا یہ حال ہے تو عوام تو بالعموم ان کے پیچھے چلتے ہی ہین، ان عوام مین بھی خال ہی خال کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا، جو دین، اور علوم دین کو ضروری و باوقعت جان کر اپنی اولاد کو اس طرف جانے دیتا ہو، ورنہ خود تکلیف اٹھا کر قرض کرکے بھیک مانگ کے یا اولاد ہی سے ٹیوشن کرا کے زیادہ تر کوشش یہی ہوتی ہے، کہ اگر بی اے ایم اے نہین تو میٹرکیولیٹ ہی ہوجائے، اس لئے عوام یا متوسط طبقہ کی جو اولاد عربی مدرسون مین نظر آتی ہے، وہ زیادہ تر کسی مجبوری و بیچارگی ہی سے آجاتی ہے،

غیر مستطیع علماء کے مسئلہ معاش کا قرآنی حل پھر بھی عربی و دینی درس گاہون کی جو کچھ آبادی ہے، وہ بہت کچھ غریب عوام و متوسط طبقہ ہی کے دم سے ہے، اس لئے بڑا سوال ان کی فکرِ معاش

کا ہو سکتا ہے کہ مولوی بن کر اور ساری زندگی علوم دین کی تحصیل و تبلیغ مین لگا کر آخر کھائین کہان سے اس کا مفصل جواب حضرت جامع المجددین نے قرآن کی ایک آیت سے دیا ہے، جو لفظ بلفظ نقل کرنے کے لائق ہے، آیت یہ ہے:۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافاً وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔

"جس سے ایک قاعدہ مفہوم ہوتا ہے، جس سے فقہا نے بہت سے فروع متفرع کئے ہین، وہ قاعدہ یہ ہے، کہ جو شخص کسی کی منفعت کے لئے محبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی پر واجب ہے، جیسے زوجہ کا نفقہ زوج پر (یہ تو انفرادی وجوب کی صورت ہے، دوسری صورت جماعتی وجوب کی ہے،) جیسے قاضی و والی کا نفقہ بیت المال پر، جس کا حاصل تمام مسلمانون پر وجوب ہے (کیونکہ بیت المال کا سرمایہ تمام مسلمانون کو ہوتا ہے) لہذا جب یہ جماعت خدمت دین کے لئے (جو مدلول ہے فی سبیل اللہ کا) محبوس و وقف ہے (جو مدلول ہے احصروا کا) تو ان کے حوائج کی بقدر کفایت تکمیل (جو مدلول ہے، فقراء کا) مسلمانون کے ذمہ واجب ہے، (جو مدلول ہے لام استحقاق کا) تو اب اس جماعت کے مصارف کی کفالت جمہور مسلمانون کا کام ہے، خواہ تعین کے ساتھ، جیسے مدرسین و واعظین کی تنخواہ، خواہ بلا تعین جیسے متوکلین کی خدمت، بس یہ شبہہ منقطع ہو گیا، کہ مولویون کی جماعت کھاوے کہاں سے،

"اس آیت سے اور بھی چند فوائد نکلتے ہین، جن کو گو اس بحث مین دخل نہین، مگر تعلق ہے اس لئے ذکر کئے جاتے ہین:۔

ایک یہ کہ ایسی جماعت کو تحصیل معاش مین بالکل مشغول نہ ہونا چاہئے، جیسا کہ لا یستطیعون

ضَرباً فی الارض اسی پر دلالت کرتا ہے، اور اس سے وہ الزام بھی جاتا رہا، جو عوام الناس علما پر طلب معاش میں اپاہج ہونے کا لگاتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ان کا اپاہج ہونا ضروری ہے، اور راز یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام پوری طرح ہوا نہیں کرتے، خصوص جب ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول رہنے کی ضرورت ہو، خواہ ہاتھ کو خواہ زبان کو، خواہ دل کو خدمتِ دین ایسا ہی کام ہے، اور علوم دینیہ کی تدریس یہ ذرائعِ معاش میں داخل نہیں بلکہ اس کی تنخواہ بوجہ خدمت دین میں محبوس ہونے کے ہے، اور تنخواہ کی تعین اس مصلحت سے ہوتی ہے کہ نزاع نہ ہو،

"ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کسی دنیادار کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرنا چاہئے، بلکہ اغنیا کی طرح مستغنی رہیں، جیسے یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف اس پر دال ہے"

واقعی ان آیات میں دین اور خادمان دین دونوں کی خدمت کا ایسا سہل و شایستہ اور اور تمام مفاسد سے پاک صاف انتظام اور ساری مشکلات کا حل اور سارے شبہات کا جواب موجود ہے، کہ اگر دنیا کے معمولی معاملات کے برابر بھی ہمت و اہتمام سے کام لیا جائے تو اپنے پرائے کوئی دین کی تعلیم و تبلیغ سے محروم نہیں رہ سکتے، حالانکہ دین کا حق اور عافیت اندیشی کا تقاضا تو یہ تھا، کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی دنیا کے بڑے سے بڑے کام کے مقابلے میں بدرجہا زائد ہمت و اہتمام سے کام لیا جاتا، لیکن جب غفلت اور ناعقبت اندیشی کا یہ حال ہو کہ دین کے بڑے سے بڑے معاملے کی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کی برابر بھی فکر نہ ہو، تو مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے، کہ اُن کی یہی غفلت خسران آخرت ہی نہیں، خسرانِ دنیا کا بھی سبب ہے، اس لئے کہ اُن کی فلاح دنیا کا دامن فلاحِ دین کے ساتھ بندھا ہوا ہے، اور اُن کو اپنی دنیا کا قیاس غیروں کی دنیا پر ہرگز نہ کرنا چاہئے،

(باقی)

اسلام کا معاشیاتی نظام

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

(۲)

اسلام کے معاشی نظام کی نظریاتی خصوصیات

کسی نظریۂ زندگی کی خوبی اور برتری کا معیار یہ ہے کہ وہ کہاں تک انسانی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے، اور مختلف انسانی طبقات مین اس کا ردِ عمل کیا ہے، دنیا کے مختلف نظریہ ہاے زندگی کے حسن و قبح کو اسی معیار پر پرکھا جا سکتا ہے،

یون تو ہر نظام کے موسسین کا دعویٰ ہے کہ ان کا بنایا ہوا نظام انسانون کی تمام مجلسی، معاشی اور سیاسی ضرورتون کا کفیل ہے، مگر یہ ضروری نہین کہ ہر دعویٰ واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہو، بلکہ جہان تک تجربہ و مشاہدہ کا تعلق ہے، ہر انسانی نظام کی تہ مین خود غرضی، تفریق و امتیاز اور ظالمانہ تفوق و برتری کے عوامل کارفرما نظر آتے ہین، یہی وجہ ہے کہ آج حریت و مساوات کے بلند بانگ دعوون کے باوجود انسان، انسان ہی کو نگل رہا ہے، اور اپنے ہی ابناء نوع کے گوشت پوست اور خون مین سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے، اگر حریت و مساوات یہی ہے تو پھر درندگی، سفاکی، وحشت و بربریت، اور غصبِ حقوقِ انسانی کس چیز کا نام ہے،

حقیقت یہ ہے کہ انسانی طبائع کسی حال مین بھی منفعتِ ذاتی اور غرض مندی کے جذبات سے مُبرا نہین ہو سکتین، اپنی ذات انسان کو ہر چیز سے عزیز تر ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ نسل خاندان، اور وطن

وغیرہ کے تعلقات عزیز ہیں اس لئے انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے مفاد کو دوسرون کے مفاد پر مقدم خیال کرتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس امتیازی طرز عمل کو خوبصورت اور دلکش پیرایہ میں حق بجانب قرار دے سکتا ہے، اور اس کے جواز کے لئے دلائل وبراہین کے انبار لگا سکتا ہے، مگر قلب انسانی کی بڑھتی ہوئی خلش شاہد ہے کہ ع

خود غلط بود آنچہ ماپنداشتیم

انسانون کا بنایا ہوا کوئی نظام طبقاتی اور نسلی احساسات سے مبرا نہین ہو سکتا، اس لئے وہ عالم انسانیت مین حقیقی مساوات قائم کرنے اور حیات انسانی کی پیچ در پیچ گتھیون کو حل کرنے سے قاصر ہے اس کے مقابلہ مین اسلامی نظریۂ اجتماع خالق کون ومکان کا بنایا ہوا ہے، اس لئے اس مین کسی طبقہ یا گروہ کی رعایت کا سوال ہی پیدا نہین ہوتا، اور ہر طبقہ اور ہر نسل کے انسانون کے لئے اس کی افادیت یکسان ہے کیونکہ اسلام مین انسانی وحدت کی بنا، وحدت فکر پر ہے، اور اس ہمہ گیر قومیت (Internationalism) مین علائق نسل ووطن اور عصبیاتی جذبات واحساسات کو قطعًا کوئی دخل نہین اس بنا پر یہ دعوی کہ ہر سلیم الفطرت انسان کے لئے قابل قبول ہوگا کہ اسلام کا سماجی نظام ہی نوع انسانی کو حقیقی امن، حریت، اجتماع اجلسی اور معاشی مساوات سے بہرہ ور کر سکتا ہے،

اسلام مین انسان کے معاشی حقوق کا احترام: اسلام کا نظریۂ معیشت وتمدن حقوق انسانی کی جیسی نگہداشت کرتا ہے اس کی مثال دنیا کا اور کوئی نظام نہین پیش کر سکتا یون تو ہر سیاسی اور معاشی نظام حریت ومساوات کا دعویدار ہے مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تک کوئی انسانی نظام انسانیت کے دکھ کا علاج نہین کر سکا، اور اس کا مرض برابر بڑھتا جاتا ہے، اور حریت ومساوات کے بڑے بڑے دعوؤن کے علی الرغم آج انسانیت پہلے سے کہین زیادہ مضطرب نظر آتی ہے، دنیا کے کروڑہا انسان انتہائی محنت ومشقت اٹھانے کے باوجود نان شبینہ کے محتاج ہین اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ موجودہ تمام نظریہ ہاے اجتماع مین ملوکیت واستبداد کی روح کارفرما ہے، اور اعلی طبقون

مین اب بھی حرص دولت اور سرمایہ پرستی کے جراثیم پرورش پارہے ہین اور پس ماندہ طبقے اُن کے ہاتھون زندگی اور موت کی کشمکش مین مبتلا ہین،

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است | نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقر آن گیتی پناہم!!! | کہ در دینش ملوکیت حرام است (اقبالؒ)

مگر اسلام کے نظامِ معیشت و اجتماع کی بنیاد انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات ہے وہ ایک طرف اعلیٰ طبقون کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور ان کے سفاکانہ طریقون کی نہایت معتدل اور موثر طریقہ سے اصلاح کرتا ہے، اور دوسری طرف طبقہ غربا کو ذلت و محکومیت کی پستی سے اٹھا کر عزت و شرف کی بلندی تک لیجاتا ہے،

عرب مین عام عربون کا ایک ایسا گروہ موجود تھا جس کو اشرافِ عرب نے انسانیت کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا، اور ان سے اسی طرح کا سلوک کیا جاتا تھا، جو آج تک ہندوستان کی اچھوت اقوام سے ہوتا ہے، یہ وہ گروہ تھا جسے غلام کے حقارت آمیز نام سے پکارا جاتا تھا، مگر دنیا جانتی ہے، کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس انسانی تفرقی و امتیاز کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور اعلان کر دیا، کہ نسلی شرافت اور قبیلوی وجاہت کوئی چیز نہین، انسانون مین اگر کوئی چیز وجہ امتیاز بن سکتی ہے، تو وہ تقویٰ اور طہارت اور کردار کی بلندی ہے،

یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَ اُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات)	اے انسانون ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف گروہون اور قبیلون مین اس لئے تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جا سکو ورنہ اللہ کے نزدیک معزز ترین اور شریف ترین وہ انسان جو تم مین سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہو،

آقا اور غلام مین مجلسی اور معاشی مساوات پیدا کردی گئی اور واضح الفاظ مین حکم دیا گیا، کہ یہ تمھارے غلام تمھارے دینی اور اسلامی بھائی ہین، اُن سے وہی سلوک کرو جو اپنے سگے بھائیون سے کرتے ہو،

عن المعرورؓ قال لقیت اباذرؓ بالربذۃ وعلیہ حلۃ وعلی غلامہ حلۃ فسألتہ عن ذلک فقال انی ساببت رجلا فعیرتہ بامہ فقال لی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا اباذر عیرتہ بامہ انک امرؤ فیک جاھلیۃ اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس، (بخاری)

معرور کہتے ہین کہ مین ربذہ کے مقام پر ابوذرؓ سے ملا، وہ ایک حلہ پہنے ہوئے تھے، اور اُن کے غلام نے بھی اسی طرح کا حلہ پہن رکھا تھا، مین نے اُن سے اس بارہ مین سوال کیا، تو انھون نے جواب دیا، کہ ایک مرتبہ مین نے ایک کو گالی دی، اور اس کو اس کی مان کا طعنہ دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، اے ابوذر تم نے اس کو اس کی مان کا طعنہ دیا ہے؟ تم مین اب تک جاہلیت کی خو باقی ہے، یہ لوگ تمھارے خدمتگذار بھائی ہین جن کو اللہ نے تمھارے قبضہ مین دیا ہے جس شخص کے ماتحت اس کا بھائی ہو، اوس کو وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور وہی لباس پہنائے جو خود پہنتا ہے۔

یہ تو غلامون کی نسبت فرمایا گیا ہے، سرمایہ دار طبقون کے غرور و پندار کو مٹانے اور عام غرباء کو ذلت و پستی سے اٹھا کر عزت و شرف کی بلندی پر لیجانے کے لئے یہ حیات بخش پیغام دیا:-

هل تنصرون وترزقون الا

اے طبقۂ امراء غریبوں کے ذریعہ تمھین

بضعفاءکم، (بخاری) ہر قسم کی مدد اور خوراک ملتی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر مگر جامع فقرہ مین امیرون کے غرور و تمرد کی حقیقت ظاہر فرمادی ہے، یعنی تم کیا ہو؟ تم تو مخلوقِ خدا کے لئے بوجھ بنے ہوئے ہو، تمھین کمانا اور محنت کرنا نہین آتا، البتہ کھانا آتا ہے، سرمایہ و دولت جو تمھیں آبا و اجداد سے وراثت مین ملی ہے، یا تم نے خود مکر و فریب سے اکٹھی کر لی ہے، اس کے ذریعہ تم غریبون پر حکومت کرتے ہو، اور گوشت و پوست کے بیکار مجسمے بنے ہو، تمھارا ہر سانس غریبون کی جانفشانیون کا رہین منت ہے، اس لئے تمھین اُن کے حقوق کا پوری طرح احترام کرنا چاہئے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی عملی کوششون سے ہر طرح کے طبقاتی امتیازات ختم ہوگئے، اور انسانون مین حقیقی مساوات پیدا ہوگئی،

سرمایہ پرستی کی مذمت اسلام نے دولت جمع کرکے اسے روک رکھنے کی شدید ممانعت کی ہے، اس قسم کی جمع دولت ہی تمام مفاسد اجتماعیہ کا سرچشمہ ہے، اور حرصِ دولت ہی سے خود غرضی اور حبِ نفس کا مکروہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو انسانی سوسائٹی کے لئے سمِ قاتل ہے،

الذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہین، اُ
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم	ان کو اللہ کے راستہ مین خرچ نہین کرتے
بعذاب الیم	اے نبی! آپ اُن کو دردناک عذاب کی
(توبہ)	خبر دین،

مسلمان کا مقصدِ حیات اتنا بلند ہے کہ دولت و زر اور جسمانی راحتون کے ساز و سامان اسکی نظر مین ذرہ برابر بھی وقعت نہین رکھتے، وہ مال و دولت فراہم کرتا ہے، مگر اس لئے نہین کہ اس کے ذریعہ غریبون پر جابرانہ تسلّط قائم رکھے یا خود دولت کی پرستش کرے، اور دوسرون سے اپنی پرستش کرائے، کہ تری المال عند الباخلین معبدا،

اس باب مین اسلام کا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے، وہ حصولِ دولت کی اجازت اس لئے دیتا ہو کہ اس کے ذریعہ فرایض ملی اور احکام مذہبی انجام پائین، غربار اور اہلِ حاجت کی حاجت برآری ہو اسی کے ساتھ صاحبِ دولت اپنی واجبی ضروریات بھی پوری کرے اور اپنی خودداری کو برقرار رکھ سکے، مگر اس کا دل حبِ دولت کی آلائشون سے پاک ہو، اسلام ہر ایسی محبت کو انسان کے لئے مہلک تصور کرتا ہے،

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ	لوگون کو عورتون بیٹون سونے اور چاندی کے
النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ	ڈھیرون نشان زدہ گھوڑون، چارپایون
مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ	اور کھیتی کی محبت مین فریفتہ کیا
الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ	گیا ہے، لیکن یہ صرف حیاتِ دنیوی
مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا،	کی متاع ہے،

خدائے قدوس نے دنیاوی علائق سے قلب مومن کو آزاد کر دیا ہے، اور اسے صرف خدا اور رسول کی محبت کا گہوارہ بنایا ہے، اس لئے وہ حقیقی محبت صرف اپنے معبود سے کرتا ہے، والدین بیٹون بھائیون، بیویون، اموال واملاک اور سربفلک عمارات کی محبت قلب مومن مین جگہ نہین پا سکتی،

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَ	اے نبی آپ مسلمانون سے کہ دین کہ
أَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَ	اگر تمھارے والدین بیٹے بھائی بیویان
عَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَ	رشتہ دار، اور وہ اموال جو تم نے حاصل
تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ	کئے، اور وہ تجارت جس کے خسارہ کا
تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ	تمھین اندیشہ رہتا ہے، اگر خدا رسول اور
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ	جہاد سے زیادہ محبوب ہین، تو تمھین عذاب الٰہی
اللَّهُ بِأَمْرِهِ، (توبہ)	کا انتظار کرنا چاہئے،

اسلام میں دولت فی ذاتہٖ بری چیز نہیں، اور نہ اس کے حصول کی کوشش مذموم ہے، بلکہ جائز حدود کے اندر اس کی طلب و جستجو اور اس کی خاطر سعی و عمل کو مستحسن قرار دیا گیا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں دولت و مال کو خیر اور فضل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے،

مَا اَنفَقتُم مِن خَیرٍ فَلِلوَالِدَینِ وَ الاَقرَبِینَ، (بقرہ)	تم اپنی دولت سے جو خرچ کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین مصرف والدین اور اقارب ہیں
وَابتَغُوا مِن فَضلِ اللّٰہِ وَاذکُرُوا اللّٰہَ کَثِیرًا، (جمعہ)	تم اللہ کے فضل (مال) کی طلب میں نکل کھڑے ہو، اور اللہ کا ذکر زیادہ کرو،

احادیثِ نبوی میں طلبِ حلال کو نہ صرف مستحسن بلکہ اُخروی درجات کا بھی ذریعہ قرار دیا گیا ہے،

الطیب الکسب عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرور، (احمد فی مسندہ والطبرانی الکبیر والحاکم فی المستدرک)	پاکیزہ ترین کسب، انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرکے کمانا اور ہر ایسی تجارت ہے، جو دیانت سے انجام پا
ان اللّٰہ یحب العبد المحترف (الطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی شعب الایمان)	اللہ تعالےٰ محنت و مشقت کرنے والے بندوں کو پسند کرتا ہے،
من طلب الدنیا حلالاً استعفافاً عن المسئلۃ وسعیاً علیٰ اھلہٖ وتعطفاً علیٰ جارہٖ لقی اللّٰہ یوم القیامۃ ووجہہٖ مثل قمر البدر (ابو نعیم فی الحلیہ)	جو شخص سوال سے بچنے اہل و عیال کی پرورش اور پڑوسی پر لطف و کرم کرنے کی غرض سے رزق حلال کے لئے سعی کرتا ہے، وہ قیامت کو اللہ تعالےٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں

اس کی وجہ یہ ہے کہ حصولِ دولت مین مسلم اور غیر مسلم کے نقطۂ نظر مین زمین وآسمان کا فرق ہے، غیر مسلم صرف مادی ضرورتون کی تکمیل اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مال حاصل کرتا ہے، اور اس کے سوا کوئی دوسرا تصور اُس کے ذہن مین نہین ہوتا، مگر مسلمان کی زندگی کا ہر عمل ایک بلند نصب العین سے وابستہ ہے اس لئے بال بچون کے لئے بھی اس کی محنت بمادنی سبیل اللہ کا درجہ رکھتی ہے،

التاجر الصدوق الامین مع النبیین	سچے اور امین تاجرون کا حشر قیامت مین
والصدیقین والشہداء یوم القیامۃ	نبیون، صدیقون اور شہداء کے ساتھ
(ابن ماجہ والحاکم)	ہوگا،

ترکِ دنیا اور ترک وسائل کے راہبانہ تصور کو اسلام سے کوئی نسبت نہین، اس نے جہد وعمل اور حرکت وسعی کو انسان کے لئے لازمی قرار دیا ہے، اور جمود وسکون اسلام مین بدترین جرم ہے، مگر اس کے باوجود مسلمان خدا اور اوس کی محبت کے سوا کسی دوسری چیز کی محبت کو اپنے دل مین جگہ نہیں دیسکتا، اور اس کی زندگی کی ہر حرکت کا اصلی مرکز رضائے الٰہی ہے،

ان اصول کا حاصل یہ نکلا کہ اسلام کسی مسلمان فرد یا جماعت کو حصول دولت کو اصل مقصد بنانے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے خزانے تو دولت وزر سے معمور ہون اور دنیا کی کثیر آبادی غربت و افلاس مین بسر کرے، یا آمدنی کے تمام وسائل پر چند افراد کا تسلط ہو، اور دوسرے لوگ اُن کی نازبرداریون کے باوجود سوکھی روٹی کو بھی ترسین، اسی کو موجودہ اصلاح مین سرمایہ داری (Capitalism) اور اسلام مین اکتناز سے تعبیر کیا گیا ہے، اسلام نے اکتناز واحتکار کی سختی سے مخالفت کی ہے، کہ اس سے دولت کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے، دراصل دولت کا مفہوم ہی اس امر کا متقاضی ہے، کہ وہ کسی ایک جماعت مین محدود نہ رہے، بلکہ تمام انسانون مین پھیلتی اور بٹتی رہے، کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم تاکہ دولت چند سرمایہ دارون ہی مین رُکی نہ رہے،

اکتناز و احتکار | اکتناز کے معنی ہیں سونے اور چاندی کے خزانے جمع کرنا، مگر اس طرح کہ اُن سے حقوق خداوندی اور حقوق ملت ادا نہ کئے جائیں، اس تعریف کی بنا پر اکتناز ایسی صورت میں ہوگا جبکہ کوئی شخص جمع شدہ دولت سے مذکورہ حقوق ادا نہ کرے لیکن جو شخص اس کو ادا کرتا ہے، اس کی دولت پر کنز کا اطلاق نہ ہوگا، اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام میں نفس جمع دولت بری چیز نہیں، بلکہ اسے اس طرح روک رکھنا کہ اس کے حقوق ادا نہ کئے جائیں برا ہے

عن ابن عمر کل مال اُدیت	جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے،
زکوتہ فلیس بکنز وان کان مدفونا	وہ کنز نہیں ہوتا، اگرچہ وہ زمین
تحت الارض وکل مال لاتودی	میں دفن کیا جائے، اور جس مال
زکوتہ فھو کنز وان کان ظاھراً	کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے
(اخرجہ العقیلی)	اگرچہ وہ سامنے پڑا ہو،

اکتناز کی حرمت قرآنِ کریم کی نصِ قطعی سے ثابت ہے۔

الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں،
وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اور اُن کو اللہ کے راستہ میں خرچ
فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ	نہیں کرتے، اُن کو اے نبی دردناک
(توبہ)	عذاب کی خبر کردو،

احتکار کے معنی ہیں اشیاء خورد و نوش کو نرخ کی گرانی کے انتظار میں روک رکھنا تاکہ اُن سے زیادہ منافع حاصل کیا جا سکے لیکن احتکار کو اگر وسیع مفہوم میں لیا جائے تو اس میں وہ مال دولت بھی شامل ہو سکتا ہے جس کو اس غرض سے روکے رکھا جائے کہ اس سے غلہ کی بڑی مقدار خرید کر کے اُسے گران نرخ پر فروخت کیا جائے، یا اس سے صنعتی کارخانوں اور دیگر وسائل معیشت پر تسلط حاصل

کیا جائے، چنانچہ موطا امام مالک کی اس روایت میں احتکار کے یہی معنی لئے گئے ہیں،

عن مالکؒ ان عمر ابن الخطابؓ	ہمارے بازار میں کوئی احتکار نہ کرے
قال لاحکرۃ فی سوقنا لا یعمد	جن لوگوں کے قبضہ میں ضرورت سے
رجال بایدیھم فضول من	زائد روپیہ ہے، وہ کسی غلہ کو جو ہمارے
اذھاب الی رزق من ارزاق	ملک میں آئے، خرید کر اسے روک نہ دیں
اللہ نزل بساحتنا فیحتکرونہ	یعنی احتکار نہ کرے،

(علیحدہ ماخذ ۔ کتاب البیوع)

غرض احتکار اور اکتناز اگرچہ نفس مفہوم کے اعتبار سے جدا ہیں، مگر منشاء کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں اور سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی اصطلاح دونوں کو شامل ہے، احتکار کی ممانعت میں متعدد احادیث و آثار وارد ہیں

عن عمرؓ الجالب مرزوق والمحتکر	غلہ کو بیچنے کی غرض سے باہر لیجانے والا
ملعونٌ ۔	مرزوق ہے، اور احتکار کرنے والا
(اخرجہ ابن ماجہ)	ملعون ہے،
عن ابی ھریرۃؓ یحشر الحکارون	احتکار کرنے والوں اور انسانوں کو
وقتلۃ الانفس الی جھنم فی درجۃ	قتل کرنے والوں کو جہنم کے ایک ہی درجہ
(اخرجہ ابن عساکر و ابن علی فی الکامل)	میں جمع کیا جائے گا،

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ اسلام کی روح سرمایہ داری کے سخت خلاف ہے، اور اسلام کا منشا یہ ہے کہ دولت کسی ایک گروہ میں مقید ہو کر نہ رہ جائے، بلکہ عام انسانوں میں پھیلتی اور چکر کاٹتی رہے، اسلام کے تمام معاشی قوانین میں اس امر کو محفوظ رکھا گیا ہے چنانچہ قانون وراثت، زکوٰۃ، عام صدقہ و خیرات کے احکام سود اور احتکار و اکتناز کی تحریم وغیرہ سب میں ایک ہی روح کار فرما ہے اور ان قوانین پر عمل کرنے سے انسانی سوسائٹی میں بتدریج ہمہ گیر معاشی مساوات بروئے کار آسکتی ہے، مگر ان میں اور سوشلزم کے اصول میں بڑا بنیادی

فرق ہے، اسلام کی اقتصادی عمل بین انسانی فطرت پر مبنی ہے، وہ سوشلزم کی طرح انسان کو اس کے حقوق ملکیت سے محروم نہیں کرتا، کہ اس سے انسان کے جذبۂ سعی وعمل کو سخت نقصان پہنچتا ہے جس سے انسانی سوسائٹی مین اختلال و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے،

تحریم سود کی اصل وجہ | سودی کاروبار موجودہ اقتصادیات کا ایک ضروری حصہ ہے، اور اس کو دولت کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے، اور آج دنیا کے اکثر مہذب ممالک مین وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار چل رہا ہے، اور موجودہ حکومتی نظام مین کوئی ایسا قانون نہیں، جو سودی لین دین کو ممنوع قرار دیتا ہو، بلکہ ہر مہذب حکومت اس کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اور اپنے حدود مملکت مین اس کو مختلف طریقون سے وسعت دی رہی ہو، حالانکہ سود اس ظالمانہ عہد کی یادگار ہے، جب کہ انسانیت، تہذیب وتمدن، علم وحکمت اور جمہوریت ومساوات کی روشنی سے محروم اور جہالت اور ملوکیت واستبداد تاریکی مین مبتلا تھی، لیکن حیرت ہے کہ آج بھی جب کہ دنیا کے ہر ملک مین حریت ومساوات کے روح پرور نغمے گونج رہے ہین، یہ لعنت بدستور بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے

سود کا لین دین، خود غرضی، انسان کشی، اور انتہائی سفاکی کی ایک معاملاتی مشکل ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی حرمت قطعی کا حکم دیا ہے، اور اخلاق ودیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان دوسرے کی عسرت وتنگدستی کی حالت مین اوس کی بے لوث اور بے غرضانہ خدمت کرنے سے قاصر ہے، تو کم از کم اوس کی مجبوریون سے ناجائز فائدہ تو نہ اٹھائے، کوئی شخص بھی انتہائی مجبوری کے بغیر سودی قرض لینا پسند نہیں کرتا، اس حالت مین شرافت واخلاق کا تقاضا یہی ہے، کہ ایسے شخص کے بوجھ کو ہر ممکن طریق سے ہلکا کرنے مین اوس کی امداد کی جائے، نہ کہ اسے اور زیادہ زیر بار کردیا جائے

اسلام نے ایسی حالت مین قرض حسن کے ذریعہ حاجتمند کی امداد کرنے کی ہدایت کی ہے، اور قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ قرض دینے والے کا مقصد غریب بھائی کی امداد، اور رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ ہو، پھر اس قرض کے وصول کرنے مین بھی مقروض کی سہولت کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ اس کو

کسی قسم کا دباؤ ڈالا جائے، قرض دینے والا اگر اپنا واجب الوصول قرض معاف کر دے تو یہ اس کے اُخروی درجات کا باعث ہوگا،

وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ (سورۂ بقر)

اگر وہ شخص تنگدست ہو تو ایک مدت تک اُسے مہلت دیجائے، اور بالکل معاف کر دینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے

امداد کی دوسری صورت یہ ہے کہ مصیبت زدہ شخص کی کوئی چیز بطور رہن رکھ کر اسے حسب ضرورت رقم دیدیجائے، یہ بھی دراصل قرض حسن ہی کا دوسرا درجہ ہے، اس مین بھی قرض دینے والے کو مرہونہ چیز سے نفع اٹھانے کی اجازت نہیں، دراصل یہ بھی سود ہی کی ایک قسم ہے،

اس بنا پر قرآن حکیم نے نہایت شدت سے حرمتِ سود کا حکم دیا ہے،

یَااَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ، (بقرہ)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور بقایا سودی روپیہ بالکل چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو، اور اگر تم ایسا نہیں کرنا چاہتے تو خدا اور اوس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، اور اگر تم توبہ کرتے ہو، تو تمھارے واسطے تمھارا اصل مال ہو نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے

عام لوگون کی نظر محسوسات سے آگے حقائق تک نہیں پہنچ سکتی، اس لئے ہر چیز کے ظاہری حسن وقبح یا سود وزیان پر ہی، اُن کی نگاہین جمی رہتی ہین، اور وہ غیر محسوس فوائد کا اندازہ نہیں کرسکتے، اسی لئے قرآن حکیم نے سود اور زکوٰۃ کا ان الفاظ میں موازنہ کیا ہے،

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ

(روم)

تم جو اس غرض سے سودی قرض دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے اموال میں بڑھے، تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں، اور جو تم رضائے الٰہی کے حصول کے لئے زکوٰۃ دیتے ہو تو اس سے دولت میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

جو لوگ حس سطحی نظر سے اشیا کو دیکھتے ہیں، اُن کے نزدیک پہلی صورت میں دولت بڑھتی ہے اور دوسری میں گھٹتی ہے مگر خدا کے نزدیک ایسا نہیں، اس کی نظر ہر چیز کے انجام اور نتائج پر ہے، اسی لئے اسلام کا معاشی نظام اخلاقی اور انسانی حدود و اقدار میں جکڑا ہوا ہے، اور کوئی ایسا کاروبار جس میں سود، احتکار، رشوت یا کسی دوسرے امر ممنوع کا شائبہ بھی موجود ہو، اسلام کی نظر میں حرام ہے اور مسلمانوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے، کہ وہ معیشت کی راہ میں پورے احتیاط سے کام لیں، اور کبھی ان کی محنت کے حاصل میں حرام کی آمیزش نہ ہونے پائے، ورنہ سب کیا کرایا اکارت ہو کر رہ جائے گا،

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ

(بقرہ)

ناپاک مال کے حصول کا قصد نہ کرو کہ اس سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرو،

عن عمرؓ قال ان آخر ما نزل من القرآن آية الرباء وان رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الرباء والريبة (ابن شيبة مسند احمد وابن ماجه وابن جرير وابن المنذر والبيهقي)

قرآن کریم کی آیات میں سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، اور آپ نے ہم سے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی، پس تمھیں ہر قسم کی ربا، اور اسکے شبہہ سے بچنا چاہئے

عن الشعبي قال قال عمرؓ تركنا

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم نے ربا کے خوف سے

تسعة اعشار الحلال مخافة الربا[1] حلال کے نو حصے بھی چھوڑ دیتے ہیں،

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا معاشی نظریہ کتنا بلند ہے، وہ کسی انسان کی معمولی سے معمولی حق تلفی کو بھی برداشت نہیں کرتا، اور انسانی معاشات کو ایک خاص ربط و انقباط (Regu lation) کے تحت چلانا چاہتا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے سرمایہ کے زور سے دوسروں پر مشق ستم نہ کرسکے، اور کسی کو غریب انسانوں کا خون چوسنے کا موقع ہی نہ مل سکے،

فریضہ زکوٰۃ کی حکمت، عام لوگوں کی نظر میں اشیا کی کثرت اور قلت کا دارومدار مقدار حجم یا تعداد پر ہے مگر اسلام کے نزدیک ہر چیز کی کثرت اور قلت ایک غیر مرئی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے، اگر تھوڑی چیز میں بھی معنوی عظمت موجود ہے، تو وہ خدا کی نظر میں کثیر ہے، لیکن جو چیز لوگوں کی نظر میں بظاہر بہت بڑی معلوم ہوتی ہے، مگر وہ معنوی عظمت سے محروم ہے، تو وہ خدا کے نزدیک قلیل ہے اور یہ چیز صرف تصورات ہی تک محدود نہیں، بلکہ حقائق وواقعات کی دنیا میں بھی اس کا تجربہ کیا جاچکا ہے، جس طرح پاکباز صالح اور منظم انسانی جماعت انتہائی قلت کے باوجود دنیا کی بڑی سے بڑی اکثریت پر غالب آسکتی ہے، اور اس کی عددی اقلیت اکثریت کا حکم رکھتی ہے، اسی طرح وہ صالح اور پاک مال جو نیک اور جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو، اگرچہ بظاہر کم ہو، مگر وہ اس دولت کے انبار سے ہزار درجہ بہتر ہے، جو غریبوں کا خون چوس چوس کر اکٹھی کی گئی ہو،

لا یستوی الخبیث والطیب و	ناپاک اور پاک مال برابر نہیں ہوسکتے،
لو اعجبك كثرة الخبيث	اگرچہ ناپاک کی کثرت کتنی ہی بھلی معلوم
(مائدہ ۱۳)	ہورہی ہو،

جو غلہ غریب کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے سمیٹا جاتا ہے، جو دولت ہزارہا انسانوں کے وسائل معیشت پر غاصبانہ قبضہ اور بے کس مزدوروں پر ظلم سے جمع کی جاتی ہے، جو تاج کرور دل

[1] عبدالرزاق فی الجامع،

انسانون کے خون ناحق کے بدلے مین حاصل کیا جاتا ہے، اور جو تخت بے گناہ مخلوق کی گردنون لاشون پر بچھایا جاتا ہے، اس سے وہ قوت لایموت اور مرد مومن کی گلیم کہنہ بہتر ہے، جو حلال اور پاک طریقون سے حاصل ہوتی ہو سے

وہ قبا جس پہ ہون دہقان کے لہو کے چھینٹے
اس سے بہتر ہے کسی مرد قلندر کی گلیم

یہی وہ مقدس جذبہ ہے جو مسلمانون کے ہاتھ کو خونِ ناحق سے رنگین نہین ہونے دیتا، اور اسی جذبہ کی تقویت کے لئے قرآنِ حکیم نے زکواۃ کا حکم دیا ہے، جو شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے بچا کر چالیس روپیہ جمع کرتا ہے، اس کو سال مین ایک مرتبہ ایک روپیہ مد زکواۃ مین دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اگر وہ دس کروڑ روپیہ کا مالک بنجاتا ہے، تو سال مین اسے قریبًا ۲۵ لاکھ روپیہ دینا پڑتا ہے، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ حب دولت کا وہ منحوس جذبہ جو نظام سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کا محرک ہے، اور جس سے ہزار ہا مفاسد اجتماعیہ رونما ہوتے ہین، آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے،

حبِ دولت را فنا سازد زکواۃ ہم مساوات آشنا سازد زکواۃ
دل ز حتی تنفقوا محکم کند زر فزاید الفت زر کم کند (اقبال)

قرآنِ حکیم نے کس شانِ بلاغت سے اس مضمون کو ادا کیا ہے،

یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے
(بقرہ) اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے

....

انسان کی فہم ناقص بہت سی چیزون کو سمجھنے سے قاصر ہے اگر خداوند تعالیٰ اپنے حکیمانہ احکام

کے ذریعہ انسانوں کو فکر و عمل کے بلند ترین مقام پر لیجانا چاہتا ہے، انسان انتہا درجہ کا حریص اور خود غرض واقع ہوا ہے، وہ جمع دولت ہی کو اپنے لئے ذریعۂ نجات تصور کرتا ہے، حالانکہ حقیقی نجات وہ ہے جو پوری سوسائٹی کی خوشحالی اور انسانی مساواتِ عامہ سے حاصل ہوتی ہے، اور سوسائٹی کی خوشحالی اس وقت تک وجود مین نہین آسکتی، جب تک کہ اس کے ہر فرد مین ہمدردی و مساوات اور ایثار کا جذبہ نہ پایا جائے،

اپنی دولت کا ایک حصّہ جماعت کے پس ماندہ افراد مین تقسیم کرنے سے کوئی انسان مفلس نہین ہوجاتا، بلکہ اس سودے مین فائدہ ہی فائدہ ہے، اسی نکتہ کی جانب قرآن کریم نے ایک لطیف اشارہ کیا ہے،

وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون	تم جو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے زکوٰۃ
وجہ اللہ فاولٓئک ھم المضعفون	دیتے ہو، تو اس سے تمھارے مال مین کئی
(روم)	گنا اضافہ ہوتا ہے،

سورۂ بقرہ مین حکم انفاق کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم	شیطان تمھین فقر و احتیاج کی راہ دکھاتا ہے
بالفحشآء واللہ یعدکم مغفرۃ	اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ
منہ وفضلاً واللہ واسع علیم،	تم سے مغفرت اور رزقِ حلال کا وعدہ کرتا
(البقرہ - ۳۷)	ہو اور اللہ کا علم وسیع ہے،

اس آیت مین عدم انفاق کو فقر اور مال کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور نہایت لطیف پیرایہ مین اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کے فہم کے لئے خداداد علم و حکمت کی ضرورت ہے، اس لئے اس کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے،

یوتی الحکمۃ من یشاء ومن	خداوند تعالیٰ جسے چاہتا ہے علم و حکمت

یُوتی الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً وما یذکر الا اولوالالباب (بقرہ ع) — عطا فرماتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اسے گویا خیر کثیر ہاتھ آگئی اور نصیحت تو عقلمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں،

متعدد احادیث و آثار میں بھی اس حقیقت باہرہ کا اظہار کیا گیا ہے،

عن ابن عمرؓ ان الصدقۃ لا تزید المال الا کثرۃ (ابن عدی فی الکامل) — صدقہ مال میں کثرت اور برکت پیدا کرتا ہے،

عن بریدۃ ما منع قوم الزکوۃ الا ابتلاھم اللہ بالسنین (اخرجہ الطبرانی فی الاوسط) — جس قوم نے زکوٰۃ روک لی، اللہ تعالیٰ اس کو قحط سالی میں مبتلا کرتا ہے،

زکوٰۃ ایک اجتماعی فریضہ ہے، اور قرآن حکیم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے، جہاں نماز کا ذکر آتا ہے وہاں زکوٰۃ کے حکم کا بھی بلا فصل ذکر کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ نماز شریعت حقہ کا ایک ایسا رکن ہے، جو کفر اور اسلام میں فارق علامت ہے، قرآن حکیم کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ہر جگہ نماز اور زکوٰۃ کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور اسلامی برادری کی رکنیت و عضویت کے لئے نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی شرط قرار دیا گیا ہے،

فان تابوا واقاموا الصلٰوۃ وآتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین، (توبہ) — پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں،

حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہ اسی اصل پر مبنی تھا،

واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ، (بخاری) — خدا کی قسم جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اس سے میں جنگ کروں گا

اس کی تفصیل تو کسی دوسرے موقع پر آئے گی، یہان صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے انسانی معیشت کے جو زرین اصول بنائے ہین، وہ انسانون کو حریتِ اجتماع اور امن و مساوات کی برکات سے مالا مال کرنے کے لئے بالکل کافی ہین، ایک طرف اوس نے سرمایہ دار طبقون کے ظالمانہ تسلط سے غریب انسانون کو رہائی دلانے کی غرض سے سود اور اس قسم کے تمام ذرائع کا سدباب کیا ہے اور دوسری طرف غربا کی امداد و اعانت اور مساوات عامہ کے لئے زکوٰۃ اور تقسیم دولت کے دوسرے ذرائع اختیار کئے ہین، یہ ظاہر ہے کہ آج دنیا مین جس قدر اجتماعی مفاسد پائے جاتے ہین، ان کی سب بڑی وجہ حُبِ دولت اور جذبۂ سرمایہ داری ہے، یہی وہ تخمِ خبیث ہے، جس سے خود غرضی، حُبِ نفس جذبۂ نفرت اور انسان کشی کی شاخین پھوٹتی ہین، اور اسی مذموم جذبہ نے تقسیم دولت کے قدرتی اصولون کو ناممکن العمل بنا دیا ہے، اور آج دنیا کے ہر گوشے مین سرمایہ دار اور مزدور مین خطرناک طبقاتی کشمکش جاری ہے،

سوشلزم اور کمیونزم کے بھیانک نظریے اسی مکروہ جذبہ کا ردِ عمل (ری ایکشن) ہین، مگر اسلام نے دنیا کو جس معاشی نظام کی دعوت دی ہے، وہ تقسیم دولت کے قدرتی اصولون پر مبنی ہے اور اس مین کسی قسم کی طبقاتی جنگ کا خطرہ نہین، حکومتِ اسلامی کا شعبۂ مالیات ہر طبقہ کی تسکین کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل رکھتا ہے جس سے کسی انسان کو شکایت کا موقع ہی نہین مل سکتا،

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (علیگ)

(۳)

فغان کے قطعات فغان نے کثرت سے قطعات بھی لکھے ہین، عام طور سے قطعہ مین کوئی حکیمانہ خیال یا اخلاقی سبق ہوتا ہے لیکن شعرائے متقدمین و متوسطین نے بعض قطعون مین کسی مرکب خیال کو ظاہر کیا ہے اور رنگ تغزل ہی کا قائم رکھا ہے، اس لئے یہ قطعات گویا مسلسل غزلون کا مجموعہ ہی ہو گئے ہین، فغان کے قطعات بھی اسی رنگ کے ہین، اُن کے قطعات مین حکمت و اخلاق کے مسائل اور پند و نصائح کے مضامین نہین، بلکہ عاشق کی ناکامی، بیچارگی اور معشوق کی بے دردی، لاپروائی، اور بے اعتنائی کی داستان ہے لیکن اُن مین بعض ایسی سچی تصویرین ہین کہ معلوم ہوتا ہے یہ فغان کے خود قلبی تاثرات اور ذاتی واردات ہین، ایک عاشق کی زبون حالی ملاحظہ ہو،

وقتِ بہار مجھ دلِ شیدا کا ای فغان ۔۔۔ یہ تھا شعار دشت کو ہر سال دیکھنا

اس سال مجھ کو دیکھ غزالان نے یون کہا ۔۔۔ منظور گر ہے قیس کا احوال دیکھنا

جا دیکھ آج دشت مین ماتم نشین ہے بید ۔۔۔ مجنون کی خاک پر وہ کھلے بال دیکھنا

شبِ فرقت کی جانگدازی دیکھئے،

سوئے شبِ فراق مین آرام سے فغان ۔۔۔ یہ ہی خیال محض وہ بیدار ہی رہا

کافر ہو گر پلک سے لگی ہو کبھی پلک یکتا ہوا سدا درد دیوار ہی رہا

اسی خیال کو ایک دوسرے قطعہ مین اس طرح باندھا ہے،

سونا شبِ فراق مین آرام سے فغان یہ تو کسی کی چشم سے اب تک نہ ہو سکا
تو نے جو رات خواب مین دیکھا تھا یار کو کیونکر پڑی تھی نیند تجھے کیونکہ سو سکا

بعض جگہ بھی مضامین کس قدر سوز و غم کی ہوبہو تصویرین گئے ہین،

کیا پوچھتے ہو حال فغان کا سنا نہین خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اس وصال و ہجر مین یون ہی گذر گئی دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

پھر اس قطعہ مین معشوق کی جفا اور عاشق کے حسرت و یاس کا کیسا موثر بیان ہے،

تنہا اگر مین یار کو پاؤن تو یون کہون انصاف کو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
آخر فغان وہی ہے اسے کیون بھلا دیا وہ کیا ہوئی تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے یون بھی گذر گئی مری وون بھی گذر گئی

ایک جگہ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بھی کھینچا ہے،

خونِ دلِ غریب کو پیتا ہون ہر سحر لختِ جگر تو آذوقۂ شام ہو گیا
اپنی کہو اے ہم سفرانِ رہِ عدم میرا تو ہر طرح سے سرانجام ہو گیا
کیون کر شفا نہ ہو دلِ بیمار کو فغان یہ اشک چشم روغنِ بادام ہو گیا

ایک جگہ صوفیانہ مضمون بھی ہے، مثلاً

ایک دن شیخ و برہمن سے فغان کہتا تھا کعبہ و دیر کی تم کرتے ہو تکرار عبث
خوب دیکھا تو میرے رشتۂ الفت کے حضور تیری تسبیح غلط ہے تیرا زنار عبث

ایک جگہ کچھ رندانہ مستیان بھی ہین،

مے واسطے ساقی نہ میں اب چشمِ تر آیا
دل دیکھتے ہی ابر کو ناچار بھر آیا

مت ڈھونڈ گزک کو اری میخوار ادھر دیکھ
اسے لے تیری خاطر میرا لختِ جگر آیا

زاہد کے تئین دیکھ کے کہتا ہون حرم مین
عیسیٰ کو فلک نے بھیج دی کعبہ مین خر آیا

حیران و پریشان و دل افگار و قبا چاک
سنتے تھے فغان کو سو وہ آج ہی نظر آیا

رباعیات فغان کی رُباعیات مین بھی وہی عاشقانہ مضامین ہین، جو اون کے جذبات کی پختگی اور قادر الکلامی کی واضح مثالین ہین، ان مین سے ایک دو ملاحظہ ہون،

ہم وہ نہین جو وصل مین سوتے رہتے
مژگان مین دُرِ اشک پروتے رہتے

بے خندۂ یار کیا ہے گریہ مین مزا
ہنستا رہتا تو ہم بھی روتے رہتے

اے دل آرام تجھ کو ہونا معلوم
دردِ شبِ ہجر جی سے کھونا معلوم

اس چشم سے خواب کی توقع مت رکھ
رونا تو نصیب مین ہے سونا معلوم

فغان اور ان کے معاصرین اوپر کی سطرون مین ہم نے فغان کی شاعری کی توصیف اس لئے مین کی ہے، کہ ہم کو ان کا دیوان ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے، بلکہ یہ محض اُن کے کمال کا اعتراف ہے، جس کی داد فغان کے معاصرین اور بعد کے ناقدین نے دل کھول کر دی ہے، میر سے خراج تحسین حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، یقین جیسے باکمال شاعر کے بارے مین میر لکھتے ہین،

بعد از ملاقات این قدر خود معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق نہ دارد، ...... جمع بر این اتفاق دارند، کہ شاعری او خالی از نقص نیست[1]"

لیکن فغان کے ذکر مین رقمطراز ہین کہ

"بسیار جوان قابل ہنگامہ آرا شعر ریختہ را خوبی می گوید گاہے فکر غزل فارسی ہم می کند"

فغان کے مندرجہ ذیل دو شعر میر صاحب کو بہت پسند آئے ہین،

---

[1] نکات الشعراء ص ۹۴ ایضاً ص ۸۲،

ساقی نہ مین یہان آپ سے کچھ چشم تر آیا — دل دیکھتے ہی ابر کے ناچار بھر آیا

آوارہ و پریشان و شکستہ دل بدنام — سنتے تھے فغان جس کو آج ہی نظر آیا[1]

میر کا فغان کو پسند کرنا ایک لحاظ سے فطری تھا کیونکہ بعض جگہ ظاہری اور معنوی حیثیت سے فغان کا کلام میر سے بالکل ملتا جلتا ہے، مثلاً

رونا جہان تلک تھا میری جان رو چکا — مطلق نہین ہے چشم مین نم کا اثر کہین

باور اگر تجھے نہین آتا تو دیکھ لے — آنسو کہیں ڈھلک گئی لختِ جگر کہین

بہار آئی میری پاؤن مین پھر زنجیر پڑتی ہے — مبارک ہو جنوں گھر کو تیرے آباد کرتا ہون

لب خندان کو میری دیکھ کیا شاداں کوئی ہووے — مین ہنس ہنس عمر کو گل کی روش برباد کرتا ہون

کیا پوچھتے ہو حال فغان کا سنا نہین — خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

اس کی وصال و ہجر مین یون ہی گذر گئی — دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

عالم کو بحر خون مین یہ قاتل ڈبو سکا — لیکن میرے لہو کو نہ دامن سے دھو سکا

پہنچا گئے مجھے تیرے در تک یہ سیل اشک — اتنا تو ہو سکا کہ میری جان رو سکا

مندرجۂ بالا اشعار مین میر کی زبان اور سوز و گداز کا کتنا صحیح مرقع ہے،

مرزا سودا بھی فغان کے بہت ہی معتقد تھے، مجموعہ نغز مین ہے، کہ

"مرزا محمد رفیع سودا بسیار ستایش دیوانش کرد"

فغان نے اپنے سے سودا کی عقیدتمندی کا اعتراف خود کیا ہے،

---

[1] نکات الشعراء صفہ، پیش نظر دیوان مین یہ دو شعر اس طرح درج ہین :-

مے واسطے ساقی نہ مین آپ چشم تر آیا — دل دیکھتے ہی ابر کو ناچار بھر آیا

حیران و پریشان دل انگشت و قبا چاک — سنتے تھے فغان کو سو وہ آج ہی نظر آیا

فغاں کون اب خریدارِ سخن تھا   اگر یہ حضرتِ سودا نہ ہوتا

سودا نے اپنے جوش عقیدت میں فغاں کے قطعات پر قطعات لکھے، اور ایک ایک شعر پر لمبے لمبے قطعات لکھے ہیں، مثلاً فغاں کے ایک قطعہ کا ایک شعر ہے،

شکوہ تو کیوں کرے ہے میرے اشک سرخ کا   تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

اس پر سودا نے جو قطعہ لکھا ہے وہ گو ذرا طویل ہے، لیکن دلچسپ ہے، اس لئے ہدیۂ ناظرین ہے،

سودا فغاں کو خط یہ لکھا اس کے یار نے   جس وقت اس کے حال کی اس کو خبر گئی
سُن اے فغاں جہان میں عاشق جو ہو گیا   معشوق سے اسے روش اس کی گذر گئی
شیریں نے جور کب نہ کیا کوہکن کے ساتھ   مجنوں پہ کیا جفا تھا کہ لیلیٰ نہ کر گئی
کل ہی پڑے سسکتے تھے بلبل چمن کے بیچ   ذرہ نہ اس کے حال پہ گل کی نظر گئی
پروانہ رات شمع سے اتنی جلی کہ صبح   خاکستر ان کی لیکے صبا دوش پر گئی
میں تازہ کچھ کیا ہے، کہ بدنامی کو مرے   آوازہ آہ و نالہ ترے گھر بہ گھر گئی
حرمت رکھی نہ رعد کی فریاد نے تری   رونے سے تیرے آبروے ابر تر گئی
لوہو سے تیرے سر کے ہے دیوار گھر کی سرخ   آنکھوں سے موج خون کی بیرون در گئی
دل کو ترے نہیں ہو اگر تاب دردِ ہجر   تو کار عشق سے تو مرے لال کر گئی
القصہ خط کو پڑھ کے یہ اُس نے کہا کہ خیر   تیرے ہی دل کی مہر نہ جانوں کدھر گئی
شیریں کی ایک میں نہ رکھوں درنہ بارہا   لیلےٰ جدھر تھی وادی مجنوں ادھر گئی
یاں تک تو گھٹ میں لیلی کے مجنوں سما گیا   اس اتحاد سے انھیں باہم بسر گئی
جاری ہوا تھا خون رگِ مجنوں سے وقت فصد   لیلےٰ کے پوست بال اگر نیشتر گئی
ظالم کہو رو گل کا گریبان ہوا ہے چاک   اک عندلیب گر اجل اپنے سے مر گئی

پروانہ کون سا تہ جلا شام کو شمع | رو تی ہوئی نہ بزم سے وقتِ سحر گئی
یہ گفتگو تو قطعِ نظر اس سے مجکو کیا | مجھ سے جفاے ہجر کی طاقت کدھر گئی
میرے لہو سے میری دیوار گھر کی سُرخ | میری ہی موج خون میری بیرن در گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سُرخ کا
تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

فغان کا ایک دوسرا قطعہ ہے،

سونا شبِ فراق مین آرام سے فغان | یہ تو کسی کی چشم سے اب تک نہ ہو سکا
تو نے جو رات خواب مین دیکھا تھا یار کو | کیونکر پڑی تھی نیند تجھے کیونکر سو سکا

اسی کی تقلید مین سودا نے بھی ایک قطعہ لکھا ہے،

اے دیدہ خانمان تو ہمارا ڈبو سکا | لیکن غبار یار کے دل سے نہ دھو سکا
تجھ حسن نے دیا نہ کبھی دل کو چین، | فتنہ نہ تیرے دور مین بھر نیند سو سکا
جون شمع تن ہوا شبِ ہجران میں صرف اشک | پر جس قدر مین چاہے تھا اتنا نہ رو سکا
سودا قمار عشق مین شیرین سے کوہکن | بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز | اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

فغان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے،

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہین | لیتا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہین

اس پر بھی سودا نے ایک قطعہ لکھا ہے،

نامہ لکھا تھا یار کو مین یہ سمجھ کے ہے | عالم مین ہم نامہ و پیغام بر کہین
لیکن سواے بندگی و عجز و انکسار | نکتہ ہوا س مین حرفِ تمنا سے گر کہین

وان لا کے مجھ کو ماریئے گردن کہ جس جگہ
پانی کے قطرے کا بھی نہو وے اثر کہین

ورنہ خدا کے واسطے انصاف تو کرو
آتا ہے ایلچی پہ زوال اس قدر کہین

اڑتا پھرے ہے نامہ گلی مین کسی طرف
دھڑ سے جدا پڑا ہے سر نامہ بر کہین

وقتیکہ دلبران جہان کا ہو یہ سلوک
پھر دل کو دون کہو تو کس امید پر کہین

کہین کہین تو سودا کے بعض اشعار فغان سے بالکل ملتے جلتے ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونون نے ایک ہی جذبات سے متاثر ہو کر کہا ہے، بات یہ بھی کہ سودا کو فغان کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی تھی اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، ایسی حالت مین اُن کے بعض مضامین اگر فغان سے مل گئے ہین تو کیا تعجب ہے،

فغان	سودا
باور اگر تجھے نہین آتا تو دیکھ لے	خونناب یون کبھو نہ مری چشم سے بہا
آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہین	اٹکا نہ جب تک آن کے لخت جگر کہین
میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے	میری طرف سے دیجو صبا گل کو یہ پیام
کیا اُڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہین	آؤن قفس بھی توڑ کے پر بال و پر نہین
ایذا فغان کے حق مین یہانتک روا نہ رکھ	کیون مجھ سے بے گناہ کو ناحق کرے ہے قتل
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہین	اے یار تیرے دل مین خدا کا بھی ڈر نہین
نے داد خواہ ہون نہ گریبان دریدہ ہون	
خستہ جگر ہون چاشنی غم چشیدہ ہون	نے بلبل نہ چمن نہ گل نو دمیدہ ہون
نے شعلہ دنے برق و نہ اخگر نہ شرر ہون	مین موسم بہار مین شاخ بریدہ ہون
مین عاشق دل سوختہ ہون تفتہ جگر ہون	

فغان	سودا
مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا	بےکس کوئی مرے تو جلے اوس پہ دل مرا
ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا	گویا یہ ہے چراغ غریبون کی گور کا
اے فغان درد دل سنون کب تک	سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اُڑ گئی نیند اوس فسانہ سے	اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانہ مین

فغان کی تقلید مین سودا کا قطعات اور غزلین کہنا اُن کے باکمال شاعر ہونے کی بین دلیل ہے،

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ فغان کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہین ہو گی کہ مرزا رفیع جیسے صاحب کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے حقیقت مین مرزا کا خود بھی یہی انداز تھا کیونکہ ان کے کلام مین بھی ہندی کے محاورے نے فارسیت کے ساتھ نئے لطف سے پختگی پائی، اور ہر خیال کو لطافت اور چوچلے کے ساتھ ادا کرتے ہین[۱]، مولانا عبد السلام صاحب ندوی بھی رقمطراز ہین، کہ فغان شاعرانہ حیثیت سے میر اور سودا کے ہم پلہ وہم مرتبہ تھے،

مگر میر اور سودا کی مختلف حیثیتون سے اردو شاعری مین جو جگہ ہے، اس لحاظ سے فغان کو اُن کا ہم پلہ وہم مرتبہ کہنا ذرا مشکل ہے، عام طور سے یہ دونون اساتذہ سخن اپنی ندرتِ خیال، طرزِ بیان اور قدرتِ زبان کے لحاظ سے اپنا جواب نہ رکھتے تھے، فغان کے یہان نہ میر کا سوز و گداز ہے، اور نہ سودا کا جوش و خروش اُن کے یہان صرف زبان ہے، اور زبان مین بھی شگفتگی، ہمواری اور موسیقیت ہے، اور شاید اپنی زبان کی شگفتگی کی خاطر انھون نے غزلون مین شگفتہ طرحون کے سوا کوئی اور طرح اختیار نہین کی یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام مین شروع سے آخر تک یکرنگی، ہمواری اور توازن ہے،

البتہ اس حیثیت سے فغان کو میر اور سودا کے مقابلہ مین امتیاز حاصل ہے، کہ میر کی غزلون پر اس اعتراض "پستش بغایت پست و بلندش بنوبت بلند" کا آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا، سودا بھی

---

[۱] آب حیات ص۱۱۴،

اس الزام سے بری نہیں ہین، لیکن استاذی مولانا عبد السلام صاحب ندوی لکھتے ہین "اگر اس اعتراض سے صرف خواجہ میر درد اور فغان کا کلام بالکل محفوظ ہے" اس رائے کی تائید پیش نظر دیوان سے حرف بحرف ہوتی ہے جس کی مثالین دینا ضروری نہین ہے، چند غزلون کو چھوڑ کر ناظرین شروع سے آخر تک دیوان مین تواتر اور یکرنگی پائین گے،

فغاں ریختہ گو جہان مین بہت ہین　　　کوئی تجھ سا دنیا مین پیدا نہ ہوگا

میر و مرزا کے علاوہ فغان کے معاصر شیخ محمد قیام الدین قائم نے بھی ان کی سخن سنجی کی تعریف کی ہے،

"سلیقہ سخن سنجی درست دارد، چنانچہ از سیاق و سباق .... کلامش پیدا است"[۵۱]

میر قدرت اللہ قاسم (۱۱۶۲ھ - ۱۲۴۲ھ) جنھون نے فغان کا زمانہ دیکھا تھا، اپنے مجموعۂ نغز مین رقمطراز ہین:-

"شورش بخشگی نام دارد، سر آمد سخن سنجان فصاحت، امام مرزا محمد رفیع سودا بسیار ستائش دیوانش می کرد"[۵۲]

گلشن ہند کا مصنف فغان کو "شیرین کلام" لکھ کر کہتا ہے، کہ

"نظم ریختہ مین طبیعت ان کی رسا ہے"[۵۳]

مصحفی (۱۱۵۶ھ - ۱۲۴۰ھ) لکھتے ہین:-

"شعر را بہ صفائی تمام می گوید"[۵۴]

موجودہ دور مین فغان کا خراج تحسین موجودہ دور کے ارباب کمال نے بھی فغان کی قدر دانی کم نہین کی،
شیخ محمد ابراہیم ذوق نے فغان کے دیوان کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، محمد حسین آزاد نے جب اس دیوان کو پڑھا، تو اُن کی آنکھین روشن ہوگئین، چنانچہ وہ لکھتے ہین کہ اگرچہ فغان کی زبان اسی زمانہ کی زبان ہے

---

۵۱ مخزن نکات ص ۴۲، ۵۲ مجموعۂ نغز حصہ دوم ص ۲، ۵۳ گلشن ہند ص ۱۳۰، ۵۴ تذکرہ ہندی ص ۱۶۲

مگر فنِ شاعری کے اعتبار سے نہایت بااصول اور برجستہ ہے، اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے ...... اُن کی طبیعت ایشیا کی شاعری کے لئے نہایت مناسب تھی[۱]، مولانا عبدالحئی نے بھی فغان کو شعر و سخن کا ماہر کہا ہے[۲]، استاذی مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعرالہند نے تو اُن کو میر اور سودا کا ہم پلہ اور ہم مرتبہ قرار دیا ہے[۳]،

فغان کی گمنامی کا سبب مگر افسوس ہے کہ ایسے باکمال استاد کے دیوان سے اب تک ارباب ذوق ناآشنا رہے، یہی وجہ ہے کہ فغان اتنے مشہور نہ ہو سکے جس کے وہ مستحق تھے، مولانا عبدالسلام صاحب مدظلہ کا خیال ہے کہ فغان اگر مرشدآباد اور عظیم آباد جانے کے بجائے دہلی یا لکھنؤ ہی میں مقیم رہتے، تو اُن کو وہی شہرت حاصل ہوتی، جو میر کو تھی، وہ لکھتے ہیں، کہ اس وقت مرشدآباد اور عظیم آباد بھی اگرچہ شاعری کے مرکز ہو گئے تھے، تاہم شہرت کے جو اسباب لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے، وہ ان مقامات میں کہاں میسر آسکتے تھے اس لئے قدرتی طور پر شہرت کے جو سامان میر وغیرہ کو حاصل ہوئے، اس سے اشرف علی خان محروم رہ گئے،

فغان کے مشہور نہ ہونے کی وجہ تو خیر یہ ہو سکتی ہے لیکن معلوم نہیں ان کا دیوان اب تک طباعت اور اشاعت سے کیوں محروم رہا، حالانکہ ہر دور کے معمولی معمولی شعراء کے دواوین شائع ہو چکے ہیں، بہرحال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فغان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ الاصلاح دیسنہ ضلع پٹنہ میں محفوظ ہے، اس کے ناظم جناب سید عبدالحکیم صاحب نے اسے ۲۲ء میں استاذی مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے پاس بھیجا، مولانا موصوف نے معارف اپریل ۲۲ء میں اس پر ایک مختصر لیکن جامع تبصرہ تحریر فرمایا ہے آخر میں لکھا کہ یہ بہترین یادگار اس قابل ہے کہ اس کو نہایت محنت کے ساتھ اڈٹ کر کے عام طور پر شائع کیا جائے، لیکن افسوس اب تک اس کی نوبت نہ آئی شاید یہ سعادت راقم سطور کے لئے مقدر تھی؛ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس فرض کو میں نے پورے طور سے انجام دیا ہے، لیکن بہرحال جو کچھ بھلا برا بن پڑا،

---

[۱] آب حیات ص ۱۱۴، [۲] گل رعنا ص ۱۸۱ [۳] معارف نمبر ۴ جلد ۹،

پیش کر دیا گیا ہے۔

پیشِ نظر دیوان نہایت خوشخط نسخہ ہے، جس مین فغان کے فارسی اور اردو دونون کلام ہیں، شروع مین (۲۹ ورق یعنی ۲۵ صفحے فارسی غزلین، قطعات اور ایک ہجو ہین، فارسی کلام کو مین نے آخر مین منسلک کر دیا ہے، اس کے بعد اردو کلام ہے، جس مین غزلون کے علاوہ شروع مین دو قصیدے ہین جو جناب امیر اور حضرت امام علی موسیٰ رضا کی منقبت مین لکھے گئے، غزلون کے ساتھ ہی جا بجا قطعات ہین، آخر مین چند رباعیان متفرق اشعار، دو مخمس اور ہجوین ہین، اردو کا کلام ۳، ورق یعنی ۷۴ صفحے پر پھیلا ہوا ہے، یہ نسخہ ایک انگریز کرامت جنگ جیمس ولیم کلکٹر گورکھپور نے اپنے کسی اہلکار کو تحفۃً دیا تھا، پھر اتفاقاً یہ جناب بشیر الحق صاحب بیدل (سب انسپکٹر پولیس پنشن یافتہ) کے ہاتھ آیا، جن کو بجا طور پر شمع علم وفن کا پروانہ کہا جا سکتا ہے انھون نے اپنے محبوب وطن کے کتب خانہ کو نذر کر دیا،

اس نسخہ مین فارسی کلام کے آخر مین یہ عبارت لکھی ہوئی ہے،

"ہذا ختمت انتخاب دیوان مرزا اشرف علی المتخلص بہ فغان مخاطب بخطاب ظریف الملک کوکہ خان بہادر سلمہ اللہ الرحمان مالکہ"

اردو کلام کے آخر مین بھی یہی عبارت صرف چند الفاظ کے اضافہ کے ساتھ لکھی ہوئی ہے،

"ہذا ختمت انتخاب دیوان مرزا اشرف علی خان المتخلص بہ فغان مخاطب بخطاب ظریف الملک مصاحب الدولہ کوکہ خان بہادر یکہ تاز جنگ سلمہ اللہ الرحمٰن

ٹھیک اس عبارت کے پہلے کاتب کی ہجو مین مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ہوا ہے،

یہ جو میرا ہے راقمِ دیوان ——— تحفہ ننے کا بھولا بھالا ہے
کچھ نہ سیکھا غلط نویسی میں ——— ہوش جس روز سے سنبھالا ہے
ہائے ہوز وہ لکھے ہے حنا ——— آپ کا رسمِ خط نرالا ہے

قاتل طبع زاد ہے ظالم مین نے دشمن بغل مین پالا ہے
زندگی ہے میری سخن جس کو سہو کاتب نے مار ڈالا ہے

یہ قطعہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیش نظر دیوان فغان نے خود لکھوایا، اور شاید کلام کا انتخاب بھی خود کیا، اور یہی گویا اُن کے ادکار سخن کا اصلی سرمایہ ہے محمد حسین آزاد نے شیخ ابراہیم کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو فغان کا دیوان دیکھا تھا، وہ صرف غزلون کا مجموعہ اور مقدار مین دیوان درد سے بڑا تھا، لیکن موجودہ دیوان تو درد کے دیوان سے بہت بڑا ہے، اور غزلون کے علاوہ بھی اس مین بہت کچھ ہے،

راقم الحروف کو فغان کے دیوان کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے بھی ملا، جو بالکل کتب خانہ الاصلاح کے نسخہ سے ملتا جلتا ہے، دونون مین کوئی فرق نظر نہ آیا، دونون کا کاتب بھی ایک معلوم ہوتا ہے، خان بہادر محمد شفیع (سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) نے بھی ازراہ نوازش فغان کے دیوان کا ایک نسخہ اپنے ذاتی کتب خانہ سے استفادہ کے لئے بھیجا، مگر یہ بہت ناقص تھا، اس کی ضخامت بھی کم تھی، اس مین بہت سے ایسے اشعار تھے، جو مذکورۂ بالا دونون دیوان مین نہ تھے، شاید فغان نے ان اشعار کو رد کرکے اپنے اصلی دیوان سے نکال دیا ہو، ان تینون دیوان پر ایک طویل تبصرہ اس مسودہ مین تھا، جو انجمن ترقی اردو کو بھیجا گیا تھا، افسوس ہے کہ ہم پھر اس پر کچھ خامہ فرسائی کرنے سے بالکل قاصر ہین،

فتاوئ عالمگیری کے مؤلفین

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب رفیق دارالمصنفین

خاتمہ فتاوئ عالمگیری کے چند اور جامعین کے حالات یا نام بعض حال کے اردو تذکروں میں مل گئے ہیں، اگرچہ کسی قدیم تذکرہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی لیکن اس خیال سے ان کے نام یا مختصر حالات کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے تاکہ اصحاب علم میں کسی صاحب کو اگر اُن کے صحیح حالات اور فتاوی کی تالیف میں اُن کی شرکت کی تائید کسی قدیم ماخذ سے مل جائے، تو وہ اس کو پیش کر سکیں،

فتاوی کے مولفین کے نام کے ذکر کرنے میں زیادہ احتیاط اس وجہ سے کرنی پڑتی ہے کہ اس کے جمع و ترتیب کی نسبت بہت سے لوگوں کی طرف غلط مشہور ہو گئی ہے، اس غلطی کی وجہ ظاہر ہے کہ فتاوی عالمگیری ہندوستان کے علماء کا ایک بڑا اور مایۂ فخر کارنامہ ہے، اس میں علما کی ایک کثیر تعداد شریک تھی، اور وہ کام چونکہ کئی برس تک ہوتا رہا، اس لئے اشخاص میں رد و بدل بھی ہوتا رہا، اس بنا پر جن اشخاص جس خانوادہ کا فتاوی کی شرکت کے علاوہ علمی تعلق دربار عالمگیری سے تھا، اُن کی طرف بھی نادانستہ طور پر فتاوی کی تالیف کی نسبت کا ہو جانا چنداں تعجب خیز نہیں ہے، نیز جن لوگوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات لکھے، انھوں نے بھی اپنے اجداد کو اس شرف میں شریک کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ ہر بڑے اور باعث امتیاز کاموں میں شرکت کی نسبت ہوتا ہے،

یہ چند سطریں اس لئے لکھ دینا ضروری معلوم ہوا کہ مؤلفین فتاوی کی فہرست میں جو نام بھی داخل

کئے جائیں، اس میں پوری احتیاط سے کام لیا جائے، بہرحال ان کے نام یا مختصر حالات یہ ہیں،

ملا محمد غوث | محمد غوث نام، ابو محمد کنیت اور وطن کاکوری تھا،

۱۰۵۶ھ میں کاکوری میں پیدا ہوئے، مکتبی تعلیم کے بعد ملا محمد زمان ملا ابو الواعظ اور ملا قطب الدین سہالوی سے عربی کی تکمیل کی،[۱]

تکمیل کے بعد دلی چلے گئے، اُن کے تبحر علمی نے دربار عالمگیری میں پہنچایا، عالمگیر ان کا بڑا اعزاز کرتا تھا، حدیث میں خاص طور سے اُس نے اُن سے استفادہ کیا تھا،

مؤلف مشاہیر کاکوری کے بیان کے مطابق ملا محمد غوث بارہ سال تک عالمگیر کے ساتھ دکن میں رہے،

ملا غوث نے درس و تدریس کا مشغلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا، اور بہت سے تشنگان علم کی پیاس بجھائی، اُن کے مشہور تلامذہ میں شاہ محمد وارث، شیخ عبد اللہ بن شیخ امان اللہ، اور مولوی غلام مرتضیٰ مولف جواہر الانشار ہیں،

۶۴ سال کی عمر میں ۲۶ صفر ۱۱۲۰ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی، صاحب مشاہیر کاکوری فتاوی میں اُن کی شرکت کے متعلق لکھتے ہیں،

"تبحر علمی نے شاہ عالمگیر کے دربار تک پہنچایا، اور وہاں مجلس جامعین و مؤلفین فتاوی عالمگیری میں مقرر ہوئے" (ص ۲۵۴)

مولف نے اُس کے ثبوت میں قاضی نجم الدین علی خان (جو ملا غوث کے پوتے ہوتے ہیں) کی کتاب انتخاب ریاض سے ایک فارسی عبارت نقل کی ہے، لیکن فتاوی کی تالیف میں شرکت کے متعلق کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے، اس لئے ان کو مؤلفین فتاوی میں شامل کرنے کے لئے مزید ثبوت اور تصدیق کی ضرورت ہے

[۱] یہ بھی مؤلفین فتاوی میں ہیں، جنوری ۱۹۴۸ء کے معارف میں اُن کے حالات لکھے جاچکے ہیں ۵۲ مشاہیر کاکوری ص ۲۵۴

نواب علی حسن خان قاضی نجم الدین کے حالات مین لکھتے ہین،

"وجد بزرگوارش ملا محمد غوث فضائل پناہ و کمالات دستگاہ و در علم حدیث استاد اورنگزیب عالمگیر بادشاہ بود" (گلشن)

لیکن انھون نے بھی فتاوی کی شرکت کے متعلق کچھ نہین لکھا ہے،

ملا سعید | ملا سعید ملا قطب الدین شہید سہالوی کے منجھلے صاحبزادے تھے، تعلیم کی تکمیل اپنے والد ہی سے کی، اور عرصہ تک والد کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ رکھا، حضرت شہید کی شہادت کے بعد انھون نے عالمگیر کے دربار سے تعلق قائم کیا، اور وہان سے فرنگی محل کے قیام کی سرکاری سند ملنے کے بعد مع اہل و عیال سہالی سے لکھنو منتقل ہو گئے،

ولادت اور وفات کی تاریخ کی کوئی تصریح نہین مل سکی، پسماندگان مین دو صاحبزادے مولانا احمد عبد الحق، اور مولانا عبد العزیز یادگار چھوڑے،

فتاوی کی تالیف کی شرکت کے بارہ مین صاحب تذکرہ علمائے فرنگی محل نے لکھا ہے، کہ:-

"مشہور ہے کہ فتاوی عالمگیری کی تدوین ملا سعید ما بھی دوسرے علمار کی مانند شریک تھے، (ص ۶۳)

لیکن محض شہرت قطعی ثبوت کے لئے کافی نہین ہے،

علامہ ابو الفرح | حیات جلیل ص ۱۳ مین مذکور ہے،

"امیر میران علامہ ابو الفرح معروف بہ سید معدن جو فتاوی عالمگیری کی ترتیب و تالیف مین دیگر علمائے عصر کے دست و بازو تھے،

مولف نے کسی ... کا حوالہ نہین دیا ہے، اس لئے قطعی طور سے فتاوی کی تدوین

مین اُن کی شرکت کے متعلق کچھ نہین کہا جاسکتا،

ملا غلام محمد برادر محترم مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے ایک خط مین ملا غلام محمد قاضی القضاۃ کے متعلق لکھا تھا، کہ وہ بھی مولفین فتاوی مین ہین، اور انھون نے ایک قلمی کتاب آثار اشرف کا حوالہ بھی دیا تھا، لیکن کوشش کے باوجود وہ کتاب دستیاب نہین ہو سکی، کتاب ملنے کے بعد اسکی مزید تفصیل پیش کیجائے گی

حیات شبلی

حصہ اول

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی

یہ نوسو صفحون کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہین، بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی، اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ مین بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہین، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، اور شروع مین ایک دیباچہ ہے جس میں جدید علم کلام کی نوعیت اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم، اور ان کے متقدمین و معاصر علماء کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس مین دیار مشرق مین علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہین، اس کے علاوہ دار المصنفین ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتون کے ہاف ٹون بلاک فوٹون بھی شامل ہین،

کاغذ و طباعت اعلیٰ ضخامت ۹۲۰ صفحے

قیمت غیر مجلد سے ۱۲ مجلد للعہ علاوہ محصولڈاک

"منیجر"

استفسار و جواب

علامہ ابن جریر طبری کی دو کتابین

جناب منور احمد صاحب
نمبر ۱ کے ال اسٹریٹ اسلامیہ پارک لاہور

"براہ کرام مندرجہ ذیل استفسار کا جواب معارف کے ذریعہ دے کر مشکور فرمائین،

(۱) ابن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان مین اُن کی دو اور کتابون کا ذکر اکثر آتا ہے، جو اس تفسیر سے قبل لکھی گئی تھین، ایک کا نام "کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الدین" ہے، اور دوسری کا "کتاب البیان عن اصول الاحکام" چنانچہ مثال کے طور پر ان کا ذکر جلد نمبر ۹ کے ص ۳ اور ص ۲۶ پر علی الترتیب موجود ہے، اُن کے متعلق مین یہ دریافت کرنا چاہتا ہون، کہ آیا یہ کتابین موجود ہین، طبع ہوئی ہین یا اُن کے مسودات کسی لائبریری مین موجود ہین،

مین بہت مشکور ہون گا اگر جناب اس کے متعلق میری رہنمائی فرمائین، کیونکہ مجھے ان کتابون کے دیکھنے کا شوق ہے،

"والسلام"

معارف:- آپکے دونون گرامی نامے ملے، افسوس ہے کہ تفسیر ابن جریر طبری کا جو نسخہ ہمارے یہان ہے مطبوعہ مطبع میمنہ مصر ہے، اس کی نوین جلد کے ص ۳ و ۲۶ مین ان دونون کتابون کا تذکرہ موجود نہین اس کے مزید صفحے بھی دیکھے، مگر تذکرہ نظر نہین آیا، شاید آپکے پیش نظر نسخہ مطبع بولاق ہو، جس آیت کی تفسیر کے ذیل مین اُن کا ذکر آیا ہے، اس کا حوالہ آپنے دیا، ہوتا تو آسانی ہوتی،

بہرحال علامہ ابن جریر طبری کی ان دونون کتابون مین سے اول الذکر کا تذکرہ ان کے سوانح حیات

مین موجود ہے، نیز ابن ندیم نے الفہرست مین اس کا تذکرہ کیا ہے، کہ "یہ فقہ مین ہو اور کتب فقہ کے طرز پر مختلف کتابون و ابواب پر مشتمل ہو"، اس نے کتاب کا نام صرف کتاب اللطیف فی الفقہ لکھا ہو (ص ۳۲۷ ذکر طبری) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ مین کتاب لطیف القول فی الفقہ" کے نام سے تذکرہ کیا ہے، کہ "یہ بہترین تصنیف ہے، جس مین انھون نے اپنے اختیار کئے ہوئے مسائل قلمبند کئے ہین، (جلد ۲ ص ۲۸۱) علامہ سبکی نے بھی طبقات الشافعیہ مین محض اسی قدر لکھا ہے کہ "یہ فقہ مین اُن کی مختصر تصنیف ہے"، (جلد ۲ ص ۱۳۶) یاقوت حموی نے ابن جریر کا تذکرہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اور ایک سے زیادہ مقام پر اس مین اس کتاب کا ذکر آیا ہو، ایک جگہ اس نے اس کتاب کے متعلق خود علامہ جریر طبری کا قول بھی نقل کیا ہے، کہ وہ فرماتے ہین؛

"میری دو کتابین ہین جن سے کوئی فقیہ بے نیاز نہین رہ سکتا، وہ الاختلاف اور اللطیف ہین"

یاقوت نے اس کے بعد ان دونون کتابون کے مباحث و معلومات مین موازنہ کیا ہو اور آخر مین لکھا ہے؛

"کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام ایک ایسا مجموعہ ہو جس مین انھون نے اپنے مذہب و مسلک کے مطابق مسائل قلمبند کئے ہین اُن پر وہ خود اور اُن کے پیرو اعتماد کرتے تھے، یہ خود ان کی تصنیفات اور فقہ مین دوسرے فقہا کی تصنیفات مین نفیس ترین تصنیف ہے"، .....

"ابوبکر ابن رابیک کہتے ہین کہ کسی خاص مذہب و مسلک پر جو کتابین لکھی گئی ہین، ان مین سے ابوجعفر کی کتاب اللطیف اُن کے مذہب پر بہترین تصنیف ہو..... اُن کی کتاب الاختلاف (جو چھپ چکی ہو) سے اس مین چند کتابین (ابواب) کتاب اللباس، کتاب امہات الاولاد اور کتاب الشرب زیادہ ہین، یہ بہترین کتابون مین سے ہو، اور اپنے موضوع پر منفرد ہو، کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اس کے "لطیف" سے موسوم ہونے کی وجہ سے وہ مختصر اور خفیف بھی ہے، بلکہ لطیف سے مراد "لطیف القول" ہو، یہ کتاب تقریباً ڈھائی ہزار اوراق پر مشتمل ہو..... اس مین اصول فقہ، اجماع، خبر احاد، مراسیل، ناسخ و منسوخ وغیرہ مباحث بھی ہین (ص ۶۴ و ۶۵)

لیکن افسوس ہو کہ یورپ، مصر اور ہندوستان کے معروف کتب خانون مین سے کسی مین اس کا کوئی نسخہ محفوظ

نہین اس لئے یہ کہا بھی نہین جاسکتا کہ اس کا وجود بھی باقی رہ گیا ہے یا علامہ ابن جریر کی بہت سی دوسری کتابون کی طرح ناپید ہو چکی ہے،

آپ نے دوسری کتاب البیان عن اصول الاحکام کا جو تذکرہ کیا ہے، افسوس ہے، کہ اس کا ذکر اُن کے سوانح حیات یا فہرست کتب مین موجود نہین،

علامہ ابن جریر طبری کی فن اصول مین ایک مختصر تصنیف "التبصیر فی معالم الدین" کے نام سے ہے معجم الادبا مین اس کا نام التبصیر کے بجائے البصیر چھپا ہے یہ تیس اوراق کا ایک مختصر رسالہ ہے، پھر انھون نے علم اصول مین ایک کتاب الموجز فی الاصول کے نام سے لکھنی شروع کی تھی لیکن اس کا لکھنا انھون نے موقوف کردیا، اور انھین اس فن مین ایک نئی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا، مگر وہ خیال عمل مین نہ آسکا، (معجم الادبا، جلد ۶ ص ۴۵۲، ۴۵۴، طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۱۳۶ و تذکرۃ الحفاظ)

تفسیر مین البیان عن اصول الدین کا ذکر معلوم نہین کس حیثیت سے آیا ہے، یاقوت نے علامہ محمد بن جریر کے سوانح حیات دو اہم ماخذ سے مرتب کئے ہین اور اچھے خاصے مفصل ہین، یہ دونون ماخذ علامہ کے صاحبزادے عبدالعزیز بن محمد طبری اور ابو بکر بن کامل کی تصنیفات ہین جو خاص سیرت طبری پر لکھی گئی ہین، (معجم الادبا جلد ۶ ص ۴۲۴) اس لئے معجم الادبا مین طبری کی تصنیفات مین البیان عن اصول الدین کا تذکرہ نہ ملنا نظرانداز کئے جانے کے لائق نہین، ممکن ہے یہ وہی اُن کی موعود تصنیف ہو جس کو وہ اصول دین مین لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ "انھون نے اصول و فروع مین بکثرت کتابین لکھی تھین، (مفتاح السعادہ جلد اول ص ۲۰۶) ہوسکتا ہے کہ البیان عن اصول الدین کے نام سے بھی کوئی کتاب تصنیف پائی ہو لیکن بہرحال وہ ابن ندیم صاحب الفہرست، حاجی خلیفہ صاحب کشف الظنون اور طاش کبری زادہ صاحب مفتاح السعادہ وغیرہ کی نظر سے نہین گذری، ورنہ اُن کی تصنیفات مین اس کا ذکر موجود ہوتا، اس لئے اس سلسلہ مین کسی آخری اور حتمی بات کا کہنا دشوار ہے، قیاسی طور پر جو باتین ذہن مین آسکتی ہین، وہ عرض کی گئین، آپ ان پر غور و خوض فرماسکتے ہین، والسلام

"س"

وفیات

ماتم گسار برامکہ کا ماتم

مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری جو البرامکہ کے مصنف کی حیثیت سے مشہور تھے، پچاسی برس کی عمر میں ۸ ار فروری ۱۹۴۸ء کو بمقام بھوپال اپنی نواسی کے گھر میں ۳ بجے رات کو یکایک انتقال کیا، وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے، اُن کے داماد ان کو علاج کی خاطر دلی لے گئے تھے، اور غرض یہ بھی تھی کہ اُن کے بعض پچھلے مسودات وہاں چھپ جائیں کہ دلی میں ہنگامہ ہوا، اور لوگوں میں بھگدڑ مچی، مولوی صاحب موصوف کو اُن کے عزیز ہوائی جہاز سے بھوپال لائے، جہاں ایک زمانہ سے مختلف خدمتوں کے تعلق سے ان کا قیام تھا،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کے احاطہ کے اندر اس وقت ہوئی جب علی گڈہ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سبب سے ملک کے اکابر و مشاہیر لکھنؤ آئے تھے، البرامکہ میں کم سنی میں پڑھ چکا تھا، مصنف سے واقف تھا، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس زمانہ میں دارالعلوم میں قیام فرماتے تھے، ملنے والوں کا ان کے پاس ہجوم تھا، انہی میں مولوی عبدالرزاق صاحب تھے، شاہ صاحب نے ان کی طرف اشارہ کرکے مذاقاً فرمایا کہ یہ برامکہ صاحب ہیں، اس تعارف سے مجھے خوشی ہوئی،

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ حیدرآباد سے قطع کرکے دارالعلوم میں معتمد ہوکر آئے، تو مرحوم کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی، یہ وہ زمانہ تھا جب

مرحوم نظام الملک سلجوقی لکھ رہے تھے، اور اس سلسلہ سے اپنے مسودات مولانا کو دکھانے لاتے تھے اور ان سے مشورہ چاہتے تھے،

مرحوم کی علمی استعداد اسی قدر تھی کہ وہ فارسی اچھی طرح جانتے تھے اور عربی سے مانوس تھے، اور عبارت سے مطلب سمجھ لیتے تھے، البرامکہ لکھتے وقت اس سے بھی کم واقفیت تھی، اس زمانہ مین ندوہ کا دفتر کانپور مین تھا، اور اسی تعلق سے مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلما جو بہت اچھے ادیب تھے، کانپور مین رہتے تھے، اور منشی عبدالرزاق صاحب جیسا کہ وہ اس وقت کہلاتے تھے البرامکہ لکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو فطری انداق بخشا تھا، اور حیات سعدی و المامون وغیرہ سے اردو مین سوانح نگاری کی ایک طرح پڑ چکی تھی، مرحوم عربی تاریخی اور ادبی کتابون کو لفظا لفظا دیکھتے تھے، اور جہان برامکہ یا برمکی کا لفظ دیکھتے، نشان لگا دیتے تھے، اور بعد کو اس کا مطلب سمجھ کر اس کو اردو مین لکھ دیتے، عربی اشعار کے سارے ترجمے جیسا کہ سنا مولانا سید عبدالحی صاحب کے کئے ہوئے ہین، اور پورا مسودہ حضرۃ الاستاذ کی نظر سے گذارا گیا تھا، اور شاید اسی جذبہ کے تحت مصنف نے بڑے ادب کے ساتھ مولانا کے نام اس کو منسوب کیا تھا، اور یہ شعر لکھا تھا،

مسند علم از وجودت منبع آداب باد   آستانت قبلۂ جان اولی الالباب باد

کانپور مین اس وقت جدید ادبی مذاق کا مرکز منشی رحمت اللہ صاحب رعد مالک نامی پریس کانپور کا مطبع تھا، جہان سے منشی صاحب پہلے ایک مصور رسالہ نکالتے تھے، اور پھر نامی جنتری نکالنے لگے تھے، منشی عبدالرزاق صاحب اس وقت جیسا کہ یاد آتا ہے، کانپور میونسپلٹی مین ملازم تھے، اور وہین رحمت اللہ رعد اور مولوی عبدالرزاق صاحب مین دوستانہ اتحاد پیدا ہوا، منشی رحمت اللہ رعد صاحب کو سرسید کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی اور سرسید کے فوٹو سے ادبی لگاؤ تھا، اس تعلق سے مولوی عبدالرزاق صاحب بھی اسی مرکز سے وابستہ ہوئے، اور تاریخ کی دلچسپی کے سبب سے خاص طور سے مولانا شبلی سے اُن کو زیادہ اُنس ہوا، مولینا نے

"سلسلۂ فرمانروایان اسلام" کی بنیاد ڈالی تھی، اور المامون لکھ چکے تھے، اور الفاروق کا غلغلہ تھا، اس مناسبت سے مولوی عبدالرزاق صاحب کے ذہن میں "سلسلۂ وزرائے اسلام" لکھنے کا خیال آیا، اور سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں البرامکہ اور اس کے ۱۵ برس بعد ۱۹۱۲ء میں نظام الملک سلجوقی لکھی، اور ملک میں بہت مقبول ہوئی، البرامکہ خصوصیت سے زیادہ مقبول ہوئی، اور بہت پڑھی گئی، اور کئی دفعہ چھاپی گئی، اخیر اڈیشن ابھی چند سال ہوئے، مرحوم نے نظر ثانی کے بعد مع جدید اضافوں کے شائع کیا تھا، ان دو تصنیفات کے علاوہ انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں، مرزا فرحت شیرازی کی کتاب آثار عجم سے لے کر ایرانی یادگاروں پر کچھ ان کے مضامین معارف علی گڈھ میں نکلے تھے، زردشت، جاماسپ اور بزرجمہر وغیرہ کے حکایات آمیروں کے پرانے افسانوں سے بھی اُن کو دلچسپی تھی،

مرحوم کی بچاسی سال کی عمر کے لحاظ سے ۱۸۶۳ء میں پیدائش ہوئی ہوگی، اور اُن کے ہوش کا زمانہ سرسید اور اُن کے رفقاء کی جد وجہد کا دور تھا، وہ علی گڈھ جاکر مولانا شبلی کے یہاں بھی مقیم ہوتے تھے، اور خود مولانا بھی ندوہ کے تعلق سے کانپور آتے جاتے تھے، اس لئے اس دور کے اکابر اور مشاہیر فن سے ان کی شناسائی تھی، اسی تعلق سے میں نے اُن سے خواہش کی تھی، کہ اپنے زمانہ کے دیکھے ہوئے بزرگوں اور ان کی محفلوں کے مشاہدات یکجا کر دیں، چنانچہ اس زمانہ میں جب سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر آئے، انھوں نے اپنے ان مشاہدات کو قلمبند کیا، اور وہ سلسلہ کسی مقامی پرچہ میں چھپتا رہا، بعد کو ان مطبوعہ اوراق کو میرے پاس بھیجا کہ میں انھیں مطبع معارف سے شائع کر دوں، مگر یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، کاغذ کی نایابی سے وہ ہمارے ہاں نہ چھپ سکا، اور مولف کو واپس کر دیا گیا، سنا ہے کہ وہ حیدرآباد دکن سے چھپ کر شائع ہوا،

نظام الملک کی قدر دانی نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے پوری کی، ریاست آصفیہ کی طرف سے اس کے بہت سے نسخے خریدے گئے اور شاید مصنف بھی انعام سے سرفراز ہوئے، اسی سلسلہ میں حیدرآباد

کے ارادہ سے وہ بھوپال وارد ہوئے، اور سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ سے ملے انھون نے ازراہ قدردانی اپنی ریاست مین تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر کردیا، یہ واقعہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کا ہوگا، بعد کو جب کسی ضرورت سے میرا یہان آنا ہوا تو سابق نواب ولیعہد بہادر کی ڈیوڑھی سے ان کو وابستہ پایا اور ان کی فرمائش سے وہ اس زمانہ مین اُن کے والد نواب احمد علی خان کی سوانحمری اور افغانان جلال آباد (ضلع مظفرنگر) کی تاریخ قلمبند کر رہے تھے، مین نے مبارکباد دی کہ کیا عجب آپ بھی کسی زمانہ مین یہان کے نظام الملک بن جائین، مگر ولیعہد بہادر نے ۱۹۲۴ء مین وفات پائی، اور سرکار عالیہ نے ان کو تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر فرمایا، یہ اس کام کو ایک مدت تک انجام دیتے رہے مگر پھر بساط ایسی الٹی کہ گوشہ نشین سے ہوگئے، اس کے بعد سر راس مسعود نے اپنی وزارت تعلیم کے عہد مین جب تالیف و ترجمہ کا ایک سرکاری ادارہ قائم کیا، تو مرحوم اس کے اسٹاف مین داخل ہوئے، اور تاریخ بھوپال وغیرہ کی طرح ڈالی، مگر سر راس مسعود کا زمانہ جلد ختم ہوگیا، اور ۱۹۳۵ء مین انتقال کر گئے، تو یہ ادارہ بھی خواب پریشان ہو کر رہ گیا،

وہ ادھر ضعف عمر کے سبب سے کمزور بھی ہوگئے تھے تاہم کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے، اخیر تصنیفات تاریخ اسلام وغیرہ کے مسودات اُن کے وارثون کے پاس ہین، اور عجب نہین کہ وہ اُن کو شائع کرین، مرحوم چونکہ یوپی سے بھوپال آگئے تھے، اور وہان کے علمی و ادبی حلقون سے الگ ہوگئے تھے، اس لئے لوگ ان کو اُن کی زندگی ہی مین بھول چکے تھے، اور انھین خود بھی یہ خیال تھا کہ لوگ انھین مردہ سمجھ چکے ہونگے، اس لئے مجھ سے دو دفعہ غالبًا یہ خواہش کی کہ مین ان کی زندگی کی خوشخبری لوگون کو پہنچا دون چنانچہ معارف کے شذرات مین ان کی یہ تحریرین ہون گی،

مولانا شبلی مرحوم کے دوسرے دوستون کے ساتھ مین جو ادب ملحوظ رکھتا تھا، وہی اُن کے ساتھ رکھتا تھا، اور وہ بھی مجھے اپنے عزیزون مین شمار کرتے تھے آج اس مساوات کے زمانہ مین ہمارے نوجوان خوردی و بزرگی کے ان آداب کو شاید نہ سمجھ سکین،

۱۰ فروری ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو دفتر دار المصنفین میں ٹیلیفون سے مجھے کسی نے مطلع کیا، کہ رات مولوی عبد الرزاق صاحب نے انتقال کیا، ۲ بجے نماز جنازہ ہوگی اور امن شاہ کے تکیہ میں مدفون ہونگے، لیکن افسوس کہ جب میں قبرستان میں پہنچا، تو اُن کے احباب اور اعزہ ان کو دفن کرکے واپس جا چکے تھے، اور اس وقت اُن کی قبر کو مزدور پتھر سے گھیر رہے تھے، دعائے مغفرت پڑھی، اور اُن کے عزیز کے گھر جاکر جہاں انھوں نے وفات پائی تھی فرض تعزیت ادا کیا،

مرحوم بلند بال، خوش خلق اور متواضع تھے، ہر حال میں وہ اپنے علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے، اب زمانہ کے حالات میں جو انقلاب ہو رہا ہے اسکو دیکھتے ہوئے ایسے شایقین و خدمتگذاران علم و ادب کی توقع بہت کم کیجا سکتی ہے،

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، "س"

نواب غلام احمد کلامی مدراس

ہماری بوڑھے قومی خدمتگذاروں میں مدراس کے ایک بزرگ نواب غلام احمد کلامی تھے، پچھلے رہنمایان ملت کے کاموں میں یہ ہمیشہ ہاتھ بٹانے رہے اور ان کی رفاقت کا دم بھرتے رہے، ندوۃ العلماء کی تحریک سے احاطہ مدراس میں جن بزرگوں کو دلچسپی تھی، ان میں ایک نام ان کا بھی ہے، اسی تعلق سے ندوہ کی رودادوں میں اُن کے تذکرے آئے ہیں، مکاتیب شبلی میں مولانا ابو الکلام کے نام کے خطوں میں بھی ان کا ذکر ہے، افسوس ہے کہ مرحوم نے ۸۲ برس کی عمر میں ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء (۱۱ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ) کو بروز جمعرات بوقت عصر اس جہان فانی کو الوداع کہا،

ان کا قیام اور کاروبار کولار واقع ریاست میسور میں تھا جہاں سونے کی کان ہے، ریاست میسور کی اسمبلی میں مسلمانوں کے نمایندے بھی رہے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرتے تھے، معارف کے قدردانوں میں تھے، شروع سے آخر دم تک وہ اس کے خریدار رہے، خاکسار کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب مدراس میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا تو اس تقریب سے مرحوم کی خدمت میں کولار حاضر ہونے کا بھی موقع ملا تھا، اور انہی کے توسط سے کولار کے طلائی معدن کے کارخانہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس کے بعد میسور کی طرف جب جاتا تھا تو ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، کبھی کبھی خط و کتابت کا بھی اتفاق ہوتا تھا، بہت نیک، ملنسار اور متواضع بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

"س"

ادبیات

نعتِ رسول

از جناب ابو طاہر مصلح الدین صاحب ڈھاکہ

مرے ذوقِ طلب کی ہے یہ خامی
کہ قسمت میں لکھی ہے تشنہ کامی

زباں کو چشمۂ کوثر سے دھولے
یہ کس کا لے رہا ہے نام نامی

جہاں میں رحمت اللعالمیں ہیں
محمد مصطفےٰ اسمِ گرامی

ملک ہیں جن کے در پر سر بسجدہ
شہنشاہوں کو ہے فخر غلامی

ہوا جو زینتِ عرشِ الٰہی
شبِ معراج یہ عالی مقامی

بیاں ہوں کس طرح اسکے فضائل
خدا سے جس کو حاصل ہم کلامی

خدا کا وہ، خدائی اس کی ساری
الٰہی اس کی یہ عالی مقامی

جو جان و دل سے قربان نبی ہو
مقدر میں ہے اس کے شادکامی

مئے وحدت کا نشہ چھا رہا ہے
طبیعت میں ہے اک کیفِ دوامی

میں یہ سمجھوں مقدر جاگ اٹھا ہے
ترے در کی جو مل جائے غلامی

جو باد ل سیرِ یثرب کو رواں ہیں
مرے جذبات دل کے ہیں پیامی

جبیں سے داغِ عصیاں کو مٹا کر
درِ حضرتؐ پہ طاہر دے سلامی

غزل

از

جناب مولوی محمد عزیز صاحب ام اے لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

دل کو پھر اضطراب ہوتا ہے — پھر وہی پیچ و تاب ہوتا ہے

تم کو معلوم کیا محبت مین — کون خانہ خراب ہوتا ہے

کس سے کہئے کہ داغِ دل سے وشن — ہر شب ماہتاب ہوتا ہے

ذکر تیرا دلِ حزین کے لئے — دورِ جامِ شراب ہوتا ہے

نگہِ غور سے اگر دیکھو — ذرہ بھی آفتاب ہوتا ہے

کس کو ہے فردِ جرم سے انکار — کیوں سوال و جواب ہوتا ہے

یاد سے اس کی بزم رنگیں کی — تازہ عہدِ شباب ہوتا ہے

جرم بھی بے شمار کرتے ہین — عفو بھی بے حساب ہوتا ہے

اُس گُلِ تر کی یاد مین ہر شب — فرشِ گل فرشِ خواب ہوتا ہے

سعیِ پیہم شعار ہو جس کا — بس وہی کامیاب ہوتا ہے

آج پھر مائلِ کرم ہین وہ — آج پھر فتح باب ہوتا ہے

شاعری مین عزیز یہ ہے — وقت خاصا خراب ہوتا ہے

مطبوعات جدیدہ

اسلامی نظریہ اجتماع از جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عا، پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدر آباد دکن،

موجودہ عالمگیر بدامنی اور فساد فی الارض کا سب سے بڑا سبب انسانوں کے خود ساختہ اخلاق و روحانیت سے خالی خالص مادی نظامات ہیں جن کی بنیاد عالمگیر انسانی اخوت کے بجائے جغرافی وطنیت اور نسلی قومیت پر ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام کے نظام اجتماعی کی اساس خدا شناسی اخلاق و روحانیت، عدل و مساوات، اور عالمگیر قومیت پر ہے اور اس کے سارے اجزاء میں یہ روح ساری ہے، یہ مباحث مصنف کا خاص موضوع ہیں، اور اس پر معارف میں بھی اُن کے مضامین نکلتے رہتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے اسلامی نظام اجتماع اور دوسرے مادی نظاموں کا فرق اور اسلامی نظام کے فوائد و برکات اور دنیاوی نظاموں کے مفاسد اور نقصانات دکھائے ہیں، اور تاریخی حیثیت سے اسلامی نظام اجتماع کی برہمی کے اسباب پر نگاہ ڈالی ہے، اور اس کے بعض اہم اجزاء اسلامی جہاد تنظیم ملی کی اساس آزادی کے اسلامی مفہوم وغیرہ کی وضاحت کی ہے، موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے کتاب کے مباحث سرسری اور تشنہ ہیں، تاہم اُن سے اسلامی نظام اجتماع کا بنیادی تصور سامنے آجاتا ہے، مصنف کی یہ دینی خدمت لائق تحسین ہے لیکن صحیح اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام اجتماعی کو پیش کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری اسلامی تاریخ پر خط نسخ پھیر دیا جائے، جو واقعہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے، یہاں تک تو بلاشبہ صحیح ہے کہ دینی اعتبار سے اسلامی تاریخ کا بہترین دور خلافت راشدہ کا ہے، اس کے بعد ملوکیت قائم ہوگئی

اور اسی کے ساتھ اس کی بہت سی برائیاں بھی پیدا ہوگئین، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دورِ ملوکیت کا سارا نظام غیر اسلامی تھا، اور تمام اموی خلفا، انتہا درجہ کے عیاش، بدکردار اور ظالم تھے (ص ۹۶) اور عباسی خلفاء ان سے بھی گئے گذرے تھے (ص ۰۰) قطعاً غلط ہے وہ دنیاوی بادشاہ تھے، ان مین اچھے بھی تھے بُرے بھی اور اپنی شخصی کمزوریون کے باوجود ان مین سے بہتون نے اسلام اور مسلمانون کی بہت سی مفید خدمات بھی انجام دین، اس سے تاریخ کا کوئی واقف کار انکار نہین کرسکتا، اور گوان کا طرزِ حکومت اسلامی روح سے خالی تھا لیکن حکومت کا قانون اسلامی ہی تھا، یہ اور بات ہے، کہ اس کے تمام اجزاء پر عمل نہ رہ گیا تھا، خلافتِ راشدہ کے بعد سارے نظامون کو باطل قرار دینے کے معنی تو یہ ہین، کہ اسلامی نظام مین زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ ایک تہائی صدی سے زیادہ نہ چل سکا، اور ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے، کہ جب اموی اور عباسی دور مین جو عہدِ رسالت سے اس قدر قریب تھا، یہ نظام قائم نہ رہ سکا اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ائمہ تابعین اور تبع تابعین، اور دوسرے صلحاء واخیارِ امت اس کی اصلاح نہ کرسکے، تو آج جب کہ ان مین سے کوئی خصوصیت بھی باقی نہین ہے، اس کا احیاء کس طرح ممکن ہے، لیکن اگر ان نظامون کو باطل اور غیر اسلامی کہنے کے بجائے اس کو نقص و فساد سے تعبیر کیا جائے، تو اس کی اصلاح کی کوشش ہر زمانہ مین ہو سکتی ہے، مصنف نے تاریخی واقعات کا بھی صرف ایک رُخ دکھایا ہے، خلیفہ منصور نے بلاشبہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو سزا دی تھی، لیکن محمد مہدی کی حمایت کے جرم مین نہین، بلکہ اس لئے کہ منصور کے اصرار کے باوجود وہ عہدہ قضا قبول نہین کرتے تھے، گو اس سے منصور کا جرم ہلکا نہین ہو جاتا، لیکن مقصود واقعہ کی تصحیح ہے، لیکن اس کے باوجود وہ امام موصوف کے کمال کا اتنا معترف تھا کہ ان کو قید سے بلوا کر استفادہ کرتا تھا، اسی طریقہ سے حضرت امام مالک کو مدینہ کے ناقدرشناس والی جعفر نے سزا دی تھی، اس مین منصور کی مرضی اور منشاء کو کوئی دخل نہ تھا، اس کو جب جعفر کی اس گستاخی کا علم ہوا، تو سخت برہمی ظاہر کی اور اس کو سزاءِ ذلت کے لئے گدھے پر سوار کرکے مدینہ سے بغداد بلوایا، اور امام موصوف سے معذرت کی منصو

امام مالک کی بڑی عظمت کرتا تھا، اس کے بہت سے واقعات تاریخون مین مذکور ہین، واقعات کا صرف ایک رُخ پیش کرنے سے اُن کی تصویر بہت غلط آتی ہے، پوری اسلامی تاریخ کو تاریک دکھانا اسلام کی کوئی اچھی خدمت نہین ہے، اسی طریقہ سے ان اسلامی تعلیمات کی تعبیر جن کا تعلق نئے مسائل اور حالات سے ہو، جدید مذاق کی رعایت سے نئی اصطلاحون مین کرنا بُرا نہین ہے لیکن اسی حد تک جس سے اُن کے اصل مفہوم و منشا مین فرق نہ آنے پائے لیکن تجدد کے شوق مین مصنف کے قلم سے کلام مجید کے ترجمہ تک مین لغزش ہو گئی ہے، مثلاً اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِلْعٰلَمِیْنَ مین ذکر کا ترجمہ ضابطۂ حیات ص ۱۷۱، اور تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کی تشریح خیر و شر اور نیک و بد کے اعتبار سے اشیاء کی قدرین متعین کرو، معلوم نہین کس لغت اور تفسیر کے اعتبار سے صحیح ہے، بجز اس کے "ضابطۂ حیات" اور "قدرین" کی اصطلاح کو خواہ مخواہ لانا مقصود تھا، ایک طرف تو یہ شدت کہ خلافتِ راشدہ کے علاوہ ساری اسلامی حکومتون کے نظام باطل دوسری طرف یہ تجدد کہ ہر نئی اصطلاح کو خواہ اس کا موقع و محل ہو یا نہ ہو کلام مجید کے ترجمہ تک مین کھپانے کی کوشش کیجاے، ہر چیز مین اعتدال ضروری ہے، امید ہے کہ لائق مصنف آیندہ ان امور مین احتیاط ملحوظ رکھین گے، ایک ہوشیار طبیب کیلئے مرض کے علاج مین مریض کے پورے مزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ علاج دوسرے امراض کا سبب بن سکتا ہے،

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز کارنامے مترجمہ جناب عبدالوہاب صاحب ظہوری تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۷ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد :- ہے، پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ، حیدرآباد دکن،

مسلمانون کا عروج و زوال دونون حیرت انگیز واقعات و حوادث پر مشتمل ہے اُن کے دورِ عروج مین ایشیا، افریقہ، یورپ تینون براعظم ان کی اولوالعزمیون کا جولانگاہ تھے، یورپ سے صدیون ان کا گہرا رابطہ رہا، اور وہان انھون نے بڑے دیرپا اثرات چھوڑے، اس لئے اُن کی ترقی اور تنزل دونون کے اثرات عالمگیر تھے، مصنف نے اس کتاب مین دونون دورون کے ان واقعات و حوادث کو جن کے عالمگیر اثرات پڑے،

خصوصاً جن کا تعلق یورپ سے ہے، موثر انداز مین جمع کر دیا ہے، مثلاً عربون کا ظہور ان کی دینی سیادت، یورپ کی حکومتون سے اُن کے تعلقات، قسطنطنیہ پر پہلا حملہ، صلیبی لڑائیان مغربین ان کے اثرات، قرون وسطی مین غلامی کا رواج اسلام کی اصلاحات، مسلمانون کی بحری سیادت، اُن کے سمندری کارنامے، رومائے انکے معرکے اسلامی اسپین کے اہم واقعات، یہان اُن کی تمدنی خدمات اسپین سے ان کا زوال، اور اُن کے علمی آثار، مارکو پولو کی سیاحت، ابن بطوطہ کی سیاحت اور اس کا درجہ وغیرہ اس نوع کے اور بہت سے مباحث اور اسلامی تاریخ کے اہم واقعات اس کتاب مین آگئے ہین، اگر بظاہر ان مین باہم کوئی ربط و علاقہ نہین ہے، اور وہ تاریخ اسلام کی کوئی مسلسل اور مربوط کڑی نہین معلوم ہوتے لیکن ان سے ایشیا افریقہ خصوصاً یورپ سے مسلمانون کے تعلق اور یہان اُن کے عروج و زوال کے اثرات کے بہت سے رخ سامنے آجاتے ہین، اور تاریخ مین اُن کی اہمیت اور اُن کے درجہ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، اصل کتاب قاہرہ کے ایک صاحب علم و قلم بیرسٹر عبد اللہ عنان کی تصنیف ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

راجپوت اور مغل زن وشو کی معاشرت	ازجناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے

پتہ :- الہ آباد پبلشنگ ہاوس الہ آباد،

ہندوستان مین ہندو اور مسلمانون کے میل جول سے جو مخلوط تمدن پیدا ہوا اس کی تکمیل تیموریون کے زمانہ مین ہوئی، ان کی اور راجپوتون کی قرابت سے جب ہندو تمدن ایوان شاہی مین پہنچا، تو ایرانی تمدن کے اختلاط سے ایک ایسا دو آتشہ پر قلمون اور دل آویز تمدن ہوا، جو ہندوستان کا معیاری تمدن قرار پایا، جو ہندو مسلمانون کے اتحاد کی سب سے بڑی نشانی ہے، لائق مؤلف نے اس کے ایک دلچسپ پہلو "راجپوت اور مغل زن وشو کی معاشرت" پر یہ کتاب لکھی ہے، لیکن یہ موضوع جس قدر دلکش ہے، اسی قدر مشکل بھی ہے، اور تاریخ سے اس معاشرت کا پورا مرقع دکھانا آسان نہین ہے، اسی لئے چارسو صفحون

کی اس ضخیم کتاب مین ہندوستان نے مسلمان سلاطین خصوصًا تیموریون اور راجگان ہند کے تعلقات، اس سے متعلق مختلف واقعات وحالات، اور اس دور کے دوسرے متفرق معلومات تو کافی ہین، اور اس کے حواشی و تعلیقات بھی قابل قدر ہین، لیکن اُن کو اصل موضوع سے بہت کم علاقہ ہے، اور یہ حصہ گویا اس کی صرف تمہید ہے، غالبًا کتاب کے دوسرے حصہ مین اس پر بحث ہوگی، تاہم یہ کتاب اس دور سے متعلق مختلف النوع معلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے، اور کہن سال مصنف کے قلمی تبرک کی حیثیت رکھتی ہے، موضوع کی دلکشی کے اثر سے جابجا مصنف کے قلم مین جوانی کی رنگینی اور چمک آگئی ہے،

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط | از جناب محمد معین الدین صاحب دردائی، ایم اے علیگ
تقطیع اوسط، ضخامت ۸۴ صفحے، کاغذ، کتابت و

طباعت اوسط، قیمت مجلد عہر، پتہ طیب حسن اینڈ برادرس، اسلامیہ بک ڈپو، آرہ،

مذکورہ بالا کتاب مین مصنف نے تاریخی علمی، اور لسانی حیثیت سے ہندی کے مقابلہ مین اردو کی اہمیت، اور لسانی اور صوتی، اور کتابت و طباعت کی سہولتون کے لحاظ سے اردو رسم الخط کی خصوصیات اور اس کی آسانیان دکھائی ہین، اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، اس کے جوابات دئیے ہین، اور دیوناگری رسم الخط کے نقائص اور اس کی دشواریان ظاہر کی ہین، لیکن راج ہٹ کے مقابلہ مین اس قسم کے سارے سنجیدہ دلائل اور بحثیں بے کار ہین، اردو کا سب سے بڑا عیب اور قصور یہ ہے کہ وہ مسلمانون کے دور حکومت کی پیداوار ہے، اور اس مین اسلامی اثرات بھی ہین، اور ہندی اور سنسکرت خالص ہندوؤن کی قدیم زبان اور اسلامی اثرات سے بالکل پاک ہین، اس کے بعد اور کسی دلیل کی ضرورت ہی نہین رہجاتی،

جلد ۶۱ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۸ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

ہم گذشتہ مہینہ مین پاکستان مین اردو کے مسئلہ پر اپنے تفصیلی خیالات ظاہر کر چکے ہین تازہ خبرون سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ وہان کی سرکاری زبان اردو ہوگی، یہ دانشمندانہ فیصلہ ہر لحاظ سے پاکستان کے لئے مفید ہوگا، لاہور کی اردو کانفرنس مین بھی اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے مناسب تجویزین پاس ہوئین، ان پر عمل کی بھی ضرورت ہے لیکن پاکستان کے اس فیصلہ سے ہندوستان مین اردو کے مسئلہ کا حل نہین ہوتا جس سے کوئی ہواخواہ اردو دست بردار نہین ہو سکتا، اس کے لئے برابر کوشش جاری رہنا چاہئے، گو جبری اور مصنوعی طریقہ سے نہ کوئی زبان پیدا کیجا سکتی ہے اور نہ مٹائی جا سکتی ہے، اس لئے اردو کا مٹنا آسان نہین ہے لیکن اس سے بھی نہین انکار کیا جا سکتا کہ زبان کی ترقی و تنزل مین حکومت کی حمایت اور مخالفت کو بڑا دخل ہے خصوصاً ایسی حالت مین جب اس کو قومی مسئلہ بنا دیا جائے،

زبان کا مسئلہ خالص لسانی اور تمدنی تھا، اس کو محض اغراض کی بنا پر سیاسی بنا دیا گیا ہے چنانچہ آج بھی ہندوؤن کی خاصی تعداد بجا طور پر اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتی، اور اس کا برملا اعتراف کرتی ہے حتی کہ وہ منصف مزاج اور ذمہ دار ہندو بھی جن کی مادری زبان اردو نہین ہے اسی کو ہندوستان کی مشترک زبان سمجھتے ہین، اور جبری سیاسی زبان کو پسند نہین کرتے، حال ہی مین مرکزی اسمبلی کے صدر مسٹر ماولنکر نے جن کی مادری زبان غالباً گجراتی ہے بنارس کی ایک تقریر مین زبان کے بارہ مین جو خیالات ظاہر کئے ہین، وہ مخالفین اردو کے لئے لائق غور ہین، اُن کے نزدیک:-

"اردو ہندی کا جھگڑا محض سیاسی ہے اگر تعصب کو ترک کر کے صرف لسانی حیثیت سے اس پر غور کیا جائے، تو بہت سی تلخیان دور ہو جائین محض نام کا پابند ہونا حماقت ہے بعض نام محض اس لئے رکھے گئے ہین کہ اختلاف پیدا ہو

ہندوستان کی زبان کے لئے ہندوستانی نہایت موزون نام ہے جب پہلی مرتبہ اسمبلی مین مادری زبان مین تقریر کرنے کی اجازت دی گئی تو مقررون نے اردو اور ہندی کی تقریرون مین فارسی اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار کر دی، لیکن یہ جوش اب ختم ہو گیا ہے، ایک مشترکہ زبان کی بنیاد عصبیت اور اکل کھرے پن پر نہین رکھی جا سکتی، (پانیر، ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء)

اس تقریر مین جس زبان کو ہندوستانی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی وہ زبان جس مین فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت نہ ہو وہی روزمرہ کی اردو ہے، محض نام کا اختلاف تو کوئی اختلاف ہی نہین تھا، اردو کے بجاے ہندوستانی نام رکھ لینے پر تو کسی کو بھی اعتراض نہین ہو سکتا، لیکن یہان تو مقصد ہی کچھ اور ہے، جس کا ثبوت ہر عمل سے مل رہا ہے، بہرحال مسٹر ما ونلنکر کے ان خیالات سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن جب اصحاب اقتدار کو اس پر غور کرنے کی توفیق ہو،

یہ عجیب تضاد ہے کہ زبان سے تو اردو کی مخالفت سے برأت ظاہر کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اردو کو بھی ترقی کے مواقع حاصل ہین لیکن عمل یہ ہے کہ اس کو سرکاری دفاتر سے خارج کیا جا رہا ہے، اس کی تعلیمی حیثیت گھٹائی جا رہی ہے اور وہ تمام صورتین اختیار کی جا رہی ہین، جس سے اردو کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے، صوبہ کی اسمبلی مین بہت سی تقریرین ایسی زبان مین ہوتی ہین، جن کو مسلمان نہین سمجھ سکتے، اور اگر ٹوکا جاتا ہے، تو آبرو دے حکمت پر بل پڑ جاتے ہین، معلوم نہین یہ جمہوریت اور قومیت کی کونسی قسم ہے، ہم ہندی کے مخالف نہین مسلمانون کو ضرور ہندی پڑھنی چاہئے، اور اس مین اتنی مہارت پیدا کرنی چاہئے کہ ان مین پھر امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخانان اور میر عبدالجلیل بلگرامی جیسے ہندی کے قادر الکلام شاعر پیدا ہون لیکن ہندی کو ہندی ہی رکھا جائے، سنسکرت نہ بنایا جائے، جسے ہندو بھی نہ سمجھ سکین، اردو کے ساتھ دشمنی نہ برتی جائے اور اس کو اس کے واجبی حق سے محروم نہ کیا جائے، اگر ہندوستانیون مین قومیت کا صحیح احساس پیدا کرنا ہے، تو حکومت کو ایک نہ ایک دن زبان کے بارہ مین اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا، مشترک زبان کے بغیر ہندوستانی قومیت کی تعمیر نہین ہو سکتی،

یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ان حالات میں جب کہ پہلے سے کہیں زیادہ اردو کی خدمت کی ضرورت ہے دہلی کے گذشتہ ہنگامہ میں اردو کے ممتاز اداروں انجمن ترقی اردو اور ندوۃ المصنفین کو جس نے اپنی تھوڑی سی عمر میں علم و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، بڑا نقصان پہنچا مکتبہ جامعہ بھی برباد ہوگیا ہم کو ان کے مخلص کارکنوں سے امید ہے کہ وہ ہمت سے اس صدمہ کو برداشت کریں گے، اور اُن کے کاموں پر اس کا مستقل اثر نہ پڑنے پائے گا، اور انجمن ترقی اردو اپنی مہم جاری رکھے گی۔ اس وقت اس کی جد وجہد کی بڑی ضرورت ہے،

مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا سید فضل اللہ صاحب استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت علم کے ساتھ صلاح و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ فرمایا ہے، امام بخاری کی ادب المفرد کی عربی میں شرح لکھی ہے، اور ازراہ حسن ظن اس کا مقدمہ اور بعض اجزار راقم کو بھی مطالعہ اور اظہار رائے کے لئے مرحمت فرمائے ہیں، میں اس کا اہل نہیں، اس کے بارہ میں صحیح رائے تو اصحاب فن محدثین ہی دے سکتے ہیں لیکن میں نے تعمیل ارشاد میں جا بجا سے اس کو پڑھا، اور اپنی محدود نظر کے مطابق یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مولانا نے محنت اور تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے، احادیث کی شرح اُن کے مشکلات کا حل، اجمال کی تفصیل، احادیث کی تخریج، روایات کی تحقیق و تنقید مسائل کا استنباط وغیرہ ہر پہلو فاضل مصنف کی وسعت علم، دقت نظر، تفقہ اور اجتہاد فکر کا شاہد ہے، احادیث کی شرح میں جا بجا حافظ ابن حجر اور ابن دقیق العید کی نکتہ سنجی کی جھلک آجاتی ہے، اور کہیں کہیں پر استدلال کے ساتھ قدماء کی رائے سے اختلاف بھی کیا گیا ہے، زبان سلیس شگفتہ اور ادیبانہ ہے۔

اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان میں فن حدیث کا ذوق گھٹتا جاتا ہے فاضل مصنف کی یہ دینی و علمی خدمت بڑی قابل قدر اور لائق ستائش ہے، اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر دے، مولانا اپنے خرچ سے اس کو مصر میں چھپوا بھی رہے ہیں کتاب کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ علمی و مذہبی ادارے اور علم دوست اصحاب ثروت اس کی طبع و اشاعت کی خدمت انجام دیتے، حیدرآباد میں جہاں ایسے اداروں اور قدر دانوں کی کمی نہیں، اس کا سامان ہو جانا کچھ مشکل نہیں ہے،

مقالات

تجدید تعلیم

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

(۲)

علما پر اعتراضات کی تحقیق آگے کچھ ان سطحی اعتراضات پر گفتگو ہے، جو بالعموم مولویون اور عربی پڑھنے والون پر دنیا دارون کی طرف سے کئے جاتے ہین، مثلاً یہ کہ مولوی ہو کر پست خیالی کم ہمتی، ذلت پسندی، تنگ چشمی و دنائت، نیز قوتِ انتظامیہ کی کمی، وغیرہ صفاتِ رذیلہ پیدا ہو جاتی ہین" اور اس لئے اپنی اولاد کے لئے مولویت کو پسند نہین کرتے، ان الزامات مین جتنی واقعیت ہے اس کا اور اس کے واقعی اسباب کا ذکر تو آگے آتا ہے، پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ زیادہ تر ان کی بنیاد برعکس نہند نام زنگی کافور پر ہے، کہ لوگ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہنے اور سمجھنے لگے ہین یعنی دنیا دارون نے

"دنیا مین مالی ترقی نہ کرنے کو پست خیالی اور اس ترقی کی فکر و تدبیر نہ کرنے کو جو قناعت ہے کم ہمتی اور اخلاق میں جاہ وکبر حاصل کرنے کو اور وضع مین سادگی اختیار کرنے کو ذلت پسندی اور اپنے پرائے کے حقوق کے امتیاز کو تنگ چشمی اور اسراف نکرنے کو دنائت اور دنیوی فضولیات مین انہماک نہ ہونے کے سبب اپنے بعض مصالح میں فروگذاشت کو قوتِ انتظامیہ کی کمی کا نام رکھ لیا ہے"

"سو اکثر اہل علم میں ان امور کا ہونا مسلّم مگر یہ رذائل ہیں یا بخلاف دنیا داروں کے زعم کے فضائل،

تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کے لئے قرآن مجید و حدیث کافی ہے"،

"قرآن میں ہے، کہ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ، الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا، إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ، عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا، لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ، إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وغیرہ آیات اور اُن کے علاوہ حدیث کی کثیر روایات میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا، کہ صفاتِ مذکورہ جو اہل علم میں پائے جاتے ہیں، آیا رذائل ہیں، یا فضائل، آپ معترضین نے ان کا نام رذائل رکھ کر اُن کے مقابل میں جو فضائل ٹھہرائے ہیں، نصوص میں اُن پر وعیدیں وارد ہیں، اور شریعت میں اُن کے نام یہ ہیں، حرص، طولِ امل، کبر، عجب اتلافِ حقوق، اسراف تبذیر، حُبِ دنیا، غفلت من الآخرہ،

شریعت سے قطع نظر اخلاقی اعتبار سے بھی حرص وغیرہ کا شمار اخلاق ذمیمہ ہی میں ہے اب ان صفات کو بھی گن لیجئے، جو علوم دین نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں، اور اس حالت میں اور زیادہ پیدا ہوتی ہیں، جب کہ علوم دین نہ ہونے کے ساتھ دوسرے علوم باطلہ یا صحبت اہلِ باطل نے بھی اثر کیا ہو، اُن کے عنوانات یہ ہیں:-

قارونیت، فرعونیت، ظلم، حمق، جزع، جن کا حاصل، بالفاظ دیگر وہی حرص و طول امل وغیرہ ہے، تو اگر علمائے دین کو پست خیال ذلیل وغیرہ کہا جائے، تو اس سے زیادہ ضروری

کہ مقابل کی جماعت کو فرعون متقارون کہا جائے"،

اور اگر ان الفاظ کے صحیح معنی لئے جائیں یعنی پست خیالی، یہ کہ فقط اپنی تن پروری و شکم پروری سے مطلب ہو، اور دوسرون کو نفع پہنچانے کا خیال نہ ہو، اور کم ہمتی یہ کہ مشقت سے گھبرائے آرام کی فکر مین رہے، گو اس سے ضروری حقوق تلف ہونے لگین، اور ذلت یہ کہ مال کو آبرو پر مقدم رکھے، اور اس کی تحصیل مین غیرت و حیا کو طاق پر رکھدے، اور تنگ چشمی یہ کہ ذرا ذرا چیز مین بخل کرے، شریعت و مروت کو چھوڑدے، تعلقاتِ واجبہ کی پروا نہ کرے اور دنائت وہی جو حاصل ہے ذلت و تنگ چشمی کا، اور قوتِ انتظامیہ کی کمی یہ کہ اوقات کا پابند نہ ہو، جن ضوابط و آدابِ معاشرت کے ساتھ دوسرے کے مصالح وابستہ ہون ان کے خلاف کرے جس سے اُن کی مصلحتین فوت ہون،

علما کی اخلاقی کمزوریان علم دین کا اثر نہین ہین

تو بلا شبہہ یہ اخلاقِ رذیلہ ہین، اور یہ بھی مسلم ہے، کہ بعض محصلین علم مین یہ رذائل پائے بھی جاتے ہین لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ علم دین کا خدا نخواستہ اثر ہے، یا کسی اور چیز کا، اس کا فیصلہ اس طرح نہایت آسان ہے کہ یہ اخلاقِ رذیلہ سب اہلِ علم مین پائے جاتے ہین، یا بعض مین پائے جاتے ہین، اور بعض مین نہین، شق اُولی مشاہدہ سے غلط ہے، اور دوسری شق سے اتنا تو ثابت ہو گیا، کہ یہ علم دین کا اثر نہین، ورنہ سب مین ہوتا،

تو ضرور یہ کسی دوسری چیز کا اثر ہے، جو میری تحقیق مین خاندان و صحبت کی کمی ہے، یعنی بعضے خاندانی حیثیت سے پست و دنی ہوتے ہین، اب اگر صحبت بھی نصیب نہ ہو گی، تو نری تعلیم کافی نہین، لامحالہ ان مین خاندانی رذائل موجود اور ظاہر ہوتے رہین گے لیکن ان کے مقابل مین ان اہلِ علم کو کیون نہین دیکھتے، جو عالی خاندان یا فطرۃً سلیم ہین، یا

صحبت نے اُن کو دُرست کر دیا ہے،

اور افسوس ہے کہ اس وقت عالی خاندان لوگون نے چونکہ سرتاپا انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، اور عربی کثرت سے ایسے ہی لوگ پڑھتے ہین، جو خاندانی طور پر دنی، دیہات مین رہنے کے سبب سے صحبت و تہذیب سے محروم ہوتے ہین، اور اس مین تبدیل کے اسباب جمع نہین ہوتے، تو لا محالہ بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آوینگے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین نے پھر بھی ان کو کسی قدر مہذب بنا دیا ہے، ورنہ اور زیادہ بے تہذیب ہوتے، اگر ایسی طبیعت کے لوگ انگریزی پڑھتے، تو اُن سے بھی زیادہ رذائل ان مین پائے جاتے،

زیادہ الزام مفرز طبقہ پر ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس الزام کا زیادہ مورد مفرز طبقہ ہے جس کے علم دین سے اعراض کی بدولت ادنی خاندان کے لوگ اہلِ علم مین زیادہ پائے جاتے ہین، جن کو دیکھ کر بقاعدہ للاکثر حکم الکل سب پر یہی گمان کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر خاندانی لوگ اپنی اولاد کو علوم دین مین کامل بنلاتے، تو ان مین کثرت سے علما پائے جاتے، اور بوجہ علو خاندان ان مین فضائل طبعیہ زیادہ ہوتے، اور رذائل مفقود ہوتے، تو جب اکثر علما ایسے نظر آتے، تو للاکثر حکم الکل کے قاعدہ سے عام طور پر علماء کو فضائلِ اخلاق کا جامع سمجھا جاتا، اور علم دین سے بدگمانی نہوتی، چنانچہ جو علما رخاندانی ہین خصوصًا جن کو اہلِ طریق کی صحبت میسر ہو گئی ان مین کسی کو پست خیال کم ہمت، تنگ چشم دکھائے گو سامان اُن کے پاس امیرانہ نہو پھر بھی اُن کی شان یہ ہے کہ ع

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

بلکہ مین دعوی کرتا ہون کہ بدونِ علم دین کے فضائلِ اخلاق و سیر چشمی و بلند نظری و عالی دماغی تہذیب اعتدالِ افعال و انتظام اقوال میسر ہونا ممکن نہین، چنانچہ بے علم امرا مین

ان اخلاق کا نام نہین ہوتا، لیکن مال کی بدولت خوشامدیون کا اجتماع رہتا ہے، اس لئے اُن کے عیوب پر پردہ پڑا رہتا ہے"،

مولوی سے مراد عالم باعمل ہے۔ | سب سے بڑی اور آخری بات یہ ہے کہ مولوی سے مراد عالم باعمل ہے جس کا نام چاہے، آپ درویش رکھ لیجئے، جو ایسا نہیں، ہمارے نزدیک وہ مولویون مین داخل ہی نہین، ہم صرف عربی جاننے والے کو مولوی نہین کہتے، مصر و بیروت مین بہت سے عیسائی، و یہودی عربی دان ہین، (حتی کہ علوم اسلامیہ کے بڑے بڑے واقف ہین، مصر و بیروت کے علاوہ خود یورپ مین) تو کیا ہم اُن کو مقتدا ے دین کہنے لگین گے"،

مثلاً اہلِ علم کی وضع و لباس اکثر سادہ کبھی اپنے گھر کا دھلا ہوا کبھی پیوند لگا ہوا کبھی بند یا بٹن کھلا ہوا، دیکھا جاتا ہے، اس سے ان پر تذلل کا شبہہ کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ تواضع ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا مدار استغنار اور تذلل کا احتیاج ہے، لباس و وضع کو اس مین دخل نہین، اگر کپڑے پرانے ہین، اور ہفت اقلیم کا بھی دست نگر نہین، تو وہ معزز ہے، اور اگر لباس و وضع نوابون کا سا ہے، ہزارون نقد تنخواہ ہے، ہزارون روپیہ جائداد کی آمدنی ہے، سامان امیرانہ ہے، مگر نظر اس پر ہے کہ اس مقدمہ مین کچھ اور مل جائے، فلان معاملے مین کچھ اور ہاتھ آجائے، تو ایسا شخص بالکل ذلیل ہے"،

ہمارے جدید تعلیم کے معززین اگر عزت و ذلت کے اس صحیح معیار کو پیشِ نظر رکھ کر خود اپنی عزت کا کچھ مشاہدہ فرمائین، تو انشاء اللہ پھر دین کی تعلیم والون پر ذلت کی نگاہ ڈالنے یا اپنی اس بلند ہمتی کے مقابلہ مین ان کو پست ہمت کہنے کی ہمت نہ ہوگی،

پھر اگر عالم دین واقعی عالم دین ہے، تو اس کو اپنے دینی و علمی مشاغل نماز روزہ تہجد و تلاوت

درس و تدریس، تعلیم و تبلیغ وغیرہ مین انہماک سے خود اپنے بناؤ و سنگار کی طرف توجہ کیسے ہو سکتی ہے، کہ ہر وقت بالون کی وضع اور پتلون کی شکن پر نظر رکھ سکے،

"یہ شخص تو قومی انجن کا ڈرائیور ہے، ڈرائیور کو غسل اور صابون ملنے کی اور کوئلون کے جھاڑنے کی فرصت کہان، اگر فسٹ اور سکنڈ کلاس کے متنعم اس پر اعتراض کرین تو یہ نہ سمجھین کہ ہم ولایت اسی کی بدولت پہنچے ہین، اور وہان سے ڈگریان حاصل کرکے فسٹ اور سکنڈ مین سفر کر رہے ہین، تو نادانی کے سوا کیا ہے"،

اور علوم دین پہ کیا موقوف علوم دنیا کے جو سچے اور پکے، طالب ہوتے ہین، وہ بھی اپنی دھن مین لگے رہتے ہین، عورتون کی طرح بناؤ سنگار کی فرصت نہین رکھتے،

تعصب اور غصہ کا اعتراض کچھ اس طرح کے اعتراضات بھی غریب مولویون پر کئے جاتے ہین، کہ یہ کسی سوال کا جواب نہ بن پڑنے پر یا غلبۂ تعصب سے غصہ کرنے لگتے ہین، اپنی بات رٹے جاتے ہین، دوسرون کی سمجھنے کا قصد نہین کرتے، باہم حسد و نفسانیت کا زور اور ایک دوسرے کی بُرائی اور بدگوئی مین لگے رہتے ہین،

"اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ انگریزی کے فاضلون مین یہ اخلاق بدرجہا زیادہ پائے جاتے ہین، ذرا اختلاف مزاج بات ہو جائے، غصہ سے بےخود ہو جاتے ہین، بات بات مین کبر و سخن پروری کا اظہار ہوتا ہے، تہذیب کی کمی کا یہ حال کہ جس کی طرف چاہا پشت کرلی، جس کی طرف چاہا پاؤن جوتون سمیت پھیلا دئے، بزرگون کا ذرا ادب نہین، مان باپ تک سے مساوات، بلکہ تحقیر کا معاملہ، اس سے زیادہ کیا بےحیائی ہوگی کسی بڑے عہدہ کی طلب مین خواہ تنخواہ نہ ملے، محض جاہ کے لئے ان کی حسد و نفسانیت، بلکہ تو تو مین مین دیکھنے کے قابل ہوتی ہے"،

کالج یونیورسٹی تک کے نام نہاد علمی فضائل اور ان کی کمیٹیون وغیرہ کی بحث و گفتگو اور ان کے

آپس کے تعلقات مین حسد و نفسانیت کے جو مناظر چوتھائی صدی سے زیادہ راقم الحروف کے خود ذاتی تجربہ و مشاہدہ مین آتے رہے، اُن سے نام کا یہ مولوی بھی اکثر شرما جاتا تھا،

" بس اتنا فرق ہے کہ اگر اہل علم مین ان اخلاق کا کوئی اثر ہو تو اس کا منشا اکثر دین ہوتا ہے، اور ان اہل ترقی مین اس کا منشا دنیا ہوتی ہے، مثلاً مولویون کو دین کی بات پر غصہ آوے گا، اور ان حضرات کو دنیا کی بات پر کیونکہ دین کی خود وقعت ہی اُن کے دل مین نہین، اس لئے اُن کو جوش بھی نہین آتا، لہذا اپنے کو حلیم اور مولویون کو تندخو قرار دیا ہے، یہی حال اور اعتراض کا بھی ہے، یہ تو الزامی جواب تھا،

اور حقیقی جواب یہ ہے کہ بالکل غلط ہے، کہ علما کو نفس سوال پر غصہ آتا ہے، غصہ اگر آتا ہے، تو اس پر کہ سوال ایک تو بطور استفادہ کے ہوتا ہے، اور وہ سوال بھی ضرورت کا ہو اس پر تو مین دعوی کے ساتھ کہتا ہون کہ کوئی شخص کسی عالم کا ایک جگہ بھی غصہ نہین ثابت کر سکتا، اور ایک سوال بطور تعنت یا تمسخر و مشغلہ یا محض اعتراض و الزام کے لئے ہوتا ہے چونکہ اس مین شریعت کی توہین ہوتی ہے تو جس کے دل مین شریعت کی عظمت ہوگی، وہ اس توہین کو کب گوارا کرے گا اسی طرح بعض اوقات سوال مین مخاطب کی اہانت ہوتی ہے، سو اس کی بھی ناگواری طبعی امر ہے، جو مذموم نہین، اسی طرح فضول یا اپنی فہم سے ماورا سوال کیا اور سمجھانے سے سمجھ مین نہ آیا، تو بھی غصہ آجانا طبع سلیم کا مقتضا ہے، جو بجائے خود ایک کمال ہے، چنانچہ سید الحکما، والعلماء حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود بعض لایعنی سوالون پر غصہ فرمانا کثیر حدیثون مین وارد ہے، کیا اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرے، یا عدالت سے کچھ سوال کرے مثلاً ادنی سی بات ہے، کہ درخواست پر ٹکٹ لگانے کی نسبت پوچھنے لگے کہ ایسا قانون کیون مرتب کیا، یا اس فیس سے نصف فیس کیون نہ مقرر ہوئی، تو کیا

توہین عدالت کو جرم اور اس فضول سوال کو ناگوار اور اگر باز نہ آئے، تو موجب غصہ نہ کہا جائے گا، کیا اس غصہ کو اخلاق رذیلہ میں داخل کیا جائے گا،

کیا مطلق غضب و تشدد کا شمار اخلاقِ رذیلہ میں ہے، اگر کسی کی عفیفہ ماں کے متعلق کوئی بناءِ شرارت سوال کرے، کہ سنا آپ کی والدہ ایک زمانہ میں چکلہ میں بیٹھا کرتی تھیں تو کیا کوئی شخص ٹھنڈے دل سے اس کی تغلیط پر دلائل قائم کرے گا، یا اگر ایسا کیا تو شرفا اس کو بے غیرت قرار نہ دیں گے، یا اگر وہ غضب و شدت سے کام لے تو عقلا کے نزدیک غیور و باحمیت ہوگا"

یا اگر آپ کا سائیس درخواست کرے، کہ مجھ کو اقلیدس کی پانچویں شکل اس طرح سمجھا دیجئے کہ نہ اس میں اشکالِ سابقہ کا حوالہ ہو، نہ اصولِ موضوعہ و متعارفہ کا تو کیا آپ سمجھانے بیٹھ جائیں گے، یا فرمائیں گے، کہ بھائی یہ تیری سمجھ سے باہر ہے، پھر بھی اگر وہ اصرار کرے، تو کیا آپ اس کو گدھا، احمق تو نہ کہنے لگیں گے، اور کیا ایسا کہنے سے کوئی یہ کہے گا' کہ آپ کو جواب نہیں آتا،

رہا تہذیب کا معاملہ اس کی نسبت کیسی دقیق و عمیق حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تہذیب کا معیار صرف مذہب صحیح ہوسکتا ہے، باقی آج کل،

"تہذیب کا معیار جو یورپ کا رسم و رواج سمجھ لیا گیا ہے، تو خود اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل ہو کیا اہلِ یورپ کی کوئی رسم تہذیب سے گری ہوئی نہیں، معیار دو ہی چیزیں ہوسکتی ہیں عقلِ سلیم یا مذہب صحیح، مگر سلیم ہونے کے لئے پھر بھی کسی معیار کی ضرورت ہوگی، کیونکہ عقل متفاوت ہیں، پس معیار ہونے کی صلاحیت صرف مذہب صحیح میں ہوسکتی ہے جب تہذیب کا معیار مذہب صحیح اور دینِ الٰہی قرار دیا گیا، تو خلافِ تہذیب

کا مصداق خلاف دین ہوا، تو اب دیکھیے، کہ دین کے خلاف علماء مین زیادہ افعال پائے جاتے ہین، یا غیر علماء مین اس سے معلوم ہو جائے گا کہ بے تہذیب کون کہلانے کا مستحق زیادہ ہے،

باہمی اختلافات کا شبہہ ایک شبہہ یہ ہے کہ مولویون مین اکثر مسئلون مین اختلاف ہوتا ہے جس سے لوگون کو عمل کرنے مین سخت حیرت ہوتی ہے، کہ کس پر عمل کرین، جواب یہ ہے کہ کیا اطباء مین باہم تشخیص و تجویز مین اختلاف نہین ہوتا، اور کیا کوئی شخص اپنے مریض کو بلا علاج ہی چھوڑ دیتا ہے، کہ اختلاف کی حالت مین کس کا علاج کرین، تو لاؤ سب ہی کو چھوڑ دین، بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون طبیب زیادہ تجربہ کار اور ماہر فن ہے اور کس کے ہاتھ سے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہین، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آدمی جس امر کو ضروری سمجھتا ہے، اس مین ایسے اختلافات سنگ راہ نہیں ہوتے، پھر کیا ہر اختلاف ہر شخص کے لئے مذموم ہی ہے، اگر ایسا ہے تو چاہیے کہ عدالت مین جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو عدالت بجاے اس کے کہ تنقیح و تحقیق کا بار اپنے ذمہ لے محض اس بنا پر کہ یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہین، اور اختلاف مطلقاً مذموم ہے فریقین کو ہمیشہ سزا کر دیا کرین، کہ ایسے جرم اختلاف کے کیون مرتکب ہوے، یا اگر سزا نہ کرین تو کم از کم مقدمہ کو خارج ہی کر دیا جائے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہل اختلاف مین سے ہر ایک کو الزام دینا اور دونون کو محض اتفاق کا مشورہ دینا عظیم غلطی ہے بلکہ پہلے تحقیق کر کے معلوم کرین کہ کون حق پر اور کون باطل پر ہے، جو حق پر ہو، اس کی طرف ہو کر صاحب باطل کو مجبور کرین اور راے دین کہ تم کو اختلاف کرنا جائز نہین،

فتوے مین مصلحت زمانہ کے لحاظ نہ کرنے کا اعتراض ایک اعتراض یہ ہے کہ علماء اپنے فتاوی مین مصلحت زمانہ

کا لحاظ نہین کرتے، وہی پرانے مسائل تبلاتے چلے جاتے ہین، زمانہ بدل گیا ہے اب علما کو چاہئے، کہ سود وغیرہ معاملات کو درست قرار دین، اس اعتراض کا باطل (بلکہ مہمل) ہونا ظاہر ہے، اس لئے کہ شریعت کے احکام اگر کسی بشر کے بنائے ہوے ہوتے تو اس احتمال کی گنجایش تھی، کہ اس کی نظر آیندہ مصالح پر نہ تھی، لیکن جب احکام شرعیہ خداتعالیٰ کے مقرر کئے ہوے ہین، جس سے قیامت تک کے مصالح کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی مخفی نہین، تو یہ احتمال ہی کب ہے، کہ ان مین آیندہ کے مصالح کی رعایت نہین، بلکہ جس مصلحت کی اس مین رعایت نہین، وہ مصلحت ہی نہین"،

رہے اجتہادی احکام تو اجتہاد بھی مجتہد یا علما اپنے دل سے نہین کرتے، وہ بھی کتاب و سنت ہی پر مبنی اور اس سے مستنبط ہوتے ہین، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قیاس مثبت نہین مظہر ہوتا ہے یعنی وہ خود کسی بات کو اپنی طرف سے ثابت نہین کرتا، بلکہ جو کچھ قرآن و حدیث سے ثابت ہے، اسی کو ظاہر کر دیتا ہے، اور پھر قیاس بھی کیسے مجتہدین کا جن کا علم و فہم تقوی و تدین ایسا غیر معمولی تھا، کہ کم از کم ہمارے مقابلہ مین ان سے خطا و لغزش کا بہت کم احتمال ہے، پھر اس خطائے اجتہادی پر مواخذہ نہین، بلکہ اجر ہے، اس لئے کہ اگر اجتہاد کے شرائط کسی مین موجود ہین، اور اس نے ہر طرح تحقیق کا حق ادا کیا، تو ماجور ہوگا، اور اگر از راہ بشریت حق کے ادا کرنے پر بھی خطا کی تو معذور ہے،

گوشہ گیری کا اعتراض ایک اعتراض مولویون پر یہ ہے کہ یہ اپنے گھرون مسجدون اور مدرسون مین بیٹھے رہتے ہین، قوم کی تباہی پر رحم نہین آتا، کہ گھرون سے نکل کر گمراہون کی دستگیری کرین، لوگ بگڑتے چلے جاتے ہین، کوئی اسلام چھوڑ رہا ہے، کوئی احکام سے بے خبر ہے"

تو اولاً تو مختلف ذرائع سے اسلام و احکام کی اتنی اشاعت ہو چکی ہے، کہ اب تبلیغ کے وجوب کا درجہ باقی نہین رہا، جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے، اگر اس کو اپنے اسلام اور دین کی کچھ بھی قدر

اور پھر وا ہو تو طرح طرح کی واہیات اور خرافات کتابین اخبارات و رسائل وغیرہ تک پڑھنے سننے مین وقت صرف کرتا، اور لڑائی بھڑائی مین دنیا بھر کی واہی تباہی خبرین معلوم کرنے مین لگا رہتا ہے، تو کیا دین کی کتابین اور رسالے نہین پڑھ اور سُن سکتا، یا جاننے والون سے مسئلے مسائل نہین دریافت کر سکتا، اسی طرح غیر قومون نے کیا اسلام کا نام نہین سُنا، اور اگر مذہب کوئی اہم معاملہ ہے، تو کیا وہ آسانی سے دو ایک رسالے پڑھ یا سُن کر اتنا نہین معلوم کر سکتے، کہ اسلام ہے کیا، اور وہ اصولاً چاہتا اور کہتا کیا ہے،

اس کے علاوہ مسجدون اور مدرسون مین جو مولوی پڑے ہین، وہ بھی تو آخر کچھ نہ کچھ اپنی بساط بھر دین کی خدمت کر رہے ہین، تاہم تبلیغ اس مین شک نہین، کہ دین کی بہت بڑی، بلکہ سب سے بڑی اور اعلیٰ خدمت ہے لیکن

"کیا اسلام کی یہ خدمت صرف علمار ہی کے ذمہ ہے، دنیا دار اور مالدار مسلمانون کے ذمہ نہین کیا وہ اتنا نہین سمجھ سکتے کہ علمار کو معاش سے فراغ نہین، لہذا آپس مین سرمایہ جمع کر کے علمار کی ایک جماعت کو اس کام کے لئے مقرر کر دین جس طرح مشنری لوگ بڑے بڑے مشاہرے پا رہے ہین، جا بجا لکچر دیتے اور رسائل تقسیم کرتے پھرتے ہین،

" اور ہمارے معترضین کو علمار پر جو یہ اعتراض سوجھا وہ انہی مشنریون کی مساعی دیکھکر اور یہ اس وقت عام عادت ہو گئی ہے، کہ اصل حقیقت مین غور نہین کرتے بس غیرون کے رسم و رواج کو اپنا رہنما اور معیار استحسان قرار دے لیا ہے حقیقت بینی سے قطع نظر یہ بھی نہ دیکھا کہ اپنے علمار پر اُن کے عمل کے برابر سعی نہ کرنے کا الزام دینے سے پہلے یہ بھی دیکھ لین، کہ آیا ہمارے دنیا داران کے برابر اعانت مالی بھی کرتے ہین یا نہین؟"

حالانکہ بیچارے ہمارے بدنام "مولوی" اب بھی اتنے قانع اور قلیل المصارف ہین کہ مشنریون سے

بہت کم پر گذر کر سکتے ہین لیکن اپنے بال بچون کے واجبات اور حقوق نفس کا ادا کرنا بھی تو شریعت ہی کا حکم ہے، اور مستحب تبلیغ کے مقابلے میں واجب بلکہ واجب تبلیغ پر بھی مقدم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قصور زیادہ کس کا ہے، ؟ دنیا دارون اور مالدارون کا یا مولویون کا اغرض تبلیغ واشاعت کا وجوب بھی

علمار کے ساتھ خاص نہین، سب مسلمانون پر اپنی وسعت و اہلیت کے بقدر واجب ہے"

تحریر و تقریر مین قصور کا شبہہ | ایک شبہہ عربی کے طالب علمون اور علمأ پر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تقریر و تحریر مین قاصر رہتے ہین، تو یہ کلی حکم تو نہایت بے انصافی ہے، کیا علمأ و طلبار مین بہت سے ایسے بجد خوش تحریر و خوش تقریر نہین پائے جاتے جن کا مقابلہ دوسری تعلیم کا بڑا سے بڑا فاضل بھی نہین کر سکتا،"

البتہ اتنی ضرورت اس زمانہ مین ضرور معلوم ہوتی ہے، کہ خوش تحریری و تقریر ی کی مشق کا اہتمام بھی مدارس مین بالالتزام کیا جائے، اور طلبار کا اختیاری امر نہ رہے، بلکہ سب کو اس امر پر مجبور کیا جائے"

شاید ندوہ والون کا خیال ہو کہ اس جدید ضرورت کا احساس پہلے پہل انہی کو ہوا لیکن جامع المجددین کی نظر کسی جدید ضرورت سے کیسے محجوب رہ سکتی تھی، یہ اور بات ہے کہ قدیم درسگاہون نے اس تجدید کے قبول کرنے مین تاخیر کی، اور ندوہ کی تعجیل قابلِ تحسین ہے لیکن وہان یہ استحسان اعتدال کی حد سے نکل کر غیر مستحسن حد کو پہنچ گیا ہے، یعنی ندوی اب اپنا اصلی کمال انشا پردازی اور انشا نگاری ہی کو جاننے لگے ہین حتی کہ اس کے پیچھے درسیات مین استعداد کی بھی پروا نہین کرتے، اور دوران طالب علمی مین عربی و درسی کتابون سے زیادہ اردو کی انشا پردازانہ کتابون کی طلب و مطالعہ مین لگ جاتے ہین، ابھی آج (۱۱ رجون سنہ) یہ سطرین لکھ ہی چکا تھا کہ روزنامہ تنویر میں طلباء ندوہ کی جمعیۃ الاصلاح کا یہ کارنامہ چھپا اور پڑھا کہ " علمی وادبی مجالس مین دلچسپی اور انشا پردازی اور تقاریر کی طرف اشتیاق زیادہ

پایا جاتا ہے" یہی نہیں اور آگے اصلی ندویت یہ لیجئے کہ "جن حضرات نے زیادہ دلچسپی لی، اور ہمیشہ اپنی تقریروں سے جلسہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، انھیں کپ و مڈل دے کر ہمت افزائی کی گئی، غریب طلبار سے زیادہ علمائے ندوہ اور منتظمین ندوہ کو سوچنا چاہئے کہ اغیار کی اس نقالی کے سوا ہمت افزائی کا کیا اور کوئی طریقہ نہیں، اور اس نقالی کے مفاسد کہاں تک جاتے ہیں، اور غیروں کی تقلید و اتباع کی اس سے کتنی ہمت افزائی ہوتی ہے، ہمارے مشہور خوش تحریر و خوش تقریر غیر ندوی فاضل اجل مولانا گیلانی نے تو اسی بنا پر ندوہ کا نام "مدرسۃ الصحافۃ والخطابۃ" رکھدیا ہے، اس کے علاوہ جن کو فطری مناسبت نہیں مجبور کرنے اور مشق کرنے سے بھی طوطے ہی بنے رہیں گے، اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ پہلے اندازہ کر لیا جائے، اور جن کو مناسبت نہ ہو، اُن کو اپنا وقت خراب نہ کرنے دیا جائے، جیسا کہ حضرت نے ہدایت فرمائی ہے، "کہ پھر بھی ایسے لوگ ثابت ہوں گے جن کو فطری طور پر تقریر و تحریر کو کم مناسبت ہوگی، سو ایسے لوگ اپنے عمل کیلئے علم حاصل کریں، دوسروں کے افادہ کے لئے اور بہت سے لوگ مل سکیں گے، یہ کیا فرض ہے کہ ہر کام ہر شخص کرے" (ص ۳۲)

علمار کی وقعت اور عظمت کی حفاظت نہایت اہم ہے

عربی و دینی تعلیم کے طلبا و علمار کو طرح طرح کے معقول و نامعقول صحیح و غلط اعتراضات کا ہدف بنانا، خصوصاً نئے فیشن کے لوگوں میں جو ایک فیشن بن گیا ہے، اس کی طرف جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے جو اس قدر بلیغ توجہ فرمائی، اور راقم ہذا نے اس کے بیشتر حصہ کی تلخیص ضروری جانی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تبلیغ کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں حضرت کی نگاہ تجدید میں دین کی حفاظت کے لئے علما و فقہار کی وقعت و عظمت کی حفاظت اہم اقدم ہے،

اس لئے کہ سارے مسلمان سارے اسلامی علوم اور احکام و مسائل کے عالم و محقق نہ کبھی ہوئے ہیں اور نہ آیندہ ہوں گے، لازماً اگر کوئی خاص جماعت "ولتکن منکم" کے تحت ہمیشہ اور ہر عہد میں نہ موجود رہے تو عام مسلمین کو ایمان اور عمل صالح کے مختلف ابواب اور شعبوں کے احکام آخر کون بتائے، اور کس سے معلوم کریں یہی نہیں بلکہ اگر خدانخواستہ علمار کی جماعت کسی عہد یا کسی نسل میں بالکلیہ ناپید ہو جائے تو دین کا وجود ہی

خطرہ مین پڑجائے، خالی کتابون اور کتبخانون سے دین ہرگز محفوظ نہین رہ سکتا، جب تک ان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ مستمر نہ رہے، خوب یاد رہنا چاہئے، کہ زبانی یا درسی تعلیم و تعلم کا تسلسل و تواتر ٹوٹ جانے سے خالی کتاب سے ہرچیز کا صحیح سمجھ لینا بھی ممکن نہین، ایک عالم نفسیات خوب سمجھ سکتا ہے کہ کتابون کی فہم کی استعداد بھی زبانی تفہیم کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے، شرح و حواشی بھی زبانی فہم و تفہیم سے مستغنی نہین بنا سکتے، کسی معمولی فن کو بھی جس نے استاذ سے نہین پڑھا ہے محض کتابون سے بیسیون مقامات پر ٹھوکر کھائے گا،

غرض جب علماء کا وجود ایک طرف دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دوسری طرف اس کی بقا و تحفظ کے لئے ناگزیر ہے، تو اگر امت کے اندر یہ جماعت خدانا کردہ موجود نہ رہے، یا موجود ہو اور اُس کی اتنی تحقیر و توہین جابیجا الزامات سے دلون مین راسخ کردیا جائے کہ لوگ ان سے بیزار ہوکر استفادہ نہ کرین، تو پھر علماً و تعلیماً اور بالآخر عملاً معاذ اللہ دین کے فنا ہوجانے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوگا، اگرچہ دین کی حفاظت خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہو وہ فنا نہین کیا جاسکتا، لیکن کیا اس سے ہم اپنے واجبات سے سبکدوش اور مواخذہ سے بری ہوجا سکتے ہین، حضرت کی کتابون اور مواعظ و ملفوظات وغیرہ سب مین کثرت سے اس پر تنبیہات موجود ہین، کہ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی عالم سے تعلق رکھنا، اور احکام دریافت کرتے رہنا ضروری ہے، بالکل اسی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر جیسے ہر شخص یا ہر خاندان کسی طبیب سے عادۃً تعلق رکھتا ہے، اور چھوٹی بڑی بیماریون مین زیادہ تر اسی کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے، کیا روحانی صحت جسمانی صحت کے برابر بھی لائق التفات نہین، اگر قریب کوئی عالم نہین ہے، تو حضرت کی تاکید ہے کہ دور ہی کے کسی عالم سے تعلق رکھے، اور خط و کتابت سے احکام معلوم کرتا رہے، اسی طرح دینی مدارس قائم کرنے اور جو قائم ہین اُن کی حفاظت و ترقی کی تاکید جابجا فرمائی ہے، کیونکہ ہماری گاڑی کے انجن ڈرائیور یہین سے پیدا ہوتے ہین، اگر خدانخواستہ عربی درسگاہون سے اُن کی فراہمی منقطع ہوجائے تو

امراء کے فرسٹ وسکنڈ متوسطین کے انٹر اور عوام کے تھرڈ، سارے کے سارے ڈبے اپنی جگہ بے حرکت کھڑے رہ جائیں، ہر طبقہ کی دینی حیات وحرکت ان مدرسوں سے نکلے ہوئے بُرے بھلے علماء یا مولویوں ہی کے دم سے قائم ہے، اور جس قدر اُمت کے مختلف طبقات اپنی اپنی اہلیت وحیثیت کے موافق ہماری دینی گاڑی کے ان ڈرائیوروں یا چلانیوالوں کی بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت، خدمت واعانت کا بندوبست کریں گے، اسی قدر ہماری دینی حرکت وحیات جاندار و پائدار ہوگی، اور اسی نسبت سے انشاء اللہ دنیا بھی درست ہوگی

علم دین کے حقوق طلباء وعلماء پر

یہان تک ان حقوق علم پر گفتگو تھی، جوزیادہ تر عامۂ مسلمین کے ذمہ ہیں، آگے باب دوم مین ایسے حقوقِ علم مین کوتاہیوں اور اُن کی اصلاح کو بیان فرمایا گیا ہے جو خود علم دین کے طلباء وعلماء پر ہیں

"بعض طلباء یہ خیال کرتے ہین، کہ ابھی تو ہمارا تحصیل علم کا زمانہ ہے، اس مین عمل کی چندان ضرورت نہین، یہ سراسر شیطانی دھوکا ہے، نصوص نے وجوبِ احکام مین طلباء وعلماء مین کہین فرق نہین کیا، البتہ اعمال زائدہ جیسے طویل اوراد یا مجاہدات وریاضات کہ اُن مین مشغول ہونے سے طالب علم کے لئے مطالعہ اور تکرار سبق افضل ہے"،

بعض نام نہاد علماء علوم دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیتے ہین، خواہ طلبِ جاہ ہو، یا طلبِ مال لیکن اُن پر سب کو نہ قیاس کرنا چاہئے "کیا کوئی اناڑی عطائی آدمی خلافِ اصول طب کسی کا علاج کرے یا کسی کو دھوکا دیکر ٹھگ لے، تو اس سے ملک کے تمام ماہرین اطباء کے کمال کی نفی جائز ہوگی"، بہر حال:۔

"بعضے ایسا کرتے ہین کہ وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہین، اور اسی غرض سے وعظ کرتے پھرتے ہین، کہ کچھ وصول ہو، اور اس قسم کی وعیدون کو بھلا دیتے ہین، کہ مثلاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ

من تعلم علما مما یبتغی بہ وجہ اللہ لا یتعلمہ الا لیصیب بہ غرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنۃ یوم القیامۃ

جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے علم کو دنیا کی کسی غرض سے سیکھا اس کو قیامت میں جنت کی بو بھی نصیب نہ ہوگی،

علم دین کے دینی و دنیوی استعمال مین فرق

البتہ جس طرح اوپر آیت للفقراء الذین احصروا کے تحت وعظ کی نوکری کا جائز ہونا معلوم ہوچکا، اسی طرح اگر اشاعت احکام، محض حسبۃً للّٰہ ہو، اور لوگ کچھ خدمت کردین جس کی قلب مین طمع نہ ہو، (گو احتمال وسوسہ ہو) تو وہ جائز ہے، اور اس کا امتحان یہ ہے کہ وعظ کے لئے یہ شخص کن مقامات کو منتخب کرتا ہے، اُن کو جہان روپیہ ملنے کی زیادہ اُمید ہے، یا اُن کو جہان تبلیغ، حکام کی زیادہ ضرورت ہے یہی امتحان علوم دینیہ کی تدریس کی نوکری کا ہے، کہ اگر تنخواہ پر نظر نہو گی، تو جس صورت مین ایک جگہ پر گذر ہوا ہوگا، اور وہان علوم دینیہ کی ضرورت بھی زیادہ ہو، تو ایسی جگہ کو چھوڑ کر ترقی پر نہ جائے گا، اور نہ خود کوشش کرکے ایسی جگہ جانا چاہے گا، اور فقہا نے جو تعلیم علوم دینیہ اور وعظ پر اُجرت کی اجازت دی ہے، اس سے مراد یہی صورت ہے، ورنہ حنفیہ رحمہم اللہ طاعات مقصودہ پر اُجرت کو بوجہ نہی کے کسی طرح جائز نہین رکھتے،"

علماء کا امراء سے اختلاط

بعض علماء امراء و اہلِ اموال سے اختلاط اسی غرض سے رکھتے ہین، کہ اُن سے وقتاً فوقتاً کچھ حاصل ہوتا رہے، اس مین گا ہے یہان تک نوبت آتی ہے، کہ اُن کی غرض سے مسئلہ بتا دیتے یا بنا لیتے ہین جس سے سردست تو وہ خوش ہوجاتے ہین لیکن بہت جلد ہی ایسے علماء اُن کی نظر سے گر جاتے ہین اور

پھر وہ اُن پر تمام علماء کو قیاس کرکے جماعت کی جماعت سے نفور ہو جاتے ہین "

باقی اگر اس اختلاط سے امراء کی اصلاح ہو کہ ان کو احکام دینیہ بتلائے جائین، خصوص جب کہ وہ خود خواہش کرین، اور اُن کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو، تو ایسا اختلاط نہ مضر ہے نہ موجب مذلت، مگر جب قرائن یا شرائط سے یہ معلوم ہو کہ آزادی کے ساتھ حق ظاہر کیا جا سکے گا، اور ایسی حالت مین اگر وہ کچھ خدمت کرین تو گو مین کچھ مضائقہ نہین، مگر احقر کا مشورہ یہی ہے، کہ ہرگز قبول نہ کرے، بلکہ جانے کے قبل شرط کرے، کہ لینے دینے کا کچھ قصہ نہ ہوگا، جس کا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت مین امراء کا حوصلہ نہین پڑتا، کہ علماء کو اپنا تابع بنانے کا وسوسہ بھی دل مین لائین، بلکہ ہر طرح انہی کو تابع ہونا پڑتا ہے، اور یہی امر قسم بالشان ہے اور اگر خود امراء آئین تو یہ اختلاط منع نہین بین مطلوب ہے، اُن سے بے رُخی نہ کری اخلاق سے پیش آئے مگر استغنا کو اب بھی ہاتھ سے نہ دے،

حیلہ شرعی کو حیلہ بنانا بعض علماء کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری غنی بنایا ہے، اُن کو کسی کے ہاتھ کی طرف دیکھنے کی نوبت نہین آتی، لیکن اپنے مالی معاملات مین ایسا کرتے ہین، کہ اگر شریعت پر عمل کرنے سے کوئی اُن کی مالی منفعت ضائع ہو رہی ہو تو ضعیف تاویلون اور غیر مشروط حیلون سے (گو نام اُن کا حیلہ شرعی رکھتے ہین) کام لیتے ہین، یہان تک کہ عام لوگون کے زبان زد ہو گیا ہے، کہ مولوی اپنے مطلب کا مسئلہ جس طرح چاہتے ہین بنا لیتے ہین، میری نزدیک اگر گناہ کرکے اپنے کو گنہگار سمجھے اور گناہگار ہونے کا اقرار کرے تو اتنا مفسدہ نہین جتنا گناہ کو کھینچ تان کر جائز بنانے مین مفسدہ ہے، اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے ہین علماء سے بد اعتقاد ہوتے اور پھر اپنے معاملات مین تاویلین اور حیلے پوچھتے ہین، اور اگر کوئی نہین بتاتا تو قیاس فاسد سے خود ہی اپنی من سمجھوتی کر لیتے

مضرت عوام کی حفاظت علماء کی شان تو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بلا تاویل بھی جائز ہو، مگر کسی وجہ

سے اوس کے ارتکاب میں عوام کی دینی مضرت ہو تو اپنا ضرر بقدر تحمل گوارا کرین لیکن عوام
کا دین بچائین، نہ کہ اُن کے لئے فتنہ کا دروازہ کھول دین لیکن اِس سے تصحیح معاملات کی
ان وجوہ پر (گو اُن کو بھی بعض کتابون مین حیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے) کوئی شبہہ نہ کرے،
جن مین بلا کسی نفسانی غرض کے، عام مسلمانون کو تنگی سے نکالنے اور معاصی سے بچانے کیلئے
اذن دیا گیا ہے، جیسا کہ خود حدیث مین ہے، کہ بع الجمع بالدراھم ثم ابتع بالدراھم
التمر وغیرہ ہے، فرق دونون مین یہ ہے کہ جس سے مقصود کسی شرعی مقصود کا ابطال ہو، وہ
مذموم ہے اور جس سے مقصود کسی مقصود شرعی کا حاصل کرنا ہو، وہ محمود ہے، مثلاً ربوا مقصود نہ ہو
بلکہ خود اجناس ہی قیمت مین متفاوت ہون لیکن اتحاد بدلین کے سبب تفاضل ممنوع ہو
وہان حدیث مذکور کے موافق تصحیح کر لینا جائز و مشروع ہے"،

علماء کی جاہ طلبی | یہ تو بصورتِ مال دنیا طلبی تھی، بصورتِ جاہ دنیا طلبی کی چند صورتین ملاحظہ ہون،

"بعض علماء اس لئے امراء سے ملتے ہین، کہ لوگون مین عزت و وقعت بڑھے گی، حالانکہ عام
مسلمان اس کو اہلِ علم کے لئے عیب سمجھتے ہین، واقع میں بھی علماء کی عزت و شان کے لئے
یہی مناسب ہے کہ دین کی خدمت کرین، امراء سے مستغنی رہین، غربا کے ساتھ خوش خلقی
کرین، اور امراء کی نظر مین تو اس سے اچھی خاصی ذلت ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہین کہ خوشامد
کے لئے ملتے ہین، اور ایک اثر امراء و غربا دونون پر ایسا ہوتا ہے، کہ تحقیق دین اور فتویٰ
کے باب مین اعتبار اٹھ جاتا ہے، ان کے وعظ فتوی اور تقریر پر وثوق نہین رہتا خیال
ہوتا ہے، کہ شاید دنیا دارون کی خوشامد مین ایسا کرتے ہین"،

لیکن ایک اثر جو خود علماء پر امراء کی صحبت کا پڑتا ہے، وہ تو اتنا خطرناک ہے، کہ بالآخر اُن کے
دین ہی کو لے ڈوبتا ہے، یعنی امراء کے منکرات پر روک ٹوک ان کے لئے دشوار ہو جاتی ہے، کیونکہ پھر تو

ان سے لطف صحبت ہی باقی رہنا مشکل ہوگا، جانبین کو انقباض ہوگا، اور چونکہ امراء کو بالعموم مطلوب بنا کر ملا جاتا ہے، ان کی خلاف شرع حرکتوں پر سکوت کرنا پڑتا ہے،

جس سے علماء کے اندر مداہنت کی کیفیت پیدا ہوتی اور صحبت کی ترقی سے اس میں ترقی ہوتی ہے، حتیٰ کہ قلب سے اس کا اثر زبان پر آتا ہے یعنی پہلے قلب میں حق کی عظمت اور باطل سے نفرت کم ہو جاتی ہے، پھر زبان سے اظہار حق کی ہمت گھٹتی ہے، پھر باطل کا اظہار خفیف معلوم ہونے لگتا ہے، پھر اس کا صدور ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ ان امراء کو اس کا احساس ہو کر اتنا حوصلہ بڑھ جاتا ہے، کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے موافق ان علماء سے توجیہات کی فرمایش کرنے لگتے ہیں، اور یہ اُن کو پورا کرنے لگتے ہیں،

اس مقام پر پہنچ کر اُن کا قلب مسخ ہو جاتا ہے، اور حق بینی کی استعداد ہی ضائع ہو جاتی ہی بلکہ الٹے کبھی کبھی اہل حق سے جدال وعناد پر آمادہ ہو جاتے ہیں،

"پھر خود اُن کی اصلاح کی کوئی توقع نہیں رہتی، اور اُمت محمدیہ کے لئے (العیاذ باللہ) ابلیس سے زیادہ ضرررساں ہو جاتے ہیں، کہ اُن کے ہوتے ہوئے اگر شیطان فارغ ہو بیٹھے تو بھی بعید نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے ہی طالب دنیا کو دیکھا ہے، کہ ایک ہزار روپیہ لے کر اور ایک ترکیب تراش کر حقیقی ساس کے ساتھ حلت نکاح کا فتویٰ لکھ دیا، حدیث میں اسی طرح کے مسخ قلب کا ذکر ہے، کہ لمّا وقعت بنوا سرائیل فی المعاصی نھتھم علماء ھم فلم ینتھوا فجالسوھم وواکلوھم وشاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض ولعنھم علی لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذٰلک بما عصوا وکانوا یعتدون"

لیکن یہ سب خرابیاں اسی وقت ہیں جب امراء کو مطلوب بنا کر جاوے، اسی کی مذمت احادیث صحیحہ میں ہو کہ ابغض القراء الی اللہ الذین یعنی اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض

یزودون الامراء ورالعلماء امنا — وہ علماء ہیں، جو امراء سے ملتے ہیں، اور
الذین مالم یخالطوا الامراء فاذا خالطوا — علماء دین کے محافظ ہیں، جب تک امرا
الامراء فھم لصوص الدین — سے میل جول نہ رکھیں، ورنہ دین کے ڈاکو ہیں

امراء سے اختلاط واجتناب کے شرائط | البتہ اگر امراء طالب ہو کر حاضر ہوں یا کسی ضرورت سے خود علما کو مدعو کریں، تو اس معاہدہ کے بعد کہ ہم آزادی سے جو چاہیں گے کہیں گے، اور نذرانہ وغیرہ قبول نہ کریں گے، تو ایسی مخالطت محافظت دین ہے، کیونکہ اگر علماء اس طرح بھی اُن سے نہ ملیں، تو اُن کو دین کیونکر پہنچے گا، مگر اس طرح کا اختلاط فرض عین نہیں، کہ سب پر ضروری ہو، فرض کفایہ ہے، اور اس کے لئے ایسا شخص موزون ہے، جو قوی القلب اور غنی النفس ہو، ورنہ ضعیف کے لئے سلامتی اسی مین ہے، کہ امراء سے بالکل نہ ملے، تبلیغ کے لئے دوسرے لوگ یا رسائل، اور کتابیں کافی ہیں"

سبحان اللہ کیا فہم دین ہے، اگر حدود سے تجاوز پر یہاں بھی تنبیہ فرمایا، جو حضرت جامع المجددین کی تجدید کی خاص و نمایاں خصوصیت ہو کہ

اُمراء سے اجتناب کرنے مین ان کو حقیر اور اپنے کو مقدس نہ سمجھے، بلکہ ان کو مبتلائے دنیا وجہل سمجھ کر رحم و دعا کرے، اور اپنے کو ضعف دین کا مریض جان کر اجتناب کو ایسا سمجھے جیسا کمزور طبیعت والے کو جس مین تاثر کا مادہ زیادہ ہو، متعدی مرض کے مریض سے بچاتے ہین، اور ساتھ ہی اس متعدی مرض کے مبتلا پر غصہ بھی نہیں کرتے، بلکہ رحم کھاتے ہین

سبحان اللہ کیسی مجددانہ حدود شناسی اور پھر کیسی حکیمانہ اُن کی تفہیم ہے! ساتھ ہی پھر تنبیہ ہے کہ اس عدم غصہ اور عدم بغض کی بھی ایک حد ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص حق سے عناد اور اہل حق سے بغض رکھے

یا تکبر کرے، تو اس سے بغض کرنا واجب و عبادت ہے، اور بغض فی اللہ یہی ہے،

آگے جاہ طلبی کی ایک اور دقیق تدبیر کا بیان ہے، کہ

جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر بعضے دنیا دارون کو دھتکار دیتے ہین، سخت سست کہتے ہین، حتی کہ بعضے پہرا بٹھا دیتے ہین، اگرچہ یہ لوگ متکبر امرا، کا پورا علاج ہین، جن سے امرا، کو ان کے تکبر کی سزا ملتی ہے، لیکن یہ تکوینی علاج ہے تشریعی نہین، اور ایسا برتاؤ یا اخلاق شرع کے بالکل خلاف ہے، پھر بعضے ایسے بھی ہین، کہ ان کا مقصود یہی ہوتا ہے، کہ اس طریقہ سے امرا مین شہرت ہوتی ہے، لوگ بڑا بزرگ سمجھتے ہین، لہذا ایسے لوگون کو بہ نسبت متکبر کے ریاکار (اور جاہ طلب) کہنا زیادہ زیبا ہے،

یہ تو وہ لوگ تھے، جن کے اس طرزِ عمل کی غایت ہی جاہ تھی، بعضون کے ہان جاہ غایت و سبب نہین، بلکہ مسبب ہوتی ہے،

"اور وہ لوگ واقع مین اپنے کو مقدس اور دوسرون کو گنا ہگار سمجھتے اس لئے اُن سے نفرت کرتے ہین، ایسون کو بہ نسبت ریاکار کے متکبر کہنا زیادہ بجا ہے، اور یہ تکبر دنیا دارون کے تکبر سے بھی زیادہ قبیح و شنیع ہے، کیونکہ ان لوگون کو بہ نسبت دنیا دارون کے علم زیادہ ہے، اور علم کے ساتھ بدعملی عند اللہ مبغوض ہے، ان لوگون کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے، (لہذا ان کو کیا معلوم کہ جس کو یہ گنا ہگار جان رہے ہین، اس کا خاتمہ کیسا ہوگا، اور خود اپنے کو جو مقدس یقین کر رہے ہین، ان کا خاتمہ کیسا ہوگا)

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

مناظرہ و مجادلہ کی حقیقت بعض لوگ ضرورت بلا ضرورت بات بات مین مجادلہ و مناظرہ کرتے، اور دن رات اسی مین لگے رہتے ہین، جس سے اکثرون کی غرض اپنی علمیت کا سکہ بٹھانا یا علمی جاہ طلبی

ہوتی ہے جس کا،

"بعض اوقات یہان تک اثر ہوتا ہے، کہ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی باطل پر اصرار کئے جاتے ہین، کہ بات ہیٹی نہ ہو جائے، مین نے ایک ایسے ہی کا فتویٰ ایک قطعی رضاعی رشتہ مین نکاح کا دیکھا، کہ ابتدا مین تو ان سے غلطی ہوگئی، مگر پھر بات کی پیچ پڑگئی، اور باوجود سارے علماء کی مخالفت اور تحریراً و تقریراً تنبیہ کرنے کے ہرگز رجوع نہ کیا، حتیٰ کہ بعض ثقہ لوگون سے سُنا گیا کہ خود اپنے ایک بزرگ سے کہا کہ اب کیا کرون قلم سے نکل گیا اب تو تائید ہی کرنا ضروری ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماضل قوم بعد ھدی کانوا علیہ الا اوتوا الجدل ثم قرء ھذہ الآیۃ ماضربوہ لک الا جدلاً بل ھم قوم خصمون جدل سے یہان مراد عناد، اور اپنے مذہب کی ترویج کے لئے تعصب ہے"

اور بعض آیات و روایات مین مجادلہ و محاجہ کا جو امر و اذن ثابت ہے، تو یہ مطلب نہین، کہ ہر مجادلہ اور ہر حال مین مذموم ہے، البتہ ہمارے زمانہ مین زیادہ تر ایسے ہی مجادلہ کا رواج ہے جو مذموم ہے، یا جس کا ترک محمود ہے، اور جس کی مذمت آیات و احادیث اور بزرگون کے کلام مین موجود ہے، اس کی تفصیل ذرا آج کل کے مناظرہ پسندون کے لئے کان کھول کر سننے کی ہے،

ظنی و قطعی مسائل کے حکم کا بڑا اہم فرق

مسائل دو قسم کے ہین، ایک جن کی ایک شق یقیناً حق اور دوسری باطل ہو، خواہ سمعاً خواہ عقلاً، یہ مسائل قطعیہ کہلاتے ہین، دوسری قسم جس مین دونون جانب حق و ثواب کا احتمال ہو، یہ مسائل ظنیہ کہلاتے ہین، مسائل کلامیہ اکثر قسم اوّل سے ہین، اور بعض ثانی سے، اور مسائل فقہیہ اکثر قسم ثانی سے ہین، اور بعض اوّل سے"

"مسائل ظنیہ مین صرف ظنی ترجیح ثابت کرنے کے لئے اہلِ علم مین باہم گفتگو و مکالمت جائز ہے، بشرطیکہ نہ بغض و عناد ہو، نہ ایک جانب کی قطعیت کا اعتقاد ہو، نہ دوسری جانب کے قطعی باطل ہونے کا یقین جازم، نیز جب سمجھ مین آجائے، تو اپنی رائے سے رجوع اور حق کے قبول کا عزم ہو،

"مگر مصلحت اس مین بھی یہ ہے کہ عوام تک اس کی اطلاع نہ ہو، اگر زبانی گفتگو ہو، مجمع خواص کا ہو اور اگر تحریری ہو، تو عام فہم زبان مثلاً ہندوستان مین اردو مین نہ ہو، عربی مین ہو، یا کم از کم فارسی مین تاکہ اگر کسی وقت وہ شائع ہو جائین، تو عوام تک اس اختلاف کا اثر نہ پہنچے، اور سلف سے اسی طرح کی گفتگو منقول ہے، نہ کہ جیسی آج کل ہوتی ہے کہ ایک قرأۃ خلف الامام کا حق ہونا، اس طرح بتلا رہا ہے کہ اس کے نزدیک تمام حنفیہ تارکِ صلوٰۃ اور فاسق ہین، اور دوسرا اس کی اس طرح نفی کر رہا ہے، کہ گویا اس کے نزدیک، قرأۃ خلف الامام کی کوئی حدیث ہی نہین، اور عین مناظرہ مین اگر مقابل کا قول دل کو لگ بھی جائے، تب بھی ہرگز قبول نہ کرین، بلکہ گفتگو شروع کرتے ہی رد ہی کا پختہ ارادہ رکھتے ہین، اور اسی نیت سے سنتے ہین، کیونکہ مقصود تمامتر اپنا غلبہ اور دوسرے کو ساکت کرنا ہوتا ہے، پھر باہمی عناد و فساد، حتیٰ کہ نوبت عدالت تک پہونچتی ہے، کیا یہ دین ہے، کیا سلف صالح اور حضرات صحابہؓ کا ان مسائل مین یہی طریقہ تھا،

افسوس اگر آج مسلمان ان ظنی مسائل مین اختلاف و گفتگو کو اپنے حدود مین رکھتے اور مجدّد وقت کی حدود شناسی کو مشعلِ راہ بناتے، تو کتنے اور کیسے کیسے عیب و مہلک مفاسد کا سدباب ہو جاتا، پھر ہمارے آج کل کے سیاسی و ملکی مسائل تو ان فقہی مسائل سے بھی زیادہ ظنی ہین، ان

مین ایک دوسرے پر لعن طعن، سب وشتم، تکفیر و تفسیق اور وہ بھی کسی خاص مجمع اور خاص زبان مین نہین، بلکہ عوام الناس کے بھرے جلسون اور ہر اردو اخبار کے کھلے کالمون مین سیاسی وملکی ہی کیا، اور عوام یا انگریزی دانون ہی پر کیا موقوف بعض مستند اور بہت سے غیر مستند مدعیان علم دین فقہی وظنی مسائل تک کو رسائل و اخبارات کے میدان مین عوام الناس کے سامنے ڈال دینا، عین خدمت دین جانتے ہین، ع :-

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

کاش اسلام کے یہ نادان دوست مجدد وقت کی ان باتون پر کان دھرتے، تو آج مسلمان ان دینی و دنیوی ہلاکتون اور ذلتون سے کیون دوچار ہوتے، حضرت جامع المجددین کی اصلاحات وتجدیدات ہر معاملہ مین ایسی جامع ہین، کہ بے ساختہ دل گواہی دیتا ہے، کہ اگر ان کا اتباع ہو تو دین ودنیا کی صلاح واصلاح سب کا نقشہ سلف خدا چاہتا پھر سامنے آجاتا،

مسائل قطعیہ مین اختلاف کی مختلف حالتون کا حکم اب رہ گئے مسائل قطعیہ جیسے کفر و اسلام کا اختلاف، یا اہل حق کے نزدیک جو متفق علیہ بدعت وسنت ہے، اس کا اختلاف تو اس مین چند حالتین ہین

ایک یہ کہ صاحب باطل متردد و طالب حق ہے، اور اپنے شبہات صاف کرنا چاہتا ہے اور اس غرض سے گفتگو یا مناظرہ کرتا ہے، تو جو شخص حق کی تائید پر قادر ہو، اس پر ایسا مناظرہ واجب وفرض ہے، اور جب جواب سے عجز ہو تو صاف کہدینا چاہئے کہ اس کا جواب میری سمجھ مین نہین آتا، سوچ کر یا پوچھ کر تبلاؤن گا، یا اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ تبلادے، اور طالب کو چاہئے، کہ وہان جاکر رجوع کرے، ایسے مناظرہ سے انکار معصیت اور مَنْ سُئِلَ عن علم فکتمہ الخ مین شامل ہے،

(۲) دوسری حالت یہ ہے کہ مخاطب طالب حق نہین، لیکن متکلم مناظرہ کو توقع واحتمال ہو کہ

شاید حق کو قبول کرلے، سو جب تک اس کی اُمید ہو، مناظرہ کرنا، تبلیغ احکام مین داخل ہے، کہ جہان تبلیغ واجب ہے، وہان یہ مناظرہ واجب اور جہان مستحب ہے، وہان مستحب ہے، جناب سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اہل کتاب و خوارج سے مناظرات اسی قبیل کے تھے،

(۳) اور تیسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب بھی نہین، نہ قبول کی امید ہے، مگر کسی مفسدہ و مضرت کا بھی اندیشہ نہین، اور کسی ضروری امر مین خلل کا بھی احتمال نہین، تو ایسی صورت مین ایسا مناظرہ مستحب ہے،

(۴) چوتھی حالت یہ ہے کہ طالب ہے نہ امید قبول نہ کسی ضروری امر مین خلل نہ کسی مضرت کا اندیشہ ہے، تو اس صورت مین قوی ہمت کے لئے عزمیت واولی ہے، اور خفیف ہمت والے کے لئے رخصت وغیر اولی،

(۵) پانچوین حالت یہ کہ نہ طالب ہے توقع قبول اور ساتھ ہی کسی دینی مضرت کا احتمال یا کسی اہم دینی منفعت کے فوت ہونے کا احتمال ہے، اس صورت مین اس سے اعراض اور ضروری مین اشتغال واجب ہے، قرآن مجید مین اعراض، اور ترک جدال کا امر ایسے ہی موقع پر ہے، سورہ عبس کی شانِ نزول کا جو قصہ تھا، جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اجتہاد سے اس کو تیسری حالت مین داخل سمجھا، اور اللہ تعالی نے اوس کو پانچوین حالت مین داخل تبلایا،

(۶) چھٹی حالت یہ ہے کہ مناظرہ کرنے مین تو مخاطب کی نہ کوئی منفعت متوقع ہے، اور نہ اس سے کسی خاص مضرت کا احتمال ہو، اور مناظرہ نہ کرنے مین عوام اہل حق کے شبہہ مین پڑجانے کا خوف ہو، اور مسئلہ ایسا ہو کہ عوام اہل حق کو اس کے غلط ہونے کا احتمال بھی نہ ہو،

تاکہ علمائے اہلِ حق سے دریافت کرسکین، تو اس صورت مین اس کی تدبیر واجب ہے جو دو ہین،

"ایک یہ کہ خود اہلِ باطل کو مکالمہ یا مکاتبہ مین مخاطب بنایا جائے، دوسری یہ کہ اس سے خطاب نہ کیا جائے، بلکہ عام خطاب سے حق کو ثابت اور باطل کو رد کیا جائے" ان مین جس تدبیر کو اختیار کیا جائے، واجب ادا ہو جائے گا،

(۷) ساتوین حالت یہ ہے کہ قیود مذکورہ حالت ششم کے ساتھ وہ مسئلہ بھی ایسا ہو کہ عوام اہلِ حق کو اس کے غلط ہونے کا شبہہ واقع ہو سکتا ہو، اس صورت مین خود ان عوام پر واجب ہے، کہ علما سے تحقیق کرین اور علما پر جواب دینا واجب ہوگا، ورنہ بدون سوال وہ سبکدوش ہون گے،

"اور ان تمام صورتون مین یہ واجب ہے کہ الفاظ و مضمون متانت و تہذیب کے خلاف ہون، اور اگر دوسرا درشتی کرے تو بھی صبر افضل ہے،

ممنوع و مذموم بحث و مباحثہ یہ ساری تفصیل و تقسیم ان امور مین ہے کہ جو شرعاً مقصود ہون بعض وہ امور ہین، جو شرعاً مہتم بالشان نہین، جیسے خاندان عثمانیہ کا باہم تفاضل، یا بعض وہ امور جن مین بحث کرنے یا حکم لگانے سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے، جیسے تقدیر کا یا کوئی دوسرا ایسا ہی مسئلہ، مثلاً باوجود اس کے کہ کسی کا کلام صحیح معنی کو محتمل ہو، پھر بھی اس پر کفر کا حکم لگانا، ایسے امور مین بحث و مباحثہ کرنا ممنوع و مذموم ہے جس مرتبہ کی نہی یا نہی عنہ ہوگا، اسی مرتبہ کی ممانعت و مذمت ہوگی،

"اس سے معلوم ہوا کہ نہ ہر مناظرہ محمود ہے، نہ مذموم، نیز تمام وہ نصوص واقوال اور عادات ائمہ دین جو بظاہر اس باب مین متعارض نظر آتے ہین، ان مین تطبیق ہوگئی،

اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس زمانہ مین زیادہ ایسے ہی مناظرے شائع ہین، جو مذموم ہین[۱]

مسٹرون کے ملکی وسیاسی مناظرون نے مولویون کے دینی و مذہبی مناظرون کو بھی مات کر دیا

البتہ مولویون اور مذہب کے میدانی یا تحریری مناظرات کی جگہ جن مین پھر بھی دین سے ایک لگاؤ تھا، اب حکومت وسیاست اور "مسٹرون" کے پنڈالی یا اخباری مناظرات نے حاصل کرلی ہے، جن کو تحقیقِ حق و قبولِ حق سے اتنا بھی تعلق نہین جتنا دینی مناظرون کے معمولی سے معمولی فریقین کو ہوتا تھا،

بس ہر جماعت اس کے ہر لیڈر و اڈیٹر اور ہر جلسہ وجلوس کا فرض یہ ہے کہ اپنی ہی بات جہان تک ہو سکے، اتنے غل و ہنگامہ کے ساتھ کہے جائے کہ دوسرے کی نہ خود سُنے نہ کسی کو سُننے دے اور اس فرض کی ادائی مین بغض وعناد، دروغ و بہتان، مکر و فریب لعن و طعن یہ سب فریقین کے لئے عین سیاست اور عین تہذیب ہے، کیونکہ یہ سب پروپگنڈا ہے، یہی نہین، بلکہ ہر درجہ کا طوفان بے تمیزی فتنہ وفساد، ملک و قوم کی عین خدمت، بلکہ درجۂ جہاد ہے، فریق مخالف کے جلسون اور جلوسون مین فتنہ برپا کردینا، مقرر کو تقریر نہ کرنے دینا، شرم شرم کے نعرون سے آسمان سر پر اٹھا لینا، حسب ضرورت سوڈے کی بوتلون اور انڈون کی مار سے تواضع کرنا، اس سے بھی کام نہ چلے تو اینٹین اور پتھر ہین، اور پھر یہ فتنہ وفساد کوئی اتفاقی نہین، بلکہ ہر جلسہ وجلوس مین اس کا احتمال ہے، اس لئے پہلے سے جلسہ وجلوس کی اجازت اور پھر موقع کے لحاظ سے پولیس یا فوج کی نگرانی لازم ہے، اور جو خوش قسمت اس قومی وسیاسی جہاد مین پولیس کے ڈنڈون [illegible]

---

[۱] ایک مناظرہ ہی کی بحث مین حضرت مجدد کی ان تجدیدی تنقیحات و تفصیلات [illegible] کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح ہر مسئلہ کے تمام جزئی پہلو آئینہ فرماتے جاتے ہین، اور بظاہر متضاد [illegible] جزئیات کی چولین کس طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہین، اور ہر شے اپنی حد مین رہتی ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست

کام آسکے، اس کے مجاہد و شہید ہونے مین کیا شک! جلسون اور جلوسون ہی کی قید نہین، یون بھی فریقین مین جو دہشت انگیزی اور کشت و خون مین بازی لیجا سکے، مثلاً فلسطین کے یہودی، تو بس وہی برسرِ حق ہے، اس کے علاوہ نہ امریکہ کے ٹرومین کے پاس "ٹرو" یا حق کا کوئی معیار ہے، اور نہ برطانیہ کے پاس انصاف یا اپنے وعدون کی شرم، بھلا حق و باطل کے پرانے مولویانہ مناظرہ کے فریقین کے پاس احقاقِ حق و ابطالِ باطل کے لئے ایسی دہشت انگیزی کی منطق اور دلائل کہان موجود تھے، جن کا مقابلہ بڑی بڑی حکومتون کو اپنی فوجون سے کرنا پڑے،

مسلمانون کی جیت سیاسی مباحثہ و مناظرون مین بھی حضرت مجدد کے تجدید فرمودہ اصول مین ہے

کاش مسلمان اب بھی آنکھین کھولتے کہ انھون نے وحیٔ نبوت کی روشنی کو رکھتے ہوئے دین و دانش دونون آنکھون کے کیسے اندھون کا دامن تھام رکھا ہے، ! مسلمانون کی تو دنیا کا بھی ہر اہم مسئلہ کسی نہ کسی طرح نفیاً یا اثباتاً بواسطہ یا بلا واسطہ دین ہی کا مسئلہ ہے، اس لئے اگر وہ اغیار سے اخباری و پنڈالی بحث و مناظرہ مین صرف اپنی دینی راہ کے ان حدود و شرائط پر عمل پیرا ہوجائین، جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے آخر مین بطور خلاصہ تحریر فرمائے ہین، تو انشاء اللہ نصرتِ حق کی بدولت معاندین کے باطل پروپگنڈے اور ناحق کی خونریزی و دہشت انگیزی کو بھی بالآخر مغلوب ہی ہونا پڑے گا، بس ذرا ایمان و عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق و تواصی بالصبر کی ضرورت ہے، بہرحال مسلمانون کے لئے بہ حیثیت مسلمان حکومت و سیاست کے بظاہر دنیاوی مسائل مین بھی بحث و مباحثہ کے وہی آداب و شرائط ہین جو خاص دینی مسائل مین ہین،

"یعنی وہ مسئلہ دین مین مقصود بھی ہو، دل سے یہ عزم ہو کہ حق واضح ہوجائے گا تو فوراً قبول کرلین گے، یہ نیت نہ ہو کہ ہر بات کو رد کرین گے، گو سمجھ مین بھی آجائے، مخاطب پر شفقت ہو، اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو، تو صبر و معدلت کے ساتھ مقابلہ کرے؛

اگر قرائن سے عناد مشاہد ہو تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرے، الفاظ و مضمون نرم ہو،
جو بات معلوم نہ ہو، نہ جاننے کا اقرار کرے، عار نہ کرے"۔

ذرا ان اصول کو مسلمان امتحاناً ہی کچھ عرصہ صبر و عزیمت کے ساتھ اپنے اخباری و سیاسی مباحثون اور اکھاڑون مین آزما دیکھین، گو یہ صبر و عزیمت دین سے تعلق کے بغیر نصیب ہونا آسان نہین تاہم جہان ترقی کی سب تدبیرین کرتے ہین، دین کے تعلق کو بھی بطور تدبیر ہی اختیار کر دیکھین، مگر جب خود علماے دین ہی طوفان بے تمیزی کے اس اکھاڑے مین کو د پڑے ہون، تو عوام سے کیا، اور کس منہ سے کہا جائے، اور دینی اعتبار سے لیڈرون کا شمار عوام ہی مین ہے ورنہ یہی ہوتا تھا جو آج آنکھون کے سامنے ہے کہ ان باتون کو دیکھ کر

"عوام الناس علما سے بھی بدگمان ہو گئے ہین، کہ یہان ہر شخص دوسرے کی تکذیب کرتا ہے، اس لئے یا تو سب ہی کو چھوڑ دیتے ہین، یا ایک کی طرف ہو کے مقابل کی بے آبروئی اور ایذا رسانی کے درپے ہوتے ہین، اور باہمی عداوت قائم ہو کر ایک دوسرے کی آبروئی (بلکہ جان تک) کی فکر مین لگ جاتے ہین، اور گروہ بندیان ہو کر مسلمانون کی قوت و وقعت مین روزانہ ضعف و انحطاط ہوتا جاتا ہے، کبھی مارپٹائی ہو کر نوبت بعدالت پہنچتی ہے"

کیا یہ سب کچھ ابھی حال ہی مین جمعیۃ و لیگ وغیرہ کے انتخابات[1] کے سلسلہ مین دن دوپہر سارے ہندوستان مین دیکھا نہین گیا، مگر علما نے ان شرمناک واقعات سے یہ عبرت حاصل کی جو اس اکھاڑے مین نہین تھے[2] وہ بھی اپنی ہی جماعت یعنی علما ہی کے مقابلہ مین تال ٹھوک کر اُتر آئے، بعض لوگ ان مفاسد سے قطع نظر کرکے اخباری یا پنڈالی بحث و مباحثون کے طرح طرح کے مصالح و فوائد بیان کرتے ہین، مگر شرائط بالا کے فقدان کی صورت مین ہوتا وہی ہے، جو ایسے مذہبی مناظرات مین

---

[1] ۴۶ء کے انتخابات مین، [2] جمعیۃ علمائے اسلام،

ہوتا تھا کہ "ملا آن باشد کہ چپ نشود" اب لیڈر آن باشد کہ چپ نشود" یعنی ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے، ہر شخص دوسرے کا جواب، پھر وہ دوسرا اس کا جواب الجواب، پھر وہ پہلا اس جواب الجواب کا رد پھر دوسرا اس رد کا رد، دونوں اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں"،

اور بقول ایک بڑے عالم ہی کے کہ "جب تک مولوی یا لیڈر کی زبان پر لقوہ اور ہاتھ پر فالج نہ گرے، اس رد وقدح کا تحریری و تقریری سلسلہ بند نہیں ہوسکتا"!

پھر ایک خرابازاری یہ ہے کہ مولویانہ وعظ کی طرح جس کس وناکس کا جی چاہے لیڈرانہ تقریر کے لئے بھی کھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ وعظ کے متعلق حدیثوں میں ہے کہ

"لا یقص الا امیر او مامور او مختال او مراء" یعنی وعظ امیر کہتا ہے یا مامور کہتا ہے (یعنی اس کو کہنا چاہئے) یا پھر شیخی باز (مختال) یا ریاکار، اسی طرح ہے کہ من تعلم صرف الکلام لیسبی قلوب الناس لم یقبل اللہ یوم القیامۃ صرفا ولا عدلا؛ یعنی جو آرٹیری (صرف الکلام) یا باتیں بنانا اس لئے سیکھتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کو پھانسے، اس کا قیامت کے دن نہ فرض عمل قبول فرمائے گا، نہ نفل،

آج کل اس "صرف کلام" یا باتیں بنانے اور الٹ پھیر کرنے کا جیسا زور اور جیسا بیجا استعمال ہے ظاہر ہے، اور جیسے بہت سے دانشا بدون کافی علم کے وعظ کہنے لگتے ہیں اور ضلوا واضلوا کا مصداق ہوتے ہیں ویسے ہی آج کل کے بہت سے لیڈر وا ڈیٹر سیاسی و دنیوی مسائل کو بھی پوری طرح جانے اور سمجھے بغیر نام کے رہنما (لیڈر) بنکر خود بھی گمراہ ہوتے، اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں،

(باقی)

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار

اسلام کی روشنی میں

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی، بی، اے

مارکسیت کیا ہے؟ فویرباخ (Feuerbach) پر اپنے گیارہویں مضمون میں مارکس لکھتا ہے:

"فلسفیون نے اپنے اپنے خیال کے مطابق صرف کائنات کی توجیہ کی ہے لیکن بنیادی سوال تو یہ ہے کہ اسے تبدیل کیسے کیا جائے" اس سے ظاہر ہے کہ مارکس نے اپنے فلسفہ کو ایک عملی طریق کار کی حیثیت سے پیش کیا، اور اگرچہ نظری اصول بھی مارکسیت کے اہم اجزا ہیں لیکن مارکس کے نزدیک عمل نظریہ مقدم ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مارکسیت میں مرتب نظریات کی کوئی کمی ہے، بلکہ علوم طبعی (Physical Sciences) کے نظریات کی طرح مارکسی نظریات بھی اپنی تفصیلات میں مارکسیت کے عملی طریق کار کو دنیا کے حقیقی حالات و واقعات پر منطبق کرنے سے وجود میں آئے ہیں،

ہالڈین اپنی کتاب مارکسی فلسفہ اور سائنس (Marxist philosophy and Sciences) میں لکھتا ہے کہ

مارکسیت وجود (Being) سے نہیں بلکہ حدوث (Becoming) سے بحث کرتی ہے یعنی وہ یہ نہیں دیکھتی ہے کہ اشیاء عالم کیا ہیں، اور کیا نہیں، بلکہ کیا ہو رہی ہیں، اسی لئے مارکسیت کا دعویٰ ہے کہ وہ ہم میں صرف معاشی اور سیاسی انقلابات سمجھنے کی نہیں، بلکہ جملہ تغیرات عالم کے فہم و ادراک کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور اس طرح ہمیں اس بات پر قادر بنا دیتی ہے کہ ہم ان

تغیرات پر قابو حاصل کرین، چنانچہ مارکسیت علم اور عمل کی وحدت کا اثبات کرتی ہے اور اُن کے درمیان کسی تفریق کو روا نہین رکھتی، لیکن ساتھ ہی وہ عمل کو مرجح اور مقدم قرار دیتی ہے، انجلس لکھتا ہے:-

"یہ سوال کہ آیا انسانی فکر معروضی صداقت (Objective reality) یا خارجی حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے، محض نظری مسئلہ نہین ہے، بلکہ ایک عملی سوال ہے، کیونکہ عمل کی دنیا مین انسان کو اپنے افکار کی صداقت کا ثبوت دینا ضروری ہے، یعنی اس بات کا ثبوت کہ اس کے افکار بے حقیقت اور بے اثر نہین ہین، بلکہ اس دنیا اور اس کے واقعات کے لئے نتیجہ خیز ہین، عالم خارجی، اور اس کے واقعات سے ہٹ کر انسانی فکر کی حقیقت رسی کی بحث بالکل لایعنی ہے،

ہالڈین لکھتا ہے کہ اس نقطۂ نظر سے مارکسیت اور نتائجیت[۱] (Pragmatism) مین ایک گہری مماثلت ہے، لیکن اور ہر اعتبار سے ان دونون مین بڑا فرق ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ مارکسیت تغیرات عالم پر خاص طور سے زور دیتی ہے، عالم خارجی کی حقیقت کا اثبات کرتی ہے اور یہ دعوی کرتی ہے کہ اگرچہ انسان صداقت مطلق تک کبھی نہین پہنچ سکتا ہے، لیکن وہ اس سے قریب تر ہو سکتا ہے،

مارکسیت اور جدلیات مارکسیت کے بنیادی اصول جدلیاتی اصول (Dialectical principles) کہلاتے ہین، جدلیات کا لفظ یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہے، یونانی زبان مین ابتداءً اس لفظ کے معنی مکالمہ کے تھے، سوفسطائیون کے عہد مین مکالمہ اور بحث و تکرار ایک مستقل فن بن گیا تھا، اس فن کے قواعد جدلیات (Dialectics) کہلاتے تھے،

---

[۱] نتائجیت وہ فلسفہ ہے جس کی رو سے کسی نظریہ کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ وہ عملی زندگی مین اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب ثابت ہو، نتائجیت ہر صداقت کو اس کی عملی کامیابیون یا ناکامیون کے لحاظ سے صحیح یا غلط قرار دیتی ہے،

اس قسم کے مباحث کا طریقہ یہ تھا، کہ متکلم کوئی خاص دعوی پیش کرتا تھا، اور اس کے بعد مخاطب اس امر کی کوشش کرتا تھا کہ اس سے کوئی ایسی بات کہلوادے جس سے اس دعوی کی نفی ہوتی ہو، اس طرح جدلیات فی الاصل بحث و مکالمہ کا ایک خاص طریقہ ہے، خواہ یہ بحث و تکرار دو اشخاص کے درمیان ہو یا کسی فرد واحد کے ذہن مین اس مین پہلے ایک دعوی کیا جاتا ہے، پھر ایک بالکل مخالف دعوی اس کی تردید کرتا ہے، پھر دونون مین جو نقص و خطا ہوتی ہے، اسے دور کر دیا جاتا ہے، اور ایک تیسری بات نکل آتی ہے، جو حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے، اس طرح یہ تردید و تطبیق کے ذریعہ جستجوے حقیقت کا ایک مخصوص طریقہ ہے،

یہ طریقہ دو اجزاے فکر پر مشتمل ہے، جن مین سے اگر ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے، اولاً یہ اس پختہ عقیدہ پر مبنی ہے، جیسے افلاطون نے پیش کیا تھا، کہ عالم کائنات کی بنیادی اور اصلی حقیقتین اشیاء خارجی نہین بلکہ افکار و تصورات ہین، دوسرے یہ تصورات جامد و ساکن نہین، بلکہ سیال حالت مین ہین، اور مسلسل حرکت کرتے ہوے نشو و ارتقار کی منزلون سے گذرتے ہین، افلاطون نے افکار و تصورات کو کامل الذات، غیر متبدل اور بے حرکت قرار دیا تھا، اور یہ نظریہ پیش کیا تھا، کہ جدلیاتی طریق ہی سے حقیقت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے، یعنی ایک ایسے طریقہ کو جس مین مخالف افکار کا پہلے اقرار و اثبات کر لیا جائے، پھر اُن کی تردید کی جائے، اور آخر مین اُن کے درمیان تطابق و توافق پیدا کیا جائے، ہیگل نے اس کے خلاف یہ خیال ظاہر کیا، کہ تصورات خود اس عمل سہ گانہ یعنی اثبات، تردید اور تطبیق سے گذرتے ہین، بالفاظ دیگر عالم کائنات کی تمام حقیقتین دراصل ایک واحد تصور کی جدلیاتی بحث و تکرار کا پرتو ہین جس مین یہ تصور اپنے مختلف اور مخالف پہلوؤن کو اجاگر کرتا ہے، اور صرف مخصوص حقائق ہی نہین بلکہ کل عالم کائنات ایک جامع تصور ہے، جو اپنے اضداد کا اثبات اور پھر اُن کی تردید کرتا ہے اور اس کے بعد اُن کے

درمیان مطابقت پیدا کرکے اعلیٰ و برتر وحدتین قائم کرتا ہے، اس طرح یہ تصور تدریجاً اپنے باطن کا انکشاف عمل مین لاتا ہے، گویا کہ کائنات ذہنِ الٰہی (Divine mind) ہے جو منطقی وجوب (Logical necessity) کے تحت مدارج ارتقاء کرکے اپنی تکمیل جدلیاتی طریقہ پر کررہا ہے، ہیگل نے چند اصول فکر وضع کئے تھے، جنھین جدلیاتی اصول کہا جاتا ہے، اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ اصولِ فکر[۵] (Principles of Thought) ازل سے قائم ہین، اور ہمیشہ قائم رہین گے، عالم مادّی زمان و مکان مین ان فکری اصولون کا خارجی تحقق ہے، فویرباخ، مارکس، اور اینجلس نے اس کے خلاف یہ دعویٰ کیا، کہ عالم فطرت مین یہ اصول پہلے سے کارفرما ہین، اور عالم افکار مین اُن کی عملداری بعد مین قائم ہوئی، مارکس نے یہ خیال بھی پیش کیا، کہ فکر بشری درحقیقت عالم مادّی کا پرتو ہے، جو ذہن انسانی پر منعکس ہوتا ہے، اور اس کے سانچہ مین ڈھل جاتا ہے، اسی طرح اینجلس نے ہیگل کی جدلیات کے متعلق یہ رائے قائم کی، کہ وہ اوّلاً مادہ کے خواص اور اس کے قوانین حرکت کو ظاہر کرتی ہے، اور اس سے قوانین فکر صرف ثانوی طور سے مستنبط کئے جاسکتے ہین، اس کا دعویٰ یہ تھا، کہ وہ اصول جو ہیگل نے عالم افکار کے لئے مرتب کئے تھے، مادی حالات و واقعات پر بھی منطبق ہوتے ہین، خواہ ان کا تعلق عمرانیات اور معاشرتی علوم سے ہو یا فلکیات، حیاتیات اور طبیعیات سے، چنانچہ اینجلس ایک مقام پر لکھتا ہے،

ہیگل کے فلسفہ کی رو سے جدلیاتی ارتقار (یعنی اضداد کی ترکیب سے ایک اعلیٰ تر وحدت کا

---

[۵] ان اصولون کا تفصیلی بیان آگے آتا ہے، مختصراً یہ اصول تین ہین اوّلاً اضداد کی پیکار و آویزش سے اعلیٰ تر وحدتون کا قیام، دوم کمیت (Transition) کی کیفیت مین تبدیلی، اور اس کے برعکس کیفیت (Quality) کی کمیت مین تبدیلی، سوم نفی کی نفی (Negation of Negation) کا اصول،

ظہور) جس کی مثالین ہمین خارجی فطرت اور انسانی تاریخ مین ملتی ہین، اور جو عبارت ہے ایک ایسی ترقی پذیر حرکت سے جس مین ادنی ترد مدتمین اعلیٰ ترد مدتون مین ضم کرتی ہین، تصور کی اس ذاتی حرکت کا ایک موہوم حربہ ہے، جو ذہن انسانی کے افکار وخیالات سے الگ اور اس کی جولانیون سے غیر متاثر ازل سے جاری ہے، مگر کوئی نہین کہہ سکتا ہے کہ کہان؟

اس الٹی بات کو کسی طرح سیدھا کرنا تھا، ہم نے پھر ایک مرتبہ تصورات کو مادی طریقہ پر سمجھنے کی کوشش کی یعنی اس حیثیت سے کہ وہ عالم خارجی کی حقیقی اشیا کی ذہنی تصاویر ہین، نہ یہ کہ عالم مادی کی حقیقی اشیا، تصور کی فلان فلان ارتقائی منزل کی خارجی تصاویر ہین، اس طرح ہیگل کی جدلیات عالم خارجی اور عالم افکار دونون کے عام قوانین حرکت کا علم بن گئی، یعنی قوانین کے دو مجموعے ہین جو در اصل ایک ہین، لیکن اپنے طریق اظہار مین مختلف ہین، اگر ایک طرف ذہن انسانی ان قوانین کو عالم خارجی کے حالات وواقعات پر پورے فہم وشعور کے ساتھ منطبق کرسکتا ہے، تو دوسری طرف عالم فطرت اور بڑی حد تک انسانی تاریخ مین بھی قوانین غیر شعوری طور سے کارفرما ہین، اس طرح تصور کی جدلیات عالم حقیقی کی جدلیاتی حرکت کا آئینہ بن گئی، اور ہیگل کی جدلیات کو جو سر کے بل کھڑی تھی، سیدھا کرکے پیرون کے بل کھڑا کر دیا گیا،

جدلیاتی اصول۔ جدلیات کا پہلا اصول اضداد کی وحدت کا اصول ہے یعنی ہر نظام زندگی، ہر تصور ہر مادی شے، اور معاشرتی حالت اپنے اندر اپنی ضد کو پرورش کرتی ہے، جو ایک خاص نوبت پر ظاہر ہوکر اس سے متصادم ہوجاتی ہے، پھر اس پیکار و تصادم سے ایک نئے نظام، نئے تصور، نئی مادی شے یا معاشرتی حالت کی تخلیق ہوتی ہے، یا اس اصول کو یون بھی بیان کیا جاسکتا ہے، کہ ہر شے دو متضاد حقیقتون یا صفات کا مجموعہ ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ زید ایک انسان ہے، تو مین ایک مخصوص فرد کو چند مخصوص حالات مین ایک عمومی حقیقت یعنی انسان کے مترادف قرار دے رہا ہون اس طرح

مین درحقیقت دو اضداد کو جمع کر رہا ہون، اسی طرح مین یہ کہہ سکتا ہون کہ اس میز کی لکڑی بہت سخت ہے، کیونکہ اگر وہ سخت نہ ہوتی، تو اس پر کوئی وزنی چیز نہین رکھی جاسکتی تھی، اور ساتھ ہی یہ لکڑی نرم بھی ہے، کیونکہ اگر وہ نرم نہوتی، تو اس کے ٹکڑے نہین کئے جاسکتے، اس طرح لکڑی مین دو متضاد صفات جمع ہین، اس قسم کے دعوون کی توجیہ ہم دو طرح سے کرسکتے ہین، ایک تو ہم افلاطون کی طرح یہ کہہ سکتے ہین، کہ اشیائے مادی بے حقیقت ہین، اور حقیقی وجود صرف عمومی تصورات یا اعیان (ideas) کا ہے، دوسرے ہم یہ کہہ سکتے ہین، جیسا کہ انجلس کا قول تھا، کہ مادہ مین دونون اضداد جمع ہین، لیکن اس کے معنی یہ ہون گے، کہ مادہ اس سے کہین زیادہ باصفت اور پیچیدہ شے ہے، جتنا کہ اٹھارہوین صدی کے مادہ پرست سمجھتے تھے، دوسرا جدلیاتی اصول یہ ہے کہ کمیت (quantity) کیفیت (quality) اور کیفیت کمیت مین تبدیل ہوسکتی ہے، جیسا کہ مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ مین لکھا ہے،

"علوم طبیعی کی طرح یہان بھی معاشرتی علوم مین"

ہیگل کے اس اصول کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی منطق مین پیش کیا ہے کہ کمی تغیرات (quantitive changes) ایک خاص حد کے بعد کیفی تغیرات (qualitative changes) مین تبدیل ہو جاتے ہین، اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ کیمیاوی خواص اس کے نقطۂ انجاد پر بدل جاتے ہین، اسی طرح اگر پانی کو حرارت پہونچائی جائے، اور حرارت کی مقدار مین اضافہ ہوتا رہے، تو حرارت کی ایک خاص مقدار کے بعد پانی کے خواص مین تبدیلی شروع ہو جاتی ہے، پانی کا حجم جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، دفعۃً تیزی سے بڑھنے لگتا ہے، اور اس کے بعض دوسرے خواص ناپید ہو جاتے ہین مثلاً اس نقطۂ حرارت پر پانی مین کوئی چیز حل نہین کی جاسکتی ہے، اسی طرح کاربن ڈائی اکسائڈ (Carbon di-oxide)

کی مثال ہے، سو سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ یہ گیس بالکل زہریلی ہے، اگر کوئی شخص خالص کاربن ڈائی آکسائڈ مین سانس لے تو فوراً مر جائے گا، لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے، کہ اس گیس کی ایک محدود مقدار انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے، اسی طرح اشیاء کی مقدار کے تغیر سے اس کے صفات بدل جاتے ہین، یہی چیز بعض اخلاقی نظامات مین بھی صحیح پائی جاتی ہے، مثلاً ارسطو کا دعویٰ ہے کہ خیر و شر کا فرق زیادہ تر مقادیر کے فرق سے وجود مین آتا ہے، مثلاً بزدل آدمی بے باک آدمی اور جری آدمی مین فرق یہ ہے کہ بزدل آدمی بہت کم، اور بے باک آدمی بہت زیادہ خطرت برداشت کرتا ہے، اُن کے مقابلہ مین جری آدمی ایک حد اعتدال تک خطرات برداشت کرتا ہے، معاشرتی علوم مین اس اصول کا اطلاق اس طرح ہوتا ہے، کہ وہ اصول و قوانین جو معاشرتی ارتقار کی ایک خاص منزل پر انسانیت کی رہبری کرتے ہین، حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقی سے دوسرے دور کے لئے بیکار ہو جاتے ہین،

تیسرا جدلیاتی اصول نفی کی نفی (Negation of Negation) ہے، اس کی مثال مارکس نے معاشی تاریخ سے دی ہے، پہلے اوس نے قرون وسطیٰ کی انگریزی صنعتون کا حال بیان کیا ہے، جب دستکار اور مزدور اپنے آلات پیدائش کے خود مالک تھے، اور بعض صورتون مین وہ زمینون کے مالک بھی ہوتے تھے، اس کے بعد صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا، اور سرمایہ داری کا زور بڑھنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دستکار اور مزدور آلات پیدائش کی ملکیت سے محروم کر دیئے گئے، اُن کی زمینین بڑے بڑے جاگیردارون اور زمیندارون نے بجبر حاصل کر لین تاکہ انھین بڑے پیمانہ پر کاشت کر سکین، اس کے علاوہ نئے کارخانون کی مشینی پیداوار کے مقابلہ مین اُن کی دستی صنعتین بے کار ہو گئین، اور یہ طبقہ آلات پیدائش کی ملکیت سے محروم ہو گیا، جس کی وجہ سے اس کی حیثیت صرف بے ملک مزدور کی سی رہ گئی، اس طرح گویا مزدورون کی ملکیت کی نفی ہو گئی، لیکن مارکس دعویٰ کرتا ہے، کہ اب اس نفی کی نفی ہو رہی ہے، یعنی اب اشتراکی تحریک کے ذریعہ سرمایہ دار جنھون نے آلاتِ پیدائش

پر قبضہ کر رکھا ہے، ان کی ملکیت سے محروم ہو جائین گے، اور ایک لحاظ سے مزدور پھر اجتماعی طور پر آلات پیدائش کے مالک ہو جائین گے، مارکس کے خیال مین نفی کی نفی ایک ایسا اصول ہے، جو تمام ترقیات تنوعات اور جدتون کا سرچشمہ ہے، لینن، ایک جگہ لکھتا ہے،

" ارتقا کے دو بنیادی نظریات ہین، ایک یہ کہ ارتقا درحقیقت نام ہے کمی بیشی، یا اعادہ کا دوسرا یہ کہ ارتقا عبارت ہے، اضداد کی ترکیب اور وحدت سے پہلا نظریہ خشک اور بیجان ہے، دوسرا زندگی اور حقیقت سے قریب تر ہے، یہی دوسرا نظریہ موجوداتِ عالم مین ہر شئے کی حرکت و ترقی کی توجیہ کرتا ہے، اسی سے ہم ان تغیرات کو سمجھ سکتے ہین، جو اچانک طور پر واقع ہوتے ہین، اور بظاہر فطرت کے تسلسل مین خلل ڈالتے نظر آتے ہین، اسی سے ہم قدیم کی شکست اور جدید کی تخلیق کا سراغ پا سکتے ہین، جدلیاتی عمل کی ایک اور مثال یہ ہے، کہ ہم کبھی عمل کو اس کے خارجی حالات سے جدا کرکے دیکھتے ہین، اور اس کے متعلق ایک نظریہ قائم کرتے ہین، جو بعد مین غلط ثابت ہوتا ہے، کیونکہ ہم نے اس شے یا عمل کے پسِ منظر پر غور نہین کیا تھا، اب کسی نقاد کے لئے یہ کہدینا آسان ہے کہ تمھارا نظریہ پہلے ہی سے بالکل مہمل تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم کوئی ایسا نظریہ نہ قائم کرین جو ایک خاص حد تک حالات و واقعات پر منطبق ہونے کے بعد پھر ان پر صحیح نہین اترتا ہے، اس وقت تک ہمین یہ نہین معلوم ہوتا ہے، کہ اس نظریہ کی تشکیل مین ہم نے واقعات کے کن پہلوؤن کو نظر انداز کر دیا تھا، جن پر غور کرنا ضروری تھا، اس طرح نظریات قائم کرنا اور پھر تجربہ سے ان کے نقائص رفع کرنا ایک اہم جدلی عمل ہے،

مارکسیت اور مادیت مارکسیت کا دعویٰ ہے، کہ ذہنِ انسانی مادہ کی پیداوار ہے، نہ کہ اس کے برعکس، ہیگل کے نظریہ کے جو تصور کو کائنات کی بنیادی حقیقت قرار دیتا تھا، بالکل برعکس مارکسیت کا نظریہ یہ ہے، کہ اصلی اور حقیقی وجود صرف مادہ کا ہے، اور مادہ ہی کے درجہ بدرجہ ارتقا سے کائنات

کے جملہ مظاہر کی توجیہ کیجا سکتی ہے نفس انسانی، اس کا شعور اور اس کے تصورات یہ سب درحقیقت مادّہ کی پیداوار ہیں ہنین کتا ہے، کہ طبیعات میں جو جدید انکشافات عمل میں آئے ہیں، اُن سے مادّیت کے اس بنیادی تصور کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا ہے، کہ مادّہ کا وجود ہمارے ذہن، اور ہمارے وقوف (cognition) پر منحصر نہیں ہے، بلکہ ایک معروضی حقیقت ہے (objective reality) جو اپنی ذات سے موجود ہے، اور ہمارے ذہن و شعور کی کسی طرح محتاج نہیں ہے، یہی معروضی حقیقت ہمارے تمام علم و ادراک کا سرچشمہ ہے، بالفاظ دیگر انسانی علم و وقوف اشیاے مادی کے محتاج ہیں، کیونکہ یہی اشیا، حواس انسانی کو متاثر کرکے اس کے تجربات کا ذخیرہ بہم پہنچاتی ہیں، اور تجربہ و مشاہدہ علم انسانی کی بنیاد ہے، اس طرح مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کو بالکل الٹ دیا، ہیگل کا دعویٰ یہ تھا کہ اصلی وجود صرف تصورات کا ہے، اور اشیاے مادی ان تصورات کا خارجی عکس ہیں، مارکسیت کا نظریہ یہ ہے، کہ فطرت (Nature) یا مادّہ ازلی ہے، اور ذہن و شعور ثانوی حیثیت رکھتا ہے، مادہ نے حیات کی صورت اختیار کی، حیات سے احساس پیدا ہوا، اور احساس سے ذہن، اس کی توثیق علم الارض (Geology) کی تحقیقات سے ہوتی ہے جنھون نے بقول مادیین یہ ثابت کر دیا ہے کہ کرۂ ارضی انسان سے قبل وجود میں آیا ہے، چنانچہ انجلیس لکھتا ہے،

"یہ مادی دنیا جس کا ادراک ہم اپنے حواس سے کرتے ہیں، یہی اور صرف یہی حقیقی ہے، ہمارا شعور اور ہماری فکر خواہ وہ ہمارے حواس و مدرکات سے بالاتر کیون نہ معلوم ہون، اسی مادی جسم اور اس کے اعضا کی پیداوار ہین، مادہ ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ ذہن مادّہ کی پیداوار ہے"

مارکسیت اور نظریۂ ارتقاء مارکسیت ڈارون اور اس کے جانشینون کے مرتب کردہ نظریۂ ارتقاء کو تسلیم کرتی ہے اور واقعات عالم کی توجیہ کے لئے اسی نظریہ کو استعمال کرتی ہے لیکن وہ ارتقا کے قدیم ڈارونی نظریہ کے ایک پہلو کو نہیں مانتی، ڈارون اور اس کے ہم خیال سائنسدانون کا دعویٰ

کہ فطرت مین جملہ ارتقائی تغیرات تدریجاً عمل میں آتے ہین، اور فطرت کا تسلسل کہین نہین ٹوٹتا ہے،
یہ نہیں ہوتا ہے کہ فطرت مین کوئی تغیر اچانک واقع ہو جائے، مارکسیت اس کے برعکس فطرت مین
اچانک تغیرات کی قائل ہے، یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، کہ فطرت تدریج و تسلسل سے کام لینے کے
بجائے ایک جست لگاکر آگے بڑھ جاتی ہے، اور کسی ایسی شے یا ذی حیات ہستی کو وجود مین لے آتی ہے
جو اشکال و صفات کے لحاظ سے اپنے پیشرو دوّن سے بالکل جداگانہ ہو، چنانچہ پالکھانور Pal
(Khanov) لکھتا ہے،

"بہت سے لوگ جدلیات کو نظریۂ ارتقاء کے مترادف قرار دیتے ہین، بیشک جدلیات بھی
ارتقاء کا ایک نظریہ ہے لیکن اس مین اور عام نظریۂ ارتقاء مین ایک بنیادی فرق ہے، قدیم نظریۂ
ارتقاء اس یقین پر مبنی ہے، کہ نہ تو فطرت مین اور نہ انسانی تاریخ مین کوئی تغیر اچانک واقع ہو سکتا ہے
کیونکہ دنیا مین تمام تغیرات تدریجاً عمل مین آتے ہین ہیگل نے پہلے ہی بتادیا تھا، کہ اس مفہوم مین
نظریۂ ارتقاء بالکل مہمل ہے"،

درحقیقت مارکسیت کا ارتقائی نظریہ لائڈ مارگن (Lloyd Morgan) کے جدید
نظریۂ ارتقاء سے بہت قریب تر ہے جس کو نظریہ بروز (Emergence Theory) کہا جاتا ہے
بروز کا نظریۂ ارتقاء ان مشاہدات پر مبنی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ عالم انسانی اور عالم فطرت
دونون مین ایسے نئے صفات اور خواص کا ظہور ہوتا ہے، جو بالکل غیر متوقع ہوتے ہین، اور سابقہ
حالات سے ان صفات و خواص کا وہم و گمان بھی نہین کیا جاسکتا ہے، مثلاً دو رنگون کے امتزاج
سے ایک نیا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، جو بلحاظ صفات اپنے عناصر ترکیبی سے بالکل جدا ہوتا ہے یا
ہائڈروجن اور آکسیجن کے تناسب امتزاج سے پانی وجود مین آجاتا ہے، جو ان دونون سے بالکل
مختلف خواص رکھتا ہے، اگر کوئی شخص ہائڈروجن اور آکسیجن کے خواص کا مطالعہ کرے تو وہ

یہ پیشین گوئی کبھی نہیں کرسکتا کہ ان کے امتزاج سے کوئی ایسی شے وجود میں آسکتی ہے، جیسے پانی، کیونکہ پانی کے خواص ہائڈروجن اور آکسیجن کی کسی خاصیت سے نہیں ملتے، مارکسیت انسانی نفس و شعور کی توجیہ اسی طرح کرتی ہے، اس کا دعویٰ ہے، کہ انسانی تغیرات اور اس کا شعور انھیں مادی وجسمانی اعضاء کی کی ترکیب سے وجود میں آیا ہے، لیکن جس طرح پانی ہائڈروجن اور آکسیجن سے بلحاظ خواص بالکل مختلف ہے، اسی طرح انسان کا ذہن اس کے جسم سے باعتبار صفات بالکل جداگانہ ہے، یعنی اجزائے جسم کی ترکیب سے ایک اعلیٰ تر شے وجود میں آگئی جو بالکل نئی ہے، اور جس کی کوئی پیشین گوئی اس کے عناصر ترکیبی کو دیکھ کر نہیں کی جاسکتی تھی، اسی طرح ذہن مادہ ہی کی پیداوار ہے، نہ یہ کہ مادہ ذہن کی پیداوار ہے، جیسا کہ ہیگل اور جرمن عین پرستوں کا خیال ہے،

مارکسیت اور دائمی صداقتیں مارکسیت کسی دائمی صداقت کو نہیں مانتی ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ تاریخ اور فطرت کے جملہ مظاہر، تغیر اور نشوونما، اور ترقی کے آثار و مشاہدات سے معمور ہیں، اس لئے اس دائرہ میں کوئی صداقت دائمی نہیں ہوسکتی، ہوانجلس کہتا ہے،

"جہاں تک انسانی تاریخ کا تعلق ہے، دائمی صداقتیں صرف اس قسم کی مہملیات ہوسکتی ہیں، جیسے تمام انسان فانی ہیں، یا انسانیت اب تک ہمیشہ حاکم و محکوم طبقات میں منقسم رہی ہے، یا یہ کہ نپولین نے ۵ رمئی ۱۸۲۱ء میں انتقال کیا"

پھر بھی مارکسیت اس بات کو تسلیم کرتی ہے، کہ ایسے اصول ہوسکتے ہیں، جو تاریخ کے کسی مخصوص دور میں انسان کی رہبری کا کام دیں لیکن یہ دور ایک متعین زمانہ کے بعد ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر وہ اصول کام میں نہیں آسکتے، کیونکہ معاشرتی حالات بدل جانے کے بعد ان اصولوں میں صداقت نہیں رہتی ہے، مارکسیت انسانی فکر کی محدودیت کو تسلیم کرتی ہے، اور اسی محدودیت کے باعث انسان سے جو خطائیں اور لغزشیں سرزد ہوتی ہیں، وہ انسان کی آیندہ ذہنی ترقی اور صداقت فکر کی کامیاب

تلاش کے لئے ضروری قرار دیتی ہے، چنانچہ اینگلس اس کے بارے میں لکھتا ہے،

انسانی فکر کی سیادت اور مطلقیت منفرد اشخاص کی محدود اور غیر مطلق فکر کے ذریعہ قائم ہوتی ہے،

وہ علم جو غیر مشروط یعنی مطلق صداقت کا حامل ہو خطاؤں اور لغزشوں کے ایک طویل سلسلہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اس کے حصول کے لئے نوع انسانی کی حیات کا لامتناہی ہونا ضروری ہے، یہاں بھی یہی ایک عجیب تضاد نظر آتا ہے، وہ یہ کہ انسانی فکر اپنے منتہا، اور قابلیت کمال کے لحاظ سے تو مطلق ہے، لیکن اس کا اظہار بہر حال اشخاص ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، جن کی پرواز فکر تنگ اور محدود ہے، یہ تضاد اس وقت حل ہو سکتا ہے، جب نسل انسانی کا سلسلہ لامتناہی ہو، اس لحاظ سے انسانی فکر کی سیادت اور غیر محدودیت ایک حقیقت ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اپنے منصب اپنے میلان ارتقاء اور اپنی تاریخی غایت کے لحاظ سے تو وہ یقیناً ایک بالاتر اور غیر محدود حقیقت ہے لیکن جب اس کا ظہور انسان کی انفرادی ذات میں ہوتا ہے، تو وہ محدود ہو جاتی ہے، اسی طرح کسی مخصوص تاریخی دور میں اس کا مجموعی ظہور محدودیت سے پاک نہیں ہو سکتا، یہی حال ابدی صداقتوں کا بھی ہے، اگر انسان کبھی اس منزل ترقی تک پہنچ جائے، جہاں وہ صرف ابدی صداقتوں کے ذریعہ دنیا کا کام انجام دے سکے، یعنی ایسے نتائج فکر کے ذریعہ جو غیر مشروط اور مطلق صداقت کے حامل ہوں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ انسان لامتناہی سلسلہ کی انتہاء کو پہنچ گیا، اور عالم حقیقی کے کل محدود امکانات بروئے کار آچکے"،

مارکسیت اور وحی و الہام | مارکسیت انسان کے خارجی تجربات کو اس کے تمام علمی تصورات کا ماخذ قرار دیتی ہے، اس لئے وہ انسانی حواس و مدرکات کے سوا اور کسی ذریعہ علم کو حقیقی نہیں تسلیم کرتی ہے، پروفیسر داس گپتا، اپنی کتاب (Materialism, Marxism, Determinism and Dialectics)

مین لکھتے ہین :-

"علم کا سارا مواد ہمین عالم مادی کے تجربات سے حاصل ہو سکتا ہے، مختلف تجربات کے باہمی تعامل سے نئے افکار و تصورات پیدا ہو سکتے ہین، جن کا ممکن ہے ہمارے خارجی مدرکات سے کوئی تعلق معلوم نہ ہو، لیکن اگر ان افکار و تصورات کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کیجائے، تو معلوم ہوگا، کہ ہمارے سابقہ تجربات ہی مین سے کوئی نہ کوئی تجربہ ان کا ماخذ و سرچشمہ ہے، الہام ربانی، فکر خالص اور وجدان علم کے ذرائع نہین ہو سکتے، یہ محض افسانے ہین، درحقیقت انسان کے تجربات جن کا کبھی وہ شعور رکھتا ہے، اور کبھی نہین رکھتا، لیکن اپنی زندگی کے ہر لمحہ مین حاصل کرتا رہتا ہے، اس کے تمام تصورات و نظریات کا مواد ہین، جب وہ انھین عملی دنیا مین آزما لیتا ہے، تو یہی تصورات و نظریات علمی حقائق بن جاتے ہین، ایک سائنسدان یا فلسفی اپنے علمی نظریات ان تجربات پر قائم کرتا ہے، جن کا وہ غیر شعوری طور پر حامل ہوتا ہے لیکن جس چیز کو الہام ربانی کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہین کہ کسی لطیف اور حساس ذہن مین اس کے غیر شعوری تجربات جگہ پا لیتے ہین، اور کسی تخلیقی مدعا کے حصول مین اس کی رہنمائی کرتے ہین، جب کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کوئی تصور خالص کسی تخلیقی عمل یا سائنٹفک انکشاف کا سبب ہی تو ہوتا یہ ہے کہ خارجی تجربات کا کوئی ذخیرہ کسی ذہین شخص کی بالغ نظر اور اعلیٰ صلاحیتِ فکر کے ساتھ مل کر ایک نئی صورت مین ظاہر ہوتا ہے"

مارکسیت اور خارجی ماحول مارکسیت کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ ہر مادی واقعہ اور ہر فکری فلسفہ کو ان حالات کی روشنی مین سمجھنا چاہئے، جن مین وہ وجود پذیر ہوا ہو، کسی واقعہ یا نظریہ کی صداقت کو اس کے خارجی احوال سے جدا کر کے سمجھنے کی کوشش کرنا اصولاً غلط ہے، اور یہ کوشش کبھی کامیاب نہین ہو سکتی، کیونکہ عالم ایک سلسلۂ واقعات ہے، جس مین ہر واقعہ دوسرے واقعہ کے ساتھ علت و

معلول کے رشتہ سے جڑا ہوا ہے، لیکن اگر ایک طرف مارکس ماحول کی تخلیقی قوت پر زور دیتا ہے تو
دوسری جانب وہ یہ نظریہ بھی پیش کرتا ہے، کہ انسان اپنے ماحول مین تبدیلی کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے
چنانچہ پالکھانوز (Pakhanzo) لکھتا ہے،

"مارکس کو اپنے مادہ پرست پیشروؤں سے یہ شکایت تھی، کہ انھون نے اس امر کو نظر انداز کر دیا
کہ اگر ایک طرف آدمی اپنے ماحول کا مخلوق ہے، تو دوسری طرف ماحول خود اس کی کوششون سے
تبدیل ہو سکتا ہے، مارکس کے نظریہ کے مطابق تاریخی واقعات کی دنیا مین مادیت کا کام یہ ہے
کہ وہ اس امر کی تشریح کرے، کہ کس طرح ماحول ان ہی انسانون کے ہاتھون تبدیل ہوتا ہے
جو اس کی پیداوار ہین"،

ماحول کے تغیرات مین انسان جو حصہ لیتا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے اینجلس نے لکھا ہے:-

"طبعی علوم اور فلسفہ نے اس پہلو پر کبھی غور نہین کیا، کہ انسان کے مشاغل اور اس کے اعمال
اس کی قوتِ فکر اور طرزِ خیال پر ضرور اثر انداز ہوتے ہین، یہ علوم انسان کو ایک طرف رکھتے ہین، اور
فطرت کو دوسری طرف، لیکن فطرت مین جو تبدیلیان انسان خود اپنی سرگرمیون سے پیدا کرتا ہے، وہی
انسانی فکر کی لازمی اور حقیقی بنیاد ہین، چنانچہ جس قدر انسان نے خارجی فطرت کو تبدیل کرنے مین
کامیابی حاصل کی، اسی قدر اس کی عقلی قوت مین ترقی ہوئی، تاریخ کا طبعیاتی تصور جو ڈریپر
(Draper) اور دوسرے طبعی سائنسدانون (Natural Scientists)
کی تحریرون مین ملتا ہے، اور جس کی رو سے تنہا خارجی فطرت انسان پر عمل کرتی ہے، اور صرف
طبعی حالات انسانی تاریخ کی تشکیل کرتے ہین، بالکلیہ یکطرفہ ہے، اس تصور مین یہ امر فراموش کر دیا
گیا ہے، کہ انسان بھی فطرت پر عمل کر سکتا ہے، اس پر اثر ڈال سکتا ہے، اور اسے تبدیل کرکے زندگی
کے نئے حالات پیدا کر سکتا ہے،

مارکسیت اور تاریخی حوادث | تاریخی حالات و واقعات کے متعلق مارکسیت کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی واقعہ بلا وجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے پیشرو واقعات کا نتیجہ یا معلول ہوتا ہے، اس طرح انسانی تاریخ میں علت و معلول کا قانون اسی طرح کارفرما ہے جس طرح خارجی فطرت میں اسی لئے تاریخی واقعات میں ایک خاص ترتیب نظر آتی ہے، لیکن تاریخ انسانی اور فطرت خارجی کے واقعات میں فرق یہ ہے کہ فطرت میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ بے شعوری کی حالت میں ہوتا ہے یعنی اشیاء خارجی غیر شعوری طور پر ایک فطری قانون کی پابند ہیں، اور ان میں جو تبدیلیاں اور ترقیاں نظر آتی ہیں، اُن میں اُن کے ارادہ و اختیار اور شعور کو دخل نہیں، اس کے برخلاف انسان جو کچھ کرتا ہے، سمجھ بوجھ کر کرتا ہے، اور تاریخ انسانی کے تغیرات انسانی شعور و ارادہ کے ماتحت ہوتے ہیں، پھر بھی انسانی تاریخ میں اضطرار بے شعوری اور عدم اختیار کا ایک عنصر ضرور موجود ہے، جس کے متعلق اینجلس لکھتا ہے

"ایک لحاظ سے انسانی معاشرہ کے ارتقاء کی تاریخ ارتقاء فطرت سے بالکل جدا ہے، فطرت پر انسان جو اثر ڈالتا ہے، اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے، تو اس میں صرف کورانہ قوتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور ان قوتوں کے تعامل سے عام قوانین، فطرت اپنا کام کرتے رہتے ہیں فطرت میں جتنے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، خواہ وہ ان بے شمار حوادث کی شکل میں ظہور پذیر ہوں، جن کا مشاہدہ اشیائے فطرت کے سطحی تغیرات میں کیا جاتا ہے، یا ان کے نتائج ہوں، جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان حوادث کی تہ میں ایک باقاعدگی اور تسلسل موجود ہے، ان میں کوئی واقعہ بھی کسی ارادی کوشش یا شعوری مقصد کے تحت پیش نہیں آتا ہے لیکن انسانی معاشرہ کی تاریخ میں جتنی قوتیں کام کرتی ہیں، وہ سب اپنے مقصد کا پورا پورا شعور رکھتی ہیں کیونکہ انسان ہمیشہ سوچ سمجھ کر کسی مقصد کے تحت عمل کرتا ہے، کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا ہے جس کی پشت پر کوئی شعوری مقصد نہ ہو، لیکن اس بنیادی فرق کے باوجود یہ بھی

ایک حقیقت ہے کہ عمومی باطنی قوانین (General Laws) تاریخ کی تشکیل کرتے ہین، کیونکہ یہان افراد کے شعوری مقاصد کے باوجود مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے، تو اتفاقات حوادث انسانی تاریخ پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہین جس چیز کے لئے ارادی طور پر کوشش کی جاتی ہو، وہ بہت کم واقع ہوتی ہے، بیشتر صورتون مین مختلف افراد جماعتون کے ارادی اور شعوری مقاصد ایک دوسرے سے متصادم ہوجاتے ہین، یا خود وہ مقاصد اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے ناممکن الحصول ہوتے ہین، اور ایسا بھی ہوتا ہے، کہ مقاصد تو قابلِ حصول ہوتے ہین، مگر اُن کے حصول کے ذرائع ناکافی ہوتے ہین، اس طرح مختلف منفرد اشخاص وجماعات کے ارادون اور کوششون مین تصادم واقع ہوتا ہے، جس سے انسانی تاریخ مین بھی وہی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جو بے شعور فطرت مین ہے، انسانی اعمال وافعال کے مقاصد تو ارادی اور شعوری ہوتے ہین، مگر ان کے نتائج وہ نہین ہوتے ہین جن کی خواہش کیجاتی ہے، یا جن کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہے، بلکہ اعمالِ انسانی اکثر اوقات ایسے نتائج پر منتہی ہوتے ہین، جو پیشِ نظر مقصد یا متوقعہ نتائج کے خلاف ہوتے ہین، اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تاریخی واقعات مین بھی اتفاقات وحوادث کی حکمرانی ہے، لیکن خواہ سطح پر اتفاقات حکمران نظر آئین، واقعہ یہ ہے، کہ تاریخ انسانی چند قوانین مستورہ کے مطابق حرکت کرتی ہے، اب یہ کام انسان کا ہے، کہ وہ ان قوانین کا انکشاف کرے،

کیا فکری غیر جانبداری اور بے لاگ ذہن کا وجود ممکن ہو؟

مارکسیت بڑے شد و مد سے اس خیال کی تردید کرتی ہے، کہ انسان کسی معاملہ مین بالکل غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر اختیار کرسکتا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ فکر کا کامل توازن غیر ممکن ہے، چنانچہ پروفیسر داس گپتا اپنی کتاب (Materialism Marxism, Determinism and Dialectics) مین لکھتے ہین،

"بے لاگ فکر کا قدیم نظریہ اور یہ خیال کہ انسان ذہن خالص کے ذریعہ کسی شے کی تحقیق وجستجو

کرسکتا ہے، بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر تحقیق و جستجو میں محقق اور جستجو کنندہ ایک متاثرہ ذہن کے ساتھ کام شروع کرتا ہے، یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے :-

ہیزن برگ (Heisenberg) نے اپنے اصول لاتعین[1] (Principle of indeterminacy) میں ثابت کر دیا ہے، کہ تفتیش و تحقیق کے عمل میں مفتش کا ملاً غیر جانبدار نہیں رہ سکتا ہے، بلکہ اس کا ذہنی نقطۂ نظر اپنا اثر ضرور رکھتا ہے، اس حقیقت سے فرار غیر ممکن ہے، جوہری عالم (atomic world) میں تحقیق اور محقق کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ممکن ہے، کہ معاشرتی علوم میں صحیح نہو لیکن یہ یقینی ہے کہ مفتش عمل تفتیش پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے، لیکن اس تداخل ذات کے معنی یہ نہیں کہ مفتش اپنے ذاتی میلان یا پہلے سے قائم کردہ نظریات کے مطابق کام کرنا شروع کرے، بلکہ اس سے مراد مفتش کی علمی اور ثقافتی روایات ہیں، جس میں وہ پرورش پاتا ہے،

(باقی)

---

[1] سائنسدانوں نے مادہ کے حقیر ترین ذرات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نظریہ پیش کیا، کہ جوہر (Atom) منفی و مثبت برقیوں پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں الکٹروں (Electron) اور پروٹان (Proton) کہا جاتا ہے، الکٹرون پروٹون کے اطراف گردش کرتے ہیں، ہیزن برگ نے یہ معلوم کیا، الکٹرون کی گردش کا کوئی اصول نہیں ہوتا ہے، یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ الکٹرون اپنی گردش میں کیا راستہ اختیار کریں گے، ہر الکٹرون چند معینہ دائروں (orbits) پر گردش کرتا ہے لیکن ہیزن برگ نے بتایا کہ اکثر اوقات الکٹرون ایک دائرہ سے نکلنے کے بعد بیچ کے دائروں کو چھوڑ کر اگلے دائرہ میں گردش کرنے لگتا ہے، اس طرح الکٹرون کی حرکت اور گردش کے متعلق کوئی اصول نہیں بنایا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، یہی اصول لاتعین ہے،

اردو زبان کا غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی ادب

از

جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"اردو کے عام اور مشترک زبان ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے تمام فرقون اور اہلِ مذاہب نے اسی کو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی مذہبی و اخلاقی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا اس مین اپنی مذہبی کتابون کے ترجمے کئے، اور مذہب و اخلاق کے ہر پہلو پر بہ کثرت کتابین لکھین، بودھ، عیسائی، جین، سناتن دھرم، آریہ، سکھ وغیرہ کوئی ایسا فرقہ نہین ہے جس کی مذہبی و اخلاقی کتابین اردو مین موجود نہ ہون ہمارے پرانے رفیق مولوی محمد عزیز صاحب نے اس موضوع پر مذکورۂ بالا عنوان سے ڈاکٹریٹ کے لئے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا ایک ٹکڑا ہمارے پاس اشاعت کے لئے بھیجا ہے یہ مقالہ اردو کے مشترک اور عام مقبول زبان ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے، اور اس لائق ہے کہ اردو کے مخالفین اس کو غور سے پڑھین اور دیکھین کہ خود ہندوستان کے مذاہب اپنی تبلیغ مین کہان تک اردو کے رہین منت ہین اور اُن کا کتنا لٹریچر اردو مین موجود ہے،" م

ہندوستان مین مسلمانون کی آمد سے سیکڑون برس پہلے اس ملک سے عربون کے تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے، وہ ہندوستان کی پیداوار مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے رہے، اور وہان کا سامان، ہندوستان، جزائر ہند، چین، اور جاپان تک لیجاتے تھے، عربون کے علاوہ ہندوستان

اور مغربی ممالک کی تجارت مین ایرانیون نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی، ساتوین صدی عیسوی کے شروع مین جب مسلمانون نے ایران فتح کیا، تو مسلمان تاجر ایران کی بحری تجارت پر بھی قابض ہوگئے، اور عرب جہازرانون کے بیڑے بحر ہند مین روان نظر آنے لگے،

ہندوستان مین مسلمانون کے آنے کی ابتدا محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے خیال کیجاتی ہے، جو پہلی صدی ہجری کے آخر مین ہوئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند مین مسلمانون کی نوآبادیان قائم ہوئین، اور سب سے پہلے وہ تاجرانہ حیثیت سے جنوبی ہند کے جزائر، اور بعض ساحلی مقامات پر آکر آباد ہوئے، سندھ پر حملہ کے مختلف اسباب تھے، ان مین سے ایک خاص سبب خود اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہو کہ جنوبی ہند کے اطراف مین مسلمان پہلے سے آباد تھے، پہلی صدی ہجری کے آخر مین حجاج عراق کا گورنر تھا، اور جزائر ہند کی طرف عراق کی بندرگاہ سے جہاز آتے تھے، لنکا کے راجہ نے مسلمانون سے اظہارِ دوستی کے طور پر منجملہ دوسرے تحائف کے ایک جہاز مین اُن مسلمانون کے اہل و عیال کو بھی عراق روانہ کیا، جو لنکا مین تجارت کے سلسلہ سے آباد تھے، اور وہین انتقال کر گئے تھے، اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ لنکا مین مسلمانون کی آبادی پہلی صدی ہجری مین قائم ہو چکی تھی، جس جہاز پر یہ تحائف اور مسلمانون کی عورتین اور بچے جا رہے تھے، اس پر سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب بحری ڈاکوؤن نے حملہ کر کے تمام سامان اور اُن عورتون اور بچون پر قبضہ کر لیا، حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے سندھ کے راجہ داہر سے ان گرفتارون کو بحفاظت عراق بھجوا دینے کا مطالبہ کیا، مگر راجہ نے یہ عذر کیا کہ ڈاکوؤن پر میرا کچھ زور نہین، حجاج نے اس عذر کو قبول نہ کیا، اور اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی سرکردگی مین ایک فوج سندھ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی، جس نے ۹۳ھ مین سندھ پہنچ کر تین برس کے عرصہ مین ملتان سے کچھ تک اور دوسری طرف مالوہ کی سرحد تک قبضہ کر لیا،

لنکا مین مسلمانون کی آمد کا سلسلہ تجارت کے علاوہ ایک مذہبی عقیدت کی بنا پر بھی شروع ہوا،

وہان کے ایک پہاڑ پر ایک نشانِ قدم تھا، جسے مسلمان حضرت آدم علیہ السلام کے قدم کا نشان سمجھتے تھے، اور اُس کی زیارت کو آیا کرتے تھے، انہی کے ذریعہ سے لنکا کے راجہ کو اسلام کا حال معلوم ہوا، اور فرشتہ کی روایت کے مطابق وہ ۲۰۰ھ ہجری یعنی ساتوین صدی عیسوی ہی مین مسلمان ہوگیا، بزرگ بن شہریار نے بھی اپنی کتاب عجائب الہند مین جو ۳۰۰ھ کے قریب کی تصنیف ہے، مسلمانون کے ساتھ لنکا والون کے محبت اور میلان رکھنے کا ذکر کیا ہے،[۴]

ان اطراف مین مسلمانون کا دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا، مالدیپ کے مفصل حالات ابن بطوطہ نے لکھے ہین، اُس کے زمانہ یعنی سلطان محمد تغلق کے عہد مین پورا جزیرہ مسلمان تھا، اور اس مین عربون اور دیسی مسلمانون کی آبادی تھی، اور سلطان خدیجہ نام ایک بنگالی خاتون وہان کی فرمانروا تھی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہان کے لوگ پہلے بت پرست تھے، لیکن مراکو کے ایک شیخ ابو البرکات بربری مغربی کی ایک کرامت دیکھ کر راجہ شنورزاہ اور اُس کی تمام رعایا مسلمان ہوگئی، وہ لکھتا ہے کہ مالدیپ کی اس مسجد کی محراب پر جسے نومسلم راجا نے تعمیر کرایا تھا مین نے یہ کتبہ دیکھا:-

"سلطان احمد شنورازہ ابو البرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا،"[۵]

قریب قریب اسی زمانہ مین مسلمانون کی ایک جماعت نے عرب سے آکر ملیبار کے ساحل پر بود و باش اختیار کی، رونلڈسن (RONALDSON) تحفۃ المجاہدین کے دیباچہ مین لکھتا ہے کہ "مسلم عرب ساحل ملیبار پر اوّل اوّل ساتوین صدی عیسوی کے آخر کے قریب آباد ہوئے" اسٹروک (STURROCK) کا بیان ہو کہ "یہ بخوبی معلوم ہو کہ ساتوین صدی کے بعد سے ایرانی اور عرب تاجر ہندوستان کی مختلف بندرگاہون مین کثرت سے آباد ہوگئے، اور اس علاقہ کی عورتون سے شادی کر لی، اور یہ آبادیان خصوصیت کے ساتھ ملیبار مین بڑھی، اور اہم مقین، جہان بہت قدیم زمانہ سے

---

[۴] عرب و ہند کے تعلقات :- از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۲۶۲ [۵] ایضاً ص ۶۵-۲۶۴

یہ پالیسی نظر آتی ہے، کہ بندرگاہوں مین تاجرون کی ہر طرح حوصلہ افزائی کیجائے"[1] ملیبار مین مسلمانون کی آمد اور اشاعت اسلام کے تفصیلی حالات شیخ زین الدین نے اپنی مشہور کتاب تحفۃ المجاہدین[2] مین لکھے ہین، جو ملیبار کے مسلمانون کی سب سے قدیم تاریخ ہے، وہان کے راجہ چیرامن پیرومال کے قبول اسلام کا واقعہ جس طرح اس کتاب مین بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے روایتی حیثیت رکھتا ہو، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے "ملیبار مین چیرامن پیرومال کا خاندان نوین صدی عیسوی کے شروع ہی مین اُس کے آخری فرمانروا کی تخت سے دست برداری کے ساتھ ختم ہو گیا تھا، جو غالبًا مسلمان ہو گیا تھا، چنانچہ راجہ کے مسلمان ہونے کی یادگار ملیبار مین اب تک اس طرح منائی جاتی ہے، کہ تخت نشینی کے وقت ٹرانکور کے راجہ زمورن (سامری) کو مسلمانون کا سا لباس پہنایا جاتا ہے، اور ایک مسلمان ماپلا اُس کے سر پر تاج رکھتا ہے، پھر راجہ کو تلوار ہاتھ مین لے کر یہ کہنا پڑتا ہے، کہ "مین یہ تلوار اس وقت تک رکھونگا، جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ہے، واپس نہین آتا"، کہا جاتا ہے کہ زمورن اُس راجہ کا جو عرب چلا گیا تھا، نائب ہے، ان مراسم کے بعد راجہ ذات باہر سمجھا جاتا ہے، اور نائر یا اعلیٰ طبقہ کے ہندو اُسے ہاتھ نہین لگاتے،

مسلمانون نے شروع ہی سے ملیبار مین ہر دلعزیزی اور اہمیت حاصل کر لی تھی، وہ ماپلا کے نام سے پکارے جاتے تھے، جس کے معنی ہین بزرگ کا بچہ یا دولھا، یہ لقب ملیبار مین عیسائیون کو بھی دیا گیا تھا، مگر دونون فرقون مین امتیاز کی غرض سے عیسائیون کو نصرانی ماپلا کہتے تھے، مسلمانون کو اور مراعات بھی حاصل تھین، مثلاً ایک مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بیٹھ سکتا تھا، حالانکہ ایک نائر کو اس کی اجازت نہ تھی، اسی طرح ماپلا کے سردار تھنگل کو زمورن (سامری) کے ساتھ ساتھ پالکی مین جانے

---

[1] ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر (انگریزی) از ڈاکٹر تاراچند مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد، ص ۳۲،

[2] "تحفۃ المجاہدین" مترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڈھ،

کی اجازت تھی، زمورن کی سرپرستی میں عرب تاجرون کی ایک بڑی تعداد اوس کے علاقون مین آباد ہوگئی، اور انھون نے اپنی تجارت سے نہ صرف ملک کی دولت مین بہت کچھ اضافہ کیا بلکہ راجہ کی فوجی مہمون مین بھی اس کی مدد کی، زمورن مسلمانون کی نسبت ایسی اچھی رائے رکھتا تھا کہ اوس نے اپنی ہندو رعایا مین اسلام پھیلانے کی حوصلہ افزائی کی، اور چونکہ ہندو جہازرانی سے مذہبًا اجتناب کرتے تھے، یہ حکم دیا کہ ماہی گیرون کے ہر خاندان مین سے کم سے کم ایک لڑکے کو مسلمانون کی سی تعلیم و تربیت دیجائے تاکہ عرب جہازرانون کے لئے جن پر وہ اپنی جارحانہ مہمون مین بھروسا کرتا تھا، سپاہی تیار ہوسکین، ان مراعات اور حوصلہ افزائیون کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا اثر روز بروز بڑھتا گیا، اور مسلمان بڑی تعداد مین جنوبی ہند مین آباد ہوگئے۔

مغربی ساحل کی طرح مشرقی ساحل پر بھی عربون کی آمد و رفت تجارت کے سلسلہ سے زمانۂ قبل اسلام سے تھی، عرب تاجر چین جاتے ہوئے خلیج بنگال سے گذرتے تھے، مسلمان عربون نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور ساحلی مقامات پر اُن کی آبادیان بڑھتی گئین، تجارتی جہاز اس کثرت سے یہان سے آتے جاتے تھے، کہ عربون نے اس ساحل کا نام ہی معبر (گذرگاہ) رکھدیا، ملیبار کی طرح معبر کے مسلمانون کو بھی مقامی راجاؤن کی طرف سے ہر قسم کی رعایتین ملین، اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے،

مسلمانون اور ہندو راجاؤن کے تعلقات کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۷۱۰ھ (۱۳۱۰ء) مین جب سلطان علاؤالدین کی فوج نے کارومنڈل پر حملہ کیا، تو اس کے راجہ کی طرف سے مسلمان عراقیون اور مسلمان عربون نے مسلمان ترکون کا مقابلہ کیا اور گو راجہ کو شکست ہوئی، اور ملک کافور نے ملک پر قبضہ کرلیا، لیکن کارومنڈل کے مسلمان اپنے عہد و پیمان کی بنا پر اور رعایتون کی حق شناسی مین جو انھین راجہ کی طرف سے حاصل تھین، مسلمان حملہ آورون سے نہایت جانبازی کے ساتھ لڑنے

اور امیر خسرو کی روایت کے مطابق محض کلمہ اور قرآن پڑھ کر اور اس طرح اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیکر ملک کافور کے شدید انتقام سے اپنی جان بچا سکے[۱]،

چودھوین صدی عیسوی میں ملک کافور کے حملہ کے بعد جب ابن بطوطہ نے معبر کا سفر کیا، تو جس علاقہ مین اب میسور کی ریاست ہے، وہان اس وقت ہوسیالا خاندان کی حکومت تھی، اور پایۂ تخت کا نام دوار سمندر تھا، حکمران راجہ بلال دیو تھا، ابن بطوطہ نے اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے، جس مین بیس ہزار کے قریب مسلمان تھے[۲]،

ڈاکٹر تاراچند اپنے ایک مقالہ مین لکھتے ہین :۔

ان بیانات سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ ظہور اسلام کے تھوڑے ہی دنون بعد مسلمانون نے ہندوستان مین اپنی تہذیب، مذہب اور خیالات کے پھیلانے کا موقع حاصل کر لیا، ساتوین صدی سے تیرھوین صدی تک ان کا تعلق تجارت کی صورت مین تھا، اور سوداگرون کی حیثیت سے شروع مین اُن کی آؤ بھگت ہوئی، جب ہندو راجہ اُن سے واقف ہوگئے، تو اُن کی وقعت اور بھی بڑھ گئی، وہ بڑے بڑے عہدون پر مقرر ہوئے، اُن مین سے وزیر، بیڑون کے کمانڈر، ایلچی، افسران محاصل اور فوج کے کپتان وغیرہ مقرر ہونے لگے، اُن کو اپنے مذہب کی پابندی کے لئے مسجدین بنانے، اور اپنے مذہبی پیشواؤن، اور فقیرون کو خانقاہون مین رکھنے کی اجازت تھی، صرف یہی نہین، بلکہ وہ کھلم کھلا اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے تھے، اور کہین کہین تو راجہ خود اس تبلیغ مین مدد کرتے تھے اور صرف جنوبی ہند تک اس پُرامن اثر کے حدود نہ تھے، بلکہ شمالی ہندوستان مین بھی مسلمانون کا ہندوؤن سے بہت دنون تک اسی طرح کا تعلق رہا، یہ سچ ہے کہ آٹھوین صدی کے اوائل مین عربون نے سندھ پر قبضہ کر لیا، لیکن ملتان اور سندھ کو چھوڑ کر اور کوئی حصہ تین سو برس تک اُن کے قبضہ مین نہین آیا،[۳]

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات ص ۵۰۰، ۲۰۴ [۲] ایضاً ص ۲۰۰ [۳] مسلمانون کا ہندوستان مین آنا، از ڈاکٹر تاراچند (مطبوعہ رسالہ ہندستانی جولائی ۱۹۳۱ء)

گجرات کاٹھیاواڑ، کچھ، اور کوکن کا علاقہ عربون کا پانچوان تجارتی مرکز تھا، ان علاقون مین بھی مسلمان بڑی تعداد مین آباد ہوگئے تھے، اور انھون نے اتنی عزت اور اہمیت حاصل کرلی تھی، کہ اُن کے باہمی معاملات کو طے کرنے کے لئے راجہ انہی مین سے کسی معززآدمی کو ..... ہنرمند مقرر کردیتا تھا ہنرمند کے لفظی معنی تو ہنروالے کے ہین لیکن اصطلاح مین اُس مسلمان قاضی کو کہتے تھے، جو راجہ کی طرف سے مسلمانون کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا، چنانچہ مختلف بڑے بڑے شہرون مین ہنرمند مقرر تھے، عرب سوداگرون نے اکثر یہین کی عورتون سے نکاح کرلیا تھا، اُن سے جو اولاد ہوتی تھی اُن کو "بیسر" (بیاسرہ جمع) کہتے تھے،

شمالی ہند مین مسلمانون کا قدم سب سے پہلے سندھ مین آیا، جیساکہ شروع مین بیان ہوا، محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری کے آخر مین دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کرلیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس حملہ سے پہلے ہی، پانچ سو عرب مسلمانون کی ایک جماعت مکران سے بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کے یہان چلی آئی تھی، اور لنکا کے مسلمان تاجرون کی یتیم لڑکیون کے علاوہ ان پناہ گزینون کو واپس نہ کرنا بھی منجملہ ان اسباب کے تھا، جو حجاج کی اس انتقامی مہم کا باعث ہوئی، بہرحال عربون نے سندھ اور ملتان پر قبضہ کرکے ان ریاستون کو اسلامی سلطنت کا باج گذار علاقہ بنالیا، لیکن یہان اُن کا بڑھتا ہوا قدم رک گیا اور آیندہ تین صدیون تک اُن کی حکومت ہندوستان کے اسی گوشہ تک محدود رہی،

مسلمانون نے ہندوستان مین آکر اس ملک کو اپنا وطن بنالیا، جنوبی ہند مین تو اُن کی آمد تاجرانہ تھی، لیکن شمالی ہند مین بھی جہان وہ فاتحانہ حیثیت سے آئے تھے، فاتح اور مفتوح کی مغائرت صرف تھوڑے دنون تک قائم رہی، اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونون ہمسایون کی طرح رہنے لگے، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے لگے، ایک جگہ رہنے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دونون ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوئے، اور اس طرح ایک نئی تہذیب وجود مین آئی، جس کو ہندوستانی

تہذیب کہہ سکتے ہین، جو نہ خالص اسلامی تھی، نہ بالکل ہندو، اس مشترک تہذیب کے ظہور مین آنے کی خاص وجہ یہ تھی، کہ ہندوستان کے مسلمانون کی ایک بڑی تعداد نومسلمون کی تھی، انھون نے باہر سے آنے والون کا مذہب تو اختیار کر لیا تھا، مگر تہذیب و تمدن مین بہت کچھ اپنی قدیم روایات کے پابند تھے، یہ اشتراک تہذیب کے مختلف پہلوؤن مین نمودار ہوتا گیا، چنانچہ مذہب، ادب، علوم و فنون، تعمیر و موسیقی، ہر ایک مین ملکی و غیر ملکی عناصر کا امتزاج عمل مین آنے لگا، جنوب مین اسلامی تعلیمات سے جو اثر براہ راست پڑا، اس کے علاوہ ایک بالواسطہ اثر ہندوؤن پر یہ بھی ہوا کہ اُن کے دلون مین مذہبی احساس از سر نو پیدا ہوگیا، اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی ہند مین بھگتی کی تحریک جسے رامانج نے تکمیل کو پہنچایا اور ویدانت کی تحریک جو شنکراچاریہ کے ہاتھون پایۂ کمال کو پہنچی، ایک حد تک اُس عام مذہبی بیداری کا نتیجہ تھی، جو اسلام کے اثر سے پیدا ہوگئی تھی، چودھوین صدی عیسوی کے بعد مہاراشٹر، گجرات، پنجاب اور بنگال کے مصلحین مذہب اپنے چند قدیم عقائد کو ترک کر کے اسلام کی بعض تعلیمات قبول کر لیتے ہین اور اس طرح دونون مذہبون کی آمیزش سے ایک نیا مذہب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہین، چنانچہ کبیر داس اور گرو نانک کی تعلیمات مین اسلامی تعلیمات کا اثر صاف ظاہر ہے،

ایسی ہی تبدیلی ادب کے میدان مین نظر آتی ہے، ہندوستان کا علمی سرمایہ عوام کی ضروریات کے لئے سنسکرت سے منتقل ہو کر ہندی، مرہٹی، اور بنگالی مین آجاتا ہے، اور ہندو اور مسلمان دونون ان زبانون کے ادب کو فروغ دینے مین حصہ لیتے ہین، علم و ادب کا یہی اشتراک ایک نئی زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنجاتا ہے، مسلمان اپنی عربی، فارسی، اور ترکی چھوڑ کر اس ملک کے باشندون کی زبان اختیار کر لیتے ہین، اور اس طرح ایک مشترک زبان وجود مین آتی ہے، یہ زبان ہندو مسلمانون کے صدیون کے میل جول کا نتیجہ تھی، دونون نے اس کو اپنا مشترک سرمایہ سمجھا اور اسے ترقی دینے مین یکسان کوشش کرتے رہے،

مسلمانون نے جب ہندوستان مین قدم رکھا، تو یہ ملک سیکڑون چھوٹی چھوٹی مملکتون اور ریاستون مین بٹا ہوا تھا، جو باہم برسرپیکار رہا کرتی تھین، زبان کے لحاظ سے بھی تفرقی وانتشار کا یہی عالم تھا، ہر ریاست کی زبان الگ تھی، اور لڑائیون مین کسی ریاست کے حدود کے بڑھنے یا گھٹنے کے ساتھ اُس کی زبان کا دائرہ بھی بڑا یا چھوٹا ہوتا رہتا تھا مسلمانون کی آمد سے جس طرح اس ملک مین سیاسی وحدت پیدا ہوئی، اسی طرح لسانی وحدت کا سامان بھی فراہم ہوا، یہان مسلمان بادشاہون کی دفتری زبان تو فارسی تھی، لیکن عام بول چال کے لئے جسے ہندو مسلمان دونون سمجھتے، یہ زبان کام نہین دے سکتی تھی، اور نہ یہ ممکن تھا، کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو تمام ملک مین جاری کر دیا جائے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ مین گئے، وہان کی زبان اختیار کرکے مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور علمی ضرورتون سے اپنی زبان کے سیکڑون الفاظ اس مین داخل کر دیئے، اور چونکہ یہ الفاظ ضرورت کی بنا پر داخل کئے گئے تھے، اس لئے اس زبان کا جزو بن کر مقبول عام ہو گئے، اس طرح ایک مخلوط زبان کا ہیکلہ تیار ہوا، جو سندھ مین سندھی، گجرات مین گجراتی، دکن مین دکنی، پنجاب مین پنجابی، اور دہلی مین دہلوی کہلائی، دہلی کی یہی زبان اپنے ارتقاء کی منزلین طے کرتی ہوئی جب شاہجہان کے اردوے معلی مین پہونچی تو زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی، موجودہ اردو دراصل دہلی اور اطراف دہلی کی پرانی ہندی ہے، جس مین زمانہ کے تقاضے سے تبدیلیان رونما ہوتی گئین، اور جو عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی شکل مین ظاہر ہوئی، اس زبان کے فعل اور حرف سب دہلوی ہندی کے ہین، اسمار مین البتہ نصف دہلوی ہندی کے ہین، اور باقی عربی، فارسی، اور ترکی ہین، یا کچھ پرتگالی، اور انگریزی الفاظ ہین یہ بیرونی اسمار وہ ہین جن کے مسمی اکثر باہر سے آئے تھے مسلمانون نے جو الفاظ اور مصطلحات صوبون کی زبانون مین داخل کئے، اُن کی ایک طویل اور دلچسپ فہرست مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تحقیقی مقالہ "ہندوستان مین ہندوستانی" مین دی ہے[۱]

[۱] مطبوعہ نقوش سلیمانی" ص ۲۶-۳۰۰،

اس مشترک زبان کی تشکیل میں مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے بڑا حصہ لیا، وہ مسلمان تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، اور اُن کی روحانی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات سے کم وسیع نہ تھا، جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں، "اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا، تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادہ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا" صوفیہ چونکہ انسان کے باطن سے سروکار رکھتے ہیں، اور تزکیہ نفس ہی اُن کی سرگرمیوں کا مقصود ہوتا ہے، اس لئے ان کے دروازے کافر و مومن دونوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں، انسانی ہمدردی خلوص و محبت اُن کے اصلی جوہر ہیں، اور یہی چیزیں اُن کی روحانی فتوحات کی ضامن ہوتی ہیں، ہندوستان میں جو درویش آئے اُن کا حلقہ اثر بھی انہی چیزوں کی وجہ سے روز بروز زیادہ وسیع ہوتا گیا، اُن کا سابقہ چونکہ بیشتر عوام سے تھا، اس لئے دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لئے ہم زبانی ضروری تھی، چنانچہ اپنے خیالات کی تلقین کے لئے وہ ملک کے جس حصہ میں پہنچے وہاں کی زبان اختیار کر لی، اور عوام کو اُنہی کی زبان میں تعلیم دی، لیکن چونکہ بعض مذہبی اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر تھا، اور یہ عربی یا فارسی میں ہوتی تھیں، اس لئے عربی اور فارسی الفاظ بھی ان بولیوں میں قدرتی طور پر شامل ہوگئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" اور مولوی عبد الحق صاحب نے اپنے رسالہ "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں دکھایا ہے کہ اس مشترک زبان کے پیدا کرنے میں حضرات صوفیہ کا حصّہ کتنا زیادہ ہے، اب تک اس مخلوط زبان کے جتنے قدیم فقرے ملے ہیں، یا جو قدیم کتابیں دستیاب ہوئی ہیں، خواہ دکھنی زبان میں ہوں یا گجراتی میں سب حضرات صوفیہ کے ملفوظات یا انہی کی تصنیفات ہیں،

یہ خیال صحیح نہیں کہ ہندوستان کی یہ مشترک زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے، اس زبان کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی اس نظریہ کی تردید کے لئے کافی ہے، غیر مسلموں بالخصوص

ہندوؤن نے اس زبان کی تشکیل، ترقی، اور اشاعت مین جتنا زیادہ حصہ لیا ہے، اس کا بیان ایک مستقل تالیف چاہتا ہے، پیشِ نظر مقالہ مین صرف ان کتابون کا ذکر کیا گیا ہے، جو غیر مسلمون نے اپنے مذاہب اور مذہبی اخلاق سے متعلق اردو مین لکھ کر شائع کی ہین، ایسی کتابون کی تعداد کئی سو ہے، انڈیا آفس کے کیٹلاگ مین جس میں صرف انیسوین صدی کے آخر تک کی کتابین درج ہین، ان کی تعداد (۱۲۷) ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانون کی فہرستون میں بھی ایسی کتابون کی کثیر تعداد ملتی ہے، مجھے پٹنہ، صوبہ جات متحدہ، دہلی اور لاہور کے پندرہ سولہ کتب خانون کی سیر مین اردو کی کم و بیش چار سو غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی کتابون کے دیکھنے، اور اُن کی یادداشتین قلمبند کرنے کا موقع ملا، ان مین سے بعض کے اقتباسات اس مقالہ مین درج کئے گئے ہین، ان اقتباسات سے مختلف غیر اسلامی مذاہب کی تعلیمات بھی معلوم ہوتی ہین، اور اس مشترک زبان کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہین، جو اس ملک کے رہنے والون کے صدیون کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، اگر یہ زبان صرف مسلمانون کی ہوتی، تو غیر مسلم خصوصاً ہندو اپنی مذہبی کتابیں اس کثرت سے اس مین کیون شائع کرتے، ہندو، عیسائی، سکھ، جین اور بہائی مذہب، اور ہندوؤن کے متعدد اصلاحی فرقے مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، دیو سماج، رادھا سوامی مت، تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ، ان سب کا اپنے مذہب و اخلاق کی نہ صرف مستند اور چوٹی کی کتابون کو اردو مین ترجمہ کرکے شائع کرنا، بلکہ سیکڑون چھوٹی بڑی کتابون کو ترجمہ اور تالیف کرکے اردو کے ذریعہ عوام تک پہنچانا اس حقیقت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہو کہ یہ مشترک زبان ہندوستان کے بڑے حصہ کی عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے، غیر اسلامی مذاہب کی یہ سیکڑون کتابین اردو مین اُن لوگون کے لئے نہین شائع کی گئی ہین، جو نہ ان مذاہب سے تعلق رکھتے ہین، اور نہ اُردو جن کی مادری زبان ہے، اس زبان کے ہندوستان کی عام زبان ہونے کا اعتراف خود ہندوؤن کی مذہبی کتابون کے بعض مصنفین نے بھی کیا ہے، مثلاً لالہ لاجپت رائے

مشہور آریہ لیڈر، اپنی کتاب "مہاراج سری کرشن، اور اُن کی تعلیم" (مطبوعہ ہندوستانی برقی پریس لاہور سنہ ۱۹۰۰ء) کے دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"اُردو حقیقت مین ہندوستانیون کی زبان کا نام ہے، بلکہ اکثر موقعون پر اُردو اور ہندوستانی ایک ہی معنون مین مستعمل ہوتے ہین"،

پنڈت جینشور پرشاد مائل دہلوی نے "حُسنِ اوّل"[۱] کے نام سے ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے، جس مین جین، بودھ، اور ہندو مذہب کے فلسفہ، اخلاق، ادب اور علوم وفنون کا گلدستہ نہایت پاکیزہ زبان مین پیش کیا ہے، اُس کے دیباچہ مین فرماتے ہین :-

"جب سے سرکار انگلشیہ کی حکومت ہم پر ہوئی، اور عدالتی دفاتر کی زبان اردو ٹھہری تو اس کی کچھ قدر ہوئی، لوگون کے شوق اور خیالات نئے نئے پہلو بدلنے لگے، رفتہ رفتہ تہذیب پھیلی، اور ہماری رفتار و گفتار کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف نے بھی انگریزیت کا جامہ پہننا شروع کیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ مین وہ نمایان ترقی کر لی کہ آج اُردو زبان بچے سے جوان ہوگئی، اگرچہ اردو کا جنم خاص دلّی مین ہوا، اور اوس نے اسی خطہ مین پرورش پائی، مگر تھوڑی سی مدت مین اتنی بڑھی چڑھی کہ تمام ہندوستان کی زبان یہی ہوگئی، بلکہ اردو سے ہندوستانی زبان کہلانے لگی،........ مین اگرچہ ناثر نہین ہون، ناظم نہین ہون، انگریزی مجھے بالکل نہین آتی، دنیا کی اور بہت سی زبانون سے بے بہرہ ہون، علوم فنون مین بھی کچھ دستگاہ نہین رکھتا، سنسکرت اور فارسی مین بھی اپنے آپ کو کسی قابل نہین سمجھتا، ہان اردو میری مادری زبان ہے، اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک سعادتمند اولاد کی طرح میرا فرض ہے، لہذا باینہمہ یہ جرات کرتا ہون، اور

---

[۱] مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد،

چاہتا ہون کہ پرانے رشیون اور مہاتماؤن کے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر لاؤن، اُن سے

اردو کا ایوان سجاؤن، اب اس مین برکت دینا اور میری محنت کو ٹھکانے لگانا اسی کا کام ہے"

ورنہ من آنم کہ من دانم،

کسے بخاک فگند و کسے نواخت مرا بقدرِ ہمتِ خود ہر کسے شناخت مرا"

یہ صحیح ہے کہ ہندوؤن کی مذہبی کتابون مین جو اردو مین لکھی گئی ہین، سنسکرت اصطلاحات بھی بکثرت ملتی ہین، یہ بالکل ایک فطری امر ہے، جس طرح مسلمان صوفیہ کو اپنی تعلیم کی اشاعت کے لئے دیسی بولیون مین عربی اور فارسی کی مصطلحات ضرورۃً داخل کرنی پڑین، اُسی طرح ہندوؤن نے بھی جب اپنے مذہب و اخلاق کا خزانہ اس ملکی زبان (اردو) مین منتقل کرنا شروع کیا تو اُن کو بھی سنسکرت مصطلحات کے استعمال کے بغیر چارہ نہ تھا، لالہ لاجپت رائے نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب کے دیباچہ مین اس مجبوری کو بہت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہین :-

"اصل تو یہ ہے کہ ہندو خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے ہندی الفاظ کا استعمال لازمی ہے، (دیکھو مولانا مولوی الطاف حسین حالی کی مناجاتِ بیوہ) بلکہ بعض استاد تو اصل اردو اُسی کو کہتے ہین، جس مین فارسی و اردو کے الفاظ نہایت کم ہون، یا بالکل نہ ہون، اردو مین سے فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائین، تو خالص ہندی رہ جاتی ہے، صرف اتنا فرق ہے، کہ جو الفاظ ہندی کے معمولی طور پر مستعمل نہین وہ مسلمان صاحبان کو برے معلوم ہوتے ہین، اور وہ اُن کو اردو نہین کہتے، مگر جو لفظ معمولی طور پر مستعمل ہین، وہ اُن کو اردو سمجھتے ہین بہرحال جو ہندو اپنے ہم قوم بھائیون کے لئے ایسی کتابین لکھتے ہین، جن مین اُن کے مذہبی یا قومی خیالات یا حالات کا تذکرہ ہوتا ہے، اُن مین ہندی یا سنسکرت کے الفاظ بیجا یا نامناسب نہین، کس طرح سے ممکن ہے کہ کوئی ہندو ہندوؤن کے لئے کتاب لکھتا ہوا

کرشن و ارجن و یدھشٹر کی تقریروں کا ترجمہ اُردوے مُعلّی مین کرے، اور خاص مُشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ تلاش کرے، ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے، فارسی وعربی کے لفظون کا استعمال تو بہت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے، پس وجوہاتِ بالا سے ہمارے خیال مین ہماری زبان پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، وہ ہمارے نزدیک کچھ بہت منزلت نہین رکھتا، ......"

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے مذہبی یا قومی خیالات یا حالات کے تذکرہ کی غرض سے ہندوؤن نے "اپنے ہم قوم بھائیون کے لئے" اسی مشترک زبان مین کتابین لکھی ہین، گو ان کتابون کی عبارتون مین ہندی یا سنسکرت کے جو الفاظ آئے ہین، وہ "بیجا یا نامناسب نہین" البتہ لالہ لاجپت رائے کا یہ ارشاد کہ "کس طرح ممکن ہے، کہ کوئی ہندو ہندوؤن کے لئے کتاب لکھتا ہو اور کرشن وارجن و یدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ اردوے معلّٰی مین کرے اور خاص مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ تلاش کرے" نیز یہ کہ "ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے فارسی وعربی کے لفظون کا استعمال تو بہت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے" محلِ نظر ہے بعض ہندو مترجمین نے کرشن ارجن اور یدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ بھی اردوے معلّٰی مین کیا ہے، مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ بھی تلاش کی ہے، اور ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے فارسی وعربی الفاظ بھی استعمال کئے ہین، جو ذرا بھی بُرے نہین معلوم ہوتے، چند مثالین ملاحظہ ہون :-

شریمد بھگوت گیتا کا سب سے قدیم ترجمہ جو مجھے دستیاب ہوا، منشی کنھیا لال عرف الکھ دھاری کا ہے، اس اردو ترجمہ کا نام گیان پرکاش ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۶۳ء مین گیان پریس آگرہ مین چھپا تھا، اس مین سے چوتھی ادھیاے کے چند اشلوک حسب ذیل ہین :-

سری کرشن کہتے ہین :- "اے ارجن کرم جوگ یعنی تہذیب اخلاق عمدہ چیز ہے، اور یہی

لازوال ہے، مین نے سب سے پہلے یہ علم آفتاب کو سکھایا تھا، اور آفتاب نے بیوست مُن کو اور اس نے
اچھواک کو، اس علم کے جاننے سے راجے فضیلت پاتے ہین، کیونکہ درویش صفت ہو جاتے ہین
لیکن انقلاب سے زمانہ کے یہ علم معدوم ہو گیا ہے، یہ جوگ قدیم اور نہایت شریف ہے، تجھے اپنا
عزیز سمجھ کے بتاتا ہون"، ارجن نے کہا:- اے کرشن تم اب پیدا ہوئے ہو اور آفتاب مدت مدید کا،
پس مین کیونکر باور کرون کہ تم نے یہ علم آفتاب کو سکھایا"، کرشن نے جواب دیا:- اے ارجن مین
اور تو قدیم ہین لیکن اس کی حقیقت تو نہین جانتا ہے، مین جانتا ہون، مین وہ ہون جس کا نہ کوئی
باپ ہے، اور نہ کوئی بیٹا، اور صاحب تمام عالم کا ہے، مگر طبیعت سے تناسخ مین پھنسا ہون،
جب اخلاقِ حمیدہ گم ہو جاتے ہین، اور شر و فساد زیادہ ہو جاتا ہے تو اعتدال دینے کو ایک
صورت پیدا ہوتی ہے، مین وہ صورت ہون واسطے مدد دینے نیکون کے اور استیصال بدون
کے اور قائم کرنے بنیاد عقل کے اور اکھاڑنے دیوار ظلم کے مین پیدا ہوا ہون، تاکہ آیندہ کوئی
اپنی حد سے باہر پاؤن نہ دھرے، اور افراط و تفریط ہونے نہ پاوے،....." (ص ۷۰-۵۰)

پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی نے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ فلسفۂ الوہیت کے نام سے کیا ہے،
اس کے پہلے ادھیا مین ارجن کی تقریر جو اس نے کروکشیتر کے میدان مین کرشن کے سامنے
کی تھی، اس طرح نقل کی ہے :-

"ارجن نے باپ دادا، گرو، ماموں، بھائی، بیٹے، پوتے، دوست، خسر اور پیارون کو جو
طرفین کی فوج مین اس موقع پر موجود تھے، دیکھا، اور ان سب یگانون کو موجود دیکھ کر وہ
پسر کنتی اُن کی غایت الفت کے سبب غمگین ہو کر کہنے لگا، اے کرشن ان اقربا کو جو جنگ پر
آمادہ ہین، دیکھ کر میرے عضو سُست ہوئے جاتے ہین، منہ خشک ہوتا ہے، بدن کانپتا
اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہین، کمان ہاتھ سے گری پڑتی ہے، خون جوش کھاتا ہے، کھڑا

نہین رہا جاتا، اور دل بے قرار ہے، کرشن مجھے آثار مخالفت نظر آتے ہین، اور یگانون کو جنگ مین مار کر کوئی فائدہ نہین دیکھتا، کرشن مین فتح سلطنت اور عیش و آرام کی تمنا نہین دیکھتا، اے گوبند ہمارے نزدیک سلطنت، لذاتِ دنیا، اور حیات ہیچ ہین، جن کے لئے ہم نے سلطنت اور عیش و آرام چاہا تھا، وہ تو جان اور مال سے ہاتھ دھوکر اس معرکہ جنگ مین کھڑے ہین، یہان پر گرو، باپ بیٹے اور دادا، ماموں خسر، پوتے، سالے اور قرابت مند موجود ہین، اے کرشن! ہر چند وہ مجھے قتل کر ڈالین، مین روے زمین کے بلکہ ترلوکی کے راج کی طمع سے بھی ان کا قتل روا نہین رکھتا، دھرت راشٹر کی اولاد کو مار کر ہمین راحت تو کیا حاصل ہوگی، ان بدکردارون کو مار کر ہم بھی آلودہ گناہ ہون گے، پس ہم کو دھرت راشٹر کی اولاد کو جو اپنے عزیز ہین، قتل کرنا لازم نہین...

.... اگر

مقابلہ کئے بغیر مجھ نہتے کو دھرت راشٹر کے بیٹے جن کے ہاتھون مین ہتھیار موجود ہین، مار ڈالین، تو میرے حق مین خوب ہو، یہ کہکر ارجن نے تیر اور کمان ڈال دئیے، اور وہ رنج سے پریشان ہوکر میدانِ جنگ مین رتھ کے اندر بیٹھ گیا" (ص ۳۲، ۳۷)

دوسری ادھیا مین سری کرشن کی تقریر ہے، جو انھون نے ارجن کے جواب مین کی :-

"اے ارجن، تجھ کو یہ بے دلی میدانِ جنگ مین کہان سے پیدا ہوئی، جو کہ بزرگون کی شان سے بعید اور باعثِ بدنامی ہے، اور جس کا انجام اچھا نہین، ارجن، مخنث کا طریقہ اختیار نہ کر کہ یہ امر تیرے لئے زیبا نہین ہے، اے فاتح دشمنان، پست ہمتی، اور بزدلی کو چھوڑ کر کھڑا ہو" (ص ۳۸ - ۳۹)

بھگوت گیتا کے انیس ترجمے نظم و نثر مین ہندوؤن کے کئے ہوئے مین نے دیکھے ہین،

ان میں سے دو ایک کا اقتباس نمونۃً اور پیش کرتا ہوں "غذائے روح" کے نام سے پنڈت بر بھو دیال مصر عاشق لکھنوی نے جو منظوم ترجمہ کیا ہے، اس میں ارجن کے اس سوال کا،

کرم یوگی کون ہو تبلائیے اے خوش خصال
اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسا ہو کیسی بول چال

سری کرشن یہ جواب دیتے ہیں :-

جو دکھی دکھ سے نہ ہو، سکھ سے نہ ہو جس کو خوشی
جس نے چھوڑا خوف و غصہ چاہ، عارف ہو وہی

جس کو ساری باتیں اچھی یا بری ہیں ایک سی
جو برائی یا بھلائی سے نہ ہو نالاں نہ شاد

جس کو حاصل ہو گئی، اس دہر میں اتنی سمجھ
چاہئے کہنا اُسے یکسوئی سے ہے بامراد

جس طرح لیتا ہے کچھوا اپنے اعضا کو سکوڑ
پھر کیسوئی یونہی منہ نفس سے لیتے ہیں موڑ

ہو گیا پرماتما کا گیان جس کو دہر میں
اس کی فکر و نفس دونوں خود ہی زائل ہو گئے

خواہشوں کو زیر کرنے کی اگر کوشش کریں
تو بھی جبراً مضطرب کرتی ہیں دل کو خواہشیں

اس لئے قابو میں رکھنا خواہشوں کو لازمی
ہو گئیں گر خواہشیں قابو میں یکسوئی ہوئی[1]

"نسیم عرفان[2]" کے عنوان سے گیتا کا ایک اور منظوم ترجمہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے کیا ہے، اس کی زبان اپنی روانی صفائی اور فصاحت کے لحاظ سے قابلِ داد ہے، ملاحظہ ہو،

ساتواں ادھیائے

علم معرفت یعنی گیان وگیان کی تعلیم

بھگوان ہیں محو خوش بیانی
فرماتے ہیں آپ گل فشانی

اے پارتھ، دل اپنا مجھ کو دیکر
زیر دامن پناہ لے کر

شغل پیہم سے جوگ کے پاک
تم جیسے کر وگے مجھ کو ادراک

---

[1] مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء ص ۴۰ [2] مطبوعہ کاروینشن پرنٹنگ ورکس دہلی،

اب حال سنو بغور اس کا | کیا ڈھنگ ہے کیا ہے طور اس کا
وہ راز نہاں عیاں کروں گا | تفصیل اس کی بیان کروں گا
علم مطلق ہے علم جس کا | امرِ برحق ہے علم جس کا
واقف اس سے بشر جو ہو جائے | اک بار اُس پر نظر جو جائے
پھر کوئی نہیں ہے امر ایسا | رہ جائے جو آگہی سے تشنا
ہونے کو تو لاتعد بشر ہیں، | ایسے انسان کم مگر ہیں،
ہے کسب کمال کام جن کا | ہے شغل یہی مدام جن کا
دُھن کے پکے جو مردِ شاغل | کر لیتے ہیں منزلت یہ حاصل
اُن میں بھی ہیں ایسے چند انسان | جن کو مراد واقعی ہے عرفان
مٹی اور اُس کے بعد پانی | پھر آگ کا پردۂ نہانی
عالم بعد اُس کے ہے ہوا کا | پھر کرّۂ محیط ہے خلا کا
پھر ہیں دل و عقل سلسلہ وار | اُن کے آگے ہے سترِ پندار
ہیں یہ آٹھوں صفات میری | محجوب ہے اُن سے ذاتِ میری
ارجن جو کرو گے ان پہ تم غور | ادنیٰ انھیں پاؤگے بہر طور
پر میری صفت اک اور بھی ہے | حاصل جسے خاص برتری ہے
بالا تر ہے مقام جس کا | مشہور ہے روح نام جس کا
جو وجہِ قیامِ دو جہاں ہے | جو اصلِ نظامِ دو جہاں ہے
یہ امر ہے جاننے کے قابل | یہ بات ہے ماننے کے قابل
ہوتی ہیں جب صفات یکجا | پڑتی ہے بنائے نظمِ دنیا

ہون یہ ہر وقت برسر کار　　ہستی ہے تمام اسی سے بیدار

امکان مجھی سے ہے بقا کا　　مین ہی مختار ہون فنا کا

یہ امر ہے سلسلہ شدہ دمنجھ　　مجھ سے بڑھ کر نہین کوئی شے

کچھ بھی میرے سوا نہین ہے　　مین ایک ہون دوسرا نہین ہے

جس طرح سے ہار مین گندھے ہون　　موتی اک تار مین گندھے ہون

اسباب جہان ہین نظم مجھ مین　　یہ کون و مکان ہین نظم مجھ مین

خورشید مین نور ماہ مین تاب　　ہون اے ارجن مین لذت آب

ہون زیدہ روزگار مین ہی　　ویدون مین ہون اونکار[1] مین ہی

مین ہی آواز ہون خلا مین　　میرا ہی ظہور ہے صدا مین

مردون مین ہون مردمی کا جوہر　　تابندہ مجھی سے ہے یہ گوہر (۸، ۷-۸)

(باقی)

[1] اسم اعظم

میری محسن کتابین

دوسرے دور کے رسالہ الندوہ نے ملک کے مشاہیر اصحاب علم و کمال سے ان کتابون کے نام دریافت کئے تھے، جن کا ان کی ذہنی تعمیر اور تشکیل سیرت مین خاص حصہ رہا ہے، اس کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، وہ الندوہ مین میری محسن کتابون کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، اور بعد مین ان کو کتابی صورت مین شائع کر دیا گیا تھا، اس مین نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولینا عبید اللہ سندھی وغیرہ ہندستان کے بہت سے اکابر اور اصحاب علم کے مضامین ہین جن سے عربی، فارسی اور انگریزی کی بہت سی اہم کتابون کی خصوصیات اور متفرق معلومات حاصل ہوتی ہین، قیمت عہ، [illegible]

منیجر

برمک اور پرمکھ

از

سید سلیمان ندوی

پچھلے معارف مین البرامکہ کے مصنف مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم کی وفات کا حال لکھا ہوا اس سلسلہ مین خیال آیا، کہ "عرب وہند کے تعلقات" مین مین نے برمکی خاندان کو مذہبًا بودھ اور اُن کے لقب برمک کو سنسکرت سے ماخوذ اوران کے عبادتگاہ نوبہار کو مجوسی معبد کے بجائے بودھ خانقاہ ثابت کیا تھا، جس کی اصل "نوا ویہار" ہے، مرحوم نے البرامکہ کے اخیر اڈیشن مین جو اضافے کئے ہین، اُن کا اچھا خاصہ حصہ میرے ان تینون نظریون کی تردید مین ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ اُن کی ان تازہ تحقیقات پر تنقید کرون، مگر ردّ و قدح سے دل کو اب اتنا بعد ہوگیا ہے، کہ جی نہ چاہا، دار المصنفین کے بعض رفیقون سے خواہش کی، کہ وہ اس کا جواب دین، مگر وہ پرایا بوجھ کیون اپنے سر اُٹھاتے،

ان تینون دعوون کے جو دلائل میری کتاب مین ہین، وہ اب بھی بالکل اپنی جگہ پر قائم ہین، مرحوم نے جو کچھ اُن کے رد مین لکھا ہے، وہ تمامتر مزعومات ہین، چنانچہ اس وقت ایک خاص تعلق سے اس فرسودہ موضوع پر چند سطرون کے لکھنے کا خیال آیا،

۱- **برمک**: اس لفظ کو مین نے سنسکرت بتایا تھا جس کے معنی رئیس کے ہین لیکن اس لفظ کی پوری توجیہ نہین کی تھی، میرے فاضل عزیز مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی نے جب میری اس کتاب کو پڑھا، تو چونکہ وہ گجرات مین کافی رہ چکے ہین اور اب بھی وہی ہین ان کی نظر اس لفظ کی اصلیت پر

فوراً پڑ گئی، اور پنسل سے اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ اصل لفظ پُرمکھ ہے، یہ نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے، اب ایک لائق شاستری سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ پُرمکھ پَر اور مکھ سے بنا ہے، مکھ کے معنی مُنہ کے ہیں، اور پر ایک سابقہ ہے، جو بعض لفظوں کے شروع میں بڑھا دیتے ہیں، جس سے معنی میں تغیر ہو جاتا ہے، مکھ کے پہلے پَر لگانے سے صدر اور رئیس کے معنی ہوں گے، چنانچہ ہندوستانی ریاستوں کی جو نئی تنظیم ہوئی ہے، اس سلسلہ میں گجرات اور بھرت پور کی متحدہ ریاستوں کا صدر اعلیٰ کا نام بھی پَرمکھ رکھا گیا ہے،

۲- نوبہار کا نوا دیہار ہونا تو اتنا کھلا ہے، کہ اس پر کچھ دوبارہ لکھنا تحصیل حاصل ہے، نوبہار کو فارسی موسم بہار سے منسوب کرنا، سراسر لفظ پر کھیلنا ہے، اور فیلالوجی کا مذاق اڑانا ہے،

۳- اس دعویٰ کے ثبوت میں کہ نوبہار بودھ معبد تھا مجوسی نہیں، میری کتاب میں بہت سے دلائل ہیں، مرحوم مؤلف البرامکہ نے اُن کے مقابلہ میں اپنے سابقہ دعویٰ کے اعادہ میں کہ یہ مجوسی معبد تھا، اپنی کتاب کے نئے اڈیشن میں بہت سی تاریخی عبارتیں نقل کی ہیں، جو خود میری کتاب میں ہیں، لیکن اس طول نضول سے کوئی فائدہ نہیں، صرف یہ دیکھنا کافی تھا، کہ ان تاریخی وجغرافی کتابوں میں اس معبد کے اندر آگ کا ہونا مذکور ہے، یا مورتوں کا، اگر اس کے اندر آگ کا ثبوت ہے تو وہ بے شبہہ آتشکدہ تھا، اور اگر مورتوں کا ذکر ہو تو وہ بودھ کا معبد تھا، بس اتنی سی بات پر سارا فیصلہ ہے، جن صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تا وہ میرے اور ان کے دلائل پر غور کریں، حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی،

تصوّفِ اسلام

(طبع جدید)

مُدیر صدق مولانا دریابادی کی مشہور کتاب تصوّفِ اسلام کا نیا اڈیشن تیار ہو گیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ صحیح اسلامی تصوّف کیا ہے، اور اس میں اور موجودہ رواجی تصوّف میں کتنا فرق ہے، اس نئے اڈیشن کے لئے پوری کتاب کے مضامین پر نظر کر کے کتاب کو بالکل نئی حیثیت دیدی گئی ہے قیمت :- عہ "مینجر"

ادبیات

گاندھی

از جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

وہ حدیثِ روح پیامِ جاں، جسے ہم نے سن کے بھلا دیا ۔۔۔ وہ حریمِ غیب کا ارمغاں، جسے پاکے ہم نے گنوا دیا

وہی ملک و ملتِ جاں بلب، جسے اس نے آبِ بقا دیا ۔۔۔ اسی ناسپاس نے ہائے اب اسی جامِ مرگ پلا دیا

ہمیں جس نے فتح دلائی تھی اسی خاک و خون میں ملا دیا ۔۔۔ ہمیں جس نے راہ دکھائی تھی، اسے راستے سے ہٹا دیا

اسے اتباعِ مسیح نے وہ عجیب دستِ شفا دیا ۔۔۔ جو گرے تھے ان کو اٹھا دیا، جو مرے تھے ان کو جلا دیا

جو اٹھا تھا شعلۂ شور و شر اسے اپنے خون سے بجھا دیا ۔۔۔ جو پڑا تھا پردہ نگاہوں پر اسے آپ اٹھ کے اٹھا دیا

وہ خمیدہ قد خمِ ماہِ نو وہ نظر فروز خنک سی ضو ۔۔۔ وہ نگاہِ برقِ عمل کی رو کہ دلوں کو جس نے ہلا دیا

وہ فروغ بخشِ ہر انجمن کہ زمانے بھر میں تھا ضو فگن ۔۔۔ وہ چراغِ بزمِ گہِ وطن، کسی تیرہ دل نے بجھا دیا

وہ کتابِ صلح کا سرورق کہ مٹائی کشمکشِ فرق ۔۔۔ وہ قتیلِ خنجرِ صبر و حق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بدھ اور کرشن کا جانشیں ہمہ تن عمل ہمہ تن یقیں ۔۔۔ وہ تبسمِ سحر آفریں کہ چمن لبوں سے کھلا دیا

وہ برنگِ آئینہ صاف دل، وہ فروغِ فطرتِ آب و گل ۔۔۔ کہ جمادِ نفس نے مستقل اسے اور حسن جلا دیا

وہ جلالِ شیوۂ سادگی، وہ جمالِ صورتِ زندگی ۔۔۔ وہ زلالِ چشمۂ آگہی کہ زمانے بھر کو جگا دیا

وہ شرارہ برقِ حیات کا، وہ ستارہ راہِ نجات کا ۔۔۔ وہ منارہ عزم و ثبات کا جسے فتنہ ساز نے ڈھا دیا

اثر اس کا اب ہے وسیع تر کہ ہر ایک دل میں ہے اس کا گھر ۔۔۔ یہ سمجھ کے خوش نہ ہوں فتنہ گر کہ اسے پیامِ فنا دیا

تری شان کون گھٹا سکے اسے خود خدا نے بڑھا دیا ۔۔۔ کہ تجھے بقائے دوام دی، تجھے منصبِ شہدا دیا

تری خامشی وہ زبان تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا | تنِ فاقہ کش میں وہ جان تھی کہ حصارِ کبر ہلا دیا
وطنِ عزیز کو شان دی اُسے قیدِ غم سے چھڑا دیا | رہ اتحاد میں جان دی جو کہا وہ کرکے دکھا دیا
جنھیں زیر کر نہ سکا ستم، ہوے صید سلسلۂ کرم | تری نیکیوں نے تری قسم سرِ خود سری کو جھکا دیا
یہ عروسِ کشورِ ہند تھی، ہمہ بیکسی ہمہ بیدلی | اسے تو نے غازۂ خرمی، تری خون نے رنگِ حنا دیا
تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ تری کرم امان ملی | تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا
یہ کمالِ پیرویِ علی، یہ فراخ حوصلگی تری | کہ خود اپنے دشمنِ جان کو بھی دہی ارمغان وفا دیا
تجھے بیکسی نے سپاہ دی تجھے مشکلات نے راہ دی | تجھے بلبلوں نے پناہ دی، تجھے غنچوں نے مزا دیا
یہی دھرم ہے یہی اصلِ دین کہ ہو قول سچ تو عمل حسین | حق و اہلِ حق پہ رہے یقین یہ پیام سب کو سنا دیا
ہمہ روشنی تری ذات تھی، ہمہ سوز تیری حیات تھی | تری روح شمع تھی گل ہوئی ترے تن کو پھول بنا دیا
ترا فیض دہر میں عام ہو، یہ غبار اٹھ کے غمام ہو | تری خاک تیرا پیام ہو، یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا

خود آگہی

از جناب اکرام لدھیانوی

گذر گئے جو خرد سے وہی ہیں فرزانے! | یقین کے راز کو عقل و شعور کیا جانے
کسے خبر کہ وہ کیا تھا جمالِ آتشناک | سلگ رہے ہیں ابھی تک دلوں کے کاشانے
ہر ایک رنگ سے خالی ہے جلوہ گاہِ وجود! | تری نظر نے تراشے ہیں یہ صنم خانے!
یہ کس طریق پہ ہوتا ہے اہتمامِ بہار! | شکستہ جام و سبو ہیں، اداس میخانے
غمِ حیات نے چھوڑا اُٹھانا تمام جنھیں | تری نظر سے مکمل ہوئے وہ افسانے
رہی نہ گرمیِ رنگِ حیات محفل میں | خموش شمع ہے، اور جل چکے ہیں پروانے
نہ بجھ دی نہ شعورِ خود آگہی اکرام | شرابِ شوق سے خالی ہیں تیرے پیمانے

مطبوعات جدیدہ

مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ (انگریزی) مؤلفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، تقطیع متوسط ضخامت ۳۰۵ صفحات قیمت معلوم نہین، ملنے کا پتہ :- شیخ محمد اشرف کشمیری دروازہ لاہور،

کسی کتاب کو ڈاکٹر حمید اللہ کی تالیف بتانا اس کی تعریف کے لئے کافی ہے، جن لوگون نے ان کی تالیفات پڑھی ہین، وہ ان کے مطالعہ کی گہرائی، وسعت نکتہ رسی قوتِ استدلال صحت استنباط، اور متانت بیان کے معترف ہون گے، زیر نظر کتاب انگریزی زبان مین انہی کی تصنیف ہے، اس کتاب کا موضوع مسلمان بادشاہون کا ... آئین معاملتِ اقوام ہے، اس کی تالیف مین مؤلف نے جس وسیع مطالعہ سے کام لیا ہے، اس کا اندازہ اس فہرست کتب سے ملتا ہے، جو آخر کتاب مین درج ہے، اس کی معلومات فراہم کرنے کے لئے مؤلف نے ہندوستانی ذخائر علم ہی پر قناعت نہین کی ہے، بلکہ مختلف ممالکِ اسلامیہ کے علاوہ فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کے ذخائر کا بھی جائزہ لیا ہے ع

تمتع ز ہر گوشۂ یافتند

اس کتاب کو مؤلف نے چار ابواب پر تقسیم کیا ہے، اصل کتاب ۲۹۰ صفحات پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد دو ضمیمے ہین، پہلے ضمیمہ مین حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور خلفاے بنو عباس کے چند فرامین ہین، دوسرے ضمیمہ مین ان عربی، اردو، فارسی، اور ترکی تالیفات پر مختصر تبصرے ہین، جن سے مؤلف نے استفادہ کیا ہے،

پہلے باب تعارف کو مؤلف نے گیارہ فصلون مین تقسیم کیا ہے، ابتدائی سات فصلون مین بین الاقوامی قانون کی حقیقت، عام قوانین کے درمیان اس کا مقام، اسلامی آئین معاملت اقوام کے موضوع، غرض، اساس اور سرچشمون سے بحث کی ہے، آٹھوین فصل مین یہ دکھایا ہے کہ انسانی معاشرہ کو بین الاقوامی بنانے مین اسلام نے کیا حصہ لیا، نوین فصل مین بین الاقوامی قانون کی تاریخ قبل اسلام سے بحث کی ہے، خلاصہ حسب ذیل ہے،

دنیا کی معلوم تاریخ دوآبہ، دجلہ و فرات کے سمیری تمدن سے شروع ہوتی ہے، اس کے بعد مصر، شام، قرطاجنہ، یونان اور روما مین، تہذیب و تمدن نے عروج پایا، بین الاقوامی رابطہ کی قدیم تر دستاویز جو ہم کو دستیاب ہو سکی ہے، فرعون مصر رعمسیس دوم (۱۲۹۲ تا ۱۲۲۵ ق م) اور ایک حتی بادشاہ کا معاہدہ امن وصلح ہے، جس نے ایک مستقل جنگ کا خاتمہ کرکے، پُر امن تجارتی اور سیاسی اختلاط کی بنیاد رکھی، اس دستاویز کے بعد قدامت مین عبرانی لٹریچر کا درجہ ہے، عبرانی قوم جنگ کی حالت مین نہایت سخت گیر تھی، اس کے آئین جنگ مین نہ صرف سورماؤن کا قتل کرنا روا تھا، بلکہ دشمن کے بچون بوڑھون اور عورتون تک کو فنا کر دینا ضروری سمجھا جاتا تھا، یونانیون نے بین الاقوامی قوانین کی ایک حد تک بنیاد رکھی، مگر ان کے آئین مین جزائر یونان کی شہری حکومتون کے سوا، تمام غیر یونانی اقوام کو وحشی خیال کیا جاتا تھا، ارسطو کا فلسفہ یہ تھا کہ یہ تمام وحشی لوگ غلامی کے لئے مخلوق ہوئے ہین، افلاطون نے اپنی قوم کو آپس کے تعلقات مین آشتی اور مدارات کا مشورہ دیا ہے لیکن اس کے خیال مین کبھی یہ بات نہ آئی، کہ غیر اقوام بھی با دوستان تلطف با دشمنان مدارا کی حقدار ہین، رومنون نے یونان سے بہتر آئین عام اور بین الاقوامی نوعیت کا بنایا، جس کی رو سے ان کے حلیف اور ماتحت ملک کے افراد کو روما مین قانونی امن وتحفظ حاصل تھا لیکن جس ریاست کا روما کے ساتھ کوئی دوستانہ معاہدہ نہ ہوتا اس کے افراد کی جان مال، اور آبرو رومن قلمرو مین محفوظ نہ تھی،

ظہور اسلام کے وقت عرب کا کچھ حصہ روما کی مشرقی حکومت کے زیر اثر تھا، کچھ ایران کے ماتحت تھا، آزاد عرب متعدد خود مختار قوتون مین بٹا ہوا تھا، بین الاقوامی قانون کے ارتقار کے لئے متعدد و خود مختار سیاسی وحدتون کا وجود لازم ہوتا ہے، یہ چیز عربون کو قدیم سے میسر تھی، جس کی بدولت عربون نے بھی چند دستور ایسے رائج کر رکھے تھے، جن کو معاملت اقوام کے آئین کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے، اشہر حرم کی تقدیس، ایلاف عہود، سفارت و منافرت کا دستور، اجنبیون کے خون کی تحریم، معاہدون کی تعظیم، پناہ گیر کو پناہ دینے کا رواج، اور حلف الفضول، ایام جاہلیت کے مستحسن آئینون مین داخل تھے،

دسوین فصل مین مصنف نے بتایا ہے، کہ بین الاقوامی دستورون کی تاریخ مین اسلام کا مقام کیا ہے، اور گیارہوین فصل مین اسلامی آئین کی اخلاقی اساس بتا کر پہلے باب کو ختم کر دیا ہے، اس کے بعد امن و صلح، جنگ و کشاکش اور مجانبت و ناطرفداری کے ان ضوابط پر سیر حاصل بحث کی ہے، جن پر مسلمان سلاطین عموماً کاربند رہا کئے ہین، کتاب میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، اگر یہ کتاب کسی یوروپین نے لکھی ہوتی، اور موضوع بحث مسلمانون کا نہین، بلکہ کسی آریا قوم کا آئین ہوتا، تو اس کتاب کے ربع سے کم مضمون کو نہایت خوش آیند اور دلکش اطناب کے ساتھ اس کتاب کے چوگنے صفحات مین لکھا گیا ہوتا، مگر ڈاکٹر صاحب نے قدما سلف کے ایجاز کو عہد جدید کے مداحانہ اطناب پر ترجیح دی ہے،

یہ موضوع ایسا ہے جس مین اختلاف رائے کی گنجایش ہے مگر اس مین شبہ نہین کہ بالعموم مصنف کی رائین صحیح ہین، مسلمانون کے بین الاقوامی آئین پر یہ پہلی کتاب ہے جو اس زمانہ کی ضرورتون کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے، تنگ و محدود نسلی اور جغرافی قومیت کی پیدا کردہ عالمگیر کشمکش کی وجہ سے اب دنیا کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہا ہے، اور یہ وسعت صرف اسلام ہی مین مل سکتی ہے، اس لئے اسلام کے بین الاقوامی قوانین کو پیش کرنا ایک بڑی مفید خدمت ہے، "ا - ح"

اقبال بحیثیت مفکر کے (انگریزی) ضخامت ..۳ صفحات قیمت ۵ر، مرتبہ شیخ محمد اشرف

کشمیری گیٹ، لاہور،

اقبال کے بعض فلسفیانہ تصورات، مثلاً نظریہ زمان و مکان، خودی کا پس منظر، اور وجود مطلق پر ہندوستان کے مختلف اصحاب علم و قلم نے انگریزی مین جو مضامین لکھے ہین، اُن کو اس کتاب مین جمع کر دیا ہے، ان مین ڈاکٹر رضی الدین صاحب حیدر آباد دکن، پروفیسر ایم ایم اشرف علی گڈھ، خواجہ غلام السیدین صاحب اور ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کے مضامین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہین، جن سے اقبال کے فلسفہ کے بنیادی تصورات کو سمجھنے مین مدد ملتی ہے، لیکن کتاب چونکہ ایک ہی شخص کی تصنیف نہین ہے، بلکہ مختلف اصحاب علم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس لئے بعض مقامات پر تضاد پیدا ہو گیا ہے، مثلاً وجود مطلق کے بارے مین پروفیسر ایم ایم شریف صاحب نے اقبال کے نظریہ کو جس قدر وضاحت اور عمق کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لائق تحسین ہے، لیکن کتاب کے آخری مضمون سے پروفیسر صاحب موصوف کے بعض نظریات کی تردید ہوتی ہے، اگر وجود مطلق کے بارہ مین ان کی تشریح صحیح ہے، اور قطعی صحیح ہے، تو پھر کتاب کا آخری مضمون جو کسی اور صاحب کا لکھا ہوا ہے، بالکل بے جوڑ ہو جاتا ہے،

لیکن ایسی کتاب مین جو مختلف الخیال اصحاب قلم کی کوششون کا نتیجہ ہو، یہ تضاد چندان تعجب انگیز نہین، تاہم پبلشر کو چاہئے تھا، کہ اس قسم کی کتاب مین صرف ایسے مضامین شائع کئے جائین، جو ایک دوسرے کو سمجھنے مین معاون اور ان کے مؤید ہون، نہ کہ ان مین تضاد پایا جائے، غلام السیدین صاحب کا مضمون جدتِ خیال کا حامل ہے، اس مین ان تمام اعتراضات کا جواب خوش اسلوبی کے ساتھ دیا گیا ہے، جو اقبال پر تعصب اور کج فہمی کی وجہ سے کئے جاتے ہین، مجموعی حیثیت سے اقبال کے فلسفہ پر یہ اچھی کتاب ہے،

ابن مسکویہ (انگریزی) از جناب خلیفہ عبد الحامد صاحب ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت عہ؎،

پتہ:- شیخ محمد اشرف کشمیری گیٹ لاہور،

ابن مسکویہ ممتاز مسلمان حکماء مین ہے، لیکن عام طور پر اس کی شہرت ایک مورخ اور فلسفہ اخلاق کے معلم کی حیثیت سے ہے، اور اسلامی فلسفہ پر یورپین زبانون مین اب تک جس قدر کتابین شائع ہوئی ہین ان مین سے کسی مین ابن مسکویہ کے اصلی فلسفہ کا پورا جائزہ نہین لیا گیا ہے، بعض مغربی مصنفین مثلاً ڈی بوئر (De Boer) نے تو اس قدر اختصار سے کام لیا ہے، کہ یہی سمجھ مین نہین آتا، کہ تاریخ فلسفہ، اسلام کے ذیل مین اس کا ذکر کیونکر کیا جا سکتا ہے، البتہ سر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب (Metaphysics in Persia) مین نسبتہً تفصیل سے کام لیا ہے، مگر بعض مقامات پر وہ بھی محض اشارات کر کے گذر گئے ہین، اس لحاظ سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے، اس مین ابن مسکویہ کے فلسفہ کے تین پہلوؤن، اثبات وجود مطلق، روح اور نبوت پر جن کی وضاحت ابن مسکویہ نے اپنی کتاب مین کی ہے، روشنی ڈالی گئی ہے، اور فاضل مصنف نے اس کی پوری کوشش کی ہے، کہ وہ ابن مسکویہ کے فلسفہ کو استدلال اور ہمواری کے ساتھ پیش کر دین، اور اس کوشش مین وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہین، مگر بعض مسائل ایسے ہین کہ جن کو شاید ابن مسکویہ بھی پورے طور سے حل نہین کر سکا ہے اور نہ اس کے شارح عبدالحکیم صاحب ہی اس کتاب مین اس کو سلجھا سکے ہین، (مثلاً اثبات وجود مطلق کے ذیل مین حرکت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی جوان دلائل سے کسی طرح ثابت نہین ہوتی، جو اس کتاب مین بیان کئے گئے ہین) وجودِ مطلق کا اثبات کیونکر کیا جا سکتا ہے، یا روح کا وجود بھی ان دلائل سے ثابت نہین ہوتا، جو اس کتاب مین پیش کئے گئے ہین، تاہم فاضل مصنف نے ابن مسکویہ کے بنیادی دلائل کو حتی الامکان پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ کتاب اس حیثیت سے بہت قابلِ قدر ہے، کہ ابن مسکویہ کے فلسفہ پر اب تک اتنا بھی کسی نے نہین لکھا ہے، اور اسلامی فلسفہ سے ذوق رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

"ع - ا"

گلمپس آف اسلام، مؤلفہ پرنس آغا خان، ڈاکٹر ذکی علی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲ صفحے،

قیمت عہ، ملنے کا پتہ: شاہ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

یہ انگریزی مین مشہور صاحب قلم ڈاکٹر ذکی علی کا مضمون ہے، جس مین انھون نے دکھایا ہے، کہ اسلام کو جو لوگ علوم کی ترقی مین حائل بتاتے ہین، وہ غلطی پر ہین، جس کا یورپ کے منصف مزاج مصنفون اور محققون نے اعتراف کیا ہے، آٹھوین صدی مسیحی سے تیرھوین صدی مسیحی تک علوم و فنون کے تنہا علمبردار مسلمان تھے مسلمانون کی علمی خدمات خصوصًا فنِ طب مین اُن کے کمال پر مؤلف نے تاریخی شہادتین پیش کی ہین، یہی مضمون کتاب کی جان ہے، کتاب تین فصلون پر مشتمل ہے، پہلی فصل کی سرخی "اسلام کے اصول" ہے، یہ فصل آغا خان کی لکھی ہوئی ہے، اس مین انھون نے اپنی اسماعیلیت کا اعلان کرتے ہوے لکھا ہے "مگر مین اس بحث مین نہ تو اپنا خاص مسلک پیش کرنا چاہتا ہون، اور نہ سنی یا شیعی مسلک، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ مغربی قارئین کے سامنے اس وسیع سرچشمہ کو پیش کرون جس کا منبع مدرسہ غزالی کے خیالات ہین" دوسری فصل ڈاکٹر ذکی علی کی لکھی ہوئی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی، تیسری فصل بھی آغا خان ہی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر ان کے نام کے نیچے ڈاکٹر ذکی علی کا نام بھی ہے، اس فصل مین باطنی مسلک کے اس عقیدہ کو دہراتے ہوئے کہ قرآن کا ایک باطنی مفہوم بھی ہوتا ہے، سنیون کے مسلک اجماع کی طرف اشارہ کیا ہے، اور مسلمانون کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ ازہر مین تمام فرقِ اسلامیہ کے مجتہدون کا اجتماع کرکے نئے سرے سے ایک نئے اجماع کی بنیاد ڈالین، مشورہ تو خوب ہے مگر اس مشورہ اور فصل اول کے مضمون کا فصل سوم کی بحث سے کوئی جوڑ نہین، مقدمہ مین مولفین نے لکھا ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کی جب از سر نو تنظیم کی ضرورت ہوگی، اس وقت اسلامی اصول پر لوگون کو غور کرنے کا موقع ملے گا، اس سے خیال تھا، کہ اس کتاب مین اسلام کے ایسے اصول پیش کئے جائین گے، جن کی اس وقت دنیا کو ضرورت ہے، مگر ہمارا یہ خیال غلط نکلا، تاہم اس کتاب کی فصل دوم قابل قدر ہے،

جلد ۶۱ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۸ء عیسوی عدد ۵

مضامین

مقالات

استفسار وجواب

وفیات

ادبیات

شذرات

ہم نے بار بار لکھا کہ ہندوستان مین اردو کو یکسر نظر انداز کر دینا کسی حیثیت سے بھی مناسب نہین، اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہین نکل سکتا، ممکن ہو کار فرمایان حکومت وقتی حالات و جذبات سے مغلوب ہو کر اردو کو نظر انداز کر دین، لیکن آیندہ وہ اس غلطی کو محسوس کرین گے، خوشی کا مقام ہو کہ کانگریس نے جلد اس کو محسوس کر لیا، اور آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے دہلی کے جلسہ مین ہندوستانی کو ہندوستان کی زبان قرار دیا ہے لیکن رسم الخط کا مسئلہ پوری طرح صاف نہین کیا گیا ہی، حالانکہ بڑا اختلافی مسئلہ یہی ہے، اس کے بغیر یہ قرار داد ناقص ہے، ہندوستانی کی تعبیر تو ہر جماعت اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کر سکتی ہے، اور اس کا صحیح فیصلہ رسم الخط ہی سے ہو سکتا ہی، اس سے زیادہ واضح بیان پنڈت جواہر لال نہرو کا ہے جس مین انھون نے تصریح کیا تھ کہا ہے کہ "ہندوستان کی زبان عوام کی زبان ہونی چاہئے، اور اس مین وہ تمام الفاظ استعمال کئے جائین، جو عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے ہون، اور ہماری زبان ہندی اور اردو دونون رسم الخط مین لکھی جانی چاہئے"، اردو کے حامی اس سے زیادہ اور کچھ نہین چاہتے،

جب کانگریس ہندوستانی ہی کو ہندوستان کی زبان مانتی ہے تو پھر اس کے عملی نفاذ اور اس کے رسم الخط کے متعلق صاف و صریح فیصلہ مین کیا تامل ہی، محض زبانی فیصلہ بے کار ہوگا، اس لئے کہ حکومتین کانگریس کے بہتیرے اصولون اور قرار دادون کی عملی پابندی ضروری نہین سمجھتین، زبان کا مسئلہ کانگریس کے دعوی جمہوریت کا پہلا امتحان ہی، اس لئے ہم کو توقع ہے، کہ وہ دستور ساز اسمبلی سے بھی اس کو منوائے گی، اور اس کو عملاً بھی نافذ

کر گی، ابھی حال مین بعض ذمہ دار سوشلسٹ لیڈرون نے اپنے بیانات مین ہندوستانی کو ہندوستان کی زبان اور دونون رسم الخط کو تسلیم کیا ہے، معلوم نہین آیندہ حکومت کی کرسی پر پہنچنے کے بعد بھی یہ بیان یاد رہیں گے، یا طاق نسیان کے حوالہ ہو جائین گے، ع تا بدولت برسی مست نہ گردی مردی"

ایران اور ہندوستان کے درمیان صدیون تک گوناگون تعلقات رہ چکے ہین، اور تیموریون کے زمانہ مین تو ایران کے بڑے بڑے علما، اور اصحاب کمال ہندوستان کھنچ آئے تھے، جن سے یہان کی علمی و ادبی رونق بہت بڑھ گئی تھی، اور ہندوستان شیراز اور اصفہان کا خطہ معلوم ہوتا تھا لیکن تیموری حکومت کے خاتمہ اور ایران کے سیاسی زوال کے بعد دونون ملکون مین بہت کم رابطہ رہ گیا تھا، تاہم وقتاً فوقتاً ان مین علمی و ادبی تعلقات کے قیام کی کوششیں ہوتی رہین، اس سلسلہ مین ۱۹۲۲ء مین کلکتہ کے چند اصحاب علم نے جن مین ہندو مسلمان دونون بلکہ غالبًا وہان کے مقیم ایرانی بھی شامل ہین" بزم ایران" کے نام سے ایک علمی مجلس قائم کی ہے، اس کے موجودہ صدر ڈاکٹر بی ام بروا ڈی لٹ اور سکریٹری ڈاکٹر محمد اسحاق پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی ہین
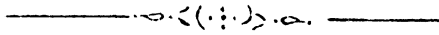
ڈاکٹر محمد اسحاق کو ایرانی ادبیات سے خاص ذوق ہے، انھون نے جدید فارسی شاعری پر ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے، جو کئی سال ہوئے شائع ہو چکی ہے، بزم ایران کی جانب سے انگریزی مین ایک سہ ماہی رسالہ" انڈو ایرانیکا" نکلتا ہے، اس مین فارسی ادبیات اور ایران سے متعلق دوسرے پہلوؤن پر مفید مضامین ہوتے ہین، بزم مذکور والہ داغستانی کا مشہور تذکرہ ریاض الشعراء بھی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، اور آیندہ دسمبر مین مشہور حکیم ابوریحان بیرونی خوارزمی کی ہزار سالہ برسی منانے والی ہے، حکیم مذکور گو نسل و وطن کے اعتبار سے عجمی تھا، لیکن اوس نے برسون ہندوستان مین رہ کر سنسکرت زبان اور ہندوستانی علوم کی تحصیل اور ان مین بڑی دستگاہ پیدا کی، جس کی شاہد اس کی مشہور تصنیف کتاب الہند ہے، اسکی

نظیر سنسکرت زبان مین بھی مشکل سے ملیگی، اس لئے ہندوستان پر اس کا حق ہے اور یہان کے اصحابِ علم کو چاہئے کہ وہ اس یادگار کو علمی حیثیت سے کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرین، اور بیرونی کے سوانح اور اس کے علمی کمالات پر تحقیقی مقالات لکھین کہ اس کے شایانِ شان اس کے حالات مین ایک مجموعہ مرتب ہو جائے،

پاکستان مین ایک اسلامی اکیڈمی کا قیام زیرِ تجویز ہے اور اس کی تشکیل کے لئے کمیٹی بھی بن گئی ہے جس مین ہندوستان کے اسلامی علوم کے ماہرین کے نام بھی ہین، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کو خصوصیت کے ساتھ اس مین شرکت کی دعوت دی گئی ہے گو ابھی اسکی تفصیل نہین معلوم ہوئی ہے لیکن پاکستان کیلئے اس قسم کی اکیڈمی ضروری ہے، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایسا گہرا رابطہ ہے کہ وہ سیاسی تقسیم سے نہین ٹوٹ سکتا، اور اُن کے بہت سے مفاد و مصالح ایسے مشترک ہین جن مین وہ اشتراکِ عمل اور ایک دوسرے سے مدد لینے پر مجبور ہین، خصوصاً علم و ادب کی بزمِ صفا کو سیاست کی مکدر فضا سے دور رکھنا چاہئے اور پاکستان و ہندوستان کے علمی ادارون اور اصحابِ علم کو بلا تفریق مذہب و ملت ایک دوسرے سے افادہ و استفادہ مین تامل نہ کرنا چاہئے،

کانگریس سے سوشلسٹ کی علحدگی، ہندوستان کی سیاست مین ایک اہم تغیر ہے جس کے نتائج بڑے دور رس ہین، جہان تک قوم اور ملک کی خیر خواہی اور خدمت کا تعلق ہے، دونون کا مقصد ایک ہے لیکن اس کے حصول کے وسائل اور طریقہ کار دونون کے جدا ہین، اور آیندہ وہی جماعت عوام مین مقبول اور کامیاب ہوگی جس کا طریقِ عمل ان کے لئے زیادہ مفید ہوگا، کانگریس عوام مین مقبولیت اور ان کی تائید ہی کی بدولت اس درجہ کو پہنچی ہے لیکن اس کا مقابلہ ایک غیر ملکی اور مستبد حکومت سے تھا اسلئے سارے ہندوستانی اس کے ساتھ تھے اور آیندہ مقابلہ جمہور کی خدمت اُن کے مفاد کی حفاظت اور ان کے ساتھ عدل و مساوات مین ہوگا اور اس مقابلہ مین وہی جماعت کامیاب ہوگی جو عوام کے مطالبات پورے اور اس کو مطمئن کریگی اور اس کا فیصلہ خود ان کے طرزِ عمل پر موقوف ہے، حکومت کا بقا و استحکام خود اس کی قوت پر نہین بلکہ عوام مین مقبولیت اور ان کی تائید پر منحصر ہے،

مقالات

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

(۳)

مدارس کی اصلاح یہ تو علمار کے فرائض و مشاغل کے متعلق اصلاحات تھیں، اس کے بعد جہان علماء بنتے ہین یعنی مدارس کی بعض اصلاحات کا بیان ہے، ان مدارس کی مجددانہ نگاہ مین اتنی اہمیت ہو کہ فرماتے ہین :-

"اس مین ذرا شبہہ نہین کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانون کے لئے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہین، دنیا مین اگر اس وقت اسلام کے بقا کی کوئی صورت ہے، تو یہ مدارس ہین، کیونکہ اسلام نام ہے، خاص عقائد و اعمال کا جس مین دیانات، معاملات، و معاشرات، اور اخلاق سب داخل ہین، اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم پر، اور علوم دینیہ کا بقا ہر چند کہ فی نفسہ مدارس پر موقوف نہین، مگر حالاتِ وقت کے اعتبار سے ضرور مدارس پر موقوف ہے"؛

لیکن ساتھ ہی ان مدارس مین ہم جیسے خدام و عمال کی سوء تدبیر سے متعدد ایسے امور

پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح بہت ضروری ہے، اور یہ اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت
ہدف ملامت بھی بنتی ہے، اور ان مدارس کے قائم کرنے کی خود جو روح و غایت ہے یعنی
عمل بالدین، وہ بھی ضعیف ہو جاتی ہے، اور لوگ علوم دینیہ سے متوحش و نفور ہو جاتے ہیں
تو اس طرح یہ جماعت علم گویا یصدون عن سبیل اللہ کا سبب بن جاتی ہے"

چندہ کے متعلق خاص واہم تجدیدی اصلاح

ایک بہت ضروری اصلاح جس کی طرف جا بجا متوجہ فرمایا گیا ہے، اور جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی خاص تجدیدی اصلاحات میں داخل ہے
اور جس میں عوام و خواص علماء و غیر علماء لیڈر وغیرہ سب ہی مبتلا ہیں، اور یہ کہ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ
الا الطیب اور لا یحل مال امرء الا بطیب نفسہ کی صریح نصوص ہوتے ہوئے مدارس کے چندوں
میں مال کے حلال و طیب پر کتنا چاہئے، کہ بالکل نظر ہی نہیں ہوتی، مثلاً چندہ لینے میں دینے والے کے
طیب نفس کی بالکل ہی پروا نہیں کی جاتی، بلکہ طرح طرح کے اثرات اور دباؤ سے کام لے کر زیادہ
سے زیادہ وصول کر لینا ہی بڑی حسن تدبیر اور کمال خیال کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ

بعض جگہ دوامی چندہ کا وعدہ کرنے والے کی موت کے بعد وارث اس چندہ کو جاری
رکھتے ہیں، اور اہل مدارس اس کی تحقیق نہیں کرتے، کہ ان لوگوں نے اپنی ملک خاص سے
جاری رکھا ہے، یا ترکۂ مشترکہ سے اور اس ترکۂ مشترکہ میں کوئی یتیم یا غائب یا غیر راضی
کی ملک تو نہیں شریک ہے، اسی طرح میت کے کپڑوں کو مدرسہ میں لیتے وقت میت
کے ورثہ اور ان کے بلوغ و رضا کی تحقیق نہیں کی جاتی"

دوامی چندہ میں جو آخر سال بقایا واجب رہ جاتا ہے، اس بقایا کا طلب کرنا (جس کا
عام رواج ہے) امر منکر معلوم ہوتا ہے اس سے صاحبِ چندہ کی نادہندگی اور
خلاف وعدگی کا اظہار ہے، مدرسہ کا نپور میں اس کی اصلاح اسی طرح کی گئی تھی کہ

له چندہ جو تجدید کی طرف سے ہی تھا

روئداد مین صرف وصول شدہ چندہ لکھا جاتا، اور بقایا کو مدرسہ کے خاص رجسٹر مین رکھکر بذریعۂ
خط یاددہانی کر دیجاتی تھی، اور یاددہانی بھی میرے نزدیک ضروری ہے، کہ لزوم و تاکید کے الفاظ نہون
بلکہ تصریح کر دی جائے، کہ اطلاع دیجاتی ہے، اگر رغبت ہو تو بھیجدیجئے ورنہ آپ آزاد ہین، اور
یہ کبھی نہ خیال کیا جائے کہ اس طرح کون دیتا ہے، یہ خیال غلط ہے، جتنا آنا ہوتا ہے آتا ہے اسکا
کامل تجربہ ہو چکا ہے، ہرگز وسوسہ نہ کیا جائے"

جب خود مدرسہ چلانے والے علماء و اکابر مین استغنا و توکل بھی نہین ہوتا، تو وہان کے پڑھنے والون
مین خدا اور دین سے کسی خاص تعلق کی توقع کہان تک ہو سکتی ہے،

"بعض لوگ چندہ کی رقمون مین اس طرح بیجا اخراجات اور خلاف اذن تصرفات کرتے ہین
جیسے گویا ان کی ملک ہے، اس مین بہت احتیاط کرنا چاہئے"

لیکن اس کی احتیاط بہت کم کیجاتی ہے، ایک مشہور مدرسہ مین تو مسجد تک کا روپیہ بے تکلف دوسری
مدون مین صرف کیا جاتا رہا، جو نہین معلوم مسجد بنتے وقت پھر کس کس طرح ادا کیا، اور کرایا گیا، بھلا ایسی درسگاہون
مین ظاہری تدابیر وانتظام کے باوجود اگر تقوی و تدین نہ پیدا ہو تو کیا تعجب ہے،

طلباء دین کی ذلت سے حفاظت | اکثر جگہ جہان طلبہ کو لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہون، طلبہ
کسی کے گھر کھانا لینے نہ جائین، اس مین علم اور اہل علم کی سخت اہانت ہے، نیز ایک اخلاقی
خرابی یہ ہے، کہ اس عادت کی بدولت دوسرون سے مانگنے مین طبعی انقباض یعنی جھجک نہین
رہتی، اور یہی طبعی انقباض حیا کی ایک بڑی فرد ہے، جو ذلت کے سوال سے انسان کو
روکتی ہے، جب یہ نہ رہی تو رکنا طبعًا نہ ہوگا، عقلًا ہوگا، اور غرض ایسی چیز ہے، جو عقل
مانع کو بہت جلد رفع کر دیتی ہے، ایسے وقت طبعی مانع ہی کی ضرورت ہوتی ہے، جب وہ
نہ رہا تو اس شخص کو جب موقع ہوگا، ہاتھ پھیلا دے گا، نیز جب دون مین ایسے شخص کی قدر و منزلت

نہ رہی، تو اس کا وعظ کیا نافع ہوگا"

اس لئے جو طالب علم کو کھانا دینا چاہے مدرسہ میں بھیج دے، اسی طرح دعوت میں بھی طلبہ کو نہ بھیجا جائے، جس کو کھلانا ہو مدرسہ مین لاکر کھلائے، اور ہر چند کہ پہلے بزرگون نے اس کو جائز رکھا تھا، لیکن اس وقت کے دنیا دار عوام اہل علم کو ذلیل نہ سمجھتے تھے، بلکہ اُن کے آنے کو اپنے گھر کے لئے موجب برکت سمجھتے تھے، تو یہ مفسدہ نہ تھا، اور خود طلبہ کے کبر کا معالجہ بھی اس مین ہوتا تھا"

اور اسی کی ایک صورت طلبہ کو چندہ کی فراہمی کے لئے بھیجنا ہے، اس کے بھی وہی آثار و مفاسد ہین، جو کھانا لینے کے لئے گھرون پر جانے کے"

طلبہ کی وضع ولباس بعض مدرسون مین طلبہ کے اعمال اور وضع و لباس پر روک ٹوک نہین ہوتی، اس سے جو اثر عوام و خود طلبہ پر ہوتا ہے، وہ محتاج بیان نہین"

لیکن اس حسن فہم کو کیا کہئے کہ جس چیز کی ضرورت حضرت علیہ الرحمہ کے نزدیک محتاج بیان نہین وہ بعض بڑے مشہور دینی مدارس اور ان کے اکابر کے نزدیک سرے سے یا چندان محتاج توجہ نہین، حالانکہ اہل فہم کے لئے "الناس باللباس" کا اصول دونون اعتبار سے نہایت حکیمانہ ونفسیاتی ہے، جیسا آدمی ویسا لباس، اور جیسا لباس ویسا آدمی یعنی جس طرح باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے، اور ظاہر کی وضع و لباس باطن کے خیالات و رجحانات کی غماز ہوتی ہے، اسی طرح ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے، یعنی ظاہر کی وضع و لباس کو باطن کے خیالات و رجحانات کے بنانے بگاڑنے مین دخل ہوتا ہے، موٹی بات ہے کہ ہماری وضع و قطع ہماری اندرونی پسند و ناپسند کے تابع ہوتی ہے جیسے اور جن عادات و اخلاق کے لوگون کو ہم پسند کرتے، اور جن کی ہماری دل مین کسی اعتبار سے عظمت و محبت ہوتی ہے، اُنھی کی وضع و لباس اور طور و طریق کو ترجیح دیتے اور اختیار کرتے ہین، آج کل کے اکثر جوان اور بوڑھے نیک

جوامرد بنے پھرتے ہین، ان سے راقم احقر بھی یہی عرض کرتا ہے، کہ یہ داڑھی مونچھ کے چند بالون یا مرد ہو کر امرد بننے یا نسوانی صورت بنانے کا سوال نہین، بلکہ درپردہ اس امر کا اظہار و اعلان ہے کہ ہمارے قلب مین "کرزن" اور "کرزنیون" کی وقعت وعظمت معاذ اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور محمدیون کے مقابلہ مین زیادہ ہے، اور کرزن کی شکل وصورت معاذ اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت سے زیادہ پسندیدہ ومحبوب ہے، کون نہین جانتا کہ جس کی ہمارے دل مین جتنی زیادہ محبت وعظمت ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ ہم طبعاً اس کی ایک ایک ادا اور نقل وحرکت کی نقالی کرتے ہین، اور اس کی حرکات وسکنات کے معقول یا نامعقول ضروری اور غیر ضروری ہونے کا سوال ہی نہین پیدا ہوتا، نہ فرض ووجوب، استحباب واباحت کی بحث کی جاتی ہے، صحابہ رضوان اللہ علیہم جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک ادا پر جان دیتے، اور اتباع کا اہتمام فرماتے تھے، اس مین شرعی بحث سے زیادہ طبعی راز یہی ہے، کہ اُن کے رگ وریشہ مین حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت ومحبت پیوستہ تھی،

اب دوسری طرف لیجئے کہ اگر کسی بزدل و نامرد کو بھی پولیس و فوج کی وردی پہنا کر کھڑا کردین، تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے اندر بھی مردانگی کی ایک جھرجھری پیدا ہو جائے گی، فوج و پولیس کے سپاہی جب گھریلو لباس اتار کر اپنی وردی یا یونیفارم پہن لیتے ہین، تو اپنے فرائض و منصب کا شعور قدرۃً تیز و تازہ ہو جاتا ہے، پولیس کا کوئی سپاہی اگر وردی مین خود چوری کرتے پکڑا جائے، تو زیادہ مجرم ومحجوب ہوگا، کہ جو وردی چورون کے پکڑنے کو بنائی گئی تھی، اس مین خود چوری کرتے پکڑا گیا، کافرون اور فاسقوں کی وضع قطع ہیئت وصورت اختیار کی جائے، تو کفر وفسق ہی کے میلانات کو تقویت ہوگی، اور اگر آدمی مختوم القلب نہ ہوگیا ہو، تو نیکون ومتقیون کے ریائی لباس مین بھی فسق وفجور کے ارتکاب سے قدرۃً شرم وجھجک ہوگی، ظاہر کے تغیرات کا باطن کے میلانات وجذبات پر اثر پڑنا نفسیات کی مسلمہ وبدیہی حقیقت ہے،

افسوس کہ فکر و فہم کے قحط اور تقلید و نقالی کی وبا کی بدولت ایسی موٹی باتون کی بھی اتنی تفصیل کرنی پڑی، جو واقعاً حضرت علیہ الرحمۃ کے بقول سرے سے محتاج بیان ہی نہ تھین، بہرحال اب یہ وبا اچھے اچھے عربی و دینی مدارس مین پھیل رہی ہے، کہ اپنے بزرگون اور صلحا و اتقیا کی صورت کے بجائے اغیار اور کفار و فساق کی سج دھج کے کھلے چھپے نقالی ہوتی ہے، داڑھیوں پر اگر استرے کا وار کسی مجبوری و مصلحت سے نہیں ہو پاتا، تو قینچی کی نوازش اس کو مسنون حد تک تو مشکل ہی سے جانے دیتی ہے، بہت سے طلبہ اور بعض اساتذہ تک کے انگریزی بال ٹوپیوں کے اندر اہتمام کے ساتھ چھپائے جاتے ہین محبوب وضع کی حفاظت بہرحال لازم ہے، خواہ اظہار کی بے تابی کے باوجود کسی مجبوری سے اخفا کی مصیبت ہی جھیلنا پڑے، پائجامون کا ٹخنون سے اوپر رکھنا بھی اکثر بار دل ناخواستہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی کتربیونت جدید ہی رہتی ہے، کہ جب موقع ملا، نیچے کھسکایا اوپر چڑھالیا، پھر بھی "مولویت" کی ذلت کو کرتا خصوصاً اگر ذرا لمبا ہو فاش کر دیتا تھا، سو اس کی جگہ قمیص تو گویا اب عربی طلبہ بلکہ اساتذہ تک مین ایک بالکل بے عیب فیشن ہے، اور بعض عربی مدارس جو زیادہ روشن خیال و ترقی یافتہ ہین، اُن کی ورزشون اور کھیلون مین بھی ہاکی فٹ بال وغیرہ ہی مقبول ہین، اور نام کی اصلاحی انجمن (یونین کی نقالی) کی ترقیون کے سلسلہ مین فخریہ اخبار مین شائع ہوتا ہے، کہ انعام مین کپ اور مڈل تقسیم ہوے، غرض اب قرآن و حدیث پڑھنے والے یہ طالب علم اپنے نزدیک ملٹن و شکسپیر پڑھنے والی برادری کی نگاہ مین زیادہ رسوا نہین،

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس روش کی شرعی حیثیت جو بھی ہو، لیکن اس سے کوئی حقیقی عزت غیرون کی نگاہ مین تو کیا ہوتی، خود اپنی نگاہ مین اپنی ذلت اور احساس کمتری کا پکار پکار کر اعلان ہے، اور دنیا کی نظر مین دنیا کی عزت بھی طبعاً و عقلاً انہی کی ہوتی ہے، جن کی نظر مین خود اپنی اور اپنے دینی و قومی شعار کی عزت ہو،

اس کے علاوہ جو مولوی یا مدارس دینیہ کا جو طالب علم "اسکول ماسٹر یا اسٹوڈنٹ" کی وضع قطع مین نظر آتا ہو، اس سے قدرۃً ایک عامی آدمی انگریزی کا خیا یا ماری پڑھوانا چاہے گا، نہ کہ کوئی فتوی یا دینی مسئلہ دریافت کرنے کا خیال کرے گا، آخر جن کے بنائے ہوئے مسٹرون کی ہو بہو نقل اور تقلید مین ہم دیوانے ہین، اُن کے مولویون (پادریون) کی بھی کم از کم اب تک تو ایک خاص وضع ہی محمود خیال کیجاتی ہے' بلکہ داڑھی تک وہ بھی ایک مشت سے زائد مقداری کی اُن کے چہرون کو بھی ایک مذہبی ومقدس جماعت کا چہرہ ظاہر کرتی ہے، اس سے بھی بڑھ کر یونیورسٹیاں اپنے طلبہ تک کے لئے خاص خاص یونیفارم مقرر کرتی ہین، لہٰذا اس ذوق تقلید ہی کی دلیل سے سہی اگر ہمارے علماء اور دینی طلبہ کا بھی کوئی یونیفارم ہو تو آخر اس مین کیون ذلت محسوس کرین!

حاصل یہ کہ لباس و وضع کا معاملہ خفیف وحقیر ہرگز نہین اس کے مصالح ومفاسد دونون اشد بھی ہین، اور جنھون نے اپنے دین کو اغیار کے دباؤ سے کچھ آزاد کر لیا ہے، اُن کی نگاہ مین اظہر بھی، اور اتنی تفصیل محض ہماری مغرب زدہ مرعوبیت وغباوت کی بنا پر ضروری ہوئی،

علماء سند مین بے احتیاطی وتعالی

ایک اور بہت بڑا خطرناک مرض تمام مدارس مین تعالی ہی کی راہ سے یہ پھیل گیا ہے، کہ پاس فیل کے کچھ نمبر مقرر کر لئے گئے ہین جس نے ان کو الٹے سیدھے کسی طرح حاصل کر لیا، بس اُس کے ہاتھون مین عالم وفاضل اور مقتدائے دین ہونے کی ایک سند پکڑا دی گئی، نہ سند پکڑاتے وقت علم کی استعداد وصلاحیت کو دیکھا جاتا ہے، نہ عمل کے صلاح وتقوٰی کو اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

"بعض مدارس مین ایسے لوگون کو سند فراغ دیدی جاتی ہے یا دستار بندی کردی جاتی ہے، جو باعتبار علم یا صلاح وعمل کے اس کے اہل نہین ہوتے، جب ان لوگون کی علمی وعملی کوتاہیان دوسرون پر ظاہر ہوتی ہین تو سارے علماء کو ان پر قیاس

کرکے سبب بدظنی ہوجاتی ہے، تو دین کے معاملات مین پھر کس سے رجوع کرین گے، کس کے قول پر عمل کرین گے، پھر دین کا کیا حشر ہوگا، توان مفاسد کا سبب وہ بے احتیاط لوگ ہوئے، جو نااہلون کو قوم کے سامنے سند دے کر اہل ظاہر کرتے ہین"

شاید اس رسالہ کی تحریک کے وقت حضرت علیہ الرحمۃ کی نظر مین بعض مدارس ہی ایسے رہے ہون اب تو کوئی استثنا رنظر نہین آتا، اگر اس ایک بات ہی کی اصلاح کا پورا اہتمام مدارسِ دینیہ کرلین تو انشاء اللہ علم و عمل، دونون اعتبار سے خدمتِ دین کے لئے اوسط درجہ کے علماء کا اثر بہت بڑھ جائے،

قواعد کی پابندی مین سستی

"تعلیم و تعلم وغیرہ کے معاملات میں اب اکثر عربی مدرسون مین طلبہ کی خواہش و مذاق اور کثرت تعداد کے مقابلہ مین اصول و قواعد کی پروا کم کیجاتی ہے، اس سے بھی وہی مذکورہ بالا قسم کے مفاسد پرورش پاتے ہین، اس لئے ضروری ہے، کہ طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے، خواہ اُن کی تعداد کم ہی کیون نہ ہوجائے، کام کے دوچار ناکارہ سو دو سو سے افضل ہین"،

تجوید و اخلاق کی تعلیم سے غفلت

"اکثر مدارس مین تجوید کا علم و عمل داخل نصاب نہین، اسی طرح اخلاق کی کوئی کتاب درس مین نہین، اول کی کمی کا نتیجہ یہ ہے، کہ اکثر طلبہ بلکہ علماء بھی افسوس ہے کہ قرآن مجید اچھا نہین پڑھتے، جس پر عوام بھی ہنستے ہین، کتنا بڑا ظلم ہے کہ امام عالم ہو اور نماز فقہ کی رو سے درست نہ ہو، لہذا طلبہ پر لازم کیا جاوے کہ تجوید علماً و عملاً حاصل کرین"

اوپر راقم سطور کہین اس معاملہ مین ایک مشہور عربی درسگاہ کا تلخ تجربہ درج کرچکا ہے کہ بچون کے لئے مکتب تو قائم کردیا گیا، اور اس مین قرآن مجید لازم بھی ہے، لیکن تجوید کیا معمولی تصیح مخارج تک کا انتظام نہین، اور نیچے سے اوپر تک کے ذمہ دارون سے عرض کرتے کرتے تھک گیا، یہان تک کہ خود اپنے بچے کو وہان سے ہٹالینے کا ایک بڑا سبب یہی ہوا،

بُرا نہ مانا جائے تو اصل یہ ہے کہ ایسی درسگاہون کے خود اساتذہ و منتظمین اور اکابر کے اندر دین کی

فکر و غفلت دونوں کا ایسا زوال ہے کہ سمجھتے ہی نہیں، کہ کس کوتاہی کا اثر کتنی دور جاتا ہے، یہ تو فکر کی کمی ہے، اگر سمجھے بھی تو غفلت کی کمی کی وجہ سے اس کی اصلاح و تدبیر میں مستعدی نہیں فرماتے،

"دوسری کمی (یعنی تعلیم اخلاق کو درس سے خارج کر دینے) کی مضرتیں اس قدر کثیر ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا، خلاصہ یہ کہ علماء کی اس فن سے بے خبری کی بدولت جھوٹے مکار پیر بن گئے ہیں، جو خلقت دو دنیا کو ذبح کر رہے ہیں، اس لئے چاہئے کہ اخلاق کی کتابوں کو درس میں داخل کریں، (اور صرف درس اخلاق ہی کافی نہیں) بعد فراغ التزاماً طلبہ محققین اہل اللہ کی خدمت میں حسب گنجایش قیام کریں، اور اُن سے عملاً آدابِ اخلاق سیکھیں، اور ان کی صحبت سے برکت حاصل کریں، اور چندے اُن کی خدمت میں آمد و رفت رکھیں جس سے کہ نسبتِ باطنہ ایک گونہ راسخ ہو جائے، تب خلق اللہ کے ارشاد کو اپنے ہاتھ میں لیں، انشاء اللہ عموماً عوام اہلِ اسلام اُن سے وابستہ ہو کر جھوٹوں کو چھوڑ دیں گے، اور مضمون قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا آنکھوں سے نظر آ جائے گا"

بات یہ ہے کہ باطنی اخلاق کی اصلاح و درستی جن کا اصطلاحی نام فقر و درویشی یا تصوف پڑ گیا ہے، یہ دراصل دین کی روح ہے، جس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے قلبی و روحانی تعلق پیدا نہیں ہوتا، اور دین بے جان یا نیم جان رہتا ہے، لوگوں کو سوکھے سا کھے دین میں خدا کی بو نہیں محسوس ہوتی، ورنہ انسان کی عام فطرت تو یہ ہے، کہ

خلق را بین بے سر و پا می آید　　ہر کجا بوئے خدا می آید

اس لئے جہاں جہل کے باوجود یہ بو کچھ موجود ہوتی ہے، خواہ زیادہ تر نقلی و نمایشی ہی ہو لوگ پھنس جاتے، اور جہل کی گمراہیوں کے ہاتھ تباہ ہوتے ہیں، اس لئے علم کے ساتھ تزکیۂ اخلاق کے اجتماع کا اہتمام ضروری ہے،

اس آخر دور میں بھی دہلی کے شاہ ولی اللٰہی خاندان میں اس اجتماع کے کیسے کیسے عظیم برکات و اثرات کا مشاہدہ ہو چکا ہے، دیوبند کا سلسلۂ خیر و برکت بھی اسی اجتماع کا فیض ہے، وہاں کے اکثر اکابر و اساتذہ ظاہر و باطن کے جامع کمالات رہے ہیں، فرنگی محل لکھنؤ کے بھی بہت سے اکابر دونوں رنگوں کے جامع تھے لیکن اب ہر جگہ اس رنگ کے اکابر کی روز بروز کمی بلکہ فقدان ہے، دیوبند و فرنگی محل دونوں پر تو مسلمانوں کا موروثی حق ہے اس لئے ان دونوں کے حضرات کو خصوصاً اور عام مدارس عربیہ کے حضرات کو عموماً اس جامعیت کے رنگ کو پیدا اور قوی کرنے کی طرف پوری توجہ فرمانے کی ضرورت ہے،

اصلاح درس و تدریس | قدیم طرز کے مدارس عربیہ کا درس و تدریس بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہو گیا ہے، مولانا عبد اللہ گنگوہی کا بالکل حضرت ہی کے اصول و رنگ کا ناصح الطلبہ نام ایک مضمون ہے، جسکو خود حضرت نے پسند فرما کر "حقوق العلم" کے آخر میں شریک فرما دیا ہے، اس میں درس و تدریس سے متعلق اصلاح طلب امور کی جو تفصیل ہے، وہ ہمارے تمام قدیم طرز کے مدارس کے اساتذہ و منتظمین کے لئے لفظاً بلفظ پڑھنے اور توجہ فرمانے کے لائق ہے۔

"خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو تحصیل علم کے سامان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ فراہم ہیں، کتابوں کو لیجئے کہ حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ کے درس میں ۲۲ آدمی بخاری شریف میں شریک تھے، اور صرف ایک نسخہ تھا، سب اس سے نقل کرکے پڑھتے تھے"، آج ہر درس کی کتاب بلا اس محنت و مشقت کے ہر طالب علم کے پاس موجود ہے لیکن دوسری طرف یہ حال کہ کہ نہ کتاب کی طرف توجہ، نہ اساتذہ سے انس، نہ شوق، نہ طلب، نہ مطالعہ، نہ تکرار، دستار فضیلت نصیب سر ہو جاتی ہے، اور استعداد کی یہ حالت کہ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے، املا تک درست نہیں (الا ماشاء اللہ)

اس قابلیت کے ثمرات ظاہر ہے کہ درس و تدریس یا افتا وغیرہ کسی اعلیٰ خدمتِ علم کے قابل نہیں ہوتے کہیں وعظ کو پیشہ بنا لیا، کہین مسجد کے امام بن گئے کہین الٹی سیدھی طب پڑھ لی، وہ بھی چلتی نہین، ان نتائج کو دیکھ کر کم عقلون نے سمجھ لیا کہ علم دین کا نتیجہ جب یہی ہے، تو اپنی اولاد کو پڑھا کر کیون برباد کرین اس کم عقلی کا جواب تو یہ ہے کہ

"مدارسِ اسلامیہ مین بیکار پڑے رہنا بھی انگریزی مین مشغول ہونے سے لاکھون کروڑ درجے بہتر ہے، اس لئے گو لیاقت اور کمال حاصل نہ ہو لیکن کم از کم عقائد تو خراب نہ ہون گے اور مسجد کی جاروب کشی اس وکالت و بیرسٹری سے بہتر ہے جس سے ایمان مین تزلزل ہو، اور خدا رسولؐ صحابہؓ اور بزرگانِ دین کی شان مین بے ادبی ہو جو انگریزی کا اس زمانہ مین اکثر بلکہ لازمی نتیجہ ہے، ہان جس کو دین ہی کے جانے کا غم نہین وہ جو چاہے کے اور کرے،

"لیکن اس کے یہ معنی نہین کہ عربی مدارس کی اصلاح نہ ہو، یہ اصلاح بہت ضروری ہے اگر اُن کی اصلاح ہو گئی، تو ایک عالم کی اصلاح ہو گئی، اس مین شک نہین کہ پرانے طریقہ تدریس سے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، اور اب بھی کچھ نہ کچھ ذی استعداد نکل آتے ہین، گو کم ہی سہی، لیکن اس زمانہ مین طلبہ کی کم توجہی، اور قوتِ فہم کی کمزوری کی وجہ سے یہ طریق تدریس کافی نہین،

اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا، اور مدرس مطلب بیان کر دیتا ہے اگر کسی کو کچھ شبہہ ہوا دریافت کر لیا، اور آگے چل پڑے، یہ طریق مبتدیون بلکہ متوسطین کے لئے بھی غیر نافع ہے، صرف ایسے منتہی طلبہ کے لئے نافع ہے، جو فاضلانہ استعداد حاصل کر چکے ہین، اور بڑے اساتذہ کے ہان مستفید ہو رہے ہین،

اس مین اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے بلا ضرورت

اُن کی امداد نہ کیجائے خود اُن ہی سے مطلب کی تقریر کرائی جائے نیز ہر قاعدہ و مسئلہ کی کثرت امثلہ سے مشق کرائی جائے البتہ جو مقام طلبہ کی استعداد سے باہر ہو اسکی خود تقریر کردے، یہ طریقہ یون تو سارے درس کے لئے مفید ہے مگر ابتدائی کتابون مین تو بہت ضروری ہے، مثلاً میزان منشعب مین ایسا نہ کیا جائے کہ سبق پڑھایا، اور اس کو رٹوا کر سُن لیا، اس سے کچھ نہین ہوتا، بلکہ ہر سبق کی بکثرت مثالون سے مشق کرائی جائے، مثلاً ماضی کی بحث پڑھائی جائے تو کم سے کم اس کے تین چار سو مختلف صیغون کی مشق کرائی جائے اور مصادر دے کر ماضی کے صیغے بنوائے جائین، اور ماضی کے صیغون کی اردو دیجائے، کہ اس کی عربی بنا دین، اگرچہ اس اجرا مین ایک ہی سبق مین کئی روز صرف ہو جائین،

اس طرح جب نحو میر تک پہنچے تو ہر قاعدہ کے متعلق چھوٹے چھوٹے عربی جملے دیکر اردو ترجمہ اور اردو کے جملے دیکر عربی بنوائی جائے، حتی کہ نحو میر کے ختم پر طویل طویل سلیس عبارتین اردو کی دے کر عربی بنوائی جائے، اور سلیس عربی کا ترجمہ کرایا جائے، اس طرح جب نحو میر ختم ہو گی تو شرح مائۃ عامل و ہدایت النحو کی عبارت طالب علم خود صحیح پڑھے گا، اور اگر کہین غلطی کرے تو بتلایا نہ جائے اس سے خود قاعدہ پر جواب طلب کیا جائے"،

اس مین شبہہ نہین کہ اگر قدیم طریق مین اتنی اصلاح کر لیجائے، تو وہ جدید کے بہت قریب آجاتا اور دونون کا نفع بڑی خوبی سے جمع ہو جاتا ہے نحو و صرف کی قواعد دانی پر پرانون کا جو اصرار ہے، اور جو نفع اس کا بتلاتے ہیں، وہ بھی قائم رہتا ہے، اور نیون کا نحو و صرف کے بے سمجھے خالی رٹانے اور وقت و ذہن کو خراب کرنے کا اعتراض بھی جاتا رہتا ہے، اور ہدایت النحو تک پہنچکر یقیناً عبارت خوانی کی کافی استعداد حاصل ہو جائے گی، جو رائج الوقت طریقہ میں کافیہ، و شرح جامی تک پڑھ کر بھی حاصل نہین ہوتی،

"آگے چل کر ہر فن کی تعلیم اسی طریقہ پر ہو، مثلاً بلاغت شروع ہو تو ہر قاعدہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات اور اشعار جاہلیت دے کر قواعد و بلاغت کو جاری کرایا جائے، اسی طرح فقہ مین ہر کتاب کے موافق چھوٹے چھوٹے مسئلے دئے جائین، کہ بحوالۂ کتب اُن کے جواب لکھین وَقِسْ عَلیٰ ھٰذَا، اس مین گو پہلے مدت زیادہ لگے گی لیکن چونکہ استعداد پڑھنے سے جی بڑھے گا، اور توجہ زیادہ ہوگی، تو آگے چل کر وقت بھی کم صرف ہوگا، اور ابتدا کی کسر انتہا مین نکل آئے گی،"

البتہ اس طریق اصلاح مین اصلی محنت و توجہ استاذ کو کرنا ہوگی، اور ہر مدرس پر اطمینان نہین کیا جا سکتا، اس لئے اس مین آسانی پیدا کرنے کے لئے بھی یہ تجویز فرمائی گئی ہے، کہ ایسی درسی کتابین شائع و مرتب کر دیجائین جن کے حواشی پر مشقی مثالین سلیقہ اور حُسن ترتیب کے ساتھ جمع ہون، اور جہان ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہو چندہ کر کے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، تو یہ اس اعتبار سے سب سے ضروری کام ہے، کہ لائق وذی استعداد علما رکے کم ہوتے ہوتے بالآخر علوم دین ہی کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہے، جس پر سارے دین کا مدار ہے،

بلکہ اگر ایک دفعہ کچھ سرمایہ فراہم کر کے ایسی درسی کتابون کی اشاعت کا صرف آغاز کر دیا جائے تو بار بار کسی چندہ کی بھی ضرورت نہین ہو گی، اُنھی کی فروخت سے آگے کا کام انشاء اللہ ہمیشہ چلتا رہے گا،

نیز اس قسم کی اصلاحات سے وحشت و استنکاف کی بھی کوئی وجہ نہین، ایسی ایسی ترمیمات تو ہمیشہ ہوتی رہی ہین، سلف صالحین و محدثین کا یہ طرز تھا، کہ شیخ خود پڑھتے، اور تلامذہ سنتے تھے، اس وقت یہی نافع دکھائی تھا، پھر علماء نے اس طرز کو بدل دیا، تلامذہ مین ایک پڑھتا، اور شیخ سنتے، اس کے بعد نمبر مقرر کیا گیا، کہ نمبر وار سب پڑھین، اس مین یہ شبہہ ہوا، کہ جس کا نمبر ہوگا، وہی مطالعہ دیکھے گا، باقی نہ دیکھین گے، اس لئے یہ کیا گیا، کہ جس کو استاد کہے وہ پڑھے، غرض حسب ضرورت طریق تدریس مین ترمیم و اصلاح ہمیشہ

سلف سے آج تک ہوتی رہی، تو اب اس سے خواہ مخواہ بھڑکنے کی کیا وجہ،

اصلاح اعمال و اخلاق یہ تو علمی و تدریسی اصلاحات کے متعلق تھا، عملی و اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی اصلاح و تدارک کی طرف بہت خاص توجہ و اہتمام کی ضرورت ہے، ان میں دو باتوں کا خصوصاً ذکر فرمایا گیا ہے،

ایک بے ریش لڑکوں کا فتنہ ہے، اس لئے مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے، کہ دس دس بیس بیس لڑکوں پر ایک معتمد نگران مقرر ہو جو ان امور کی نگرانی رکھے، کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے، نگران سے الگ ہو کر آپس میں باتیں نہ کریں، اُن کے نام جو خطوط آئیں، وہ بھی دیکھ کر دے، اُن کے سر منڈا تا رہے، پان نہ کھانے دے، لباس سادہ ہو، اگرچہ امرا کے بچوں کا قیمتی ہو، نماز و جماعت میں اُن کی حاضری کی فکر رکھے، تفریح یا کسی ضرورت سے بازار وغیرہ جائیں، تو اُن کے ساتھ رہے، ان باتوں کی خلاف ورزی پر مناسب سزا دے،

نئی روشنی کے اثرات دوسری نہایت قابلِ افسوس چیز نئی روشنی یا نیچریت کے اثرات ہیں، جو ہیضہ و طاعون کی طرح پھیل گئے ہیں جس سے بہت کم نفوس محفوظ ہیں، عربی مدرسوں کے طلبہ بھی ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں،

الحمدللہ کہ ابھی عقائد پر تو زیادہ اثر نہیں پہنچا ہے لیکن پہلی سی سادگی و بے تکلفی جاتی رہی ہے وضع قطع سے مسٹر یا نیم مسٹر معلوم ہوتے ہیں، نہ چہرہ پر تقوی کے انوار، نہ بات چیت میں تواضع کے آثار، کتابوں میں جی نہیں لگاتے، نہ مطالعہ سے کام، نہ تکرار سبق سے سروکار، مقرر بننے کی فکر، اخباروں اور پرچوں میں مضمون نگاری کی دھن، تاویل یہ کہ ضرورت زمانہ سے مجبوری ہے کہ تبلیغ کے لئے تحریر و تقریر نئے رنگ و مذاق کی ہو، اس کی ضرورت مسلم، لیکن اس کے اندر جو خفیہ مفاسد ہیں، اُن پر اطلاع ضروری ہے، تجربہ یہ ہے کہ ایسی تحریر و تقریر بالعموم حُبِّ جاہ

پیدا کرتی، اور اخلاص کے زنگ کو مٹاتی ہے، اور طالب علمانہ رنگ وسادگی، قلب سے دور ہو کر صرف عبارت آرائی اور دعوی ہی دعوی رہ جاتے ہین، اس لئے عام طلبہ کو عموماً ایسیا تقریر و تحریر اور نئی روشنی والون کے ساتھ افادہ یا استفادہ کی نیت سے ملنے سے تعلق رکھا جائے، کچھ اپنا رنگ چڑھانے کے بجائے خود اُن کے رنگ مین رنگ جاتے ہین، البتہ تبلیغ احکام اور مخالفین کے معترضین کو تحریراً و تقریراً رد کرنے کے لئے ایسے منتہی طلبہ کو منتخب کیا جائے جن کے ظاہر و باطن مین کچھ تو دین کی طرف خاص میلان موجود ہو، اور پھر ان کو حضرات اہل اللہ کی خدمت مین رکھا جائے جس سے اُن کا اخلاص راسخ اور اُن کے اخلاق کی درستی ہو، یہ مطلب نہین کہ خواہ مخواہ عرفی صوفی ہو جائین، اور ضربین لگانے لگین، بلکہ اُن کی صحبت سے انشاء اللہ اخلاص کا کچھ حصہ ضرور مل جائے گا حسب استعداد جب کافی مدت تک اُن کی خدمت سے مستفید ہو لین تب اُن کو تحریری و تقریری تبلیغ کے منصب پر مقرر کیا جائے، اس وقت اُن کی تقریر و تحریر نئے پُرانے کسی طرز کی بھی انشاء اللہ مفید ہی ہو گی، مضر نہ ہو گی، باقی جو لوگ بے اس کے آج کل کے مذاق کی تحریر و تقریر کے عادی ہو رہے ہین، وہ یاد رکھین، کہ خود کاتب و مقرر کی بڑائی کا کچھ اثر بے وقوفون پر ہو جاتا ہو ورنہ اصلاح یا تبلیغ جو بتائی جاتی ہے، اس کا اثر برائے نام ہی ہوتا ہے"،

عام مدارس کے ساتھ کاش یہ چند سطرین خاص طور سے اکابر ندوہ کو اپنی جانب متوجہ کرسکین!

راقم احقر کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس کی تحریر کے وقت اگر علماء بتجربةً نہین تو کشفاً خصوصیت کے ساتھ ندوہ ہی پیش نظر تھا، بات یہ ہے کہ جب آب و ہوا مین کوئی سمیت سرایت کر گئی ہو، تو جس چیز سے بھی اس کی کچھ اعانت ہو گی، اسی کے اثر کو غائب کر دے گی، اس لئے اکثر عرض کیا گیا کہ ایک مرتبہ ہمت کر کے اس سمیت کے جراثیم کا پورا پورا استیصال کر دیا جائے، پھر انشاء اللہ تقریر و تحریر وغیرہ

کے ان مفاسد کی خود ہی اصلاح ہو جائے گی،

مختصر نصاب | علوم دینیہ کے نصاب تعلیم و تدریس مین ایک اور بڑی اہم اصلاح و تجدید کی ضرورت یہ تھی، کہ اس کے لئے کوئی ایسا مختصر راستہ تجویز کیا جائے، جو بقدر ضرورت کافی بھی ہو، اور اتنی مدت نہ صرف ہو، کہ علوم معاش کی تحصیل کا عذر اس کی تحصیل سے لوگون کو مانع ہو، حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی تجدیدی جامعیت نے اس ضرورت کا بھی پورا احساس فرمایا، اور صرف کوئی نظری خاکہ نہین پیش کیا، بلکہ تخلیصاتِ عشرہ کے نام سے مروجہ نصاب کا (دیگر ضروری اضافون مثلاً اخلاق و فلسفہ جدیدہ وغیرہ کے ساتھ) ایسا عطر کھینچ دیا ہے، کہ اس بحث کی بھی گنجایش نہین رہی، کہ کون سا علم و فن قدیم نصاب کا تقلیل مدت کی ضرورت سے سرے سے خارج کر دیا جائے، اور لوگون کو یہ وسوسہ و اعتراض باقی رہے کہ فلان چیز کے بالکلیہ نکل جانے سے فلان خاص خامی رہ جائے گی،

اس نصاب مین تمام چیزین تجوید سے لے کر صرف و نحو، معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، عقائد و کلام، مناظرہ و ہیئت، تفسیر و حدیث، اصول فقہ، اخلاق و تصوف سب ہی کا اتنا ضروری حصہ اور ایسا ملخص موجود ہے کہ کہ ضروری ضروری مسائل سب کے آگئے ہین، اور حضرت کی مقررہ ہدایات کے مطابق اُن کی تعلیم ہو تو انشاءاللہ ہر فن سے اتنی مناسبت حاصل ہو جائے گی، کہ پھر جس مین چاہے آگے تکمیل کر سکتا یا ذاتی مطالعہ سے استعداد بڑھا سکتا ہے، یہ پورا نصاب کم و بیش تین سال کی مدت مین پورا ہو جاتا ہے،

یہی نہین کہ اس کی بدولت اس قلیل مدت مین سارے علوم دینیہ عربیہ سے فی الجملہ واقفیت و مناسبت پیدا ہو جا سکتی ہے، اور ساتھ ہی دینی تربیت کا بھی ان تین سالون مین اگر پورا اہتمام رکھا جائے، تو پھر علوم معاش یا دنیوی علوم مین مشغول ہونے سے بھی انشاءاللہ ایمان و عمل ایسا برباد نہ ہوگا، کہ اسلام کے نام کے سوا اسکا کام کوئی نہ رہ جائے، بلکہ خود ان دنیوی و معاشی علوم کی فہم و قابلیت اور ان مین سرعت ترقی کے لئے ذہن مین ایک مضبوط و مستحکم بنیاد قائم ہو جائے گی، اس پر بھی امراء و غرباء اگر سب ہی معاش و معاد دونون کے جامع

منافع کے لئے اس کو لبیک کہیں، توع

"تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل"

ذیل میں اس تجویز و تجدید کے مقصد و مطلب کو مختصراً خود حضرت مجدد کی زبان سے بھی سُن لینا چاہئے، جو اسی تلخیصات عشر کی تمہید سے ماخوذ ہے، سب سے پہلے اس پر تنبیہ فرمایا گیا ہے، کہ یہ نصاب کوئی ایسی جدت طرازی نہیں، جو قدامت پسند حضرات کے لئے موجب وحشت ہو،

"بلکہ نصابِ قدیم کی دینیات مقصودہ یعنی تفسیر و حدیث و فقہ و کلام و فرائض کی ضروری کتابوں کی تحصیل کو زوائد پر مقدم کر دیا گیا ہے اور چونکہ یہ علوم بعض فنونِ آلیہ صرف و نحو و معقول و اصول پر موقوف ہیں، لہذا اُن سے پہلے یہ رکھدئے گئے ہیں، اس لئے یہ نصابِ قدیم ہی کا ایک جزء ہے"،

اس کے بعد اس تجویز کا اصل مقصد ملاحظہ ہو، جس کی دو غرضیں بیان فرمائی گئی ہیں،

اول جن لوگوں کو تحصیلِ معاش کی ضرورت یا کسی اور وجہ سے مہلت کم ہے، اور ساتھ ہی علوم دینیہ میں فاضلانہ استعداد حاصل کرنے کی رغبت و شوق ہے، مگر متعارف درسیات کی تطویل دیکھکر ہمت پست ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ ترک محض ہوتا ہے، اُن کی تنگی رفع ہو جاوے گی، دوسرے جو لوگ تحصیل علوم دینیہ کے لئے فارغ بھی ہیں، اُن کو بھی اتفاقاتِ زمانہ سے کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا وقت نہیں ملتا، اور درمیان ہی سے چھوڑ دینا پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ جس قدر وقت ملا تھا، وہ علوم آلیہ میں صرف ہو گیا، اور اصل مقصود سے محروم ہی رہے، اس جدید نصاب یا طرز سے اس محرومی کا بھی تدارک ہو جاتا ہے،

لہذا اس مصلحت کے پیشِ نظر عام اور رائج الوقت طویل نصاب پر ہر حال میں اس مختصر نصاب کو مقدم رکھنا انسب ہے، اس کے پورا کرنے کے بعد

"اگر وقت مساعد ہو تو بقیہ درسیات کو پورا کر لیا جا سکتا ہے، نیز چونکہ اس شخص کی استعداد

مین ایک گونہ قوت زیادہ ہو گی، اس لئے بقیہ درسیات پر سرعت و بصیرت سے عبور کر سکے گا'
اور اگر وقت نہ ملا تو اصل مقصود تو حاصل ہی ہو چکا، اگر توجہ کرے گا، تو چونکہ مطالعہ کا ملکہ پیدا
ہو چکا ہے، کتب بینی سے اپنی استعداد و تبحر کو جہان تک چاہے ترقی دے سکتا ہے"،

ایسی صورت مین چاہئے تو یہ تھا کہ دیوبند، سہارنپور، نظامیہ، (فرنگی محل) ندوہ وغیرہ سب ہی
بڑی بڑی درسگاہین اپنے ہان بطور ایک شاخ، بلکہ بطور جزء اور بنیاد کے اس کا التزام لازماً کرتین تاکہ ایک
طرف طالبانِ دنیا پر طلبِ دین کی حجت قائم ہوتی، اور دوسری طرف خود ان درسگاہون کے فیض و افادہ
مین وسعت ہوتی، اور جو لوگ تین چار سال سے آگے کی ہمت و فراغت رکھکر پوری تکمیل کرنا چاہتے، ان
کے لئے یہ شاخ اسی طرح جزء کا کام دیتی جس طرح دنیوی تعلیم کا میٹرکولیشن معمولی نوکریون وغیرہ سے "آ
حوصلہ رکھنے والون کے لئے اعلی تعلیم کی بنیاد کا بھی کام دیتا ہے،

بلکہ اگر اس طرز کے سہ سالہ مدارس مستقلاً جابجا ملک مین کثرت سے قائم ہو سکین، اور دنیوی یا معاشی
مدارس مین جانے والے مسلمان بچے پہلے اس کی تکمیل کر لیا کرین، تو انشاء اللہ ایک ہی نسل مین اس بیک کرشمہ
دو کار کے دینی و دنیوی منافع کا مشاہدہ ہو جائے گا، ان سہ سالہ بنیادی مدرسوں مین دینی تعلیم کے ساتھ
دینی تربیت کا اہتمام بھی لازم ہو، تو اُن کے طلبہ دین و دنیا جدھر بھی جائین گے، خدا سے اُمید ہے کہ
دینی آگے ہون گے،

کاش ہمارے پاکستانی علما اور دین دوست حضرات حکومتِ پاکستان کو اس کی طرف متوجہ فرما سکتے
تو ایک ہی نسل مین پاکستان تمام دینی و دنیوی ناپاکیون سے پاک ہو کر واقعی پاکستان بن جاتا، ذہنی و
قلبی انقلاب کا بڑا دار و مدار تعلیم و تربیت ہی پر ہے، اگر مسلمانون کو مسلمان بنانے کا کوئی انقلاب پیدا کرنا ہے
تو اس کا راستہ پاکستان و ہندوستان بلکہ ساری دنیا ے اسلام کے لئے اس کے سوا نہین کہ اُن کی تعلیم
و تربیت کی اساس اسلام ہو، یہ بنیاد اگر کج ہی، تو پھر "تا ثریا می رود دیوار کج" کے نتیجہ کو کوئی سیاسی

انتظامی طاقت روک نہین سکتی،

لیکن اس محرومی کا کیا علاج کہ ساری دنیا کے مسلمانون کے سر پر مغربیت یا فرنگیت کا جادو ایسا سوار ہے، کہ اسلام کا نام لے کر بھی اُن کی سمجھ مین کام غیرون ہی کا آتا ہے، تجربہ یہ ہے کہ خود اہلِ دین اور دینی مدارس کے اکابر تک کا دل و دماغ اس درجہ مسحور ہو رہا ہے، کہ دین کی سیدھی بات سمجھنا، اور سیدھی راہ چلنا، ان پر شاق ہو رہا ہے،

بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی ایک صورت اور حضرت جامع المجددین کی زندہ کرامت ہو، کہ حضرت ہی کے ایک مستعد جوان صالح خادم اور مجاز خدمت (مولانا ابرار الحق سلمہ اللہ تعالیٰ) نے اللہ کا نام لے کر اس راہ مین قدم اٹھا دیا ہے، اور اپنے وطن ہردوئی کے ضلع کے ایک پُرانے علمی قصبہ بلگرام مین اشرف المدارس کے نام سے رہنمائی کا نشان کھڑا دیا ہے[1] جس کا اصل مقصود حضرت مجدد وقت کی اس مذکورہ بالا مجددانہ تعلیمی تجویز کی تکمیل ہے، بڑی بات یہ ہے کہ تربیت کی طرف تعلیم سے کم نہین زیادہ توجہ ہے، یہ سُنی سنائی نہین بلکہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بناء پر عرض کیا جا رہا ہے، اور خود اپنے بچون کی دینی تعلیم و تربیت کے باب مین بڑی بڑی نامی جگہون سے ٹھوکرین کھا کر اور مایوس ہو کر بالآخر حضرت جامع المجددین کی اس زندہ کرامت کے دامن مین پناہ ملی، ورنہ ایک بڑے خاندانی مشائخ زادہ اور خود دیندار صاحبِ علم و فضل نے تو اس سلسلہ مین ایک مخدوم بزرگ کی مثال پیش کر کے یہان تک تحریر فرما دیا تھا، کہ فلان صاحب دین و دولت بزرگ باوصف غایت دینداری، اپنی اولاد کو کالج ہی مین تعلیم دلا رہے ہین، اور متوسط و غریب طبقہ کے لئے اس سے چارہ نہین، کہ موجودہ تعلیم کو اختیار کرے، یا اولاد کو نرا جاہل رکھ کر کارخانون کا مزدور بننے پر مجبور کرے، جہان بے علمی کے ساتھ بے اخلاقی و بداخلاقی کا بھی شکار ہون، باقی ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے دعا کرین"،

---

[1] یہ مدرسہ خاص ہردوئی میں قائم ہوا تھا لیکن اب وہان سے بہ مصالح بلگرام مین منتقل کر دیا گیا ہے،

مگر یہ نادان اس فتوی پر کیسے عمل کرتا جب کہ اس کے مشاہدہ و تجربہ مین خود دنیا کے لئے بھی خالی دنیا کے علم سے نرا جہل بہتر، اور دین کے حق مین کمتر ضرررساں ہے، کیونکہ اس جہل مین کچھ برا بھلا ایمان و اعتقاد تو سلامت رہ جاتا ہے، اور اس اعتبار سے کارخانہ کا مزدور بنجانا کونسل کے ممبر بننے سے بدرجہا ہون ہے، خود حضرت مجدد کے افادات اس بارے مین آگے تعلیم انگریزی کی تحقیق مین آتے ہین،

ہماری عام عربی و دینی تعلیم اور تعلیم گاہون کی بڑی کمزوری غفلت یہی ہے، کہ تعلیم کے ساتھ تربیت و عمل کا بہت کم اہتمام و التزام فرمایا جاتا ہی، بلکہ گویا طالب علمانہ زندگی کو عملی زندگی کی آزادی کا پروانہ (لائسنس) خیال کیا جاتا ہے، یہ تصور بھی فرنگی طالب علمی کی برکات مین ہے، اور اگر کوئی اس پر معترض ہو تو غلطی کو غلطی کے لئے حجت بنایا جاتا ہے، کہ "آپ بھی اپنی طالب علمی کو یاد کرین"، حالانکہ موٹی بات ہے، کہ تربیت کی بنیاد کو پختہ کرنے کا زمانہ تو طالب علمی کے سن سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے، تو عین علم دین کی تحصیل کے زمانہ مین عمل دین سے غفلت و مسامحت کیسے روا ہو سکتی ہے، خود حضرت علیہ الرحمۃ نے تو بے عمل طالبعلمون کو سند فراغ و تکمیل دیدینا موجب مواخذہ قرار دیا ہے تلخیصات عشر کی تمہید مین اس مختصر نصاب کی تحصیل کا جو دستور العمل تحریر فرمایا ہے، اس کا آخری نمبر (۱۱) بھی یہی ہے، کہ جو کچھ پڑھے اس پر پورا عمل کرتا رہے،

دینی نصاب و تعلیم کی مقدار و مدت مین اختصار و تقلیل کی اس مجددانہ تجویز کی جو اہمیت و حاجت حضرت مجدد وقت علیہ الرحمۃ کی نگاہ مین ہے، اس کا مزید اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ بعض چیزون کو حذف فرما کر یا ان کا بدل تجویز فرما کر ارشاد ہے کہ

اگر کوئی شخص کسی سبب سے اور زیادہ اختصار کا طالب ہو، تو ایسے شخص کے لئے یقیناً تین سال مین سے اور چھ ماہ گھٹ جاوین گے،

پھر آگے ارشاد ہے کہ

"اگر کوئی شخص صرف اپنی اصلاح و نجات آخرت کے لئے کتب دینیہ کو عربی زبان مین پڑھنا چاہے تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہ سمجھے، یا علوم عقلیہ سے دلچسپی نہ ہو، اس کے لئے اس درس کا اور بھی اختصار ہو سکتا ہے، یعنی صرف و نحو کی کتب مندرجہ کے بعد قدوری کامل اور سراجی، اور متن معانی، اور تجوید اور تلخیص البدایہ اور متن عقائد نسفیہ، اور تیسیر یا مشکوٰۃ اور جلالین کافی ہے"،

لیکن نفس اپنی اصلاح و نجات آخرت کے لئے چونکہ عربی زبان مین پڑھنا بھی لازم نہین اس لئے مزید ارشاد ہے، کہ

"جو عربی زبان کی قید بھی ضروری نہ سمجھے، اس کے لئے صرف بہشتی زیور کے پانچ حصے، اور مفتاح الجنۃ اور صفائی معاملات اور تعلیم الدین، اور فروع الایمان اور جزاء الاعمال اور اصلاح الرسوم، اور قیامت نامہ اردو شاہ رفیع الدین اور حقوق الاسلام اور سراج السالکین اور تواریخ حبیب الہ اور تال تہذیب کے سب حصے،

اور عورتون کے لئے بلکہ کم فرصت مردون کے لئے بھی بہشتی زیور کے سب حصے پڑھ لینا اور ضرورت کے وقت علماء سے رجوع کرتے رہنا کافی ہے"،

بہر نوع دینی تعلیم اختصار نصاب و تقلیل مدت کی یہ اصلاح و تجدید اتنی ضروری ہے، کہ حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک سارے عربی مدارس، اور اُن کے سارے طلبہ کے لئے اس کی تقدیم مناسب ہی، حتی کہ اگر

"کسی وجہ سے سب کے لئے علی الاطلاق تقدیم نہ ہو، تو اقل درجہ حضرات علماء و اہلِ مدارس اسلامیہ دامت فیوضہم و برکاتہم اس قدر التزام کی تکلیف گوارا فرمائین کہ جن کی حالت اپنی تحقیق یا اُن کے استفسار سے اس تجویز کے مصالح مذکورہ بالا کی بنا پر تقدیم کی مقتضی پاوین

تو ان کے لئے ایک الگ جماعت قائم کر دیں، تو اس سے اہل حاجت کی رعایت کا ثواب بھی ملے گا، اور امید ہے کہ مدارس میں طلبہ بالخصوص امیرزادوں کی ترقی ہو جاوے، اور کوئی طالب علم باوجود کمی وقت کے محروم نہ رہے، اور جو اہلِ وسعت اساتذہ کو مکان پر بٹھلا کر اس طرز سے تعلیم دلانا چاہیں، استاد کو یہ نقشہ دے کر اس کی پابندی کے لئے فرمائش کر دیں"

کاش امراء اور اہلِ وسعت میں دین کی اتنی حس ہو کہ وہ اس رعایت کو رعایت سمجھیں اور دنیا کی ترقی کے ساتھ اپنی اور اپنی اولاد کی آخرت کی فلاح و نجات سے اتنی بےفکری نہ ہو کہ گویا مرنے کے بعد کچھ ہونا ہی نہیں، ! اگر اس دنیا کی ۶۰، ۷۰ سال کی غیر یقینی زندگی کے لئے (اور اتنی غیر یقینی کہ یقین ایک سکنڈ کا بھی نہیں) ہم اپنی اولاد کو ۲۵، ۳۰ سال تک مسلسل تعلیم میں جوتے رہتے ہیں، تو کس منہ سے آخرت پر ایمان کا دعوی رکھتے ہیں، جب کہ آخرت کی یقینی و ابدی زندگی کو سنوارنے والی تعلیم و تربیت کے لئے ڈھائی تین سال دینے سے بھی گریز کریں، !

مشورۂ معاش ایک مخدوم بزرگ جو خود ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں، اور ایک معروف بزرگ و شیخ کی قائم کردہ خالص دینی درس گاہ کے ناظم ہیں، اور اسی درسگاہ میں خود اپنے ایک بچے کو قرآن حفظ کرا رہے ہیں، باوجود اس کے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

"یہ تو بتاؤ کہ آخر حافظ و عالم ہو کر کھائیں گیا!"

اسی طرح ایک اور مخدوم و مخدوم زادہ بزرگ، جن کا ہندوستان کے ایک ایسے مشہور و مسلم خاندان سے قریب ترین تعلق ہے، جس کا فخر و امتیاز نسلاً بعد نسل تک علوم دینیہ ہی کی طلب و خدمت رہا، اور جو ابھی ایک ہی پشت پہلے کے ایک ایسے صاحب تقوی و توکل مشہور و مسلم شیخ وقت کے صاحب سجادہ ہیں جن کے یہاں فاقہ ہو جانا بھی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی، ان مخدوم کے ایک صاحبزادے جب ایم اے ہو کر ملازمت اور اس کے لئے سعی د

سفارش مین سرگردان و پریشان تھے، تو ایک موقع پا احقر نے اپنے ان مخدوم کی خدمت مین عرض کیا کہ حضرت نے آخر اپنے خاندان کے دینی علم و توکل کو راستہ سے اولاد کو ہٹا کر اس دنیوی تعلیم و تذلیل کو کیون پسند فرمایا! جواب وہی کہ دین اور علم دین کا پوچھنے والا اب کون ہے اور اس کو حاصل کر کے کھاتے کہان سے! احقر نے عرض کیا، اس سے تو تجارت اور کاروبار کی کوئی راہ اہون و اسلم ہوتی، اس کا جواب واقعی بڑا پُرمعنی اور پرلطف عطا فرمایا کہ

"میان تجارت بڑی محنت و مشقت، ہوشیاری و بیداری کا کام ہے، ہم تو بس ملازمت ہی کے کام کے رہ گئے ہین، کہ سوتے جاگتے بُری بھلی طرح تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب ہو جائے"!

اس مین شک نہین کہ ملازمت کا یہ بہترین ترجمہ ہے، میمن بوہرے وغیرہ نسلاً نسل کی تجارت پیشہ مسلمان جماعتون کا ذکر نہین ورنہ عام مسلمانون خصوصاً آخون زادون کو دیکھا کہ نوکری تو وہ بُری بھلی طرح نباہ کر اور تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب کر کے وصول کر لیتے ہین لیکن تجارت مین اکثرون کا دیوالہ ہی نکلتے دیکھا،

غرض جب خود ایسے ایسے خاندانی مشائخ اور دیندار علماے دین تک اپنی اولاد کو تعلیم دین سے ڈر کر دور رکھتے ہین اکہ علم دین کو حاصل کر کے کھائین گے کہان سے تو پھر ما و شما یا امرا کا ذکر ہی کیا جو خاندانی دنیا دار اور دینی تعلیم و روایات سے یکسر محروم ہین!

ایسے دیندار اور دنیا دار دونون قسم کے مسلمانون کی خدمت مین عرض ہے اکہ "کھائین گے کہان سے" کا یہ خوف وہی خشیتِ املاق (خوف افلاس) ہے، جس کی بنا پر جاہلیت کے مشرکین اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتے تھے، اتنا فرق ہے کہ وہ اس خوف سے اپنی اولاد کی چندروزہ دنیوی زندگی کا خاتمہ کر دیتے تھے، اور ہم ہمیشہ کی اُخروی زندگی کو برباد کر دیتے ہین! آج بھی جاہلیت جدیدہ مین ضبطِ تولید کی وجہ

قتل اولاد کی خفی شکل ہے) بڑی دلیل یہی بیان کی جاتی ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے، اتنے آدمی آخر کھائین گے کہان سے!

اس کا حقیقی جواب نئے اور پرانے سب جاہلون کو قرآن نے جو دیا ہے، وہ ایسے مسلمانون کے لئے اور زیادہ حقیقی ہے، جو "خوف افلاس" کی بنا پر اپنی اولاد کو تعلیم دین سے محروم رکھ کر دنیا کی غیر یقینی زندگی کو بنانے سے زیادہ آخرت کی یقینی زندگی بگاڑتے ہین، جواب یہ ہے کہ تمھاری اولاد کو بھی وہی خدا رزق دے گا جس نے تم کو دے رکھا ہے،" (نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ) اگر ہم کسی درجہ مین بھی مسلمان ہین، اور قرآن پر ہمارا کچھ بھی ایمان ہے، تو خوب یاد رکھنا چاہئے، کہ قرآن کے خدا نے انسان کو کھانے کمانے کی فکر مین فنا ہو کر مرنے کے لئے ہرگز نہین پیدا فرمایا، ہمارا "زیستن برائے خوردن" نہین، بلکہ خوردن برائے زیستن" ہے، اور زندگی کا اصل مقصود عبدیت و بندگی کے فرائض کی ادائی ہے، صاف صاف دو ٹوک ارشاد ہر کہ

مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ه مَااُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَّمَااُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ

مین نے جن وانس کو محض عبدیت و بندگی کے لئے پیدا کیا ہے، رزق کی فکر کے لئے نہین پیدا کیا، اور نہ اس لئے کہ مجھکو کھلائین، رازق تو سب کا صرف اللہ ہی ہے، جو رزق رسانی کی پختہ قوت

(ہر نہایت ۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ)

باقی اپنی بندگی و عبدیت کو بھلا کر رزاقیت کی تدبیر و قوت کے مدعی انسان کی واماندگی کا تماشہ جو مسلسل ۶۰-۷۰ سال سے دکھایا دکھلایا جارہا ہے، تاریخ نے تو کب دیکھا ہوگا، لیکن آج ہر آنکھ والے کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو "زیستن" کا مطلب تمام تر "خوردن" قرار دے لیا گیا ہے، اور حکومت و سیاست سب کا اصل مطلب و مقصود پکار پکار کر نعرۂ روٹی کپڑا بنایا جاتا ہے، دوسری طرف عالمگیر جنگ کے سلسلہ مین اور خصوصاً اس کے بعد ساری دنیا جس طرح عالمگیر قحط کے چنگل مین پھنسی ہے، اس کے ازالہ

کی ہر روز ہر حکومت کی جانب سے طرح طرح کی تدبیرون کا اعلان کیا جاتا ہے، فراہمی غذا کی مستقل وزارتین اور محکمے قائم ہین، ہر دن قومی و بین الاقوامی کانفرنسین منعقد ہوتی رہتی ہین، ساری حکومتون نے راتب بندی کر رکھی ہے، یعنی ناپ تول کر دو وقت کا بُرا بھلا غلہ حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اکثر صورتون مین انسان کی معمولی مقدار غذا کا نصف سے زیادہ نہین ہوتا ہے، اس پر بھی وقتاً فوقتاً تخفیف و تقلیل کی دھمکی اور اطلاع شائع ہوتی رہتی ہے، کہ بس ایک مہینہ یا دو مہینہ کا غلہ رہ گیا ہے، اور آیندہ فلان مہینہ بڑا نازک آنے والا ہے، امریکہ جو دنیا کا سب سے دولتمند و خوشحال ملک ہے ابھی (۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء) پائیونیر مین وہان کے غذا و زراعت کے ڈائرکٹر جنرل کا بیان چھپا ہے، کہ

"اس موسم سرما مین ایسے شدید قحط سے دوچار ہونا ہے، جو دنیا مین کبھی نہ پڑا ہوگا، اور جس کا مقابلہ ہر طرح کی معاشی تدابیر اور قومی و بین الاقوامی اجتماعی جد وجہد ہی سے ممکن ہوگا"

انسان نے جس طرح اپنے خالق سے منہ موڑا ہے، اس کی سمجھ مین تو آنا اب مشکل ہے، لیکن راقم ہذا کو یہ روز افزون و عالمگیر قحط نہین، بلکہ عالمگیر قہر ہی نظر آرہا ہے، اور قرآن مجید مین جابجا جو رزق و رزاقیت کا ذمہ بالکلیہ حق تعالیٰ نے خود لے کر، نہ صرف یہ کہ انسان کو عبدیت و بندگی کے لئے فارغ و بے فکر فرمانا چاہا ہے، بلکہ غور کیجئے تو اس دنیا مین اس کی سب سے جامع الصفات صفت ربوبیت کا سب سے بڑا اور نمایان مظہر رزاقیت ہی ہے، اور انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر بالکلیہ اپنے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر، نہ صرف اللہ تعالیٰ کی اس صفت خاصہ مین اپنے کو شریک و سہیم ٹھہرا رہا ہے، بلکہ دراصل خدا کی خدائی چھین کر خود خدا بن بیٹھا ہے، اس کے بعد اگر اسی کا قہر و عذاب اسی قبض رزق کی راہ سے ظاہر ہو، تو عین سنۃ اللہ ہے،

اپنا تجربہ تو اپنے اکثر عزیزون دوستون کے انفرادی واقعات تک مین یہی ہے اور جو بھی ذرا غور کرے گا اسکو تجربہ ہوگا کہ معاش و رزق کا معاملہ کچھ من حیث لا یحتسب ہی ظاہر ہوتا ہے،

اور تدبیر کے تیر بالعموم اپنے نشانہ سے ہٹ کر ہی گرتے ہین، بارہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم مین بھی طالبعلمی مین جن کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا، وہ کچھ نہ ہوسے، اور جن کو انھون سمجھا گیا، وہ ان ہونہارون سے میدان معاش مین کہین آگے نکل گئے، یہی تجارت وغیرہ ہر چیز مین مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہین، وہ رہجاتی ہے، اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہین، وہ چل جاتی ہے، یا توہون نکالئے بعد الوقوع تو ہر واقعہ مین نکال لئے جاسکتے ہین (باقی)

حیاتِ شبلی

حصہ اول

مولانا سید سلیمان ندوی

یہ نوسو صفحون کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہین بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی ادبی، سیاسی تعلیمی مذہبی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ مین بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہین، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا اور شروع مین ایک دیباچہ ہے، جس مین جدید علم کلام کی نوعیت اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم اور ان کے متقدمین، او معاصر علما رکی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس مین دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے لکھا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علمار کے حالات بھی آگئے ہین، اس کے علاوہ دارالمصنفین ندوۃ العلماء مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتون کے ہاف ٹون بلاک بھی شامل ہین،

کاغذ، کتابت وطباعت اعلی، ضخامت ۹۲۰ صفحے،

قیمت، غیر مجلد ہے، مجلد لعہ، علاوہ محصولڈاک۔

"منیجر"

اردو زبان کا غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی ادب

از

جناب مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

(۲)

مذہبی کتابوں سے ہندو عورتوں کی تقریروں کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی ہندو اہل قلم نے فارسی عربی کے وہ الفاظ جو اردو میں قبول عام ہو چکے تھے، بے تکلف استعمال کئے ہیں، راماین کا وہ سین بہت مشہور ہے جس میں برج نراین چکبست نے رام چندر جی کا اپنی ماں سے رخصت ہونا دکھایا ہے، اس کے چند بند جن میں ماں کی گفتگو ہے، ملاحظہ ہوں،

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جان
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں

سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید
اندھا کئے ہوے ہے زرو مال کی امید

انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزان مثال بید

لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر مین اگر جنم — ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم — تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
مین خوش ہون پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہین تو آگ لگاؤن گی راج کو

کن کن ریاضتون سے گذاری ہین ماہ و سال — دیکھی تمھاری شکل جب اے میرے نونہال
لائی دلھن بیاہ کے شادی ہوئی کمال — آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہون اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا مین نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئین گے نظر — گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر — یہ جائے صبر تھی کہ دعا مین نہین اثر
لیکن یہان تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ — منجدھار مین جو یون مری کشتی ہوئی تباہ
آئی نظر نہین کوئی امن و امان کی راہ — اب یان سے کوچ ہو تو عدم مین ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے"

رام چندر جی سے مشکل بن باس مین ساتھ چلنے کی اجازت حاصل کر کے سیتا جی اپنی خوشدامن رانی کوسلیا سے رخصت ہونے جاتی ہین، اور وہ اُن کو عزم سفر سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہین، اس منظر کو منشی شنکر دیال فرحت نے اپنے منظوم ترجمہ رامائن مین بڑی خوبی سے دکھایا ہے، (مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶ء)

یہاں پیچ پیدا گیسوے سخن ہے	جبینِ صفحہ پر ثابت شکن ہے
ورق ہے صورتِ سطر کشیدہ	دوات آسا قلم ہے آبدیدہ
بیانِ رخصت و عزم سفر پہ	حروف تازہ خاک افشاں ہیں سر پر
جناب جانکی نے جب سنا حال	تو جوشِ گریہ سے آنکھیں ہوئیں لال
ہوئی آسایشِ خاطر فراموش	اڑا اوجِ ہوا پہ طائرِ ہوش
نہ تھا ضبط شکیبائی کا یارا	ہوئی شوہر کی فرقت ناگوارا
حیا نے آکے دامن کو لیا تھام	مگر جوشِ محبت نے کیا کام
خیال آیا کہ ہمراہی میں رہئے	صبا بن کر ہوا خواہی میں رہئے
پئے پابوسیِ خوشدامنِ خاص	ہوئیں حاضر براہِ لطف و اخلاص
کہا مجھ کو بھی ارشادِ سفر ہو	کہ تسکینِ دل و جان و جگر ہو
سنی جس دم یہ خوشدامن نے گفتار	کئے دامن کے پرزے جیب کے تار
کہا رو کر کہ اے سرمایۂ عیش	نباتے نازکی پیرایۂ عیش
تمھیں سے قالبِ جاں میں ہے جان	تمھیں سے مشکلِ لاحل ہے آسان
تمھیں ہو رونقِ کاشانۂ دل	تمھیں نورِ چراغِ خانۂ دل
مکانِ بادشاہی میں کرو چین	رہو دل میں مثالِ مردمِ عین
متاعِ ننگ و ناموسِ شہنشاہ	کرو غارت نہ بن میں جا کے ہمراہ
سفر میں اصلِ بیم و ضرر ہے	حقیقت میں سفر شکلِ سقر ہے
کہاں پائے حنائی رشکِ گلزار	کہاں نشتر صفت نوکِ سرِ خار
کہاں یہ چہرۂ پرنور کا نور	کہاں وہ ظلمتِ شبہائے دیجور

رگ گل پائے نازک میں جو گڑ جائے جبین پر چین تسکن ابرو پہ پڑ جائے" (صفحہ ۱۲۰)

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی مشہور کتاب "رگ وید آدی بھاشی بھومکا" یعنی رگوید کی تفسیر کا اردو ترجمہ منشی رام جگیا سو نے کیا ہے، جس کی پہلی جلد ۱۸۸۱ء میں مطبع ست دھرم پرچارک جالندھر سے شائع ہوئی تھی، اس کے بعض حصے سوال و جواب کے پیرایہ میں ہیں، ایک مقام کا اقتباس حسب ذیل ہے، قوسین کی عبارتیں خود مترجم کی ہیں :-

"وید کے ظاہر کرنے میں پرمیشور کی کیا غرض تھی،

سوال :- یہ فرمائیے کہ وید کے پیدا کرنے میں ایشور کی کیا غرض تھی،

جواب : ویدوں کے نہ پیدا کرنے میں اس کی (پرمیشور کی) کیا غرض (ہوسکتی) تھی، اگر تم یہ کہو کہ اس کا جواب تم نہیں جان سکتے تو بالکل ٹھیک ہے اب ویدوں کے ظہور کی جو غرض ہے وہ سنئے :-

سوال : ایشور میں کیا انت و دیا (لا محدود علم) ہے یا نہیں ؟

جواب : ہے،

سوال : اس کی وہ ودیا کس مطلب کے لئے ہے ؟

جواب : اپنے ہی مطلب کے لئے (جس سے کہ جہان کے پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا کام ہوتا ہے)،

سوال : اچھا یہ بتلایئے کہ آیا ایشور پراوپکار کرتا ہے یا نہیں،

جواب : (پراوپکار) کرتا ہے، پھر اس سے کیا مطلب،

(نتیجہ) اس سے یہ مطلب ہے کہ علم اپنی اور دوسروں کی مطلب برآری کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ علم کا یہی وصف ہے، اگر ہم لوگوں کے لئے پرمیشور ودیا (علم) کا اپدیش نہ کرے تو

ودیا کے دونون وصفون مین سے ایک وصف (یعنی پروپکار) بے معنی ہو جائے گا، اس لئے

پرمیشور نے اپنی ودیا وید کے اپدیش سے یہ مطلب (یعنی پروپکار) سدھ کیا ہے، پرمیشور باپ

کی طرح ہم لوگون پر بڑی عنایت رکھتا ہے جس طرح پر کہ باپ اپنی اولاد پر ہمیشہ مہربان

رہتا ہے، اسی طرح پرمیشور نے بھی بے غایت مہربانی سے سب انسانون کے لئے وید کا

اُپدیش کیا ہے، اگر پرمیشور ایسا نہ کرتا تو انسان دھرم، ارتھ، کام، اور موکش کے بغیر

پرم آنند (یعنی راحتِ حقیقی) سے بھی محروم رہتا ...." (ص ۲۴، ۲۵)

پنڈت جنیشور پرشاد مائل دہلوی کی کتاب حسن اوّل کا ذکر اوپر آچکا ہے، موصوف جین مذہب

کے پیرو معلوم ہوتے ہین، کیونکہ یہ کتاب سنٹرل جین پبلشنگ ہاوس، آرہ سے شائع ہوئی ہے، اس مین

جین، بودھ اور ہندو مذہب کے فلسفہ اور علم اخلاق کا نچوڑ ہے، اس کے پہلے باب کا ایک اقتباس ذیل

مین درج کیا جاتا ہے جو "وقت" کے زیرِ عنوان لکھا ہے، یہ عبارت اُس شخص کے قلم کی ہے، جو مسلمان

نہین ہے لیکن اُردو کو اپنی "مادری زبان" کہتا ہے، اور "اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک

سعادتمند اولاد کی طرح" اپنا فرض سمجھتا ہے :-

"غرض اس تغیرات کے سمندر مین کیا جاندار کیا بیجان ایک صورت پر کسی کو بھی قرار نہین ہم

شکل وضع اور حال وخیال ایک ایک لمحے ادلتے بدلتے رہتے ہین، وقت ایک پرندہ ہے کہ

کہ برابر اُڑا چلا جاتا ہے، اور اس سرعت سے اُڑتا ہے کہ نگاہین دیکھ نہین سکتین، کان اس کے

پر دن کی سرسراہٹ سن نہین سکتے ہان اس کی گردن مین ایک گھنٹی بندھی ہے جس کی آواز

سے اپنی رفتار کا امتیاز اہلِ دنیا کو کراتا جاتا ہے، اور سامانِ دنیا کو نئے سے پرانا اور پرانے

سے نیا بناتا جاتا ہے، اس کے پنجون مین ان گنت دھاگے الجھے ہوئے ہین، یہ جاندارون

کے رشتہ حیات ہین، جو پرواز کے ساتھ کھنچے چلے جاتے ہین، اس مین جس کی صدا آجاتی ہے"

ٹوٹ جاتا ہے، اسی کو موت کہتے ہیں جس پر کسی کو اختیار نہیں ہے سے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اور لفظِ انتقال کے معنی نقل و حرکت کرنا ہے، حاصل کلام یہ کہ دنیا ایک پرشور سمندر ہے جس میں ہوا کے زور سے کہیں مینڈھا اچھل رہا ہے، کہیں بھنور پڑ رہا ہے کہیں پانی پہاڑوں سے ٹکراتا ہے، اور کہیں یک رُخا بہا چلا جاتا ہے، کسی جگہ فطرتی دلچسپیوں نے منظر کو حد سے زیادہ دل آویز بنا دیا ہے، اور کسی جگہ ناگہانی حادثوں نے وہ ڈراونا اور ہونک سین دکھایا ہے، کہ جی دہلا جاتا ہے، دم بھر میں قطرے سے بھاپ، بھاپ سے بادل، بادل سے پانی، اور پانی سے دریا بن جاتا ہے، کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں چمن شاداب ہوتے ہیں، سبزے لہکتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، جو نگاہوں کو مسرور اور دلوں کو تازہ کر دیتے ہیں یہی نیچر کی دلچسپیاں ہیں، جو ایک آن واحد میں اپنے حُسن کے جلوے دکھا کر اسی عالم میں محو ہو جاتی ہیں یعنی چشم زدن میں اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے،" (ص ۶-۷)

مذہبی اخلاق پر جو کتابیں ہندوؤں نے لکھی ہیں، اُن میں تو سنسکرت کے الفاظ بہت ہی کم ملتے ہیں، اور بعض تو بالکل اردوے معلی کی زبان میں لکھی گئی ہیں، مثلاً اخلاق برجباشی جو راے برجباشی لعل نے ۱۸۷۵ء میں لکھی تھی، اور مطبع رفاہ عام، سیالکوٹ میں چھپی تھی، اس کتاب کو مصنف نے یوں شروع کیا ہے

"ھوالغنی

"شکر اور احسان ہے اس بادشاہ کا جس کا حکم کل زمین و آسمان اور جہان و جہانیان پر ظاہر ہے اور جس کی سلطنت کی حد و انتہا کا بیان زبان انسان اور قلم و زبان سے باہر ہے، آبادی بائن تا دی کہ تمام خلائق جن و ملائک اور انسان و حیوان کا شمار نہیں، اور جانوران درندہ و گزندہ اور چرندہ و پرندہ کا حصار نہیں، انتظام باین خوبی و انصرام کہ بحر و بر اور کوہ و شجر سب اپنی

اپنی جگہ برقرار ہین، اور شمس و قمر اور کواکب و اختر سب زیر و زبر روشنی کے آثار ہین، عدل و انصاف نہایت صاف کہ گوناگون صورت اور سیرت آدمیون کے دیدار اور کردار سے درجہ بدرجہ دکھلائی دیتی ہین، اور بوقلمون شکل و شمائل جانورون کی گفتار اور رفتار سے علحدہ علحدہ معلوم ہوتی ہین، قدرت بایں ندرت کہ کوئی حاکم کوئی محکوم، کوئی خادم، کوئی مخدوم، کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ ہے، اور بعض پاک بعض مذموم بعض فیاض بعض شوم بعض پست ہمت اور بعض بالا ہمت" (ص)

تیسرے باب مین والدین کی خدمت گذاری کا حق بیان کرتے ہین :-

چونکہ ماں باپ کے فرائض تمام عمر اُن کی خدمت کرنے سے بھی ادا نہین ہو سکتے، لہٰذا اولاد پر فرض ہے، کہ ماں باپ کی تمام عمر خدمت کیا کرے، اور یہی عمدہ عبادت سمجھا کرے، کیونکہ ماں باپ کی خدمت جملہ عبادات سے افضل تر عبادت ہے اور ان کی رضا جوئی سے سعادت اور خدمت گذاری سے جنت ہے، مناسب ہے کہ والدین کو اپنی خوش گفتار اور نیک کردار سے خوش کرو، اور مال و متاع و زر و نقد جو کچھ اُن کو ضرورت ہو، بے طلب موجود اور مہیا کرو، اور سچے دل سے خدمت مین مستعد رہو،......" (ص ۲۵)

"اخلاقِ ہندی" کے نام سے ایک مثنوی منشی کنھیا لال ہندی تخلص نے لکھی تھی، جو ۱۸۷۷ء مین لاہور مین چھپی، اس کی زبان کی روانی و سلاست قابلِ داد ہے، شروع مین حمد کے اکتیس شعر ہین، پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر حمد شروع کرتے ہین، نمونہ یہ ہے :-

بنامِ خداوند ملکِ جہان	خبر گیر احوال خرد و کلان
بنا نور سے جس کے شام و پگاہ	ہوا جلوہ گر جلوۂ مہر و ماہ
اُسی سے ہوا نیستی کا وجود	بنا بود سے اس کے ہستی کا بود
اُسی سے ہے ارض و سما کا ظہور	اسی سے ہے صبح و مسا کا ظہور

اکیلا ہے وہ وحدہٗ لاشریک نہیں دوسرا کوئی جس کا شریک
وہ خالق کہ ہے جس کی خلقت تمام وہ حاکم کہ محکوم ہیں خاص و عام
وہ ستار جو ساترِ عیب ہے وہ علّام جو عالم الغیب ہے
وہ فتّاح مشکل کشائے جہان وہ مشکل کشا حامیِ بندگان
یہ وحدت کہ ثانی نہیں دوسرا یہ کثرت کہ ہے سب میں جلوہ نما
میں کیونکر لکھوں وصف ایزد تعال میں مخلوق وہ خالقِ لایزال
میں محتاج وہ شاہِ شاہنشہان میں عاجز وہ پروردگارِ جہان
وہ خورشید پر نور اوجِ کمال میں ہوں زار و ناقص تشکلِ ہلال
میں ہوں بندۂ زار و کم اقتدار سراپا خطا ہندی خاکسار (ص ۳)

اس کے بعد رام چندر جی اور سری کرشن جی کی مدح ہے، پھر نعتیہ اشعار اس طرح لکھے ہیں:-

"درنعت سرور کائنات خلاصۂ موجودات جناب محمد علیہ السلام"

شفیعِ جہان رہبر خاص و عام جنابِ محمد علیہ السلام
جنابِ محمد رسولِ امین عیاں جس سے ہے علم عین الیقین
جنابِ محمد رسولِ خدا باطوار نیکو قبولِ خدا
محمدؐ حمید و محمد کریم، محمد علیم و محمد سلیم
نبی الوریٰ شاہِ شاہنشہان امین الہدیٰ رہبرِ گمرہان
ہوئی پست فرمان جس کی زمین نگوں ہے اطاعت میں چرخِ برین
سراپا عرب جس کے فرمان گذار عجم سر بسر بندۂ جان نثار
.... (ص ۸)

تیرھوین باب مین تواضع کا بیان ہے :-

تواضع کرے جو کوئی آدمی ہے انسان مین انسان وہی آدمی

تواضع سے عزت ہے تکریم ہے تواضع سے حرمت ہے تکریم ہے

تواضع سے ملکِ دل آباد ہو تواضع سے اندوہگیں شاد ہو

تواضع سے بدخواہ ہو نیک خواہ تواضع سے گمراہ ہو اہلِ راہ

تواضع سے ہو سرد نارِ غضب فرو اس سے ہووے شرارِ غضب

تواضع سے حاصل ہے حق کی رضا تواضع سے ہو دور رنج و بلا

.... (ص ۱۰۵)

سکھون نے بھی اپنی مذہبی کتابین جو اُردو مین ترجمہ یا تالیف کی ہین، اُن کی زبان بھی وہی ہے، جسے آج صرف مسلمانون کی زبان کہا جاتا ہے، سکھ مذہب کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب ہے، اس کا پورا ترجمہ تو اردو مین ابتک نہین ہوا ہے، (غالباً ضخامت کی دشواری سے) لیکن اس کے اہم حصون کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہین، منجملہ اُن کے "سری جپ جی صاحب" ہے، مجھے لاہور مین گرنتھ صاحب کا ایک قدیم ترجمہ ملا جو گیان پریس گوجرانوالہ کا مطبوعہ ہے[1] اور جس مین کتاب کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ بڑی تقطیع کے (۱۴۲) صفحات پر چھپا ہے، ممکن ہے اس سلسلہ کی دوسری جلدین بھی طبع ہوئی ہون، مگر وہ دستیاب نہین ہوئین، اس مین جپ جی کا جو گرو نانک کی تصنیف ہے، ترجمہ اس طرح کیا ہے :-

"سری آدگرنتھ صاحب سری جپ جی صاحب

ایک اونکار ست نام کرتا رپورکھ

نربھو نربیرا کال مورت اجونی سے بھن

گور پرشاد

[1] کتاب پر سنہ طباعت وصفحہ نمبر نہیں، لیکن نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہے

۱۔ واحد مطلق یا مظہر صفات ثلاثہ یا محض حق یا فاعلِ کل وہی ذات پاک ہے، جو خوف اور عداوت اور موت اور حدوث سے پاک اور جنم اور مرن یعنی تناسخ اور آواگون سے آزاد اور مظہرِ رحمتِ مرشدی ہے،

جپ ۔   آد سچ جوگ آد سچ ہے بھی

سچ نانک ہوسی بھی سچ

ورد کر کہ ازل مین بھی حق تھا، اور عالم سفلی سے پہلے بھی حق تھا، اور اب بھی وہی حق ہے، اور اے نانک آیندہ بھی وہی حق ہوگا،

پوڑی اوّل

سوچے سوچ نہ ہوئے جے سوچے لکھ بار

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

۲۔ حکم رضا مین چلنا نانک لکھیا نال

(۱) خواہ کتنی ہی سوچ کرے تو بھی آپ نہین سوچ سکتا، جو سوچنے کا حق ہے، خواہ لاکھون بار سوچا کرے،

(۲) خواہ کیسی ہی خاموشی اختیار کرے تو بھی آپ چپ نہین ہوسکتا، خواہ کیسی ہی خاموشی کی حالت پیدا کرے،

(۳) اگر بھوکا ہو اور کوشش سے بے شمار اغذیہ و اطعمہ کو جمع کرے، تو بھی اپنی بھوک کو رفع نہیں کرسکتا، اور دوسرے معنی اس کے یہ بھی ہوسکتے ہین کہ کوئی اپنی احتیاج کو آپ سے آپ رفع نہین کرسکتا گو بڑے بڑے سامان حاجت روائی کے جمع کرے،

(۴) ہزارون دانائیان ہون اور لاکھون علوم کے ماہر ہون تو بھی کوئی دانائی کارگر نہین ہوسکتی، مراد یہ کہ کوئی حکمت قدرت کا مقابلہ نہین کرسکتی،

(۵) اگر کوئی پوچھے کہ عارف راست باز کیونکر ہون اور جہل کا ذہ کی قید کیونکر ٹوٹے،

(۶) تو اس کا جواب سری نانک جی دیتے ہین، کہ رضا و تسلیم کو اختیار کرے اور ملائم و غیر ملائم کو حکم الٰہی سے جانے،

بہ درد و صاف ترا حکم نیست دم درکش ۔۔۔ کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

رضا بدادہ بدہ وز جبین گرہ بکشا، ۔۔۔ کہ بر من و تو در اختیار نہ کشاد است (ص)

گرنتھ صاحب کے ایک اور مشہور حصہ سکھ منی صاحب کا ترجمہ[1]

"سرور روحانی" کے نام سے بھائی دیارام عاکف نے کیا ہے، جو "پنج گرنتھی" اور گرو نانک کی مشہور ضخیم سوانحمری "جنم ساکھی بھائی بالا والی" کے بھی مترجم ہین، اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے،

"شلوک اول ۔ ایک اونکار ست گور پرشاد

ایک ہی اونکار ہے جو مرشد حقیقی کی رہنمائی اور نظر عنایت سے حاصل ہو سکتا ہے، جو لاتعین سے تعینات مین آیا، اور نرگن سے سرگن ہوا، اور عقل کل اور ہرن گربھ پرجاپت وغیرہ نامون سے موسوم ہوا، وہ اونکار ہے، برہما، وشنو، شیو، ست، رج، تم، شہوت، غضب، تمیز، جسم کل، نفس کل، عقل کل، ناسوت، ملکوت، جبروت، جاگرت، سپن، سکھوپت، دوزخ، بہشت، اعراف، مرت لوک، تدہ لوک، سرگ لوک، غرض کہ جتنی اشکال گوناگون نمایان اور ظاہر ہین اور جو حواس خمسۂ ظاہری سے محسوس ہوتا اور روپ رس گندھ شبد سپرش مین آتا ہے، سب اونکار ہے، سب کا مبدا اونکار ہے، سب اونکار سے پیدا ہو کر اُس مین رہتے، اور اس مین محو ہو جاتے ہین، اونکار اصل مین اُوم تھا، اوم کا تلفظ سنسکرت سے متعلق ہے، گو بظاہر اس مین تین حرف ہین، الف واو، میم لیکن

---

[1] مطبوعہ گیان پریس گوجرانوالہ، طباعت کا سنہ اس پر بھی درج نہیں ہے، لیکن دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ۱۹۳۵ء مین کیا گیا تھا،

ایک نون غنہ بھی ہے، جو با ہمہ اور بے ہمہ ہے، اور اسکا نام سنسکرت مین اردہ ماترا ہے۔ یہ نون غنہ وہی ہی جس کو نقطۂ مفروضہ اور جزء لایتجزی کہتے ہین، اور اس کی کچھ مقدار نہین، مگر سب مقدارین اسی سے پیدا ہوئی ہین، جتنی مقدارین اور مفروضات ہین، سب کو فنا لازم ہے، مگر وہ مفروض ذہنی جو صورت و شکل سے منزہ اور نام و ذات سے پاک ہی لازوال اور باقی ہے، جملہ اشکال محسوسات کو اونکار یعنی ایزد لایزال سے وہ نسبت ہی جو ادم یعنی آکار اور کار مکار کو نون غنہ سے ہی" (ص ۱۹-۲۰)

مسیحی مشنریون نے ہندوستان آکر اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جس زبان کو وسیلہ بنایا وہ یہی مشترکہ زبان تھی، جس کو پہلے ہندوستانی اور اب اُردو کہتے ہین، اُن کی اُردو مطبوعات کی کثرت سے اس زبان کے پڑھنے والون کی کثرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، انڈیا آفس کی فہرست کتب اُردو مین جو ۱۹۰۰ء مین چھپی تھی، مسیحی مطبوعات کی تعداد (۴۸۶) ہے، اور پنجاب ٹریکٹ بک سوسائٹی لاہور کی فہرست مین جو ۱۹۲۶ء مین مرتب ہوئی ہے، سوسائٹی اور بعض دیگر مسیحی ادارون کی کتابون کا شمار (۵۱۹) ہے، اس مین زیادہ تر خود سوسائٹی کی کتابین ہین، ہندوستان کی دوسری زبانون مین عیسائیون نے بہت تھوڑی کتابین شائع کی ہین، اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اُردو کو ملک کے بڑے حصہ کی زبان سمجھتے تھے، اور اسی کے ذریعہ یہان کے باشندون کی اکثریت کو اپنا پیغام پہنچا سکتے تھے،

اس مقالہ کی ترتیب کے سلسلہ مین مجھے عیسائی مذہب کی سوا سو سے زیادہ کتابین دیکھنے کا موقع ملا، زبان کے لحاظ سے یہ سب نہایت سلیس اور صاف عبارت مین لکھی گئی ہین، ہندو، جین، اور سکھ مذہب کی کتابون مین تو مذہبی مصطلحات کے لئے سنسکرت کے الفاظ اکثر ناگزیر طور پر استعمال کیے گئے ہین، گو بعض مؤلفین اور مترجمین نے اُن کے ترجمے بھی عربی یا فارسی اصطلاحات مین ساتھ ساتھ دیدیے ہین لیکن عیسائیون کی اردو کتابون مین مذہبی مصطلحات کے لئے بھی عربی یا فارسی کے علاوہ مجھے کسی دوسری زبان کا لفظ نہین ملا، معلوم نہین گارسان دتاسی نے کس بنا پر لکھا ہے کہ مسیحی تصانیف مین انگریزی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے جاتے ہین، وہ اپنے چوتھے مون

خطبہ میں لکھتا ہے :۔

"اہلِ ہند نے اپنے ہاں انگریزی زبان کے بہت سے لفظ رائج کرلئے ہیں بعض اوقات تو اُن کی زبان میں لفظ موجود ہوتا ہے، جب بھی وہ ہم معنی انگریزی لفظ کو ترجیح دیتے ہیں .... اُ بہت سارے انگریزی الفاظ پیش کئے جاسکتے ہیں جنھیں اہلِ ہند خود اپنے لفظوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور بہتر سمجھتے ہیں، چنانچہ مرزاپور کا اخبار "خیرخواہِ ہند" اس قسم کی ہندوستانی میں ہوتا ہے جس میں انگریزی الفاظ کثرت سے کھپائے جاتے ہیں، مشنریوں کی بیشتر تصانیف جو مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کے لئے شائع ہوتی ہیں، اسی طرز کی زبان میں ہوتی ہیں" [له]

اُردو میں عیسائی مذہب کی سب سے قدیم کتاب جو مجھے ملی، وہ "صلوٰۃ الجماعت" کی کتاب ہے، یہ چرچ مشن پریس، کلکتہ میں ۱۸۴۳ء میں چھپی تھی، قدیم نستعلیق ٹائپ میں ہے، جیسا کہ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کا ہوتا تھا، اس میں مختلف دنوں اور مختلف موقعوں اور وقتوں کی دعائیں تفصیل کے ساتھ درج ہیں، اس کے علاوہ کلیسا کے رسوم و دستور کی تفصیل بھی دی ہے، شروع کا ایک اقتباس حسبِ ذیل ہے :۔

"نمازِ صبح کے احکام

برس کے ہر دن

"صبح کی نماز کے آغاز میں خادمِ دین بلند آواز سے کتاب کی ان آیتوں میں سے ایک یا کئی آیت پڑھے تس پیچھے اُس عبارت کو جو اس کے بعد مندرج ہے،

جب بد آدمی اپنی بدی سے جو کہ اُس نے کی ہو، باز آوے اور اعمال فرض و مستحب کو بجا لاوے تب وہ اپنی جان جیتا بچائے گا، (حزقیال - ۱۸ - ۲۷)

میں اپنے گناہوں کا مقر ہوں، اور میرا گناہ ہمیشہ میرے سامنے ہے، (مزمور ۵۱ - ۳)

میرے گناہ سے چشم پوشی کر اور میری ساری بدیوں کو محو کر، (آیت - ۹)

له خطبات گارساں دتاسی شائع کردہ انجمن ترقی اردو ص ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹

"خدا کی قربانیاں آشفتہ حالی ہے، اے خدا تو دل شکستہ اور تائب کو حقیر نہ جانیگا" (۱۷-آیت)

اپنے دل کو چاک کرو اور نہ اپنے گریبان کو اور اپنے خداوند کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ وہ رؤف اور

حلیم اور رحیم ہے، اور رنج پہنچانے سے ملول ہوتا ہے، (یوئیل ۲-۱۳)

رحمتیں اور آمرزشیں ہمارے خداوند خدا ہی کی ہیں، گو کہ ہم اُس سے باغی ہوئے ہیں، اور

نہ ہم نے اپنے خداوند خدا کے فرمان کو مانا، اور نہ ہم اُس کے شرائع پر جو کہ اُس نے ہمارے لئے مقرر

کئے ہیں، چلے ہیں، (دانیال ۹-۹-۱۰)

اے خداوند معذوب کر مجھے نہ ساتھ عدل کے اور نہ از راہ خشم کے مبادا تو ہمیں معدوم کر ڈالے، (یرمیاہ ۱۰)

توبہ کرو، کیونکہ آسمان کی سلطنت آن پہنچی، (متی ۳-۲)

میں اٹھ کر اپنے باپ کے پاس جاؤنگا، اور اُسے کہونگا کہ اے باپ میں آسمان کا اور

تیرا گنہگار ہوں اور اب میں اس قابل نہیں کہ تیرا بیٹا کہلاؤں" (لوقا ۱۵-۱۸-۱۹)

اے خداوند اپنے بندے سے محاسبہ ساتھ عدل کے نہ لے، کیونکہ تیرے حضور کوئی بشر بےگناہ

نہیں ہو سکتا، (مزمور ۱۴۳)

اگر ہم کہیں کہ ہم بےگناہ ہیں، تو ہم اپنے تئیں فریب دیتے ہیں، اور صداقت نہیں رکھتے،

لیکن اگر ہم اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو وہ اپنے صدق اور عدل سے ہمارے گناہوں کو

معاف کرے گا، اور ہر نوع کی ناراستی سے پاک کرے گا" (۱-۸-۹)

اے پیارے بھائیو، کتاب کے کئی مقام سے ہمیں نصیحت ہے کہ ہم اپنے بےشمار گناہوں

اور بدیوں کا اعتراف اور اقرار کریں، اور ہم خدا سے تعالی کے حضور جو ہمارا آسمانی باپ ہے

ریا اور اخفا کے ساتھ درپیش نہ آئیں، بلکہ عجز و انکسار اور توبہ اور اطاعت دلی سے مقر ہوں

تاکہ اس کی خوبی و رحمت غیر متناہی سے ہم عفو پائیں، اور اگرچہ ہم پر لازم ہے، کہ ہر وقت

بعجز و انکسار ہم خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کریں، مگر خصوصاً اس وقت زیادہ تر لازم ہے جب کہ ان بڑی نعمتوں کی شکرگذاری کے لئے جو کہ ہم نے اس کے ہاتھوں سے پائیں، اور اُس کے لائق کی مدح کرنے کے لئے اور اس کے کلام اقدس کے سننے کے لئے اور اُن چیزوں کے مانگنے کے لئے جو کہ ہمارے جسم و روح کے لئے مطلوب اور ضروری ہیں ہم باہم اکٹھے ہوں پس میں تم سب کی جو یہاں حاضر ہوتی ادو سماجت کرتا ہوں کہ میرے ساتھ صدق دل اور عجز کی آواز سے آسمانی فضل کے تخت کے حضور پیچھے پیچھے کہو،

اعتراف عام،

ساری جماعت جاثیاً خادم دین کے پیچھے پیچھے کہے،

"اے قادر مطلق اور رحیم باپ ہم مثل گم شدہ بھیڑ کے تیری راہ سے بہکے اور بھٹکے ہیں، اور ہم اپنے دلوں کی ہوا و ہوس کی طرف بہت ہی متوجہ ہوئے ہیں اور ہم تیری شرع مقدس کے مخالف ہوئے ہیں اور ہم ان چیزوں کو نہ بجا لائے جن کی ادا ہم پر فرض تھی اور ہم نے ان چیزوں کو کیا جن کا ذکر کرنا ہمیں مناسب تھا اور ہمارے پاس کچھ عافیت نہیں ہے، مگر تو اے خداوند ہم سے شکستہ حال گنہگاروں پر رحم کر، معاف رکھ انھیں اے خداوند جو اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، اور پھر مقبول کر انھیں جو کہ توبہ کرتے ہیں، موافق اُس عہد و پیمان کے جو تو نے بوسیلہ ہمارے خداوند مسیح عیسیٰ کے انسان سے کیا ہے اور اے بڑے ہی رحیم باپ اس کے طفیل سے بخش کہ آئندے کو ہم پرہیزگاری اور نیکوکاری اور پاک دامنی کے ساتھ زندگی بسر کریں، تاکہ تیرے اسم اقدس کا جلال ظاہر ہو۔ آمین

گناہوں کا عفو تیس کھڑا ہو کر پڑھے اور جماعت جاثی رہے۔" (ص ۱-۵)

انجیل اور توریت کے متعدد ترجمے دیکھنے میں آئے، ان میں سب سے قدیم ترجمہ جو میری نظر سے گذرا، وہ ۱۸۳۹ء کا ہے، اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے :-

"کتاب مقدس کا آخری حصہ یعنی خداوند یسوع مسیح کی انجیل جو متی، مارک، لوک، اور یوحنا سے لکھی گئی تھی، اور رسولون کے اعمال اور نصیحت اور نبوت کے خطوط، یونانی زبان سے اردو زبان مین ترجمہ کیا گیا، کلکتہ، انگریزی، اور امریکے کی دینی مجلس کی مدد سے بابٹسٹ مشن چھاپہ خانے میں چھاپا گیا ۱۸۳۹ء یسوعی"

یہ ترجمہ ٹائپ مین چھپا ہے، اور (۸۲۲) صفحات پر مشتمل ہے، عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"پھر وہ وہان سے اٹھ کر یردن کے پار یہودیہ کی سرحد مین آیا، اور جماعتین آس پاس پھر جمع ہوئین، اور وہ اپنے طور پر پھر انھین نصیحت کرنے لگا، اور فروسیون نے اس پاس آکے امتحان کی راہ سے اس سے پوچھا کیا عورت کو مرد کا چھوڑنا روا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ موسیٰ نے تمھین کیا حکم دیا، وے بولے، کہ موسیٰ نے طلاق نامہ لکھ کے طلاق دینے کی اجازت دی، تب یسوع نے جواب دیا، کہ اوس نے تمھاری سخت دلی کے سبب سے تمھارے لئے وہ بات لکھی، لیکن خلقت کی ابتدا سے تو خدا نے انھیں ایک نر اور ایک مادہ بنایا، اس سبب سے آدمی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کے اپنی جورو سے ملا رہے گا، اور وے دونون ایک تن ہون گے، سو وے اب دو تن نہین، ایک تن ہین، اس لئے جسے خدا نے جوڑا کیا ہے، آدمی جدا نہ کرے، گھر مین اس کے شاگردون نے اس کے حق مین پھر اس سے پوچھا، اس نے انھین کہا، جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑے، اور دوسری سے بیاہ کرے، تو اپنی جورو کے برخلاف زنا کرتا ہے، اور اگر جورو اپنے شوہر کو چھوڑ دے، اور دوسرے سے بیاہ کرے، تو وہ بھی زنا کرتی ہے"، (ص ۱۴۲)

اس کے بعد ۱۸۴۱ء کا بائبل پریس کلکتہ کا چھپا ہوا "ہمارے خداوند یسوع مسیح کا نیا وثیقہ" ہے، یہ بھی ٹائپ مین ہے، اور چھوٹی تقطیع کے (۵۵۳) صفحات پر مشتمل ہے، پھر اسی پریس سے "کتاب المقدس" کی پہلی جلد ۱۸۴۳ء مین اور دوسری ۱۸۴۴ء مین ایشیاٹک پریس کلکتہ سے شائع ہوئی، پہلی جلد مین جس کے صفحات کی تعداد

(۱۰۱۲) ہی، پیدایش سے آستر تک کا ترجمہ ہے، اور دوسری جلد مین جو (۴۲ ۷) صفحات کی ہے، ایوب سے ملاکی تک کا، سرورق پر لکھا ہے "ترجمہ عبرانی زبان سے زبان ہندی مین"، مگر اس زبان ہندی کا نمونہ یہ ہے:

"ابتدا مین خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی، اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا، اور خدا کی روح پانی پر جنبش کرتی تھی، اور خدا نے کہا کہ اُجالا ہو اور اجالا ہو گیا، اور خدا نے اُجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے، اور خدا نے اُجالے کو اندھیرے سے جدا کیا، اور خدا نے اجالے کو دن کہا اور اندھیرے کو رات کہا، سو شام اور صبح پہلا دن ہوا، اور خدا نے کہا کہ فضا پانیون کے بیچ فاصل ہووے، اور پانیون کو پانیون سے جدا کرے، تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیون کو فضا کے اوپر کے پانیون سے جدا کیا، اور ایسا ہی ہو گیا، اور خدا نے فضا کو آسمان کہا، سو شام اور صبح دوسرا دن ہوا، اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے پانی ایک جگہ جمع ہو دین، کہ خشکی نظر آوے، اور ایسا ہی ہو گیا، اور خدا نے خشکی کو زمین کہا، اور جمع ہوئے پانیون کو سمندر کہا، اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔" (ص ۱)

انجیل کا ایک اور ترجمہ ۱۸۴۹ء مین باپٹست مشن پریس کلکتہ مین چھپا تھا، اس کے سرنامہ پر اردو اور انگریزی مین یہ عبارتین درج ہین:-

"کتاب مقدس، یعنی خداوند یسوع مسیح کی انجیل جو متھی، مارک، لوک، اور یوحنا سے لکھی گئی تھی، اور رسولون کے اعمال اردو زبان مین"

"The Four Gospels and The acts in Hindu-stani. Translated from The greek.

اس سے ظاہر ہے کہ مترجم اردو اور ہندوستانی کو ایک ہی زبان سمجھتا ہے، اب اس زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

رسولون کے اعمال

پہلا باب

یسوع کا مریدون کو دکھائی دینا اور حکم دیکے آسمان پر جانا،

۱۔ اے تھیوفلس مین پہلی کتاب مین بیان کر چکا ان سب کامون اور نصیحتون کو جو یسوع کرتا رہا۔

۲۔ اس وقت تک کہ وہ روح قدس سے اپنے برگزیدہ رسولون کو حکم دیکے اوپر اٹھایا گیا:

۳۔ جن کے نزدیک اُس نے بعد اپنے مرنے کے اپنے تئین بہت سی دلیلون سے زندہ ثابت کیا کہ وہ چالیس دن تک انھین دکھائی دیکے خدا کی بادشاہت کی باتین کہتا رہا:

۴۔ اور انھین اکٹھا کرکے یہ حکم کیا، کہ یروشلم سے باہر نہ جاؤ، بلکہ جو وعدہ کہ باپ نے کیا جس کا ذکر تم مجھ سے سُن چکے ہو، اس کا انتظار کرو:

۵۔ کہ یحیٰی نے تو پانی مین غوطہ دلایا، پر تم تھوڑے دنون کے بعد روح قدس مین غوطہ دلائے جاؤگے،" (ص ۳۱۹)

اس کے بعد مرزا پور آرفن پریس کا چھپا ہوا "مقدس کتاب کا احوال" ہے، جسے ڈاکٹر بارتھ (Dr. Barth) کے جرمن نسخہ سے ریورنڈ جی ہوئرنلے (J. Hoernle) نے اردو مین ترجمہ کیا ہے، مجھے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ملا جو ۱۸۵۹ء کا مطبوعہ ہے، پھر اسی پریس کا ۱۸۶۱ء کا چھپا ہوا "ترجمہ مزامیر با شرح و تفسیر" تالیف پادری یوسف آون (Owen) ہے، ان دونون کی عبارت کا طرز بھی وہی ہے، جو مندرجۂ بالا اقتباسات کا ہے،

عیسائیون کی مذہبی کتابون مین سے ان چند کتابون کے حوالے صرف اس وجہ سے دیئے گئے ہین، کہ یہ سب گارساں دتاسی کے اس خطبہ سے پہلے شائع ہو چکی تھین، جس مین اس نے یہ بیان کیا ہے کہ مشنریون کی بیشتر تصانیف مین جو مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کے لئے شائع ہوتی ہین، انگریزی الفاظ

کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں، یہ خطبہ ۵ دسمبر ۱۸۴۴ء کا ہے، ۲ دسمبر ۱۸۶۱ء کے خطبہ میں وہ خود انجیل کے ایک "دلپذیر" اردو ترجمہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے،

"جیسا کہ میں اپنے پچھلے خطبہ میں کہہ چکا ہوں کہ برطانیہ اور ممالک غیر کی انجمن انجیل نے انجیل کا جو دلپذیر ترجمہ گزشتہ سال شائع کیا، اُسے یقیناً اردو زبان کی چوٹی کی کتابوں میں سمجھنا چاہئے، یہ ترجمہ اس لئے اور بھی عمدہ اور معتبر ہے، کہ ایک مشہور ہندوستانی فاضل نے اس کام میں ہاتھ بٹایا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس ہندوستانی فاضل کو اپنی زبان اردو کے علاوہ انجیل مقدس پر پورا عبور حاصل تھا"[۵]

تعجب ہے کہ فاضل خطبہ نگار کی نظر سے انجیل کے مذکورۂ بالا ترجمے نہیں گذرے، ان ترجموں میں مجھے انگریزی کا کوئی لفظ نہیں ملا، چہ جائے کہ کثرت سے ان کا استعمال ۱۸۶۱ء کے بعد کے بھی متعدد ترجمے انجیل اور توریت کے میں نے دیکھے، نیز اُنیسویں صدی کے رُبع آخر اور بیسویں صدی کے موجودہ زمانہ تک کی ایک بڑی تعداد مسیحی مذہبی کتابوں کی جو اردو میں شائع ہوئی ہیں، مطالعہ میں آئی لیکن زبان سب کی شستہ اور فصیح ملی، اور انگریزی الفاظ کا استعمال بکثرت یا بقلت کہیں نظر نہیں آیا، ممکن ہے دتاسی کی مراد مشنریوں کی "بیشتر تصانیف" سے "خیر خواہ ہند" کے قسم کے مذہبی اخبار اور رسالے رہے ہوں، جو انگریزی آمیز اُردو لکھتے تھے،

اردو کے مسیحی مترجمین اور مولفین میں وہ بھی ہیں، جو اصلاً ہندو تھے، اور بعد کو عیسائی ہو گئے تھے لیکن اُن کی زبان بھی وہی ہے جو ان پادریوں کی کتابوں میں ملتی ہے، جو مسلمان سے عیسائی ہوئے، مثلاً "ہینا اسمتھ" کی کتاب کا ترجمہ "مسیحی کی خوش وقت زندگی" کے عنوان سے بابو یونس سنگھ نے کیا تھا جو مشن پریس الہ آباد میں ۱۸۸۶ء میں چھپا تھا، اس کے سترہویں باب "میں" مسیح کے ساتھ یکتائی حاصل

---

[۵] خطبات گارساں دتاسی ص ۳۱۴،

کرنے کا بیان" اس طرح لکھا ہے :-

"ایمانداروں کی روح کے ساتھ خدا کے جتنے سلوک ہیں، اُن کا یہی مطلب ہی کہ اُن کو اپنے ساتھ ایک کرلے، کہ ہمارے خداوند کی وہ دعا پوری ہو، کہ "وہ سب ایک ہوں، جیسا کہ تو اے باپ مجھ میں ہے، اور میں تجھ میں ہوں، کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ایک ہوں"...... "میں اُن میں اور تو مجھ میں تاکہ وہ ایک میں کامل ہوں، اور تاکہ دنیا جانے کہ تو نے مجھے بھیجا ہے، اور انھیں پیار کیا ہے، جیسا کہ تو نے مجھے پیار کیا ہے"،

خدا نے دنیا کے پہلے ہی یہ جلالی ارادہ کیا، کہ ایمانداروں کی روحوں کو اپنے ساتھ ایک کرلے، یہ وہ بھید ہے کہ جو زمانہ دراز اور پشت در پشت بنی آدم کی نظر سے چھپا ہوا تھا، اور مسیح کے مجسم ہونے کے باعث سے پورا ہوگیا، یہ کلام میں کھول دیا گیا ہے، اور اس کی سچائی کا یقین بہتیرے ایمانداروں نے اپنے تجربہ سے حاصل کیا ہے،......" (ص ۱۷۳)

منشی کدار ناتھ منت نے ایک مثنوی بعنوان "ستم ہامان یعنی فریب شیطان" لکھی ہے، جو واسٹنگٹن پرنٹنگ پریس لاہور سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی ہے، اس کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں :-

بسم الاب والابن والروح

اگر طاقتِ آسمانی ملے — مجھے روح سے کامرانی ملے

تو لکھوں میں تمجید تثلیث پاک — نمایاں ہو توحید کا اشتراک

وہی ایک میں تین معبود ہے — وہی تین میں ایک مقصود ہے

ازل سے جو تھا ساتھ اس کے کلام — اُسی سے کیا خلق اُس نے تمام

بنے حکم سے اُس کے ارض وسما — مبارک خداوند سم کا خدا

ادا کب ہو حمد خدا اے جہان — ہے تقدیس میں اوس کی قاصر زبان

عجائب خدا کے غرائب ہیں کام — محبت سے معمور سب لا کلام

محبت سے آدم کو پیدا کیا — محبت سے سب کچھ ہویدا کیا

کیا بے گنہ خلق و پاکیزہ راست — محبت کی مینڈول سے بیش و کاست

مگر بو البشر نے اُسے کھو دیا — گناہ و ہلاکت کو سر پر لیا

تھا ازدروں پہ اُس وقت غوغاے عدل — سزا چاہتا تھا تقاضاے عدل

محبت سے لیکن خدا نے وہین — کی تدبیر ظاہر عجائب ترین

کہ عورت جو مصدر ہوئی موت کی — وہین سے نمایان ہوئی زندگی

ہوا نسل زن سے مسیحا نمود — کیا نیست اُوس نے گنہ کا وجود

ہوا بطنِ مریم سے وہ آشکار — کہ جس نے کیا کوفتہ فرق مار

سہی ابنِ حق نے صلیبی قضا — کیا قرض یون عاصیون کا ادا

اسی طرح وقتاً فوقتاً مدام — رہائی کے دکھلائے اعجوبہ کام

اُنھین مین یہ اک قصّہ دلپسند — مصیبت زدون کو ہو تعلیم و پند

کہ کیونکر خداوند نے ناگہان — بچائی تمام اپنے لوگون کی جان

یہ ہامان و استر کا مذکور ہے — طرب بخش دلہاے رنجور ہے (ص ۴۲)

مندرجۂ بالا تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غیر اسلامی مذاہب اور اُن کے اخلاق کے مقبولِ عام بنانے مین اردو کو کتنا دخل رہا ہے، ہندوستان کے مختلف مذہبون اور فرقون کی مذہبی اور اخلاقی کتابون کے اقتباسات بکثرت پیش کئے جا سکتے ہین، لیکن چونکہ یہ مضمون محض ایک اجمالی خاکہ ہے اصل مقالہ کا اس لئے یہ چند مثالین بھی کافی ہون گی،

نوٹ: یہ مضمون جیسا کہ پہلے نمبر مین لکھا گیا تھا، ڈاکٹر ٹیٹ کے مقالہ کا ٹکڑا نہین بلکہ اس کا خلاصہ ہو،

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار
اسلام کی روشنی مین

از

جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے

(۲)

یہان تک ہم نے مارکسیت کے بنیادی فلسفہ کی توضیح کی ہے، اب ہمین یہ دیکھنا ہے، کہ یہ فلسفہ واقعاتِ عالم کے لحاظ سے کہان تک صحیح ہے، اور اسلام کے بنیادی تصورات وعقائد سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم اسلام اور مارکسیت کا موازنہ کرتے ہین، تو ہمین ان نظامات کے درمیان مشابہت کے دو پہلو توی نظر آتے ہین، اولاً جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز مین بتایا ہے، مارکسیت صرف کائنات کے واقعات ومظاہر کی توجیہ وتعبیر کا فلسفہ نہین ہے، بلکہ وہ اس کائنات مین جہان تک انسان سے اس کا تعلق ہے، تغیر اور تبدیلی پیدا کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے، بعینہٖ یہی بات اسلام کے متعلق صحیح ہے، یعنی اسلام بھی محض ایک کائناتی نظریہ نہین ہے، جو واقعاتِ عالم کی توجیہ وتشریح پر اکتفا کرتا ہو، بلکہ وہ انسان کی حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی کی تعمیر وتاسیس کا ایک عملی پروگرام ہے، مذہب اور فلسفہ مین بنیادی فرق بھی ہے، فلسفہ صرف کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے، مذہب اسے بدلنا بھی چاہتا ہے، مارکسیون کو یہ بات کتنی ہی حیرت انگیز معلوم ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہین کیا جا سکتا، کہ مذہب کا سارا دار ومدار عمل پر ہے، اور عملی زندگی کو اگر اس کے دائرہ سے خارج کر دیا جائے تو پھر اس کے اندر کوئی معنویت باقی

نہیں رہتی ہے، یون تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک مخصوص اخلاقی سانچہ مین ڈھالتا ہے، اور افرادِ انسانی سے مطالبہ کرتا ہے، کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کرین لیکن اسلام اس بارے مین دیگر ادیان و مذاہب پر نمایان فوقیت رکھتا ہے، کیونکہ اُس نے کردار وعمل کی اس تبدیلی کو جس کا مطالبہ ہر مذہب مین موجود ہے انسان کی عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرہ سے وسیع کرکے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا، نیز اس نے اخلاق اور نیک عمل کے اصولون، اور مذہبی اقدار و غایات کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس مین اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے، اس کے مقابلہ مین دوسرے مذاہب نے نیکی اور حسنِ عمل کا صرف انفرادی اور معاشرتی تصور پیش کیا، اور اخلاقی اصولون کو زیادہ سے زیادہ سماجی اور عائلی زندگی تک وسعت حاصل کرنے کا موقع دیا، اس کے برعکس اسلام اپنے پیرؤن سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہین کرتا، بلکہ انھین عالمِ انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے، اور اُن سے تقاضا کرتا ہے، کہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہیئت اجتماعی مین وہ بنیادی تبدیلیان عمل مین لائین، جن سے یہ ثابت ہو جائے، کہ وہ اپنے اقرار مین صادق ہین جس حد تک انسان اپنی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی مین یہ تبدیلیان پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے، اس حد تک اسکا ایمان ناقص ہوتا ہے، غرضکہ اسلام صرف ایک طرزِ فکر نہین ہے، جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظامِ اجتماعی کی صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو، بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریقِ عمل ہے، جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے، اس انقلاب و تبدیلی کی کوشش کو مذہبی اصطلاح مین جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جہادِ اسلامی زندگی کا اصل اصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے، اگر فریضۂ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان والون کی ایک ضروری صفت یہ قرار دیتا ہے، کہ وہ راہِ خدا مین اپنے اموال اور اپنی جانون سے جہاد کرتے ہین :-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ،	مومن وہ ہین جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھون نے اس بارے مین کوئی شک نہین کیا، اور اللہ کی راہ مین اپنے مال اور اپنی جانون سے جہاد کرتے رہے، وہی لوگ سچے ہین،
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ، تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ،	اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو، کیا مین تمکو ایک ایسی تجارت بتاؤن، جو تمھین سخت عذاب سے بچا سکے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ کی راہ مین اپنے مال اور اپنی جانون سے جہاد کرو،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ	اللہ ان لوگون سے محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ میں اس طرح لڑتے ہین جیسے کہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو،

اب ظاہر ہے کہ اگر اسلام حیاتِ اجتماعی مین بنیادی انقلاب و تبدیلی کا مطالبہ نہ کرتا اور محض انفرادی زندگی مین عمل صالح اور تزکیۂ اخلاق کو کافی خیال کرتا تو وہ مزاحمت اور کشمکش پیدا کیسے ہوتی، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانون سے نفس و مال کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا، محض انفرادی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش سے وہ منظم مخالفت کبھی رونما نہ ہوتی، جس کے لیے مسلمانون کو عسکری زندگی اختیار کرنی پڑی، غرضکہ مذہب کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرزِ فکر کے بالکل مغائر ہے، جس مین محض عبادات و ریاضات اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، کیونکہ شخصی نجات کے حصول کا

یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی مین تبدیلی کرنے کی جد و جہد سے بے نیاز کر دیتا ہے، حالانکہ اسلام انفس و آفاق دونون کو مرضی الٰہی کے مطابق بدلنا چاہتا ہے، کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونون ایک ہی اصل کی شاخین ہین جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہین کیا جا سکتا، اور جب کبھی انھین ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، تو نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے، انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور خارجی ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہین، نہ کہ ان مین کے کسی ایک سے، اس لئے صرف ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے اسباب مرض کبھی دفع نہین ہو سکتے ہین، جب کبھی انسان عبادات و ریاضات مین مشغول ہو کر خارجی ماحول مین تبدیلی کی ضرورت سے بے خبر ہو جاتا ہے، تو اس کی سوسائٹی مین بد اخلاقی اور بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے، جس سے بالآخر وہ خود اپنا دامن محفوظ نہین رکھ سکتا ہے، خواہ راہبانہ اتقاء اور زاہدانہ پارسائی کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بلند ہو، اسی طرح جب وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی احوال کی تبدیلیون مین معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈتا ہے، اور اپنی باطنی اخلاقی زندگی سے غفلت برتتا ہے، تو بدی کی قوتین بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس مین پرورش پاتی رہتی ہین، اور بالآخر اپنے پورے زور و طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہین، یہانتک کہ اس کی معاشرت، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ اُن کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے صرف عبادات و ریاضات اور دعاؤن پر اکتفا نہین کیا، بلکہ اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کے ساتھ ساتھ حضور نے کل نظام زندگی مین انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اور جب کفار و مشرکین کی جانب سے اُن کی منظم مخالفت کی گئی، تو حضور نے وعظ و پند سے کام لینے کے ساتھ اپنی اجتماعی قوت سے بھی اُنکا مقابلہ کیا، اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کر دیا، کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ یا فلسفہ نہین ہے، بلکہ وہ ایک عظیم الشان انقلابی قوت ہے، جو اگر ایک طرف باطن مین نفس انسانی کی شرارتون اور انسانی خواہشات کی بے قیدیون کا مقابلہ

کرتی ہے، تو دوسری طرف ظاہر مین اپنے خارجی ماحول اور اپنے معاشرتی سیاسی ماحول اور عمرانی زندگی کے امراض و مفسدات سے آمادۂ پیکار رہتی ہے، مارکسیت اور اسلام مین مشابہت کا ایک پہلو اور بھی نظر آتا ہے، اگر مارکسیت کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے، کہ وہ نتائجیت سے قریب تر ہے، تو اس لحاظ سے بھی یہ تحریک اسلامی انداز فکر سے مماثلت رکھتی ہے، کیونکہ اسلام نتائجیت کے اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہے کہ افکار و تصورات کی صداقت کا ایک معیار یہ بھی ہے، کہ وہ عملی دنیا کے واقعات پر موثر اور انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے سود مند ہون، انجلس کا یہ خیال ایک پہلو سے اسلامی نظریۂ زندگی سے قریب تر ہے کہ اس مادی دنیا کے واقعات سے ہٹ کر انسانی فکر کی حقیقت رسی کی بحث محض لایعنی ہے، اسی وجہ سے اسلام ایسی نظریہ سازی اور فلسفہ آرائی کو پسند نہین کرتا ہے، جو عملی دنیا کے واقعات پر موثر نہ ہو اور انسان کو عالمِ خیال مین الجھائے رکھے، جو اعمال و اذکار انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کیلئے بے قیمت ہون، اسلام کی نظر مین وہ بالکل لاحاصل ہین، یہی وجہ ہے کہ وہ راہبانہ طریق زندگی اور طرز فکر کا مخالف ہے، اور غیر مسنون عبادات و ریاضات اور مراقبات اس کے مزاج کے منافی ہین، نیز وہ اپنے تمام عبادات و احکام کے نتائجی (Pragmatic) پہلو پر خاص زور دیتا ہے، نماز جو ہر مسلمان کے لئے فرض عبادت ہے، اس کے معاشرتی فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ		نماز انسان کو فحش اور بری باتون سے روکتی ہے،

شراب کی ممانعت کرتے ہوئے قرآن اس امر کو ظاہر کر دیتا ہے، کہ اس کی تحریم مین انسانون کا اجتماعی فائدہ بھی پیش نظر ہے،

اِثۡمُهُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا		ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے،

اسی طرح قرآن کا یہ ایک عام اصول ہے، کہ وہ مسلمانون کو بیشتر اپنے احکام کی معاشرتی

اور اجتماعی مصالح سے آگاہ کر دیتا ہے، تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ کی شریعت کوئی ایسا حکم نہیں دیتی جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ انسانی زندگی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، خود خدا اور آخرت کے دونون تصورات جن پر اسلام کا کل عملی اور فکری نظام قائم ہے، اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے سود مند ہین، اگرچہ اس کے یہ معنی نہیں ہین، کہ خدا اور آخرت کا اقرار محض اس لئے کیا جائے کہ ان کے اثرات سوسائٹی کے لئے سود مند ہین، بلکہ خدا کا حکم سمجھ کر ان پر ایمان لایا جائے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خدا اور آخرت کے تصورات انسانی زندگی پر بھی بہت قوی اور فائدہ مند اثرات مترتب کرتے ہین اور جب کبھی تاریخ کے کسی دور مین انسان نے ان دونون تصورات کو ان کے صحیح مفہوم کے ساتھ مخلصانہ طور پر قبول کیا، اور ان کے مقتضیات کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس کی زندگی مین ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا، مارکسیت تاریخ کے ان شواہد کو نہیں مٹا سکتی، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ درحقیقت یہی تصورات انسان کی عملی اور علمی ترقیون کا سبب ہین، اور اگر وہ اپنے اس اصول پر قائم رہے، کہ کسی تصور کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت اس کے عملی نتائج ہین، تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا، کہ خدا اور آخرت کے تصورات غلط اور بے حقیقت نہیں ہین، اگر اس کی تردید مین مارکس کے پیرو تاریخ کے ان ادوار کا حوالہ دیتے ہین جن مین خدا اور آخرت کے تصورات نے انسان کو بے عمل اور گمراہ بنا دیا تھا تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے، کہ ان تمام ادوار مین جن مین کورۂ بالا تصورات نے انسان کو باعمل بنانے کے بجائے اسے سست، اپاہج اور کمزور بنا دیا، ان تصورات کو یا تو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے مانا گیا گویا کائنات کی ابتدا و انتہا، اور خلق آدم کا واقعہ محض ایک فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی نظریہ اور ایک خانگی اور شخصی رائے ہے، جو انسان کی عملی و اجتماعی زندگی مین کسی تبدیلی اور انقلاب کا تقاضا نہیں کرتی ہے، یا یہ کہ خدا اور آخرت کے تصورات کو انھون نے مسخ کر دیا تھا، اور ان کو ان کی اصلی صورت مین نہیں، بلکہ بگڑی ہوئی شکل مین مانتے تھے، اس سے خود ان تصورات کی عملی حیثیت اور انقلاب آفرینی

پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، خدا کا یقین اس کا نام نہیں ہے، کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہی اس کی مرضی ہے، اس لئے رائج الوقت تصورات اور نظامات کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہئے، بلکہ اس کا یقین ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے، کہ ہم دنیا کی ان قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں، جو کائنات کے مادی اور انسانی وسائل کو اس کے بنانے والے کی مرضی اور منشاء کے خلاف استعمال کر رہی ہیں، اسی طرح آخرت کا یہ تصور نہیں ہے، کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے، اس لئے یہاں جیسے بھی گذرتی ہو، گذر جانے دو، بلکہ آخرت کا حقیقی نظریہ یہ ہو، کہ کائنات عالم کو خدا کے حکم کے مطابق چلانے میں مخالف قوتوں کے خلاف جو جد و جہد کرنی پڑے، اور اس میں جو مصائب اور تکالیف اور آزمائشیں پیش آئیں، اُن کے سامنے سپر نہ ڈالی جائے، اُن کا صلہ و انعام دوسرے عالم میں ملے گا، جن کے مقابلہ میں یہ تمام تکالیف و مصائب و جانکاہیاں اور مایوسیاں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں، جس کو خدا نے ان انسانوں کے لئے خاص کر دیا ہے، جو دنیا میں اس کے احکام کی تعمیل اور اس کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان و مال کی بازی لگاتے ہیں،

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ	ہم تمھیں خوف بھوک اور مال و دولت کے
وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ	نقصانات میں مبتلا کرکے تمھاری آزمائش
وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ	کرین گے، اس کے بعد اُن لوگوں کے لئے
الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم	خوشخبری ہے، جو صبر کرین، اور جب اُن پر
مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ	کوئی مصیبت آئے، تو کہیں کہ ہم اللہ
رَاجِعُونَ ۝ (بقرہ)	کے لئے ہیں، اور اسی کی طرف ہمیں واپس

ظاہر ہے کہ قرآن نے ان آیات میں جس ابتلا و آزمائش کا ذکر کیا ہے، وہ اس جماعت کے لئے تھی، جو منشاے الٰہی کے مطابق کارگاہِ عالم کو بدلنے کی سعی و کوشش میں نقصانات و خطرات برداشت

کر رہی تھی، قرآن نے یہ کبھی نہین کہا کہ یہ دنیا بالکل بے حقیقت ہے، البتہ اوس نے اس بات پر یقیناً زور دیا ہے کہ آخرت کے مقابلہ مین یہ دنیا ہیچ ہے،

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ	تم لوگ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہو
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ	حالانکہ آخرت زیادہ بہتر ہے، اور زیادہ باقی رہنے والی ہے،

یعنی جس طرح ایک اعلیٰ تر حقیقت کے سامنے ادنیٰ حقیقت کوئی وقعت نہین رکھتی، اسی طرح آخرت کے مقابلہ مین بھی یہ دنیا بے قیمت ہے لیکن اس کے معنی یہ نہین ہین، کہ وہ مطلقاً بے حقیقت ہے کیونکہ انسان ادنیٰ حقیقت ہی سے گذر کر اعلیٰ حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح آخرت اگرچہ اس دنیا سے بلند و برتر اور زیادہ حقیقی ہے، مگر انسان اسی دنیا کی زندگی مین حصہ لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے، نہ کہ دنیا سے الگ اور بے تعلق ہو کر،

مارکسیت کا یہ دعویٰ کہ وہ انسانی افکار کو اُن کے عملی نتائج کے معیار پر پرکھتی ہے، اس لئے اس کا انداز فکر فلسفۂ نتائجیت سے قریب تر ہے، کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہین کہ مارکس اور اس کے تمام متبعین تاریخ کی مذہبی، سیاسی اور معاشی تحریکات کے حسن و قبح اور صداقت کا فیصلہ کرتے وقت اُن کی ابتدا اور آغاز کو خصوصیت کیساتھ پیش نظر رکھتے ہین، اور ان کی صحت و عدم صحت کو ان حالات و اسباب پر منحصر قرار دیتے ہین، جن مین ایسی تحریکات رونما ہوتی ہین، حالانکہ یہ طرز فکر نتائجیت کے بالکل مغائر ہے، نتائجیت کسی شے کی ابتدا، اور اس کے اسباب پیدائش سے بحث نہین کرتی ہے، بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ وہ شے عملی زندگی کے لئے کیا قدر و قیمت رکھتی ہے، اس کا مقصد اور مآل کار کیا ہے، اور وہ کن غایات کی طرف بڑھنا چاہتی ہے، یہ طرز فکر ماضی پر نہین مستقبل پر نظر کرتا ہے، اور مارکسیت کسی فکری یا عملی تحریک کے مستقبل کے بجائے اس کے ماضی سے بحث کرتی ہے، ان اسباب

کا تجزیہ کرتی ہے، جو اس کی آفرینش اور نشو و نما کا باعث ہوئے، اور پھر اس تجزیہ پر اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے، مثلاً مذہب کے متعلق مارکسیت کا انداز بحث یہ ہو کہ وہ فلان فلان اسباب و حالات سے پیدا ہوا، فلان فلان عوامل اس کی نشو و نما کا باعث ہوئے، اور اب چونکہ وہ اسباب و عوامل ناپید ہین، اس لئے وہ قابلِ ترک ہے وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہین کرتی، کہ مذہب کا مقصد کیا ہے وہ کن غایات کی طرف انسان کو لیجانا چاہتا ہے، اور عملی زندگی پر اس کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہین، مارکسیت کہتی ہے کہ مذہب انسان کے جذبۂ خوف سے پیدا ہوا، اور انسان کے احساس بے بسی نے اس کو تقویت پہنچائی، اور اب چونکہ فطرت خارجی پر انسان نے ایک حد تک قابو حاصل کرلیا ہی اس نے خوف[۱] و دہشت کا وہ سبب باقی نہین ہے، جس نے مذہب کو پیدا کیا تھا، اور نہ انسان اب قدرت کے سامنے اتنا عاجز اور بے بس ہے، کہ اُسے مذہب کے سہارے کی ضرورت ہو، حالانکہ اصل سوال

۱؎ اس نقطۂ نظر سے بھی مذہب ابھی بیکار نہین ہوا ہے، کیونکہ انسان اپنی تمام ترقیون کے بعد بھی عجز و بیچارگی کے احساس سے خالی نہین ہے، سائنس کے حیرت انگیز انکشافات و ایجادات کے باوجود انسان کو نہ تو اپنی تخلیق و پیدایش پر قدرت حاصل ہو سکی ہو اور نہ موت کے خوف سے آزاد ہوا ہے، اور نہ اُسے جذبات و شہوات پر قابو حاصل کرنے مین کامیابی ہو سکی ہے، بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جیسے جیسے انسان قوائے فطرت کی تسخیر مین کامیاب ہوتا جاتا ہے، اسی نسبت سے وہ اپنے شخصی اور قومی جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو رہا ہے، جس سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے، کہ انسان کائناتِ خارجی پر تو حکومت کر سکتا ہے، لیکن اپنے نفس و باطن کا فرمانروا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے میلانات اور خواہشات اور اس کے جذبات و داعیات کی باگ ڈور کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ مین ہے، بقول شاپن ہار انسان جو چاہے کر سکتا ہے، مگر جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کے انتخاب و تعین مین اس کی اپنی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہین ہے۔

وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہ

نہین ہے کہ مذہب کس طرح اور کن اسباب سے پیدا ہوا، بلکہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے، حیاتِ انسانی کے لئے کیا عملی پروگرام رکھتا ہے، اور اس کے مقاصد صحیح ہین یا غلط، مارکسیت تحلیل وتجزیہ کے جس طریقہ سے مذہب کو باطل کرنا چاہتی ہے؛ وہی طریقہ اسے باطل قرار دینے کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے، مثلاً ہم کہہ سکتے ہین، کہ خود اشتمالی تحریک خوف کی پیداوار ہے، وہ معاشی بے اطمینانی کے خوف سے پیدا ہوئی، اور معاشی بےبسی کا احساس اس کی ترقی اور اشاعت مین معاون ہوا، لیکن یہ اصولِ فکر صحیح نہین ہے، مارکسیت یا مذہب کی صحت اور عدم صحت کا تعلق، اس کی ابتدا اور اسباب پیدائش سے نہین ہے، بلکہ دونون کی صداقت جس معیار پر جانچی جائے گی وہ یہ ہے کہ ان کا عملی پروگرام انسان کے لئے کہان تک مفید ہے، جن مقاصد کی یہ دونون دعوت دیتے ہین، وہ انسان کو بحیثیت انسان کے کہان تک مطلوب ہین، اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جو ذرائع استعمال کرتے ہین، آیا وہ ذرائع مناسب ہین یا نہین، صداقت کی جستجو کا تحلیلی طریقہ (Analytical method) علوم طبعی کے دائرہ مین کیسا ہی مفید ثابت ہوا ہو، لیکن تمدنی اور معاشرتی علوم مین جہان انسان کی فطرت اور اس کے اقدارِ زندگی پر بحث ہوتی ہے، یہ طریقہ بالکل مہمل نتائج پر منتہی ہوتا ہے، مثلاً کسی عمارت کو اگر اس لئے بیکار اور بے فائدہ ٹھہرایا جائے، کہ وہ چونے گارے اینٹون اور پتھرون سے بنی ہے، تو یہ بات بالکل خلافِ عقل ہوگی، کیونکہ عمارت کی قدر وقیمت کا مدار اس کے ترکیبی عناصر پر نہین ہے، جن سے وہ وجود مین آتی ہے، وہ چونے گارے مٹی اور پتھر سے ضرور بنی ہے، لیکن باعتبار قدر وقیمت اور فوائد، مراتب وجود مین وہ ان اشیا سے اعلیٰ اور بہتر ہے، اسی طرح اگر کارل مارکس اور انجلس کے بارہ مین رائے قائم کرنے کے لیے اس کی پیدائش اور ابتدائی زندگی کے حالات سے بحث کی جائے، اور اس کے فلسفیانہ افکار کو محض اس لئے

باطل قرار دیا جائے کہ وہ دونوں ایک حقیر قطرۂ خون سے پیدا ہوئے، یا اُن کے دماغی اور جسمانی
اعضا اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے تھے، جس سے ایک دہقانی کا جسم ودماغ ترکیب پاتا ہے،
تو کیا یہ اندازِ فکر صحیح ہوگا، ظاہر ہے کہ اُن کے اسبابِ پیدائش اور اعضائے جسمانی ودماغی
کی ترکیب سے اُن کی فلسفیانہ صداقت یا عدمِ صداقت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، کسی شے کی حقیقت
اس کے آغازِ پیدائش کے حالات اور اُس کے عناصرِ ترکیبی سے ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ اس کے
مزاج ومیلان اس کی تعمیری ہیئت اور اس کے قابلِ حصول امکانات میں پوشیدہ ہوتی ہے،
لیکن مادّیت کے اور تمام اقسام کی طرح مارکسیت، ماضی کی پرستار اور تحلیلی طریقہ کی پابند ہے،
جہاں تک مارکسیت کے فلسفۂ اضداد کا تعلق ہے، جو ہیگل کے فلسفہ سے ماخوذ ہے،
اس کی نسبت اطالوی فلسفی کروس (Croce) کی حسب ذیل رائے نہایت معقول
معلوم ہوتی ہے،

"ہیگل کی ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے اشیار اور تصوّرات کے باہمی فرق
کو اُن کی ضد سے تعبیر کیا، حالانکہ جو اشیاء اور تصوّرات باہم مختلف ہوں، وہ لازماً
ایک دوسرے کے ضد نہیں ہوتے، کون کہہ سکتا ہے کہ مذہب آرٹ کی ضد ہے، یا فلسفہ
میں مذہب اور آرٹ کا اجتماع اضداد ہوگیا ہے، یا یہ کہ قوتِ نظری، قوتِ عملی کی
عقل، وجدان کی اور تمدنی زندگی، خانگی زندگی کی نفی ہیں، اسی طرح جس طرح
وجود، عدم کی نفی ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن تصوّرات کو ایک دوسرے کی ضد قرار
دیا جاتا ہے، وہ اکثر ایک ہی اصل کے فروع ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کی
تکمیل کرتے ہیں، نہ کہ نفی، مارکس نے ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو جوں کا توں لے لیا،
البتہ اُس نے کائناتِ فطرت اور انسانی تاریخ سے ہیگل کی روحانیت کو خارج

کر کے ان کا خد و خال جدلیاتی مادیت سے تیار کیا، وہ مادہ کو کائنات کی بنیادی حقیقت
قرار دیتا ہے لیکن مادہ کا جو تصور پیش کرتا ہے، وہ بنیادی طور پر ہیگل کے اس تصور کا
چربہ ہے، جو اس نے روح عالم کی بابت قائم کیا تھا، اور کم و بیش انہی صفات سے
آراستہ ہے، یعنی جس طرح ہیگل کے فلسفہ مین، روحِ عالم اپنی ذات سے متحرک ہے،
اور ایک مخصوص منطقی ترتیب کے ساتھ درجہ بدرجہ ایک متعین اور پہلے سے بنے بنائے
مقصد کی جانب سفرِ ارتقا طے کرتی ہے، اسی طرح مارکس کے نظریہ کی رو سے مادہ بھی
اپنی ذات سے متحرک ہے، اور اپنی باطنی فطرت کے لحاظ سے ایک منطقی نظم و ترتیب کا
پابند ہے، جس کے مطابق وہ ایک مخصوص اور پہلے سے متعین کردہ مقصد کی جانب حرکت
کر رہا ہے، اس میں شک نہین کہ ہیگل کا مقصد روحانی ہے، اور مارکس نے جس مقصد
کا تعین کیا، وہ مادی ہے، لیکن کائنات کی فطرت اور اس کے قوانین حرکت کے
متعلق دونون کے نظریات مین کوئی فرق نہین ہے"، (باقی)

ادبیات
استفسار و جواب

شرح شمائل ترمذی کا ایک قلمی نسخہ

جناب عبد الشکور صاحب
پور بندر کاٹھیاوار

مکرمی السلام علیکم

گذشتہ دنوں معارف مین کتب خانہ ٹونک کے قلمی مخطوطات کے سلسلہ مین اسفرائینی اور ہیثمی کی شرح شمائل ترمذی کا تذکرہ دیکھا، خاکسار کے پاس شرح شمائل کا ایک قلمی نسخہ ہے، مجھے معلوم نہین ہے کہ یہ نسخہ کبھی طبع ہوا ہے یا نہین، نہ ہی اسکے اول و آخر سے تصنیف کا پتہ چلتا ہے، کتاب کے خاتمہ کی عبارت مین جو نام درج ہے، وہ کاتب کا ہے یا شارح کا، مین تو کم از کم اپنی نا اہلی کے باعث اسکو سمجھنے سے قاصر ہون، کتاب کی ابتدائی تمہید سے اندازہ ہوتا ہے، کہ مصنف نے اسفرئینی اور ہیثمی کی شرحون پر تعلیق کے طور پر یہ کتاب لکھی ہے، ابتدائی کتاب حسب ذیل ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (کرم خوردہ ہے) علی سیدنا محمد و آلہ الخ وکان ممن تصدی لشرحہ افضل المدققین اوحد المحققین مولانا عصام الدین الاسفرائینی الشافعی الخ وتلاہ العالم النحریر الفقیہ الشہاب بن حجر الہیثمی نزیل مکۃ الخ فسألنی بعض الافاضل ان املی تعلیقا عن ؟! التطویل والاخلال مراعیا للانصاف متجنبا للاعتساف فاجبتہ لذالک مع الاعتراف للقصور عن الخوض فی ھذہ المسالک ولخصت ما فی ھذین الشرحین ضاما الیھما من فوائد الفوائد ما فرح الصدور وتقربہ العیون

اس کے بعد شرح شروع ہوتی ہے، خاتمۂ کتاب کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

تم شرح الشمائل علی ید العبد الفقیر محمد مومن ابن محمد امین (آگے کرم خوردہ ہے) بمکۃ المشرفہ یوم السبت، سابع یوم من شہر شعبان المبارک سنہ واحد وثمانین والف ۱۰۸۱"

اگر ممکن ہو تو جناب کرم اس کتاب پر اپنے معزز ماہنامہ میں مزید معلومات بہم پہنچائیں تو بڑی عنایت ہوگی،

اگر کسی صاحب ذوق کو اس کتاب کو اپنے کتب خانہ کے لئے ضرورت ہو تو مناسب قیمت پر میں فروخت کر سکوں گا، والسلام

معارف :- آپکے پاس شرح شمائل کا جو قلمی نسخہ ہے، وہ حافظ زین الدین المعروف بہ عبدالرؤف ابن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ کی شرح ہے، یہ شرح جیسا کہ اس کے مقدمہ میں تصریح ہے مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائنی المتوفی ۹۴۳ھ اور حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ کی شرحوں[1] کا خلاصہ ہے، اور کچھ مزید تعلیقات اور اضافے بھی ہیں، محمد مومن اس کے شارح نہیں بلکہ کاتب ہیں، آپنے اپنے نسخہ کے شروع کی جو عبارت نقل کی ہے، وہی مناوی کی شرح کے مقدمہ کی عبارت ہے، آپنے اوس کو پورا نقل نہیں کیا ہے، بلکہ بعض فقرے الخ لکھ کر چھوڑ دیئے ہیں، ورنہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، مناوی کے مقدمہ کی پوری عبارت یہ ہے[2]

---

[1] مولانا عصام الدین کی شرح کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہیں، ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۲۴۲ ومفتاح کنوز الخفیہ ج اول ص ۱۷۱، اور ابن حجر مکی کی شرح اشرف الوسائل فی شرح الشمائل کے نسخے ... ورامپور کے کتب خانوں میں ہیں، فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد ۴ ص ۴۵۹ وفہرست کتب عربی کتب خانہ رامپور ص ۲۰۵، کشف الظنون ج ۲ ص ۶۰

"انّ ممن تصدّی لشرحها وحلّ الدقائق مولانا عصام الدین الاسفرائینی
فاتی ابما لم یسبق الیہ من کشف النقاب عن اسرارها، لکنہ من الاحتمالات
العقلیۃ فی ھذا الفن الذی ھو من الفنون النقلیۃ، مع ماھو علیہ من
الاوھام حتی علی ذالک من سقطات الاوھام وتلاہ عالم الحرمین
الفقیہ الشھیر الشہاب بن حجر الھیثمی نزیل مکۃ المکرمۃ فاطال واطاب
لکن بعد الانتھاب من ذالک الکتاب وازال لتر رونق المتن باقتصارہ
علی مازعم انہ المھم من الفاظ الباب مع ماھو علیہ من التشفف بالرد
والتعصب مما لیس بکبیر امر تارۃ اخری فسالنی بعض الافاضل ان املی
علیھا تعلیقا مختصرا منصفا فاجبتہ ولخصت مافی ھذین الشرحین ضاما
الیھا من الفوائد مالابد منہ الخ

ان دونون کے موازنہ سے ظاہر ہے کہ دونون ایک ہی کتاب کے مقدمہ کی عبارتین ہین، خط کشیدہ عبارتین وہ ہین، جن کو آپنے الخ لکھ کر چھوڑ دیا ہے، کشف الظنون کی عبارت مین بعض الفاظ اور فقرے مختلف ہین لیکن اس قسم کے خفیف اختلافات قلمی نسخون مین اکثر ہوا کرتے ہین، اور آپنے بعض الفاظ غلط نقل بھی کئے ہین۔

خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۰ھ نے اس شرح کا ترکی مین ترجمہ کیا تھا، اور مصطفی بن حسن المعروف بہ مظلوم زادہ نے اس کو ترکی مین نظم کیا[۱]۔ اس کے قلمی نسخے مصر اور بانکی پور کے کتب خانون مین موجود ہین[۲]، اور یہ شرح ملا علی قاری کی شرح شمائل ترمذی جمع الوسائل کے ساتھ مصر اور قسطنطنیہ کے مطبعون مین چھپ چکی ہے[۳]۔

"م"

---

[۱] کشف الظنون جلد ۲ ص ۶۰ [۲] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اول ص ۳۲۰، و مفتاح الکنوز الخفیۃ جلد اول ص ۱۰۲ [۳] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۱۶۹

وفیات

مولانا ثناء اللہ امرتسری

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو قیامت گذری، اس کی تاریخ قیامت تک ناقابلِ فراموش رہے گی، مسلمانوں کے لئے یہ سانحہ کتنا حسرتناک ہے کہ اب امرتسر سے لے کر دلی کے کناروں تک ساری مسجدیں بے چراغ، خانقاہیں سونی، مدرسے بے نشان اور کتبخانے ویران ہوگئے، اسی حادثہ میں مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے صاحبزادہ عطاء اللہ ثنا ہے بحالت نماز شہید ہوئے، اُن کا کتب خانہ لُٹ گیا، اور وہ خود مع خاندان بہزار خرابی گوجرانوالہ پہنچے، اور اب خبر آئی ہے کہ انھوں نے ۱۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو بعارضۂ فالج وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون،

مولانا ہندوستان کے مشاہیر علماء میں تھے، فنِ مناظرہ کے امام تھے، خوش بیان مقرر تھے، متعدد تصانیف کے مصنف تھے، مذہبًا اہلحدیث تھے، اور اخبار اہلحدیث کے اڈیٹر تھے، قومی سیاسیات کی مجلسوں میں کبھی کبھی شریک ہوتے تھے،

مرحوم سے مجھے نیاز زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، وہ سال میں ایک دو دفعہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں آتے جاتے لکھنؤ آتے تھے، اور دارالعلوم ندوہ میں تشریف لاکر احباب سے ملتے تھے، اسی سلسلہ میں مجھے بھی نیاز حاصل ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مرحوم مدرسہ میں تشریف لائے، میں درس میں تھا، اُن کو آتا دیکھ کر اُن کی طرف لپکا، مگر مرحوم نے میرے بجائے سبقت استاذی شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور حدیث کا یہ ٹکڑا پڑھا، کبّر الکبر یعنی بڑے کو بڑائی دو،

مرحوم ندوہ کے رکن بھی اکثر رہے، بلکہ خود اُن کے بقول ندوہ کانپور میں اُن کی دستار بندی ہی کے جلسہ میں پیدا ہوا، مرحوم نے ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دنوں مدرسہ دیوبند میں پڑھا، پھر وہ کانپور آکر مدرسہ فیض عام میں داخل ہوئے، اور یہیں ۱۳۱۴ھ میں فراغت پائی،

یہ زمانہ وہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں سے پنجاب میں فتنہ پیدا تھا، انھوں نے مرزا کے خلاف صف آرائی کی، اور اس وقت سے لیکر آخر دم تک اس تحریک اور اس کے امام کی تردید میں پوری قوت صرف کردی، یہان تک کہ طرفین میں مباہلہ بھی ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صادق کے سامنے کاذب نے وفات پائی، یہ پرانے قصے ہین جن کو دہرانے کی چندان ضرورت نہین،

موجودہ سیاسی تحریکات سے پہلے جب شہروں میں اسلامی انجمنیں قائم تھیں، اور مسلمانون اور قادیانیون اور آریون، اور عیسائیون مین مناظرے ہوا کرتے تھے، تو مرحوم مسلمانون کی طرف سے عموماً نمائندہ ہوتے تھے اور اس سلسلہ سے وہ ہمالیہ سے لیکر خلیج بنگال تک ہمیشہ دوان اور روان رہتے تھے،

اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی، اور قلم اٹھایا، اس کے حملہ کو رد کرنے کیلئے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا، اور اسی مجاہدانہ خدمت مین انھون نے عمر بسر کردی، فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء

وہ مصنف بھی تھے، مخالفینِ اسلام کے اعتراضون کے جواب مین اُن کے اکثر رسالے ہین، ان کی تصنیفات مین دو تفسیرین خاص ذکر کے قابل ہین، تفسیر ثنائی اردو مین اور تفسیر القرآن بالقرآن عربی مین، مرحوم کو خود بھی یہ تفسیرین پسند تھین، مرحوم چونکہ مناظر تھے، اس لئے پہلی تفسیر مین آیات صفات کے بات مین سلفی عقائد کے بجائے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی پیروی مین تاویل کی راہ اختیار کی تھی اس سے امرتسر کے غزنوی علماء اہلِ حدیث نے ان کی بشدت مخالفت کی، ۱۹۲۶ء مین جب حج کی تقریب سے خاکسار اور مرحوم اور دیگر علماء اہلحدیث کا حجاز جانا ہوا تو یہ نزاع سلطان ابن سعود کے سامنے بھی پیش ہوئی، اور سلطان نے کوشش کرکے فریقین مین صلح کرادی، مرحوم وہین مجھ سے فرماتے تھے، کہ افسوس کہ

کہ نجد کے علماء حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و قیمت سے واقف نہین اور مجھ سے چاہتے تھے کہ مین اس باب مین سلطان سے کچھ عرض کردن،

مرحوم کبھی کبھی قومی جلسون مین بھی شرکت کرتے تھے، ۱۹۱۲ء مین ندوہ کی تحریک اصلاح کے سلسلہ مین جب حکیم اجمل خان مرحوم کی دعوت پر دہلی مین ایک عظیم الشان اجلاس ہوا جس مین سارے ہندوستان کے مسلمان نمایندے شریک تھے، تو مولانا شبلی کی تحریک پر مرحوم ہی صدر مجلس قرار پائے تھے، ۱۹۱۹ء مین جب تحریکِ خلافت کا پہلا ابتدائی جلسہ لکھنو مین ہوا جس مین سارے ملک کے اکابر اور مشاہیر جمع تھے اس مین بھی مرحوم شریک تھے، ۱۹۲۵ء کی جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ مین جس مین اس خاکسار کی صدارت تھی، مرحوم موجود تھے، اور خاص طور سے اس لئے آئے تھے کہ جمعیۃ کے اس اجلاس مین دار الحرب مین سود کے مسئلہ پر بحث کرنے والے تھے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور دوسرے علماء دیوبند بھی تشریف فرما تھے، انھون نے مجھ سے کہا کہ اگر حضرات علماء دیوبند حنفیہ کے مشہور مسلک لاربوا بین الحربی والمسلم فی دار الحرب پر متفق ہون تو مین بھی تائید کردن گا، مگر علماء مین نج کی گفتگو ہو کر رہ گئی، جلسہ علانیہ مین کوئی بحث نہین ہوئی،

مرحوم ۱۹۲۶ء مین حجاز کے موتمر اسلامی مین نمایندۂ اہلِ حدیث کی حیثیت سے شریک تھے، اور عربی مین ایک دو مختصر تقریرین بھی اپنے طرز کی موثر مین کی تھین، مدینہ منورہ بھی حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے، کہ جو اہلِ حدیث یہان نہ آئے وہ محبت سے خالی ہے، (اُن کا اصل فقرہ اس وقت پوری طرح یاد نہین)

مرحوم کو ایک دفعہ مجھ سے شکایت بھی پیدا ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ دس پندرہ برس ہوئے، مرحوم اور اُن کے حنفی حریف مولانا عبد العزیز صاحب خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری کے درمیان حدیث اذا قرءالا مام فانصتوا کے صحیح مسلم مین موجود ہونے یا نہونے پر اخبارات مین تحریری مناظرہ ہو رہا تھا، فریقین نے اس باب مین مجھے حکم مانا، مین نے مولانا مرحوم سے کچھ پوچھے بغیر صرف دونون کی تحریرون

کو دیکھ کر فیصلہ مرحوم کے خلاف اور مولانا عبدالعزیز صاحب کے موافق کیا، جس پر مرحوم نے مجھے لکھا کہ حتی یسمع من الآخر کی بنا پر طرفِ ثانی کا بیان سُنے بغیر آپ نے فیصلہ کیسے کر دیا، مگر ان کی یہ شکایت محض مناظرانہ تھی ورنہ اس کے بعد بھی ان کی شفقت میرے حال پر ویسی ہی رہی، ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد جب میرا لاہور جانا ہوا، اور اُن کو خبر ہوئی تو مجھے پیغام بھیجا کہ واپسی میں اُن سے ملے بغیر نہ جاؤں، چنانچہ واپسی میں امرتسر اترا، اور اُن کے پاس دو دن ٹھہرا، اور بہت سی باتیں ہوئیں، جن میں سے ایک جیسا کہ خیال آتا ہے اہل حدیث کے انتشار اور پراگندگی کی گفتگو تھی، میں مرحوم کو لکھتا رہتا تھا کہ آپ آمین اور رفع یدین وغیرہ مسائلِ فقہ پر جن کا ہر پہلو جائز اور ثابت ہے، مناظرانہ تحریروں میں وقت ضائع نہ کریں مگر وہ اُن کی اہمیت پر بھی مصر تھے

ان کی عمر میرے خیال میں اسّی سے کچھ متجاوز ہوگئی، ابھی چند سال ہوئے وہ گر پڑے تھے، جس سے کولھے کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی جس کے سبب سے وہ چلنے پھرنے سے معذور سے ہو گئے تھے، پنجاب کے گذشتہ حادثہ میں جوان بیٹے کی مفارقت کا اثر یقیناً بڑا ہوگا، لیکن اُس کے بعد پاکستان و ہندوستان کے درمیان جو دیوار قائم ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو مرحوم کی وفات کی اطلاع بھی اس سے پہلے نہیں ہوئی، اور یہ اطلاع بھی جمعیۃ العلماء دہلی کے تازہ جلسہ میں تعزیت کی تجویز سے ہوئی، انا للہ، اگر کوئی صاحب اُن کی وفات کی تاریخ و روز و وقت و مقام سے مطلع کریں تو ممنون ہوں گا،

مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا، اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا، وہ وہی ہوتے، اللہ تعالیٰ اس غازیِ اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے

مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری

مہینوں سے اخبار نہیں پڑھتا کہ ان کو پڑھ کر ایک ایسے شخص کو جو ملک میں ہر طرح امن و امان اور مہر و محبت کا طالب ہو دلی صدمہ پہنچتا ہے، اسی لئے مولانا کی وفات کی خبر اُن کے صاحبزادوں کے خطوط سے ہوئی، میں نے اُن کے صاحبزادوں کو لکھا کہ مرحوم کے کچھ ابتدائی تعلیمی حالات مجھ کو لکھ کر بھیجیں

لیکن ان کا پھر کوئی جواب نہین آیا، البتہ اخبارات کے چند تراشے ملے، جن مین وفات کی خبر کے سوا کچھ اور نہ تھا،

مرحوم کا وطن صوبہ بہار مین شہر دانا پور متصل پٹنہ تھا، مگر وہ ایک عرصہ سے کلکتہ مین طبیب کی حیثیت سے مقیم تھے، اور گویا اب وہی اُن کا گھر ہوگیا تھا، مجھے یہ بھی معلوم نہین کہ انھون نے تعلیم و تربیت کن اساتذہ سے حاصل کی، مگر گفتگو اور تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو علوم دینیہ مین پوری دستگاہ حاصل تھی، پھر کلکتہ مین رہکر اور سیاسی مجلسون مین شرکت کے سبب سے وہ زمانہ کے ضروریات اور عصری خیالات و افکار سے پوری طرح آگاہ تھے، اور ان علماء مین تھے، جو قدیم علوم و اعتقاداتِ فقہ کو جدید خیالات و افکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہین،

میری اُن کی پہلی جان پہچان اس وقت ہوئی، جب مین ۱۹۱۲ء مین الہلال کلکتہ کی ادارت مین شرکت کے لئے کلکتہ پہنچا، اور اس تقریب سے کئی مہینہ کلکتہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مختلف جلسون مین ان سے گفتگو، بات چیت اور میل جول کی نوبت آئی، پھر ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء مین مجلس علمائے بنگالہ کی صدر کی حیثیت سے جب میرا کلکتہ جانا ہوا، اور یہ وہ وقت تھا، جب اسی کے ساتھ لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بھی وہان ہو رہے تھے، اور ہندو اور مسلمان تمام ملک کے نمایندے وہان جمع تھے، اور بیت المقدس کی انگریزی فتح کا حادثہ تازہ تھا، اور طبائع مین بڑا ہیجان تھا، مرحوم سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا، اور خیال آتا ہے کہ اُن کے قیامگاہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا، جو چونا گلی مین تھی، اور جہان مرحوم نے وفات پائی،

۱۹۱۲ء مین ہندوستان مین ایک مسئلہ زیر بحث تھا، اور وہ یہ کہ پنجاب کی ایک مسلمان عورت نے جو اپنے شوہر کے مظالم اور عدم نفقہ سے تنگ آچکی تھی، اس سے چھٹکارے کے لئے علماء سے استفتاء کیا تھا، مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی نے حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس کو جواب دیا، کہ اسلام مین اس کے لئے کوئی مخلص نہین، اس پر آریہ اخبارون نے اسلام کو اُس کی تنگ دامانی کا طعنہ دیا، اس کو پڑھکر مولانا ابو الکلام نے بعض فقہائے تابعین اور ائمہ فقہ کے مسلک کے مطابق مولانا ٹونکی کے فتوون کی تردید کی

اور لکھا کہ تین ماہ کے انتظار کے بعد بھی اگر شوہر اپنی بیوی کے نان و نفقہ کا انتظام نہ کرے اور بیوی مطالبہ کرے تو قاضی زوجین میں تفریق کر سکتا ہے، مولانا دانا پوری نے مولانا ابوالکلام کے فتوی کی تغلیط کی اور کلکتہ کے اخبارات میں ایک مفصل مضمون اس کے جواب میں لکھا یہ معارف کی اشاعت کا پہلا سال تھا، خاکسار نے ان تینوں صاحبوں کے فتووں پر ایک محاکمہ لکھا، جو معارف کی پہلی جلد میں زوجۂ غیر منفق علیہا کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اور جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ نہ تو مطلقاً مولانا ابوالکلام کا فتوی صحیح ہے اور نہ مولانا عبدالرؤف صاحب کا، اور نہ تو مولانا ابوالکلام کی وسعت صحیح ہے اور نہ مولانا دانا پوری کی تنگی، بلکہ یہ سب فتوے الگ الگ مختلف حالات سے مخصوص ہیں، کسی کہنے والے نے مجھ سے نقل کیا، کہ مولانا دانا پوری نے میرے اس مضمون کو پڑھ کر فرمایا کہ ہاں! یہ مضمون ایک پڑھے لکھے شخص کا ہے،

پھر مرحوم سے جمعیۃ العلماء کے کلکتہ کے اجلاس کے موقع پر ملاقات ہوئی، اور آخری ملاقات آٹھ دس برس ہوئے اس وقت ہوئی جب مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڈھ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں کمال یار جنگ تعلیمی تحقیقاتی کیٹی مقرر ہوئی تھی، یہ وقت ملکی سیاسیات کے ایک نئے پہلو کا تھا،

مرحوم سیاسیات میں جمعیۃ العلما کے ساتھ تھے، اور اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کر چکے تھے، لیکن آخر میں وہ اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں منسلک ہو گئے تھے اور جمعیۃ علمائے اسلام میں داخل ہو گئے تھے، اور اس حیثیت سے وہ بنگال کی اسلامی سیاست پر بہت اثر انداز تھے،

مرحوم علوم دینیہ کے علاوہ زمانۂ حال کے حالات و خیالات سے بھی پوری طرح باخبر تھے، جس کا ثبوت ان کے وہ مختلف خطبات ہیں جو انھوں نے مختلف مجلسوں میں پڑھے، ان کا جمعیۃ العلماء کا خطبہ صدارت ان کی سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، چند سال ہوئے جامعہ ملیہ دہلی میں اسلام کے سیاسی و معاشی اور دوسرے عصری مشکلات پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اہل بصیرت نے اس کی بیحد قدر کی، ان کی زندگی کا سب سے آخری کارنامہ ابھی چند ماہ ہوئے مشرقی بنگال کے ایک مذہبی و تبلیغی جلسہ میں ان کا حکیمانہ خطبہ

جس میں پاکستان کی سیاسی حیثیت اور سیاسی مجبوریوں کی بنا پر اصول خلافت کی بنیاد پر حکومت کی تاسیس کی معذوریوں کا بیان تھا، یہ خطبہ بھی ان کی سیاسی فہم و تدبر کا نمونہ ہے۔

مرحوم ایک ممتاز طبیب، ایک مشہور عالم، ایک خوش بیان خطیب اور ایک مفکر ہونے کے ساتھ مصنف بھی تھے، چنانچہ ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب اصح السیر ہے، جو افسوس ہے کہ ان کی وفات سے ناتمام رہی۔

مولانا اونچا سنتے تھے، اس لیے ہمیشہ ایک آلہ ساتھ رکھتے تھے، جس کو لگا کر دوسروں کی بات سنتے تھے، تاہم ان سے ملنے جلنے والوں کا بڑا حلقہ تھا، اور کلکتہ میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اہل علم اور اہل سیاست دونوں میں ان کا خیر مقدم تھا، وہ متواضع، سادہ مزاج اور خلیق تھے، چھوٹے بڑے سب سے یکساں ملتے تھے۔

مرحوم کی عمر اس وقت ۸۱ سال کی تھی، جس کے معنی یہ ہیں ۱۸۷۷ء میں انکی ولادت ہوئی ہوگی، ۱۹ فروری ۱۹۵۸ء کی صبح کو جمعرات کے دن ۸ بجے کے قریب ان کی علالت کی ابتدا ہوئی، فرمایا کہ بخار معلوم ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد جاڑا معلوم ہوا، دن بھر کچھ بخار رہا، مغرب کی نماز تک کوئی خاص بات نہ تھی، ساڑھے سات بجے شام سے حالت بگڑی، یہاں تک کہ رات کو ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم کی وفات سے کلکتہ کی سرزمین علم وعرفان کے نور سے محروم ہوگئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن کرے۔

"س"

یعقوب بخش راغب قادری بدایونی

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کے خط سے یہ معلوم کرکے دل کو بڑا رنج ہوا کہ میرے پرانے دوست مولوی یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی نے ۲۱ فروری ۱۹۵۸ء کو علی گڈھ میں جہاں وہ دینیات کے استاد تھے، اچانک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے وفات پائی، جنازہ

علی گڈھ سے بدایون لے جایا گیا، اور درگاہ قادریہ میں وہ سپرد خاک ہوئے، عمر غالباً ساٹھ سال کے قریب ہوگی،

مرحوم بدایون کے ایک نامور اور صاحب علم گھرانے سے تھے، ان کے پرنانا مولوی علی بخش صاحب صدر الصدور تھے، جن سے سرسید کے تحریری مناظرے رہے ہیں، کیا عجیب بات ہے کہ اس کا پرنواسا جس کا پرنانا سرسید سے ایسا مذہبی اختلاف رکھتا تھا جس میں کفر و اسلام تک کا تفرقہ تھا وہ سرسید کی تعلیم گاہ میں دینیات کا مدرس ہوکر رہا،

مرحوم سے میرے تعلقات بڑے پرانے تھے، ان کا آغاز شعر و سخن سے ہوا، مرحوم اردو کے اچھے شاعر تھے، انھوں نے اپنا کلام مجھے میری رائے معلوم کرنے کو بھیجا، میں نے اس کی بڑی داد دی، اور اس طرح مکاتبت کا سلسلہ جاری ہوا، پھر تحریک خلافت کے زمانہ میں محب عزیز (جن کا نام اب بھی محبت کے ساتھ زبان پر آتا ہے) مولانا عبد الماجد صاحب مرحوم بدایونی کے توسط سے معرفت اور شناسائی کا تعلق دوستی سے بدل گیا، ملاقات کا اتفاق بدایوں کے ایک جلسۂ خلافت کے سلسلہ میں ہوا، جس میں مولوی عبد الماجد صاحب بدایونی مجھے صدر بنا کر لے گئے تھے، اور کئی روز ان کے مکان پر ٹھہرنا پڑا،

مرحوم عربی کے بڑے عالم، ادب و لغت کے فاضل اور ہیئت و نجوم کے استاد تھے، عربی میں قصیدے بہت لکھے اور بہت اچھے لکھے، بدایون کے سلسلۂ قادریہ میں حب رسول کی بنا پر سیادت سے بے انتہا شیفتگی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں مرحوم کو مجھ "بدنام کنندۂ نکونامے چند" سے بھی محبت کی عقیدت تھی، چنانچہ اپنے عربی قصیدوں کو میری طرف نسبت دیکر میری عزت بڑھائی،

ہیئت و نجوم سے ان کو خاص ذوق تھا، ان کے گھر میں بزرگوں کا اندوختہ بڑا اچھا کتبخانہ تھا، جس میں بعض نادر قلمی کتابیں تھیں، انھیں میں محقق طوسی اور دوسرے قدیم مسلمان علماے ہیئت کے قدیم رسالے تھے، مرحوم نے اپنے ذوق سے ان کو پڑھ کر اور صحیح کرکے الانجم الطوالع کے

نام سے شائع کیا، سر شاہ سلیمان مرحوم کے اشارہ سے علامہ بیرونی کی قانون مسعودی کے کچھ جزار کا اردو مین ترجمہ کیا تھا،

حدیث مین ان کا سلسلۂ تلمذ مولانا سید یونس علی صاحب بدایونی کے واسطے سے خاندان ولی اللّٰہی تک اور معقول مین مولانا محب احمد صاحب بدایونی کے توسط سے خانوادہ خیرآباد تک منتہی ہوتا ہے، شاعری مین شیخ احمد علی شوق لکھنوی کے شاگرد تھے، اور بیعت سلسلۂ قادریہ مین مولانا عبد القادر صاحب بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے حاصل تھی، عقیدہ مین سخت حنفی سنی قادری تھے، تاہم اس سختی مین لچک اتنی تھی، کہ مجھ جیسے نرم وگرم سے بھی نباہ کر لیتے تھے،

پہلے گھر ہی پر بدایون مین پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتے تھے، ۱۹۳۰ء مین مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات مین مقرر ہو کر علی گڈھ منتقل ہو گئے تھے،

مرحوم کی دوستی کا ایک نادر تحفہ یہ تھا کہ جب ان کا جی چاہتا، بدایون کے پیڑے ڈاک سے اعظم گڈھ بھیجتے اور اس کے معاوضہ مین صرف ایک تشکر کا ہدیہ کافی سمجھتے، ان کا سب سے اخیر خط مجھے بھوپال مین ملا جس مین اپنے ہونہار صاحبزادہ کا تعارف مجھ سے کرایا تھا، اللہ تعالیٰ ان صاحبزادہ کو علم دنیا کے ساتھ علم دین کا حصہ بھی عنایت کرین، اور اپنے بزرگون کے نقش قدم پر قائم رکھین" س"

سیر انصار حصہ اول

اس مین انصار کرام کے حالات وسوانح اور ان کے علمی مذہبی، اخلاقی، اور سیاسی کارنامون کی پوری تفصیل کی گئی ہے، اس سے پہلے ایک بسیط مقدمہ مین انصار قبل از اسلام کی مفصل تاریخ، اُن کے نسب نامے، آداب وتمدن، اور معاشرت واخلاق کو نمایان کیا گیا ہے، اس طرح یہ حصہ انصار کی تاریخ قبل الاسلام اور بعد الاسلام کا ایک بہترین مجموعہ بن گیا ہے، طبع دوم ضخامت ۲۱۲ صفحے، قیمت حصہ دوم سے، ر

"منیجر"

ادبیات

خلیفۂ اوّل کا کفن

از جناب محمود اسرائیلی

وقتِ وصال احمدِ مرسلؐ کا یارِ غار
کہتا تھا عائشہؓ سے کہ نورِ نگاہِ من

جب تین چادروں میں میسر ہوئی تھی دفن
اتنا ہی میرے واسطے کافی ہی بس کفن

اک چادر اور ہو مری میت کے واسطے
موجود میرے تن پہ ہیں دو چادریں کہن

کی عرض عائشہؓ نے کہ اے محترم پدر
اے مایہ دارِ خلقِ نبی، نازشِ وطن

اے آسمانِ صدق کے تابندہ ماہتاب
اے محفلِ رسول کے فانوسِ ضوفگن

اے بعد انبیاء جہان افضل البشر
شاداب جس کے دم سے نبوت کا ہی چمن

اے منبعِ سخاوت و احسان و حلم و زہد
اے معدنِ تدبر و دانائے علم و فن

اے وہ کہ جس کی ذات ہی بیکس کی پردہ دار
لیتا ہے جس سے جامۂ نو ہر برہنہ تن

یہ امر اقربا کو گوارا ہو کس طرح
اس کے کفن کے واسطے ہو چادرِ کہن

توفیق دی ہے ہم کو بہ ربِ کریم نے
تکفین کی غرض سے خریدیں نیا کفن

دختر کی التجا کا پدر نے دیا جواب
جو تھا فدائے شیوۂ سرکارِ ذوالمنن

"اے نورِ دیدہ تجھکو یہ اب تک خبر نہیں
ہوتا ہے ریم و خون ہی کی خاطر فقط کفن

زیبا ہیں جسم زندہ ہی کو جامہ ہائے نو
شایاں ہیں مردہ تن کے لئے جامہ کہن

مطبوعات جدیدہ

حکومتِ الٰہیہ:۔ مترجمہ جناب رئیس احمد صاحب جعفری ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے سکہ عثمانیہ ۱۲؎ کلدار، پتہ:۔ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن،

حکومتِ الٰہیہ یعنی اسلامی نظام حکومت پر اردو مین بکثرت مضامین لکھے جا چکے ہین، اور بہت سی کتابین تالیف و ترجمہ ہو چکی ہین، مذکورۂ بالا کتاب مصر کے ایک صاحب قلم عبد الوہاب خلاف انسپکٹر محاکم شرعیہ کی کی تالیف السیاستہ الشرعیۃ کا ترجمہ ہے، اس مین حسب ذیل ابواب و مباحث ہین، جنمین گفتگی اسلام اور سیاست عادلہ، اسلامی حکومت کا دستور و آئین، اسلام مین تمدن و اختیار، خلافت، حکومت، اسلام کا محکمۂ خارجہ یعنی غیر اقوام کے تعلقات کے قوانین، جنگی احکام، صلح و امن کے احکام، مالی نظام، حکومت کے مالی ذرائع اس کے مصارف، اس کا آمد و خرچ، جیسا کہ ان ابواب سے ظاہر ہے اس مین اسلامی نظام حکومت کے ان تمام شعبون پر جو کسی حکومت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہین، بحث کی گئی ہے، یہ مباحث عالمانہ اور مبصرانہ ہین، خصوصاً پہلے دو باب جن مین اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظام حکومت کے متعلق اصولی مباحث ہین، زیادہ اہم ہین، جنمین گفتگی مین بتایا گیا ہے، کہ اسلام کا قانون چونکہ دائمی اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر زمانہ کی ضروریات بدلتی رہتی ہین، اس لئے قرآن مجید اور احادیث نبوی مین جو اسلامی تعلیمات کا اصل ماخذ ہین، انسانی زندگی مختلف شعبون کے متعلق صرف بنیادی اور اصولی تعلیمات ہین، اور اس کی تفصیل مجتہدین کی رائے پر چھوڑ دی گئی ہے، کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ان بنیادون

پر نئے مسائل کی تفریع اور ان کا استنباط کرتے رہین، اور خلفاے راشدین صحابۂ کرام اور قرن اول کے ائمہ و مجتہدین کے عمل سے اس کی مثالین دی گئی ہین، اور اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے اسباب اور اس کی خرابیان ظاہر کی گئی ہین، دوسرے باب مین حکومت کے بارہ مین اسلام کے اصولی اور کلی قوانین کو بیان کیا گیا ہے، باقی ابواب مین دوسرے اہم شعبون کی تفصیل ہے، ان مین دورِ جدید کے نقطہاے نظر اور ان کے نظامون اور دستورون کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے، اور بڑی حد تک صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے لیکن اجتہاد حق تشریع، اسلام مین اقتدار و اختیار شخصی حریت و آزادی، اور اس قبیل کے بعض دوسرے مسائل مین کہین کہین جدید اثرات نمایان ہوگئے ہین، گو اُن کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی گئی ہے لیکن جس زور و قوت کے ساتھ مذکورۂ بالا امور کی حمایت کی گئی ہے، اس کے مقابلہ مین دفع دخل مقدر کا پتہ ملکا ہے، اس پہلو سے قطع نظر، ورتمام حیثیتون سے اردو مین اس موضوع پر جس قدر کتابین لکھی گئی ہین، ان سب مین یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے، لائق مترجم ایک مشاق صاحبِ قلم ہین، اس لئے ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے،

مسلم سماج از فاطمہ ثریا صاحبہ حمیدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے پتہ حمایت نگر، بنگلہ نواب نثار یار جنگ بہادر حیدر آباد دکن،

آج کل تربیت کی خرابی اور غیر اسلامی ماحول کے اثر سے نوجوان تعلیم یافتہ لڑکون اور لڑکیون کو عموماً اپنے مذہب و روایات سے کوئی علاقہ نہین ہوتا، اُن کی روشن خیالی کی معراج مذہب سے آزادی، اور ان کی تعلیمی استعداد کا مظہر ترقی پسند ادب اور حسن و عشق کی داستان سرائی ہوتی ہے، زندگی کے سنجیدہ پہلوؤن اور دینی و اخلاقی فرائض کی جانب ان کی نظر نہین جاتی، لیکن ہر کلیہ مین مستثنیات ہوتے ہین، مصنفہ بھی انہی مستثنیات مین ہین، انھون نے مسلم سماج مین دنیوی اور دینی دونون پہلوؤن سے ایک مسلمان کی معیاری زندگی کو افسانہ کی شکل مین پیش کیا ہے، اور مذہب کا احترام، اس کی پابندی، جدید تعلیم کے ساتھ اسلامی

تربیت، اخلاق و سیرت کی اصلاح، مذہبی حقوق و فرائض کی ادائگی، دنیا وی ترقی کے اسلامی اصولوں
جدوعمل، اور موجودہ دور کی محنت و سرمایہ کی کشمکش اور اس کے حل کو خوبی کے ساتھ دکھایا ہے یہ کتاب
ہونہار مصنفہ کی پہلی قلمی کوشش، اور ایک اصلاحی افسانہ ہے، اس لیے اس کو ناول نگاری کے فنی
معیار سے نہ دیکھنا چاہیئے، اس حیثیت سے وہ خامیوں سے خالی نہیں، لیکن جس مقصد سے لکھی گئی
ہے، اس میں پوری طرح کامیاب ہے، امید ہے کہ مشق و مہارت سے انکی خامیاں دور ہو جائیں گی،
اور ہونہار مصنفہ کی یہ کوشش قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی،

بہار اور اردو شاعری از جناب محمد معین الدین صاحب دردائی ایم اے علیگ تقطیع
چھوٹی، ضخامت:- ۱۶۵ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت عہ پتہ طیب حسن
اینڈ برادرس اسلامیہ بک ڈپو آرہ،

دہلی اور لکھنو کے بعد اردو شاعری کا تیسرا مرکز عظیم آباد تھا، اور ہر دور میں یہاں بڑے بڑے شعرا
پیدا ہوئے، اور آج بھی بہار خوش گو شاعروں سے خالی نہیں ہے، مصنف نے اس کتاب میں بہار
میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، اور مرزا بیدل سے لے کر اس زمانہ تک ہر دور کے شعرا
کا مختصر تذکرہ کیا ہے، اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے، جس سے بہار میں اردو شاعری کی تاریخ کا سرسری
اندازہ ہو جاتا ہے، کتاب میں طباعت و کتابت کے اغلاط کے علاوہ جس کا اعتراف خود مصنف کو
ہے، اور بھی بعض غلطیاں نظر آئیں، مثلاً سطر کا سطر اڑا دیا گیا ہے "وہ بھی میرے شناسا ں نہ تھے" "نجاتِ
پیام نجات کو"، اس قسم کی فروگذاشتیں اور بھی ہیں،

عطر الوردین مرتبہ جناب حکیم سید محمد شعیب صاحب رضوی وعون احمد صاحب قادری
تقطیع بڑی ضخامت ۳۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ مولوی محبوب عالم
صاحب خانقاہ مجیبی پھلواری شریف، پٹنہ۔

حضرت مولانا شاہ بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ امیر شریعت صوبہ بہار اور اُن کے جانشین مولانا شاہ محمد محی الدین پھلواروی، علم و عمل اور شریعت و طریقت کی جامعیت کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے، اور فارسی مین فکر و سخن فرماتے تھے، عطر اور دین ان کے کلام کا مجموعہ ہے لیکن شاعری کو انھون نے مشغلہ نہین بنایا، بلکہ تفنن طبع کے طور پر کبھی ادھر بھی توجہ ہو جاتی تھی، اس لئے ان کا کلام مختصر ہے، مگر جس قدر ہے، توحید و معرفت، اور حب رسول کے جذبات سے لبریز ہے، اس لحاظ سے یہ مجموعہ اس بادہ کے لذت شناسون کے لئے صحیح معنون مین عطر اور دین کی حیثیت رکھتا ہے، امید ہے کہ وہ اس کی نکہت سے لطف اندوز ہون گے،

نمونۃ المعرب از پروفیسر سیف بن حسین القطیطی ایم اے پروفیسر احمد بن ناصر العیسری استاد عربی عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن،

عربی زبان کے طلبہ کے لئے عرصہ سے ایک مستند "عربی اردو" اور "اردو عربی" لغت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، اول الذکر لغت کی ترتیب کا کام عرصہ ہوا دارالمصنفین نے شروع کیا تھا، اور اس کا ایک حصہ لکھا بھی جا چکا ہے، لیکن ابھی پورا نہین ہو سکا ہے، خوشی کا مقام ہے، کہ "اردو عربی" لغت کی تدوین حیدرآباد کے دو فاضلون نے جو غالباً وہان کے متوطن عرب ہین، اور جن کو عربی زبان کے ساتھ اردو پر بھی پورا عبور ہے، شروع کی ہے، اور اس کا مطبوعہ نمونہ اظہار رائے کے لئے ہمارے پاس بھیجا ہے، اس مین، الف، ب، پ اور گ کے اردو کے مفرد و مرکب الفاظ، مصطلحات اور اُن کے عربی مترادفات کے نمونے ہین، جو محض ترجمہ نہیں بلکہ اہل زبان کی فصیح عربی ہے، اس لغت سے ایک بڑی کمی پوری ہو گی، اور اردو مین ایک مستند اور قابل اعتماد، اردو عربی لغت کا اضافہ ہو گا، جس سے عربی کے طلبہ کو بڑی سہولت ہو جائیگی، اس لحاظ سے فاضل مولفین کی علمی خدمت بڑی قابل قدر ہے،

"م"

جلد ۶۱ ماہ رجب ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

ادبیات

انگریز فلسطین سے اپنا دامن چھڑا کر الگ ہوگئے لیکن انھوں نے آج سے تیس سال پہلے فساد کا جو بیج بویا تھا، وہ رنگ لاکر رہا، اور اس مقدس سرزمین میں عرب اور یہود کی جنگ شروع ہوگئی، اگر امریکہ اور یورپ کی حکومتوں کا قدم درمیان میں نہ ہوتا، تو عرب تنہا اس کا فیصلہ کر لینے کے لئے کافی تھے لیکن ان تمام حکومتوں کے سیاسی اور اقتصادی مفاد فلسطین سے وابستہ ہیں، اس لئے وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتیں، امریکہ مشرق وسطی میں انگریزوں کی جگہ لینا چاہتا ہے، اور اس کی حکومت و سیاست پر یہودی ساہوکاروں کا بڑا اثر ہے، اس لئے وہ ان سے الگ نہیں ہو سکتا، لیکن عربوں کی علانیہ مخالفت بھی اس کے مصالح کے خلاف ہے، اور اس کی زیادہ مخالفت یورپ کی حکومتیں بھی برداشت نہیں کر سکتیں، اس لئے نہ وہ کھل کر میدان میں آسکتا ہے اور نہ یہودیوں کی حمایت سے دستکش ہو سکتا ہے، اس کا حریف روس بھی اس میدان میں اس سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا، اسی لئے قوموں کی آزادی کے دعوی اور سرمایہ دشمن ہونے کے باوجود وہ سرمایہ دار صیہونی حکومت کی حمایت پر مجبور ہے، صرف ایک برطانیہ کا رویہ اس کے مصالح کی بنا پر عربوں کے خلاف نہیں ہے، ان سطور کی تحریر کے وقت تک عربوں کا پلہ بھاری ہے، اور عرب حکومتیں جس اتحاد و یکجہتی اور جانفروشی سے لڑ رہی ہیں، اور جس طرح بڑھ رہی ہیں، اگر حفاظتی کونسل اور امریکہ اور یورپ کی حکومتیں مداخلت نہ کریں تو یہودیوں کی شکست یقینی ہے، لیکن حفاظتی کونسل مختلف بہانوں سے مداخلت کر رہی ہے، اور جب تک اس کا اور دوسری قوتوں کا رویہ واضح نہ ہو جائے، اس وقت تک آخری نتیجہ کے متعلق کوئی صحیح پیشگوئی نہیں کیجا سکتی،

فلسطین اسلام کے پہلے داعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مدفن اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ ہے، مسجد حرام اور مسجد نبوی کے بعد ان کی تیسری مقدس مسجد مسجد اقصیٰ جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی یہیں ہے، اس کے علاوہ بہت سے صحابۂ کرام، تابعین و تبع تابعین اور دوسرے اکابر و ائمۂ اسلام اس سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں، اس لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد ان کا تیسرا مقدس شہر بیت المقدس ہے، اس کی سیاسی حیثیت بھی کم اہم نہیں مسلمان تیرہ صدیوں تک اس سرزمین کے حکمران رہے، اور اس زمانہ میں جب یہودیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، اور وہ ساری دنیا میں بے خانماں پھر رہے تھے مسلمانوں نے اس کی حفاظت و پاسبانی کا فرض انجام دیا، اس کے ایک جانب بحر روم اور

تین سمتون مین عرب حکومتین ہین، اوراب یہودی اپنی دولت کے بل پراور امریکہ کی مدد کے سہارے فلسطین کے عربون کی جن مین مسلمان اور عیسائی دونون شامل ہین، آزادی چھینا چاہتے ہین، اگر یہان صیہونی حکومت قائم ہوگئی تو نہ صرف فلسطین کے عرب اور عیسائی محکوم ہوجائین گے، بلکہ اس کی ہم سرحد عرب حکومتون کے لئے بھی دائمی خطرہ پیدا ہوجائے گا، اس لئے فلسطین کا مسئلہ مذہبی اور سیاسی دونون حیثیتون سے مسلمانون کے لئے نہایت اہم ہے،

انگریزی حکومت کے زمانہ مین جب کہ ہندوستانیون کو بیرونی معاملات مین مداخلت کی پوری آزادی نہ تھی، یہان کے مسلمانون نے اسلامی حکومتون سے متعلق اپنے فرض کی ادائگی مین کبھی کوتاہی نہین کی، اوراب جب کہ وہ آزاد ہین، عربون کی ہرممکن مدد کرنا اُن کا فرض ہو، ایک حیثیت سے ہندوستان سے بھی اس کا تعلق ہوجاتا ہے، فلسطین مین صیہونی حکومت کے قیام کے معنی مشرق وسطیٰ مین جو مشرق و مغرب کا درمیانی دروازہ ہے، بالواسطہ امریکہ اور یورپ کے اقتدار کے ہین اور یہودیون اور عربون کی جنگ صیہونی آمریت اور عرب جمہوریت کی جنگ ہے اس لئے بحیثیت جمہوری اور ایشیائی حکومت کے عربون کی حمایت کرنا انڈین یونین کا بھی اخلاقی فرض ہے،

ایک طرف کانگریس ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی اور باہمی رواداری اور فیاضی کا وعظ کہتی ہے اور دوسری طرف اس کے ذمہ دار اشخاص فتنہ انگیزی مین مشغول ہین، حال مین صوبائی اسمبلی اور کانگریس کے صدر ٹنڈن جی نے جو تقریرین کی ہین، وہ نہ صرف کانگریس کے اصولون اور ملکی مصالح کے خلاف بلکہ حد درجہ شرانگیز ہین، ان تقریرون مین انھون نے ہندوستان و پاکستان کی تقسیم اور اس سلسلہ کے خونین واقعات کو نہایت اشتعال انگیز طریقہ سے دہرایا ہے، اور مسلمانون سے ہندی زبان کے ساتھ ہندو کلچر کے جبری قبول کرنے کا مطالبہ کیا ہے، اور اردو زبان کو پیدائش کے علاوہ ہر حیثیت سے غیر ملکی، دو کلچرون کی تفریق اور ہندوستان و پاکستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اور تنہا ہندی کو ہندوستان کی مشترک زبان اور ہندوستانی کلچر کی نمایندہ قرار دیا ہے، ان کو ہندوستان مین ہندی زبان اور ہندو کلچر کے علاوہ اور کسی زبان اور کلچر کو دیکھنا گوارا نہین،

اس سے قطع نظر کہ کانگریس کے ایک ذمہ دار کی زبان سے اس قسم کی تقریرین کہان تک مناسب ہین حقیقت واقعہ علم و تحقیق اور منطق و استدلال کے لحاظ سے بھی نہایت مہمل ہین، اچھا بُرا جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا اب اس کو عوام کے سامنے باربار دہرانے سے ان مین اشتعال انگیزی اور منافرت پھیلانے کے سوا کچھ حاصل نہین، اردو کو غیر ملکی زبان کہنا یا

اس سے ناواقفیت کا ثبوت ہے یا صریح جھوٹ ہے اس کی تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، خود منصف مزاج ہندو تک اس کے جوابات دیچکے ہیں، اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، اردو پر دو کلچروں کی تفریق، اور ہندوستان کی تقسیم کا الزام لگانا اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز ہے، اب تک تو اس کو مسلمہ طور پر دونوں کلچروں کے اختلاط کی پیداوار اس کا زندہ نمونہ اور ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی نشانی سمجھا جاتا تھا، ٹنڈن جی کا یہ انکشاف بالکل نیا اور یہ دعویٰ بالکل نرالا ہے،

خرد کا نام جنون پڑ گیا جنون کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

پھر ہندوستان میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں، مرہٹی، گجراتی، سندھی، پنجابی، بنگالی، تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم وغیرہ اور آخر الذکر زبانیں تو اردو سے کہیں زیادہ ہندی سے دور اور اس سے مختلف ہیں، اور اس کے بولنے والے ہندو انھیں چھوڑ کر ہندی کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، اور اس کی مخالفت میں جیل تک جا چکے ہیں، ایسی حالت میں تنہا ہندی ہندوستان کی مشترک زبان اور ہندو کلچر کی نمایندہ کس طرح ہو سکتی ہے،

رہا ہندوستانی اور بیرونی کلچر کا سوال تو ہندوستانی مسلمانوں کا کلچر خالص اسلامی کب ہے وہ تو ہندو مسلم کلچر کا مرکب ہے، مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کا کون سا شعبہ ہندو کلچر کے اثر سے خالی ہے اس کا تو خود یہ حال ہے:-

ع قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لیکن اگر ٹنڈن جی کو بیرونی اثرات سے ایسے ہی چھوت ہے تو وہ ان کو کس کس چیز سے مٹائیں گے، ہندو مذہب تک اس سے پاک نہیں ہے، یہ مورتی پوجا کی مخالفت، آریہ سماج اور برہمو سماج کی تحریکیں، اچھوت ادھار، مساوات کی تعلیم، طلاق اور لڑکیوں کی وراثت کے قوانین اور اس قسم کی دوسری اصلاحات کس شاستر میں ہیں، اور کس کے اثرات ہیں؟

ع دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ، ٹنڈن جی اس زمانہ میں تو ہندوستان کے قدیم طریقہ کے مطابق کھانا تک نہیں کھا سکتے تو اور چیزوں کا کیا ذکر ہے پھر ساری بیرونی اثرات کو مٹانے کے بعد ہندوستانی تہذیب کیا جائیگی اور ہندوستان کا حشر کیا ہوگا یہ طعن و طنز نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور تہذیبوں کے اختلاط سے ایک دوسرے کا متاثر ہونا بالکل طبعی ہے جس سے کوئی قوم بھی مستثنیٰ نہیں، خود مسلمانوں میں کتنے ہندوانہ رسوم رائج ہیں، دوسرے تمدنوں کے صالح اجزاء کو قبول کئے بغیر کوئی تمدن ترقی نہیں کر سکتا،

ہندو مسلمانوں کا مشترک تمدن تو ایک ہزار سال پرانا ہے اور بہرحال مشرقی ہے جس کے بہت سے عناصر خالص ہندی ہیں، ٹنڈن جی تو مغربی تمدن کے اثرات کو بھی جو خالص بدیسی ہے جس کو ہندوستانی کلچر سے کوئی علاقہ نہیں اور اسکی عمر بھی ہندوستان میں نسبۃً بہت کم ہے نہیں مٹا سکتے انڈین یونین کا سارا کارخانہ اسی پر قائم ہے ایسی حالت میں اس تمدن کو مٹانے کا تصور جو صدیوں سے ہندوستان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے خیال خام سے زیادہ نہیں، ٹنڈن جی کو ان اوہام کو چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی بھلائی کا صحیح راستہ اختیار کرنا چاہئے، وہ رجز خوانی تو بہت کر چکے، اب ذرا مہر و محبت کے زمزمہ کا بھی تجربہ کریں،

مقالات

تجدید تعلیم

از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

(۴)

الغرض کوئی اور سمجھے نہ سمجھے، مگر مسلمان کو اس کے سوا سمجھنے کا حق ہی کیا ہے، کہ رزق یا معاش کی تنگی و فراخی قبض و بسط، عطا و منع بالکلیہ مشیتِ الٰہیہ پر منحصر ہے، انَّ ربَّکَ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر، اَوَلَمْ یعلمُوا انَّ اللّٰہ یبسُط الرزق لمن یشاء و یقدر، وغیرہ کثیر آیات نے اس باب مین کوئی شک و شبہہ کی گنجایش نہین چھوڑی ہے، کہ رزق کے ظاہری اسباب بس ظاہری سے زیادہ نہین، اس لئے غیرون کی طرح ان مین اتنا غلو دینا کہ گویا اسباب و تدابیر ہی حقیقی رازق ہین، نہ اسلام ہے نہ اسلام کے خدا پر ایمان، اور نہ حقیقی اسلام اور نہ حقیقی مسلمانون کی تاریخ و زندگی ہی سے اس کی شہادت ملتی ہے، یہ تو دراصل زبان سے خدا کا اقرار اور عمل سے اپنی خدائی کا اعلان ہے، اس قسم کے تصورات کو جب تک دماغ بدر نہ کیا جائے، اس وقت تک اسلام کی دینی و دنیوی برکات، انفرادی و اجتماعی ثمرات کی توقع کا حق ہی کیا حاصل ہے؟

یہ تو اس سوال کی کہ "عربی یا دینی تعلیم حاصل کرکے کھائین گے کیا" بڑی خطرناک ایمانی و اعتقادی غلطی تھی، ایک دوسری بڑی خود فریبی اور مغالطہ یہ ہے کہ کھانے سے مراد ضروریات زندگی سے زیادہ فضولیاتِ زندگی ہوتی ہین، یعنی ہم نے کھانے پہننے، رہنے سہنے، شادی بیاہ، مکان و سامانِ زندگی کے تمام جاری و وقتی مصارف کا ایک خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے، جب تک وہ پورا نہ ہو اس وقت تک ہم سمجھتے، اور کہتے ہین، کہ کھانے ہی کو نہین مل رہا ہے، حد یہ کہ امرا تک سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر آپ کو اس کی

کیا حاجت ہو، کہ دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اولاد کو جج و کلکٹری کے لئے دنیا دی تعلیم دلاتے ہین، تو جواب بہی ملتا ہے، کہ اگر ہماری آمدنی زیادہ ہے، تو ہماری حیثیت و مصارف بھی تو ویسے ہی ہین یعنی اس حیثیت جاہ و مال کو موجودہ آمدنی مین اضافہ اور جاہی مناصب حاصل کئے بغیر کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے، یہ ایسی منطق ہے کہ جاہ و مال کے کسی اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی لاجواب نہین ہو سکتی۔

ورنہ ابھی عالمگیر حب جاہ و مال کی اس عالمگیر جنگ سے پہلے اسی ہندوستان مین زندگی کی نفس ضروریات پانچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھین، یعنی چھوٹے بڑے چار پانچ آدمیون کے گھر کے لئے ۲۵، ۳۰ ماہوار نفس ضروریات کی حد تک بلا کسی تکلیف و تنگی کے کافی ہوتے تھے، اور بہتیرے مولوی بلکہ اچھے اچھے علما اس سے بھی کم مین گذر فرماتے تھے، خود حضرت علیہ الرحمہ کی تنخواہ کانپور مین پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار تھی، جو حضرت کے علم و عمل کے کمالات کے لحاظ سے کیا تھی، پھر بھی حضرت نے اس کو بہت بڑی تنخواہ سمجھا تھا، اور فرماتے کہ

> "مین طالب علمی مین سوچا کرتا تھا، تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کی درس اپنی ضروریاتِ معاشی کے لئے کافی سمجھتا تھا، (اس مین بھی) پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لئے اور پانچ گھر کے خرچ کے لئے، اس سے زیادہ کی تنخواہ پہ کبھی نظر ہی نہ جاتی، نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا" (اشرف السوانح حصہ اول ص ۳۷)

خود راقم ہذا کو اپنے گھر کا تجربہ ہے کہ والد مرحوم دیہاتی و وہ بھی نہایت قانع و متوکل طبیعت کے واقع تھے، خرچ اوسطاً ۸، ۱۰ آدمیون کا، اندر باہر ایک آدھ نوکر چاکر بھی، کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ سب کا معیار اوسط درجہ کے شرفا اور اہل برادری کا، مگر آمدنی کا اوسط شاید ہی کبھی ۳۰۔۴۰ سے بڑھا ہو، نہ آمدنی مین ترقی کی کبھی کوئی فکر فرمائی، البتہ اللہ اور اللہ والون سے تعلق مین ترقی کی فکر آخر دم تک رہی، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت کے باوجود ان کی وفات کے بعد

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آخر تک برابر اصلاح و استفادہ کا تعلق جاری رہا، زیادہ عبرت و سبق کی بات یہ کہ گھر بھر مین چھوٹے بڑے سب کو قلب کی جو راحت و طمانیت یا دل کا جو سکون چین نصیب تھا، وہ اس نالائق نام لیوا اور اُس کے متعلقین کو سیکڑون ہزارون کی آمدنی اور کوٹھی و موٹر مین بھی میسر نہ ہوا، ہان گھر بھر مین والد علیہ الرحمہ کے اس رنگ و برکت کا وارث والدہ مدظلہا کا دم رہ گیا ہے (رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا) برکت کی حقیقت بھی ان اللہ والے والدین ہی کی زندگی و آمدنی کو دیکھ کر سمجھ مین آئی،

باقی اپنی سیکڑون ہزارون کی آمدنی کوٹھی موٹر نوکر چاکر سب کے چوتھائی صدی کے تجربات کی میزان اپنے ایک حکیم و حکیم طبع استاد (مولانا شیر علی صاحب مرحوم) کے ایک بڑے ہی حکیمانہ فقرہ کے سوا کچھ نہ نکلی، مولانا ندوہ مین جب راقم الحروف آخری جماعت مین تھا، صدر مدرس و مہتمم تھے، پھر جامعہ عثمانیہ مین شعبۂ دینیات مین علم کلام کے استاد مقرر ہو گئے تھے، مشاہرہ چھ سو ماہوار تھا، ابھی تک موٹرون کے بجائے گھوڑا گاڑی کا چلن وہان زیادہ تھا، اکثر عہدہ دار اپنی گھوڑا گاڑی رکھتے تھے، مولانا کے پاس بھی تھی جس پر یونیورسٹی تشریف لاتے تھے، کچھ دن بعد دیکھا کہ ایک کرایہ کی گاڑی پر تشریف لانے لگے، عرض کیا کہ حضرت گھر کی گاڑی کیا ہوئی ؟ فرمایا نکال دیا، دو گھنٹے مین اس پر سوار ہوتا تھا، چوبیس گھنٹے وہ میرے اوپر سوار رہتی تھی "!

اس وقت تو یہ حکیمانہ بات سمجھ مین آئی، اور مولانا کی پیرانہ سالی اور کم ہمتی کا تقاضا معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد خود گھوڑا گاڑی بھی رکھی، موٹر بھی رکھا، سو ماہوار تک کی کوٹھی بنگلہ کا بھی مزا چکھا، لکھنؤ مین ایکڑ بھر زمین مین خود اپنی دو منزلہ لمبی چوڑی کوٹھی بنائی لان اور پھلواری، نوکر چاکر، سامان اور فرنیچر سب ہی کا ٹھاٹ اپنی حیثیت و حوصلہ سے بڑھ کر دیکھا دکھلایا، مگر خدا کو گواہ کرکے گواہی دیتا ہون کہ جیسا جیسا حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی جوتیون کے تعلق سے کچھ عقل ٹھکانے لگی ویسا ویسا

اس سارے فخر و نمایش کے ساز و سامان کو راحت و آسایش سے زیادہ خود اپنے دل و دماغ پر سوار پانے لگا، اور بالآخر کچھ عرصہ بعد حیدر آباد ہی میں جب ایک محب و محسن کی ہمت و احسان سے جامعہ کے قریب ایک نو تعمیر مسجد کے احاطہ ہی میں خاص راقم الحروف احقر کے لئے دو حجرے تیار ہو کر ان میں قیام نصیب ہوا، تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ دل و دماغ قید کی کوئی بڑی سزا جھیل کر باہر آگیا ہے، اور آج بھی لکھنؤ کی ذاتی طویل و عریض کوٹھی میں بیٹھ کر حیدر آباد کی کوئی چیز یاد آتی ہے، تو شہر و شہرت سے دور مسجد اقصیٰ[1] کے یہی دو حجرے اور اسی زاویہ کے دو چار انے گنے عنایت فرما، لکھنؤ کی اپنی کوٹھی کا معاملہ بھی وارم چراغو شتم کا ہو رہا ہے، ورنہ اب کوٹھی کے بجائے کوٹھری ہی کو دل ڈھونڈتا ہے، یہ تو آپ بیتی تھی، جگ بیتی بھی جو کچھ وطن و دکن ہر جگہ دیکھی، اور سنی، وہ یہی کہ بڑے بڑے عہدہ دار اور بلند مناصب وزراء و امراء بظاہر جاہ و مال سب کچھ رکھ کر بھی سب کے سینہ کے اندر مزید جاہ و مال کے مقابلہ و مسابقت کی بھٹی دہکتی رہتی ہے اور بالعموم اسی کے انگاروں میں لوٹتے لوٹتے دم نکل جاتا ہے۔

یہ اپنی پرانی بظاہر طویل داستان اپنے مقصد و مفاد کے اعتبار سے طویل نہیں قصیر ہی ہے، اس لئے کہ دنیا کی جس طلب میں دین و آخرت کا ہوش نہ رہے، جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے، دوزخ و جنت کا خوف و شوق دل سے نکل جائے، خدا کی رضا و ناراضی کا غم نہ ہو تو یہ تو (معاذ اللہ) مومن و ایمان کے منافی بلکہ فر و کفر کی دنیا کے سوا کیا ہے، اور یہ دنیا کی طلب نہیں اور دنیا کا عشق بلکہ جنون ہے، بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے کہ کسب دنیا یا دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں، مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جائے کہ گویا خدا تعالیٰ سے بالکل واسطہ ہی نہیں، یہ تو کافروں کی زندگی کی خاص شان ہے، کہ گویا خدا سے

---

[1] یہ مسجد شہر کے بالکل کنارے دور (جو لفظاً اقصیٰ کے معنی ہیں) واقع ہے، جہاں اب جامعہ کی بدولت کچھ آبادی ہو چلی ہے، مولانا گیلانی احقر کے سالہا سال کے رفیق قیام و طعام بھی اسی مسجد کے جوار میں تشریف فرما ہیں اور اس مسجد کا "مسجد اقصیٰ" نام تو ایک اور دوست نے تجویز کیا تھا، مگر اس کا تاریخی نام ثابت ہونا مولانا ہی کی یادگار رہے،

کوئی واسطہ نہیں،

اور مومن کی زندگی کی خاص شان یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے بس مسافر اور سرائے کا سا تعلق رکھتا ہو، باقی فکر و عمل جد وجہد کا اصل تعلق خدا و آخرت سے ہوتا ہے، اور دنیا میں جو ہم یہ چاہتے ہیں، کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے، یہ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں،

"ایسا ہی ہے، جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ، فانوس سب لگا دئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دئے، تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے، خاص کر جب یہ بھی حکم ہو، مثلاً اس سرائے میں چار دن سے زیادہ کوئی قیام نہیں کر سکے گا، اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے۔ اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہو، کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا، تو اول تو سرائے میں قیام اگر اختیاری بھی ہو، تب بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے، اور جب اختیاری بھی نہیں تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہئے،

اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک الدنیا سجن المومن کے، لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لئے ہیں، اگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا، بلکہ اسلئے کہ جیل خانہ میں جی کبھی نہیں لگا کرتا، خواہ کیسا ہی ہو، عیش ہو، تو مسلمان کی شان ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے، اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو، کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہی اور دنیا گھر نہیں، پھر جب جی نہ لگے گا، تو کیوں ہوسیں ہوں گی، اور کیوں سوچیگا کہ یوں ہو اور یہ ہو، اور وہ ہو، بلکہ اب یوں سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے، یہاں جس طرح بھی گذر جائے اور دنیا کی بجائے آخرت کی سوچ ہونی چاہئے، ورنہ یہ سوچے گا کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر وہاں یوں بہار ہو گی، یوں عیش ہو گا، ورنہ یوں پریشانی ہو گی، یوں مصیبت ہو گی،

(انفاس عیسیٰ ص ۴۷۴)

لیکن ہماری زندگی اس کے برتاؤ اور معاملات سے (اِلّا ماشاء اللہ) بس ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ

"جیسے کوئی منکر آخرت ہو، کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے، آخرت کی نہین، نہ اس کا اتنا شوق ہے، چنانچہ دلون کو ٹٹول کر دیکھ لین کہ دنیا مین قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہین، کہ یون رہین گے، یون کرین گے، جائداد ہوگی، ملازم ہون گے، ڈپٹی کلکٹر ہون گے، وغیرہ وغیرہ،

"اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگین ہوتی ہین، کہ مرجائین گے تو خدا کے سامنے جائین گے، یون جنت ہوگی، اس مین باغات ہون گے، مکانات ہونگے حورین ہون گی، غالبًا کبھی یہ امنگین نہین ہوتین، بلکہ خیال بھی بہت کم آتا ہے"،

"بعض ایسے ہین جن کے پاس دنیا کی خوشی کا کوئی سامان نہین، اور وہ یون کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیان نہین مناتے، بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہین، کہ کوئی والی وارث نہین، زندگی کیسے کٹے گی، تو اُن سے یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کو بھی سوچا، اور وہان کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی، دوزخ مین جانا پڑا، تو وہ مصیبت کیسے سہی جائے گی، پھر جیسے یہان تکلیف کو سوچکر تدبیر سوچتے ہو، کہ شاید فلان تدبیر سے یہ تکلیف کٹ جائے، یا فلان تدبیر سے مشکل آسان ہوجائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کے لئے بھی سوچا،

"حالانکہ دنیا کے مصائب بعض ایسے ہین، جن کی کوئی تدبیر ہی نہین، اور اس لئے اس کو سوچنا ہی عبث ہے، مگر پھر سوچتے ہو، اور آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہین جو لاعلاج ہو، بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے، لیکن پھر اس کا ذکر نہ فکر، (الرفیق ص ۴۳)

خدا و آخرت سے بے تعلقی و بے فکری کا یہ حال صرف عام دنیا دارون ہی کا نہین، جو لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے اور سمجھے جاتے ہین، اُن کا حال بھی اس معاملہ مین کچھ بہتر نہین، ارشاد ہے کہ

"دنیادار تو الگ رہے، دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ اُمنگین پیدا ہوتی ہین، نہ اندیشے" حالانکہ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہین، یاایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ و لتنظر نفس ما قدمت لغد،

پھر جو لوگ علم بھی دنیا کا نہین دین ہی کا حاصل کرتے ہین، ان کو بھی اگر دین و آخرت کی اُمنگون اور اندیشون کے بجائے اس کی فکر دامنگیر رہے، کہ کھائین گے کہان سے تو یہ کیسے ظلم و حسرت کی بات ہے!! اُن کی زندگی تو اُمت کے لئے مثالی اُسوہ ہونا چاہیئے، اور ان کا اُسوہ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہونا چاہیئے، کہ حضور کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کیسی زندگی پسند و ماموری تھی، اس کا اندازہ اس سے کرو کہ لوگون کی آسودہ حالی سے متاثر ہو کر ازواج مطہرات کو بھی کچھ طبعاً اس طرف میلان ہوا، اور حضور سے کچھ مزید نان و نفقہ اور سامان کی درخواست کی، جو حضور کے قلب مبارک پر اتنی گران گذری کہ ایک مہینہ گھر مین نہ جانے کی قسم کھالی، بالآخر یہ آیت اُتری:

یاایہا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا و زینتہا فتعالین امتعکن و اسرحکن سراحا جمیلا و ان کنتن تردن اللہ و رسولہ و الدار الآخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجرا عظیما،

(خلاصہ یہ کہ حضور کو امر ہوا کہ صاف صاف اپنی بی بیون سے فرما دین کہ اگر تم کو دنیا اور اس کا ساز و سامان مطلوب ہے تو میرا تمھارا نباہ نہین ہو سکتا، اور اگر تم خدا و رسول کی رضا و خوشنودی اور آخرت کے مراتب و انعامات کی طالب ہو تو ایسی نیک بی بیون کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت مین عظیم الشان اجر و

ازواجِ مطہرات، آخر ازواجِ مطہرات تھیں، سب کی آنکھیں اتنی تنبیہ ہی سے کھل گئیں، اور پھر مدت العمر حضورؐ کے ساتھ خوشی خوشی فقر و فاقہ میں گذار دی، کیونکہ حضور کے ہاں بار ہا فاقہ ہو جاتا تھا، قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی، اور حضورؐ کا یہ فقر و فاقہ اضطراری نہیں بالکل اختیاری تھا، جس کو حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ نے فقرِ صادق سے تعبیر فرمایا ہے:۔

"جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو، اور دلچسپی اس کو کہتے ہیں، کہ حضور (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) کو فقر محبوب تھا، حتیٰ کہ اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً و عملاً اختیار کرکے دکھلایا، قولاً تو یہ کہ خدائے تعالیٰ سے دعا کی،

"اللّٰھُمَّ اجعل رزقَ آلِ محمد قوتًا، اے اللہ محمد کی اولاد کو رزق بس بقدر گذر اوقات عطا فرما،"

اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن اس مرتبہ جب اُن کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے چھالے پڑ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے حضور (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) سے کسی لونڈی غلام کی .... درخواست کی تاکہ کچھ مدد ملے، آپ نے فرمایا کہو تو لونڈی غلام دوں، کہو تو اس [illegible] اچھی چیز دے دوں، یہ سُن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پھر نہ پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے، بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی چیز ہی دیدیجئے، آپ نے فرمایا سوتے وقت سبحان اللہ تینتیس بار، الحمد للہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار پڑھ لیا کرو، بس یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے، اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی قبول کر لیا، تو دیکھئے حضور (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) کو فقر محبوب تھا، تو اپنی اولاد کے لئے اس کو تجویز کرکے دکھلا دیا،

(الرفیق ص ۳ و ۴)

اور جو اولاد کے لئے محبوب تھا، محبوب اصل میں وہی امت کے لئے بھی تھا، جیسا کہ اس عمومی ارشاد سے ظاہر ہے کہ

مَنْ اصبح منکم معافی فی جسمہ	یعنی جس کو جسم کی صحت وعافیت، اور
وامنا فی سربہ عندہ قوت	دل کا امن وچین نصیب ہو، اور ایک
یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذافیرھا	دن کا کھانا پاس ہو تو گویا ساری
	دنیا جمع ہوگئی،

البتہ یہ ضعفائے اُمت کے حال پر ارحم الراحمین ورحمۃ للعالمین کی شانِ رحمت تھی، کہ جائز حد تک دنیا کے کسب و طلب کی اجازت واباحت فرمادی، لیکن دنیا کا ایسا عشق وجنون کہ جیسے کوئی منکرِ آخرت ہو، یا جیسے خدا سے کوئی واسطہ ہی نہیں، اس کی اگر اجازت ہو تو پھر دین ودنیا کا فرق من و تو کا جھگڑا ہی کیا رہا،

(۱) الغرض اسلامی ودینی زندگی کے لئے سب سے مقدم یہ ہو کہ ہر کام میں یوم دین اور مالکِ یوم دین سے معاملہ و واسطہ پیشِ نظر ہو، اس کے بعد دنیا وی زندگی کے سارے مسائل ومشکلات از خود حل وسہل ہوجاتے ہیں، اس لئے کہ ان کی قدر وقیمت وزن واہمیت ہی مستقل مسائل ومقاصد کی نہیں رہجاتی، نہ اپنی سعی وعمل کا سارا زور کوئی ہوشمند اس دنیا کے کھانے پینے، عیش وآرام پر اس طرح لگا دینے کو راضی ہو سکتا ہے، کہ ساری جد وجہد اسی ادنیٰ یا خسیس وحقیر زندگی میں گم ہو کر رہ جائے، اور پھر حُسن فہم یہ کہ ہم بڑا کارِ نمایاں انجام دے رہے ہیں ضل سَعْیُھُمْ فی الحیوٰۃ الدُّنیا وھُمْ یحسبُون انھُمْ یحسنون صنعًا، یہ تو بقول حضرت علیہ الرحمہ کے ویسا ہی خلل دماغ ہوگا، جیسا کوئی شخص کسی منزلِ مقصود کو بھلا کر ڈرائنگ روم اور ہوٹل یا مسافرخانہ اور سرائے کے چند ساعت یا چند دن کے قیام کے لئے اپنے فکر وعمل کی ساری قوت اس کی زینت و راحت پر خرچ کر ڈالے، سرائے وسفر میں تو آدمی کو اگر دو ایک وقت کھانا بھی نہ ملے، اور فاقہ ہوجائے، تو بھی زیادہ

پروا نہین کرتا، چہ جائیکہ کسی ایسی سرا ے مین مستقل جی لگا بیٹھے، جہان سے نکال دیا جانا یقینی ہے، یہ رَضُوا بِالحیوٰۃ الدُّنیا واطمأنوا بہا، تو خاص کا فر و منکر آخرت ہی کا شیوہ ہے، اور انہی کو مبارک ہو،

(۲) دوسری بات جو منکر کے مقابلہ مین مومن بالخصوص اہل علم مومن کے پیش نظر رہنے کی ہے، وہ ہمارا یہ ایمان و اعتقاد ہے، کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح رزق اور اس کا قبض و بسط، یا فراخی و تنگی بھی بالکلیہ حق تعالےٰ ہی کے ہاتھ مین ہے، اور پہلے ہی سے اس کا سارا پروگرام یا نظام عمل متعین و مقدر ہو چکا ہے، اسی طرح اصل نظر اسباب کے بجاے مسبب الاسباب اور تدبیر کے بجاے تقدیر پر رہنا عین ایمان ہے جس کے بغیر ایمان ہی صحیح اور پیدا نہین ہوتا، جو کچھ خدا دینا چاہے، اوس کو کوئی روک نہین سکتا، اور جو وہی نہ دینا چاہے گا، تو کوئی دے نہین سکتا" (لامعطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت) حدیث مین تو صاف صاف ہے کہ کوئی بندہ بلا ان چار باتون پر ایمان لائے مومن نہین ہو سکتا، ایک توحید (لا الٰہ الا اللہ) دوسرے رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تیسرے آخرت یا بعث بعد الموت، اور چوتھے تقدیر[۱]،

(۳) تیسرے جو ان دونون مقدمات کا لازمی نتیجہ ہے، کہ اس دنیا کی زندگی مین مومن بس زیادہ سے زیادہ اپنی سعی و طلب کو ضروریات زندگی تک محدود رکھے، اور فضولیات زندگی کی فکر و سعی قطعی وقت عزیز کو گنوانا ہی اور طفلانہ لہو و لعب سے زیادہ نہین، البتہ بلا اضاعت وقت اور بلا ابتلاء لہو و لعب کچھ راحت کا سامان بھی میسر ہو جائے، تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اس طرح ایک انعام و احسان جان کر متمتع ہو جس سے خدا و آخرت کا تعلق اور بیدار و پائدار ہو، البتہ راحت بھی یاد رہے، کہ اصل مین قلب کی راحت کا نام ہے،

اور یہ بات کان کھول کر دین دارون ہی کو نہین دنیا دارون کو بھی سن اور سمجھ لینی چاہئے، جیسا اوپر اور پرانے سب کے تجربات سے واضح کیا جا چکا، کہ قلب کی راحت یا دل کے سکھ چین کا راز مادی ساز و سامان

---

[۱] الفاظ یہ ہین، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤمن عبد حتی یؤمن باربع یشہد ان لا الٰہ الا اللہ و انی رسول اللہ بعثنی بالحق و یؤمن بالموت والبعث بعد الموت و یؤمن بالقدر،

یا فضولیات کی بہتات میں نہیں بلکہ ضروریاتِ زندگی پر قناعت ہی میں پوشیدہ ہے، اور ساتھ ہی اگر ایمان و عمل صالح یا دینداری کی زندگی بھی نصیب ہو، تو "حیٰوۃً طیّبۃً" کی موعودہ زندگی کا تجربہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے، جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے،

سو آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا، کہ مومن کامل کے اس سوال کا کہ "کھائیں گے کہاں سے" کیسا کامل و سہل حل موجود ہے، بلکہ جس کو معاش کی فکر و پریشانی کہا جاتا ہے، ایمانی زندگی سے جسم و جان کو گھلانے والی یہ فکر معاش دراصل سرے سے خارج ہو جاتی ہے، اور یہ سوال سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے، کہ "دینی یا عربی تعلیم حاصل کرکے کھائیں گے کیا" خصوصاً علم دین کی تحصیل و تعلیم کی ہمت و سعادت رکھنے والوں کا یہ سوال تو اور بھی بے معنی ہے، اس کے معنی تو صرف یہ ہیں، کہ ابھی علم دین کی ابجد بھی نہیں سمجھی، اور دستار فضیلت باندھ لی اس لئے جیسا کہ اوپر بتصریح و تاکید کے ساتھ عرض کیا گیا ہے، زندگی میں دین پیدا کرنے کے لئے تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تربیتِ دین لازم بلکہ الزم ہے، کیونکہ تربیت بلا تعلیم تو دیندار بنا دیتی ہے لیکن تعلیم بلا تربیت سے شاذ و نادر ہی دین پیدا ہو سکتا ہے،

تاہم انسان ایک تو بالطبع اس عالم اسباب میں اسباب و تدابیر کا سہارا ڈھونڈتا ہے، اور اس سے تسلی پاتا ہے، دوسرے وقت کے حالات، جبکہ ہر طرف پیٹ ہی پیٹ کی پکار ہے، اور پھر ہمارے عام ایمانی و اعتقادی ضعف و اضمحلال کی بنا پر حضرت مجدد وقت نے تعلیم دین کے ساتھ بقدر ضرورت تحصیل معاش کے ظاہری اسباب کا بھی جا بجا مشورہ دیا ہے، اگرچہ ایسے غیر مستطیع علمائے دین کی جو اپنا سارا وقت خدمتِ دین میں صرف فرماتے ہوں معاشی کفالت اسلامی حکومت یا بیت المال اور اغنیائے امت کے ذمہ ہے، جیسا کہ اوپر[1] خود حضرت علیہ الرحمہ "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللّٰہ" کی تفسیر سے بتفصیل واضح و ثابت فرما چکے ہیں، لیکن جب نہ ایسی اسلامی حکومت نہ بیت المال، نہ اغنیائے امت کو اس کا ادراک نہ ہمت،

---

[1] باب ہذا ص ۲،

تو علمائے اُمّت کی مزید سعادت اسی مین ہو کہ گذر اوقات کے بقدر تدبیر معاش کی خود ہی ہمت فرمائین اس ہمت افزائی

کی مثالین اسلاف اُمت کے اکابر ائمہ مین بے شمار موجود ہین اور تعلیمات عشر کی تمہید کو بھی حضرت نے اس مشورہ پر ختم فرمایا ہے کہ

جو لوگ صرف اردو کتب دینیات کے ذریعہ احکام دین حاصل کرنے کے بجائے اور علوم دین حاصل کرنا چاہین،

(۱) تو صنعت و حرفت یعنی دستکاری و پیشہ سے معاش حاصل کرنے مین بہت آسانی و سلامتی ہو"

(۲) اور عربی تکمیل کرنے والون کے لئے چند صورتین معاش کی مناسب ہین، اسکول مین نوکری

کر لینا، مطب کرنا، مفید رسالے یا حواشی تصنیف کر کے یا درسی کتابین چھپوا کر اُن کی تجارت کرنا،

کاپی نویسی کرنا، کسی مطبع مین تصحیح کی نوکری کرنا، اور ان سب صورتون مین اوقات فراغ مین

مطالعہ و تدریس کا شغل رکھنا، یا کسی اسلامی مدرسہ مین مدرسی کرنا بشرطیکہ چندہ کی درآمد و برآمد سے،

باقی اصل راہ علم دین حاصل کرنے والون کی وہی ہے، کہ

"اگر غنائے ظاہری و باطنی یعنی ثروت یا قوت توکل حاصل ہو، تو محض حسبۃً للہ اپنے کو

دینی خدمات تدریس و تالیف، وعظ و افتاء وغیرہ کے لئے وقف کر دین" (ص ۳)

اس مشورہ کے پیش نظر اور اس مین آسانی و سہولت پیدا کرنے کے لئے راقم ہذا کے خیال مین

مدت سے یہ بات ہے کہ خود عربی و دینی مدارس ہی مین اور زمانہ تعلیم و تعلم ہی مین طلبہ مین صنعت و حرفت اور

تجارت کی مختلف و مناسب صورتون سے مناسبت و ذوق پیدا کر دیا جائے، جس کی تدبیر یہ ہے کہ کم از کم

ہر بڑے مدرسہ مین ساتھ ساتھ ایک مطبع بھی ہو جس مین مفید درسی وغیر درسی دینی کتابین شائع ہون، جس

کے ذیل مین طلبہ کو کاپی نویسی، تصحیح، جلد سازی وغیرہ طباعت و اشاعت کے مختلف متعلقات سے گنجائش و فرصت

کے بقدر واقفیت کا موقع دیا جائے،

اسی طرح ایسی ضروریات زندگی نہ کہ فضولیات زندگی جن کی صنعت کا باسانی انتظام ہو سکتا ہو،

مثلاً کفش سازی، اُن کی صنعت کا بھی انتظام ہو، اور کھانے پینے کپڑے وغیرہ دیگر ضروریات زندگی کی

بڑی چھوٹی حسب موقع و محل دوکان ہو جس سے بیرونی خریدارون کے علاوہ خود طلبہ و اساتذہ وغیرہ تمام متعلقین مدرسہ کی ضروریات بھی فراہم ہون، اور باری باری طلبہ اس مین تھوڑا تھوڑا وقت دے کر اس قسم کی صنعت و تجارت سے مناسبت پیدا کرین تاکہ حسب مناسبت آیندہ زندگی مین اس سے ذریعۂ معاش کا کام لے سکین،

اگر کچھ زمین دستیاب ہو سکے تو باغبانی اور غلہ اور ترکاریون وغیرہ کی کاشت کا بھی کچھ ضرور انتظام ہو جس سے معاشی مشغلہ کے علاوہ ورزشی و تفریحی مشغلہ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے،

اگر طالب علمی ہی کے زمانہ سے اِن چیزون کا مذاق پیدا کرا دیا گیا، تو انشا، اللہ پھر ظاہری اسباب کی حد تک دین کے طلبہ و علمار کے متعلق ضروریاتِ زندگی کے بقدر نہ یہ سوال ہوگا کہ کھائین گے کہان سے اور نہ انشا، اللہ مخلوق کی بندگی، اور ملازمت کی ذلت سے اُن کو دوچار ہونا پڑے گا،

ایک تنبیہ | نہایت ضروری اس معاملہ مین یہ ہے کہ ایک درس گاہ نے دوکان وغیرہ کی قسم کی چیزین کچھ جاری بھی کین، جن مین احقر کے مشورہ کو بھی مصالح مذکور کی بنا پر بہت کچھ دخل تھا، لیکن ہوا یہ کہ نظر طلبہ کی معاشی تربیت کے بجائے زیادہ تر مالی منفعت پر رہنے لگی، اور آگے چل کر عربی و دینی مدرسہ کے مناسب مطبع و مکتبہ وغیرہ کی کچھ مزید مفید تر تجاویز جو پیدا ہوئین، اُن کے نقشے مین بھی مالی منفعت کا رنگ زیادہ بھرا تھا، اس کے علاوہ مزید نقص یہ تھا، کہ اصل مقصد یعنی درس و تدریس کے فرایض مین خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ تھا، لہذا جس طرح ایک طرف وقت کے تقاضون کی بنا پر دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ معاشی تربیت کا خیال رکھنا ضروری ہے، اُسی طرح یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے، کہ مقصود بالذات دین کے طلبہ و علمار کو ملک التجار بنانا نہین ہے، بلکہ وہی گذر اوقات کے بقدر ضروریاتِ زندگی کے لئے حیلہ فراہم کر دینا ہے تاکہ خدمتِ دین استغنار کے ساتھ کر سکین، نہ یہ کہ تاجرانہ منفعت کی فکر و تدبیر مین دینی تعلیم و تعلم کے اصل مقصد ہی مین خلل و تہاون واقع ہونے لگے، ماحصل یہ کہ اہلِ دین خصوصًا علماے دین کی دنیا کا زندگی کے

ہر شعبہ میں دین اور مقاصد دین کے تابع رہنا مقدم ہے،

واعظ و افتاء و تصنیف کے متعلق اصلاحات

علمائے متعلق مین خدمات اور ہین، وعظ، افتاء اور تصنیف، ان مین بھی جو ضروری ضروری باتین اصلاح طلب ہین، ان کی طرف بھی حقوق العلم کی ایک خاص فصل مین متوجہ فرمایا گیا ہے :-

"وعظ مین ایک کوتاہی تو وعظ نہ کہنے کی ہے، اکثر اہلِ علم کو دیکھا کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہین، بلکہ اس کی تحقیر کرتے، اور علم کی شان مین خلاف سمجھتے ہین، حالانکہ تعلیم دین کا اصلی طریقہ جس کے لئے انبیاء علیہم السّلام مبعوث ہوئے، یہی وعظ و ارشاد ہے، جس کے ذریعہ تبلیغ دین فرماتے تھے، باقی تدریس و تالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہین، سلف مین قوتِ حفظ و تدین کی بنا پر زبانی روایات اور خطبات عام پر قناعت و وثوق تھا، بعد مین علوم کی حفاظت کے لئے تدریس و تالیف کی ضرورت ہوئی، اس سے بھی اصل مقصود تبلیغ ہی ہے جس کی خطابِ عام کی صورت کو وعظ کہا جاتا ہے،

باقی جو کوتاہیان خود وعظ کہنے کے متعلق ہین وہ یہ ہین (۱) وعظ پر نذرانہ لینا یا پہلے سے ٹھہرانا جس کی بدولت وعظ کا اثر نہین ہوتا، دوسرے واعظ قوتِ مال کے خوف سے اظہارِ حق سے رُکتا ہے، تنخواہ لے کر وعظ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے جس کا اوپر مبسوط بیان ہو چکا (۲) وعظ مین غیر ضروری یا عوام کے حق مین مضر مضامین، مثلاً دقائقِ تصوّف وغیرہ بیان کرنا (۳) منطق تقریر کرنا (۴) کسی خاص شخص پر وعظ مین تعریض کرنا جس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے (۵) وعظ مین کسی کی فرمائش کے تابع بنجانا" ظاہر ہے کہ وعظ وہی ہے جو ان شرائط کے ساتھ ہو، ورنہ وعظ کی نفع نہیں بلکہ اس کا نسخہ ہے،

افتاء مین یہ کوتاہیان ہین، حصولِ زر کا اس کو آلہ بنانا، البتہ اگر اس کی تکمیل و انتظام مین

(جون ۱۲ ۵/۴۸)

کچھ خرچ ہوتا ہو تو اس کے بقدر وہ بھی اہل استطاعت پر کچھ بطور فیس لگا دینے مین مضائقہ نہین، ہر سوال کے جواب مین کوشش کرنا، نہ بھی معلوم ہو تو یہ نہ کہنا کہ نہین جانتا، بلکہ کھینچ تان کر کچھ لکھ دینا، اسی طرح معلوم ہونے پر بھی ہر سائل کے سوال کا جواب دیدینا ضروری نہین، اس کا اثر عوام پر بُرا پڑتا ہے، علمار کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہین، لہذا جو سوال فی نفسہٖ یا کسی سائل کے اعتبار سے غیر ضروری ہو، صاف کہہ دیا جائے کہ یہ سوال غیر ضروری ہے یا جو سائل دلیل سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو، اور دلیل معلوم کرنا چاہے، اس کو بھی صاف جواب دیدینا چاہئے، سمجھانے کی کوشش نہ کرنے لگے، جب دلیل انّی کے متعلق یہ مشورہ ہے، تو دلیل لمی یعنی علت دریافت کرنے کی عوام کو گنجایش ہی نہ دے، کہ اس کا علم تو خود علمار کو پورا پورا نہین، الا ماشار اللہ، مثلاً نماز کے پانچ وقت فرض ہونے کی دلیل انّی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اور لمی اس کی وہ حکمتین ہین جن کی بنا پر نماز فرض کی گئی،

بعضے فرمایش کرتے ہین، کہ قرآن مجید سے پانچ وقت کی نماز کا ثبوت لاؤ، اب مجیب صاحب ہین کہ قرآن مجید مین اس کی تلاش کرتے، اور دوسرون سے مدد لیتے پھرتے ہین، حالانکہ حکم شرعی کے لئے مطلق دلیل شرعی کافی ہے، خاص دلیل کی حاجت نہین، اور ادلہ شرعیہ چار ہین، کتابؔ، وسنتؔ اور اجماعؔ وقیاسؔ مجتہد، ان مین سے کسی ایک دلیل سے بھی جو حکم ثابت ہو جائے، وہ ثابت ہے البتہ حسب تفاوت ادلہ ثبوت احکام کا درجہ متفاوت ہوگا،

بعضے استفتار کرنے والے چیلے پوچھا کرتے ہین، جو ہرگز نہ بتلانا چاہئے، بعض اوقات سوال مہمل یا نامات ہوتا اور دو صورتون کو محتمل ہوتا ہے، وہان اکثر اہل علم تشقیق سے جواب دیدیتے ہین، کہ یہ صورت ہو، تو یہ حکم اور وہ صورت ہو، تو وہ حکم، اس سے تجربہ کارون نے منع فرمایا ہے، کیونکہ ناخدا ترس لوگون کو اپنی مرضی کے مطابق سوال تراش لینے کی گنجایش

ملتی ہے، کہ وہ مفید مطلب ہی شق کے مدعی بنجاتے ہین، اور اصل واقعہ ملتبس ہوجاتا ہے"

"تصنیف مین بھی چند کوتاہیان ہوتی ہین، غیر مفید فنون مین تصنیف کرنا، ردّ و قدح اور مجادلہ تصنیف کا بڑا مقصود بنا لینا، ایسے مباحث لکھنا جن کی ضرورت عوام کو نہ ہو یا جن سے وہ تشویش مین پڑجائین، مثلاً تصوف و کلام کے نازک مسائل، اور اگر خواص کی نفع رسانی کے لئے ایسی ہی ضرورت ہو، تو خاص زبان مثلاً عربی مین لکھے، کہ عوام کی نظر تک نہ پہنچے، بعض تجارت کے لئے عوام کے مذاق کی کتابین لکھ کر اس سے روپیہ کمانا یا حقِ تصنیف کو بیع کرنا"

یہ تصنیف و تالیف کی وہ موٹی موٹی خرابیان یا کوتاہیان ہین جو دینی کتابون تک مین سرایت کر گئی ہین، اور جن سے اس زمانہ مین بس اللہ کا کوئی خاص بندہ ہی محفوظ ہوگا،

متفرق اصلاحات

سب سے آخر فصل مین کچھ متفرق اصلاحات بیان فرمائی گئی ہین :-

"مثلاً بعض اہلِ علم اپنے کو خوب بناؤ سنگار سے رکھتے ہین، جو شانِ علم کے خلاف اور ضروری خدماتِ علم سے بیفکری کی علامت ہے، کیونکہ اس فکر کے ساتھ لباس و طعام وغیرہ کے تکلفات کی طرف التفات نہین ہوتا، اسی طرح مجلس مین صدر یا ممتاز جگہ پر بیٹھنے کا شوق، چلنے مین تقدم کی فکر، مجمع مین امام ہونے کا خیال، یہ سب ریا و کبر کے شعبے ہین، تواضع و بے تکلفی اور سادگی ہی مین علم و دین کی شان ہے، حدیث مین ہے، البذاذۃ من الایمان، اس سے مساکین کو بعد و توحش نہین ہوتا، اور یہی لوگ دین کے زیادہ قبول کرنے والے ہین، البتہ سادگی کے ساتھ طہارت و نظافت ضروری ہے،

"اور مثلاً دوسرے مولویون کو بُرا کہنا جس مین بعض اوقات معصیت کے علاوہ عوام پر بُرا اثر ہوتا ہے، وہ سب سے بدگمان ہوجاتے ہین، اگر کسی صاحبِ باطل کے شر سے بچانا ہی

ضروری ہو تو تہذیب کے ساتھ اصلاح کر دینا کافی ہے، اسی طرح دوسروں سے مولویوں کی بلکہ
غیر مولویوں کی برائی سننا بھی گو کسی حالت میں جائز بھی ہو مگر علماء کی شان کے مناسب نہیں،
بعض دفعہ اس کے مفاسد سے خود اپنے دین میں حرج ہونے لگتا ہے،

اور مثلاً کسی کے فیصلہ میں پڑنا گو فی نفسہٖ طاعت ہے لیکن حسب ارشاد نبوی کہ حضرت ابوذرؓ
کو فرمایا کہ لا تقضین بین اثنین، ان علماء کو جو حکام نہیں اس میں پڑنا مناسب نہیں، طرفداری
کا شبہہ اور بدنامی ہوتی ہے، اور جو دینی نفع مسلمانوں کے ساتھ یکسان تعلق رکھنے سے ہوتا وہ
فوت ہو جاتا ہے، البتہ ایک صورت اسلم ہے، کہ اگر فریقین درخواست کریں تو اُن سے کہے کہ دونوں
سوال لکھکر اپنے اپنے دستخط کر دو، پھر بطور جواب کے اس پر حکم شرعی لکھ کر حوالہ کر دے کہ اس پر دونوں
عمل کر لو، یا کسی ثالث کو مقرر کرکے اس سے نافذ کرالو،

اور اسی مصلحت سے مناسب ہے کہ کسی شخص کے دنیوی معاملہ میں دخل نہ دے اور مالی معاملات
سے بھی الگ رہے، مثلاً چندہ وصول کرنا اس کا تحویلدار بننا یا اس کے صرف کا اہتمام لینا یہ
سب صورتیں بدگمانی اور تہمت کی ہیں، ایسے کام متدین رؤسا کے متعلق ہوں، البتہ ان کو چاہئے
کہ جو کام کریں، علماء سے شرعی حکم دریافت کرکے کریں"

اہلِ دنیا اور علماء کے تعلقات سب سے آخر میں خاتمہ کے تحت ان باہمی تعلقات کا بیان ہے، جو اہلِ دنیا
اور علماء میں ہونے چاہئیں، جو مختصراً یہ ہیں، کہ

" دنیا دار علماء کو مخدوم سمجھیں، وہ جو کام دین کا کر رہے ہوں بدوں اُن کی استدعا کے
اس میں اعانت کریں، مالی بھی (اور غیر مالی بھی)، جو بات پوچھیں ادب سے پوچھیں، دلائل نہ
دریافت کریں، اگر کوئی شبہہ رہے معاندانہ سوال نہ کریں مستفیدانہ پوچھیں، اُن سے کوئی
لغزش ہو جائے تو اُن کی مذمت نہ کریں، آخر وہ بھی بشر ہیں اور اس حال میں بھی تمہارے نفع

و ہدایت کے لئے کافی ہین تم اُن کے اقوال پر عمل کرو، افعال کو مت دیکھو تمھارا شبہہ ایک سے نہ حل ہو

تو دوسرے سے حل کرو، مگر ایک کا قول دوسرے کے رد پر مت نقل کرو،

اور علماء کو چاہئے کہ دنیا دارون کو اپنا برابر کا بھائی سمجھین ان سے تعظیم و خدمت کے متوقع نہ ہون،

اگر بلا توقع کچھ کر دین تو سمجھین کہ علم دین کی خدمت تو ہمارے ذمہ تھی ہی انھون نے احسان کیا، کہ

ہماری اعانت کی، اس مین قیل و قال نہ کرے، جیسے بعض کی عادت ہے کہ کہین تنخواہ پر تکرار ہے کہین

ترقی کا تقاضا کہین نذرانہ پر بحث، اگر کسی سے کچھ بے تمیزی ہو جائے، صبر کرین کہ جب اُن کو ہمارے

برابر علم نہین، تو ہمارے برابر تمیز کیسے ہوگی، اگر کسی کو قولاً یا فعلاً شرع کے خلاف دیکھین تو جس پر قدرت

وحکومت نہ ہو، اس پر تشدد نہ کرین، نرمی سے بہت اصلاح ہوتی ہے، اگر عامی کوئی حق بات کہے

قبول سے عار نہ کرین، اگر کسی مسئلہ مین اپنی غلطی ظاہر ہو، اعلان کر دین"

(مختوم رجب ۱۳۳۰ہجری)

معلم و متعلم و شرکاے علم کے باہمی حقوق

اس رسالہ حقوق العلم مین چونکہ معلم و متعلم اور شریک تعلیم کے حقوق کا ذکر نہین فرمایا گیا تھا اسلئے بعد مین اصلاح انقلاب حصۂ اول کے آخر مین اس کی تفصیل فرمائی گئی ہے کیونکہ

"علوم دینیہ کی جس طرح تعلیم و تعلم ضروری ہے، اسی طرح اس تعلیم و تعلم کے سبب جن لوگون کے

ساتھ تعلقات ہوتے ہین، ان تعلقات کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے،"

اور یہ تمام حقوق آیات و احادیث سے ثابت و مستنبط ہین، :-

حقوق معلم

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِلٰی قولہٖ تعالیٰ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ،

اس آیت مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے نعمت و منت ہونے کی علت تعلیم کتاب و حکمت

کو قرار دیا گیا ہے جو اس امر کی صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم دے، وہ اس کے حق

مین نعمتِ الٰہی ہے، اور اس کی قدر و تعظیم لازم ہے، اور اس تعلیم مین نہ صرف باقاعدہ سبق پڑھانا

بلکہ مسئلہ وغیرہ تبلانا سب داخل ہین حتی کہ کسی کی تصنیف سے انتفاع یہ بھی مصنف کے شاگردون مین داخل ہوجاتا ہے،

"حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا جو قصہ قرآن مین مذکور ہے، اس مین بھی استاد کے کئی آداب و حقوق ثابت ہوتے ہین، اوّل یہ کہ استاد کی خدمت مین خود شاگرد جایا کرے، دوم اگر استاد کسی اعتبار سے مرتبہ مین شاگرد سے کم ہو تب بھی اس کا اتّباع کرے، سوم جس بات کے پوچھنے کو استاد منع کرے نہ پوچھے، چہارم اگر غلطی سے استاد کے خلاف مزاج کوئی بات ہوجائے تو معذرت کرے، پنجم اس کے تنگ ہونے یا مرض وغیرہ کی وجہ سے کسلمند ہونے کے وقت سبق بند کردے،

ایک حدیث مین ہو کہ جو شخص تم پر احسان کرے، اگر اس کی مکافات کرسکتے ہو تو مکافات کرو، ورنہ دعا کرو تعلیم دین کے احسان ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے، لہذا اس کے مکافات مین ہر قسم کی جانی و مالی خدمت سے سعی کرنا چاہئے، اور جب کسی قسم کی استطاعت نہ ہو یا استاد سے جدائی کے بعد نہ رہے تو کم ازکم دعا ہی سے یاد رکھنا چاہئے،

بعض طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ احتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہین، حالانکہ خود بھی اس کو مہمل سمجھتے ہین، مگر محض اپنی ذہانت جتانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول باتین کرتے ہین، جو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور سے منع فرمایا ہے، (نھی عن الاغلوطات) چہ جائے کہ استاد کو مغالطہ دینا

نیز اس سے شاگرد کا یہ بھی ایک حق ثابت ہوگیا کہ بعض مدرسین کی عادت ہو کہ کسی مقام پر خود بھی شبہہ ہو، مگر شاگرد پر ظاہر نہین کرتے بلکہ گڑھ گڑھ کے تقریر کردیتے ہین، گویا اس کو مغالطہ مین ڈالتے ہین۔

ایک حدیث مین انس ابن مالک سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

جانتے ہو، سب سے زیادہ سخی کون ہے، انھون نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ دانا ے حال ہے، تو آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے، پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ میں، اور پھر وہ جس نے علم دین سکھلایا، اور اس کو پھیلایا یہ شخص قیامت میں تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا،

"اس حدیث میں تمام وہ لوگ داخل ہیں، جو تدریس و تلقین وعظ و تصنیف کسی طرح بھی دین کی تعلیم و اشاعت کرتے ہوں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ سخاوت و جود کرے اس کا کتنا حق ہوتا ہے،

حجۃ الوداع کے خطبہ کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کردو جس سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش و متوجہ رہنا چاہئے کسی سے بات یا کسی کی طرف التفات نہ کرے"،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، اور اس کو پڑھنا شروع کیا جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ اے عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کو تو دیکھو کہ ناخوشی کے آثار پائے جاتے ہیں، حضرت عمرؓ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں"،

اس سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا چاہئے، دوسرا حق شاگرد کا یہ ثابت ہوا کہ اس سے کوئی امر نامناسب صادر ہو تو اس کو تنبیہ کرنا ضرور ہے، تاکہ اس کی اصلاح ہو، اور تیسرا حق شریک علم یا رفیق سبق کا یہ ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو، جس پر وہ خود مطلع نہ ہو تو خیرخواہی کے ساتھ اس کو مطلع کردے

"تاکہ تدارک کرلے"

راقم ہذا کے نزدیک ایک فروعی امر اور بھی اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے، کہ اگر کسی کتاب کے متعلق شاگرد کو معلوم ہو جائے، کہ استاد کسی وجہ سے اس کے لئے اس کا پڑھنا پسند نہیں کرتا، خواہ کم استعدادی یا اور کسی مضرت و مصلحت کی وجہ سے تو اس سے باز رہنا چاہئے،

ایک اور حدیث مین استاد کا یہ ادب صراحتہً مذکور ہے، کہ علم سیکھو اور اوس کے لئے سکینہ و وقار اختیار کرو، اور جس سے علم سیکھو اس کے ساتھ تواضع و ادب سے پیش آؤ"

آگے طلبہ کی ان مختلف موٹی موٹی کوتاہیوں پر کچا تنبہ فرمایا گیا ہے، جو محتاج اصلاح ہین مثلاً استاد کے ظاہری ادب و تعظیم و سلام کا لحاظ نہ رکھنا، اس کی پوری اطاعت نہ کرنا کوئی بات مان لی تو کسی کو بلا عذر ٹالدیا، خلوص مین کمی، بدنی یا مالی خدمت مین کمی، بلکہ بدنی خدمت پنکھا وغیرہ جھلنے کو تو اب بہت سے شاگرد عار و ذلت سمجھنے لگے ہین"

خاص طالب علمانہ کوتاہیان | یہ ہیں کہ

مثلاً مطالعہ نہ دیکھنا، یا کم دیکھنا جس سے سبق سمجھنے مین دقت ہوتی ہے، اور استاد کو بار بار تقریر کرنا پڑتی ہے، یا اس کم سمجھنے کی بدولت فضول سوال کرنے سے استاد کو تنگی و پریشانی ہوتی ہے، اور مثلاً استاد کی تقریر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ ہے۔ اور وہ دوسری طرف جس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے یا بعض اپنی جہالت جتلانے یا استاد کا امتحان کرنے کے لئے فضول سوالات کرنا، یا مقدار سبق و کتاب وغیرہ کے معاملہ مین استاد کی رائے نہ ماننا کہ ہم تو اتنا ہی سبق پڑھین گے، یا فلان ہی کتاب شروع کرین گے،

یہ تو زمانہ طالبعلمی کی بعض کوتاہیون کا بیان تھا، بہت سے لوگ طالب علمی کے بعد یا

یا استاذ سے جدائی کے بعد کوئی حق نہین سمجھتے، یا سمجھتے ہین مگر ادا کرنے کا اہتمام نہین کرتے، کبھی خط تک نہین بھیجتے کہ استاد کی خیریت ہی معلوم کرلین، حالانکہ چاہیئے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی اس کے حقوق ملحوظ رکھے، جس کا خلاصہ دو باتین ہین، ایک اس کے لئے دعاے مغفرت ہمیشہ کرتے رہنا، دوسرے اس کے اقارب و احباب اور معاصرین کی تعظیم و خدمت کا خیال رکھنا، جیسا کہ والدین کے اس قسم کے حقوق کی حدیث مین تاکید ہے،

کچھ بدنصیب ایسے ہین جو کسی نفسانی غرض سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہین، اور تحریراً یا تقریراً ان کی شان مین گستاخی کرتے ہین، حالانکہ استاد وہ چیز ہے، کہ اگر دینی ضرورت سے بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تو بھی کافر باپ کی طرح دین مین مخالفت کرنے کے باوجود ادب و احترام ترک نہ کرے،

جو اساتذہ کسی مدرسہ سے تنخواہ پاتے ہین، ان کے حقوق اور بھی ضعیف سمجھے جاتے ہین اتنا نہین سمجھتے کہ ان حقوق کی جو بنیاد ہے وہ تنخواہ پانے سے معدوم نہین ہو گئی، کیا تنخواہ تعلیم دین جیسے احسان کا بدل ہو سکتی ہے، اگر اس نے محض تنخواہ یا دنیا کی نیت سے بھی تعلیم دی تو بھی خواہ ثواب کم ہو جائے، مگر احسان تو ویسا ہی ہے،

بعض شاگرد استاد کی تعظیم و تکریم اس کی کسی دنیوی وجاہت و عظمت کی وجہ سے کرتے ہین، وہ بھی شاگردی کی خوبی نہین، چنانچہ اگر استاذ جاہ و شہرت مین شاگرد سے کم ہو تو بعض ناخلف اپنے کو اس کی طرف منسوب کرنے مین بھی عار کرتے ہین، مبارک وہ ہے جو ایسے استاد کا بھی حق استادی ادا کرے،

متعلم کے حقوق اس کے بعد اب کچھ متعلم و شاگرد کے حقوق معلم و استاذ بھی اپنے اوپر سن لین،

"ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی

ھِیَ اَحْسَن، اس آیت سے نصًا معلوم ہوا، کہ مستفیدین کے ساتھ اگرچہ وہ طالب نہ ہون (کیونکہ آیت مین مدعوین ایسے ہی لوگ ہین) ان کے مذاق و استعداد اور رفق و ملاطفت کی رعایت ضروری ہے، ابتدائی خطاب (مثلاً کتاب کی تقریر) مین بھی جیسا کہ اُدعُ سے مراد ہے، اور سوالات کے جواب مین بھی جیسا کہ جَادِلھم سے یہی مقاولت مراد ہے،

اور حدیث مین تو صاف ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ ہمارے پاس دور دراز ملکون سے علم دین سیکھنے آوین گے، اُن کے بارے مین میری وصیت ہے کہ بھلائی سے پیش آنا"

اُسی طرح حدیث مین ہے کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے، تو وہ بھی جھوٹا ہے" جس سے معلوم ہوا کہ سبق مین غلط سلط یا مستفتی کو غلط فتوی تبلا دینا حرام ہے، جیسا کہ بعضون کی عادت ہو کہ اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہین، اتنا کہنے کی توفیق نہین ہوتی کہ یہ بات ہماری سمجھ مین نہین آتی، سوچ کے بتاوین گے، یا دوسرے سے پوچھ لین، یا طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدین، اس سے عار آتی ہے، حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا، آپ بارہا کسی سوال کے جواب مین فرما دیتے کہ نہین معلوم اور جب وحی نازل ہوتی اُس وقت تبلا دیتے، اور حدیث ہی مین ہے کہ "اگر کسی نے بلا علم کے مسئلہ تبادیا تو اس کا وبال تبانے والے پر ہوگا"

"اس مین کئی خرابیان ہین، اگر طالب علم کو پتہ لگ گیا کہ استاد نے غلط سلط تبلا دیا، تو اس سے نفرت اور دل مین حقارت پیدا ہو گی، جس کے ساتھ استادی کے حقوق ادا کرنا دشوار ہو گا، اور اگر نہ پتہ لگا تو طالب علم بیچارہ عمر بھر جہل مین مبتلا رہا جس کا سلسلہ

آگے معلوم نہین کہان تک جائے، پھر استاد کے اخلاق اکثر شاگردوں میں سرایت کرتے ہین، تو یہ ہٹ دھرمی اور سخن پروری کا عیب شاگردون مین بھی پیدا ہوگا،

حضرت عبداللہ بن مسعود ہر جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت روزانہ فرمایا کرین تو فرمایا کہ مین تم کو تھکانا نہین چاہتا اور مین تمہارا ایسا ہی خیال رکھنا چاہتا ہون جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا خیال فرماتے تھے، کہ ہم تھک نہ جائین،

اس حدیث سے مستفیدین علم کا یہ حق بھی معلوم ہوا کہ ان کے شوق و نشاط کو باقی رکھنے کا بھی خیال رکھے، مثلاً اتنا سبق نہ پڑھا دے یا اتنی کتابین نہ شروع کرا دے، کہ طالب علم اکتا جائین، بعضے تعطیل مین بھی طالب علمون کی جان مارتے اور اس کو اپنی بڑی کارگذاری جانتے ہین،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہین، کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر مین ہم سے پیچھے رہ گئے اور ایسے وقت آکر ملے کہ نماز کا وقت آگیا تھا، اور ہم وضو کر رہے تھے، جلدی مین کسی وجہ سے پاؤن دھونے مین کچھ سوکھا رہ گیا، تو آپ نے دو تین مرتبہ زور سے فرمایا کہ خبردار عذاب ہے ان ایڑیون کے لئے جو سوکھی رہ جائین،

اس سے تین حق شاگردون کے ثابت ہوئے ایک تو یہ کہ صرف تعلیم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اعمال کی بھی نگرانی رکھے، جس کی طرف اب بالکل ہی توجہ نہیں کیجاتی، اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہین، دوسرا حق یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے اس کا احتمال ہو کہ بدون آواز بلند کئے آواز نہ پہنچے گی، مثلاً حلقۂ درس بڑا ہو، تو تقریر بلند آواز سے کرے تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار کی تقریر سے طلبہ نے نہ سمجھا ہوگا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کر دینا مناسب ہے، اور یہ تو حضورؐ کی عام عادت تھی، کہ جب کوئی بات مہتم بالشان ہوتی تو تین بار

فرماتے تاکہ لوگ خوب سمجھ لین"

"بعض اہلِ علم کو ضرورتاً بلا ضرورت اپنے علم کے اظہار کا عارضہ ہوتا ہے جس سے بعض جماعتون کو ضرر بھی ہوتا ہے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے اس حال مین ملے، کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، تو وہ جنت مین داخل ہوگا، تو حضرت معاذؓ نے عرض کیا، کہ کیا لوگون کو یہ خوشخبری نہ سناؤن آپنے فرمایا نہ سناؤ کیونکہ مین ڈرتا ہون، کہ اس پر تکیہ کر لین"

"دیکھو یہ مضمون اپنی جگہ صحیح اور شریعت کے مقاصد عظیمہ مین سے تھا، پھر بھی آپنے لوگون کے ضرر کے خیال سے اس کی اشاعت ناپسند فرمائی، جس سے معلوم ہوا، کہ جو مسئلہ یا کتاب کسی طالبعلم کے لئے مضر یا نامناسب معلوم ہو، اس سے روک دینا بھی استاذ کے ذمہ ہے، اور طالب علم کو اس مین استاذ کی اطاعت لازم ہے،

"حضرت ابنِ عمرؓ فرماتے ہین کہ مین نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ خواب مین مجھے دودھ کا ایک پیالہ دیا گیا، مین نے خوب سیر ہو کر پیا کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا، پھر بچا ہوا دودھ عمر کو دیدیا، لوگون نے عرض کیا حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی، فرمایا دودھ سے مراد علم ہے،

اس سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لین کے، اور ایک معنی لین کے، اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے مین شریک کر لیا کرے، جس سے اس کا دل بڑھتا، اور محبت زائد ہوتی ہے، اور جس قدر استاذ سے محبت ہوگی، اسی قدر علم مین برکت ہوگی، دوسرا یہ کہ اگر حق تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی برکت عطا فرمائے، تو شاگرد سے دریغ نہ کرے، غرض ظاہری و باطنی غذا کا کچھ حصہ اس کو بھی دے،

"ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فلان شخص کی نماز اتنی طویل ہوتی ہے کہ مجھکو اندیشہ ہے کہ نہ پاسکون (یعنی بددل ہوکر جماعت چھوڑ دون) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر آتنا برافروختہ ہوئے، کہ کبھی اتنا برافروختہ ہوتے نہ دیکھا تھا، پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگون کو متنفر کرتے ہو، جو نماز مین امامت کرے، اس کو چاہئے کہ (قرأت) مین تخفیف سے کام لے، کیونکہ نماز مین مریض ضعیف و حاجتمند سب قسم کے لوگ ہوتے ہین،"

"اس سے بھی دو امر ثابت ہوئے ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق اپنے شاگرد یا ماتحت مدرس کے سپرد کئے جائین اور اس کی شکایت ہو تو شکایت سننا اور تحقیق کے بعد انتظام کرنا چاہئے، یہ نہین کہ شکایت کرنے والے کو محض طالب علم سمجھ کر نظرانداز کر دیا جائے، دوسرا یہ کہ اگر کسی شاگرد یا طالب علم سے کوئی نامناسب حرکت ہو، اور معلوم ہو، کہ غصہ ہوکر کہنے سے زیادہ نفع ہوگا تو اس کی مصلحت سے غصہ ہی کرنا افضل ہے،

عورتون نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم پر مرد غالب آگئے ہین، کہ آپ کا وعظ سننے کا موقع ہم کو نہین ملتا، ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیا جائے، آپنے مقرر فرما دیا، اس سے اوقات کی تعیین و تقسیم اور طلبہ کی جماعت بندی کا مصلحت ہونا معلوم ہوا، ایک عظیم مصلحت یہی ہے، کہ جن کے لئے جدا سبق مناسب ہے، وہ ایک ہی مین کیسے شریک ہون،

اس قسم کی خاص خاص باتون کے ساتھ شاگردون کا ایک عام اور بڑا حق یہ ہو کہ اُن کے حق مین علم کی دعا بھی کیا کرے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہین، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرمایئے"

شرکائے علم کے حقوق آگے شرکائے علم کے حقوق کا بقدر ضرورت بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث مین ہے کہ

"حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی عوالی مدینہ میں کچھ فاصلہ پر رہا کرتے تھے اور باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، جس دن میں جاتا، جو کچھ سن کر آتا، ان سے بیان کر دیتا، جس دن وہ جاتے، مجھ سے بیان کر دیتے۔"

"اس سے معلوم ہوا کہ اپنا شریک تعلیم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق اس کو تکرار کرا دیا جائے، اور یہ اس کا حق ہے، نیز مدرسوں میں باری باری سے پڑھنے کی بھی اس سے اصل نکلتی ہے۔"

باقی خود کلام مجید میں والجار الجنب اور والصاحب بالجنب یعنی ہمسایہ و ہم صحبت یا ساتھ بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ احسان کا جو حکم ہے، وہ حسب موقع شرکائے تعلّم کا بھی ایک دوسرے پر حق ہے، جیسا کہ مفسرین نے شریک تعلیم کے ساتھ اس کی تفسیر کی بھی ہے، اس کے علاوہ شرکائے تعلّم کے باہمی حقوق کی پوری پوری تفصیل و تکمیل کے لئے حضرات صحابہ کی باہمی معاشرت و طرزِ عمل کا پیشِ نظر رکھنا کافی ہوگا، اس لئے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم سب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہی تھے،

ضروری تنبیہات آخر میں تین ضروری تنبیہات فرمائی گئی ہیں،

"ایک یہ کہ گو متعلّم کے مفہوم میں متعارف استاد کی طرح پیر، واعظ اور مصنف جس سے بھی افادہ و استفادہ کا تعلق ہو، سب داخل ہیں لیکن حقوق سب کے مساوی نہیں، بلکہ متعارف معنی میں جس کو استاد کہا جاتا ہے، اس کا حق زیادہ ہے، اوّلاً تو اس لیے کہ یہ استاد شاگردوں کے لئے جتنی مشقت برداشت کرتا ہے، دوسرے اہلِ افادہ نہیں کرتے، بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت ہی نہیں اور بعض میں اگرچہ مشقت ہے، مگر وہ کسی خاص مستفید کے لئے برداشت نہیں کرتا، حالانکہ ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا کی نص قطعی سے مشقت کی بنا پر

حق کا عظیم ہونا ثابت ہے ثانیاً شاگرد استاد کی تابعیت کا التزام کرتا ہے، اور التزام ایک وعدہ ہے اور وفاے عہد لازم ہے،

عام لوگ اس مین یہ غلطی کرتے ہین، کہ پیر کی تعظیم اور خدمت و اطاعت مین تو حدود شرعیہ سے بھی تجاوز کر جاتے ہین لیکن استاذ کے حقوق ادا کرنے مین حدِ شرعی کے قریب بھی نہین پہنچتے، اور یہ شریعت کی تغییر کے سوا اور کیا ہے،!

دوسری قابلِ تنبیہ بات یہ ہو کہ استاد اور پیر کا حق زیادہ ہے یا باپ کا اس مین بھی لوگ یہ سمجھتے ہین کہ پیر اور استاد روحانی مربی ہین، اور باپ جسمانی اور روحانی مربی کا درجہ جسمانی سے بڑا ہے، اس دعویٰ کی غلطی اجمالاً اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ نصوص مین جس شد و مد سے باپ کے حقوق بتلائے گئے ہین استاد اور پیر کے نہین بتلائے گئے،

دوسرا مغالطہ یہ ہو کہ باپ نرا جسمانی مربی ہو حالانکہ اس کے ذمہ روحانی تربیت بھی ہے، خود نہ کر سکے تو کسی استاد کے پاس یا مدرسہ مین بھیجے، جیسا بہت سے کرتے ہین، اتنا بھی نہ کرے، تو قابلِ مواخذہ ہے، جیسے کوئی باپ جسمانی تربیت یا کھلانے پلانے میں کوتاہی کرے بہرحال باپ باپ ہی ہو جہل کی اور بات ہو، ورنہ اس کی برابر جسمانی و روحانی اعتبار سے خیرخواہ کون ہو سکتا ہو،

پھر سب سے بڑی روحانی مربی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہین اور حق تعالیٰ تو جسم و روح دونون کے مربی ہین انھین خدا و رسول ہی نے باپ کا حق نمایان فرمادیا، تو ان کی اطاعت بڑے مربی کی چھوٹے مربی کے حق پر تقدیم ہو البتہ واجبات شرعیہ کی مخالفت مین نہ باپ کی اطاعت ہوگی نہ استاد و پیر کی اور مباحات مین باپ کا حق مقدم ہوگا

تیسری تنبیہ یہ ہو کہ آیا معقولات فارسی اور حساب وغیرہ کے استاد بھی حقوق مذکورہ کے مصداق ہین یا نہین، اسی طرح کافر استاد بھی اس مین قواعد سے تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو چیزین مضر ہین ان کا استاد تو خود مضر و مضل ہے، اور استاد کا جو کچھ حق تھا، وہ بوجہ مفید و محسن ہونے کے اور جو چیزین

مضر نہیں ہین، ان مین تفصیل ہے، کہ اگر علوم دینیہ مین نافع و معین ہین تو چونکہ مقدمہ کا حکم مقصود کا ہوتا ہے، اس لئے ایسے اساتذہ حقوق مذکورہ کے مستحق ہون گے، گو اساتذہ مقاصد کے درجہ مین نہ سہی جس طرح اقارب کے حقوق مین قوتِ قرابت کے تفاوت سے حقوق مین تفاوت ہوجاتا ہے، اور اگر نہ مضر ہین نہ مفید تب بھی ایک دنیاوی احسان ہی، اور دنیوی احسان پر شکر گذاری نصوص عامہ سے ثابت ہی اس لئے اس کا بھی حق ثابت ہوگا، گو دینی احسان کے برابر نہ سہی"

اقتباساتِ بالا مین صریح نصوص سے جو استنباطات فرمائے گئے ہین، اور اُن سے طلبہ و اساتذہ کو تعلیم و تعلم کے جن حقوق و آداب کی طرف متوجہ اور جن کوتاہیون پر تنبہ فرمایا ہے، دنیوی درسگاہون یا انگریزی اسکولون اور کالجون کے اکابر و اصاغر کی خدمت مین تو اس سلسلہ مین کچھ عرض کرنا ہی عبث ہی ان کی تو دنیا ہی الگ ہی، البتہ عربی و دینی مدارس کے اساتذہ و تلامذہ کی اُن سے غفلت بلکہ الٹے انگریزی اسکولون اور کالجون ہی کے استادون اور شاگردون کی نقالی کو فخر جاننے کی جو وبا ان مین بھی پھیل گئی ہے، اس کی بنا پر حضرت مجدد کی اس باب مین تجدیدات و اصلاحاتِ بالا کی کچھ مزید تفصیل و تشریح کا جی چاہتا تھا، مگر کس کس چیز کی کہان کہان تک شرح کیجائے ؎

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

باقی مدارس دینیہ کے مخلص و اہلِ فکر حضرات کے لئے جن کو دل سے کچھ اصلاح کی فکر ہے حضرت کے یہ اجمالی اشارات و ارشادات بھی رہنمائی کے لئے کافی ہین، ورنہ اکثرون سے اندیشہ تو ان باتون کو محقراتِ امور کہکر ٹالدینے کا ہے، کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی اور ان کی اصلاح سے بےفکری کا یہ بھی ایک چلتا ہوا بہانہ بنا لیا گیا ہے، کہ یہ چھوٹی اور حقیر باتین ہین، جس کا جواب وہی ہے، جو حضرت ایسے مواقع پر فرمایا کرتے تھے، کہ "اچھا تو ایک چھوٹی سی چنگاری اپنے کپڑون کے صندوق مین رکھدو"۔

"باقی"

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار

اسلام کی روشنی مین

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے

(۳)

جیسا کہ ابتدا مین بیان کیا جا چکا ہے مادہ کے متعلق مارکسیت کے بنیادی تصورات دو ہین، ایک یہ کہ مادہ ازلی ہے، اور اس کا وجود ہمارے ذہن و وقوف پر منحصر نہین ہے یعنی وہ بالذات موجود ہے، خواہ کوئی ذہن اس کا شعور کرنے کے لئے موجود ہو یا نہ ہو، دوسرے یہ کہ مادہ اپنی ذات سے متحرک ہے، اور کائنات کے جملہ مظاہر خواہ وہ مادی ہون یا ذہنی مادہ کی اسی حرکت و ترقی سے وجود مین آئے ہین، یہ نظریہ درحقیقت اس دعویٰ کی تردید کرتا ہے کہ کائنات عالم کی تخلیق اور مظاہر عالم کی توجیہ کے لئے کسی خلاق ذہن (Creative mind) کے فرض کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ مادہ کی ذاتی حرکت اور اس کے عام قوانین ارتقاء سے جملہ واقعات و مظاہر کی توجیہ کی جا سکتی ہے، اس لحاظ سے مارکسیت تمام مذاہب عالم اور بالخصوص اسلام کی نفی ہے، کیونکہ مذہب کا سارا دار و مدار اس تصور پر ہے، کہ مادہ مخلوق اور حادث ہے، اور یہ کائنات اور اس کے جملہ مظاہر ایک ماورائی طاقت کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہین، جو شعور اور ارادہ اور حکمت کی صفات سے متصف ہے، مارکسیت کے ان دو بنیادی تصورات پر پہلا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے، کہ اگر مادہ ازلی ہے یعنی ہمیشہ سے تھا، اور اس کا وجود ہمارے ذہن و وقوف پر منحصر نہیں ہے، تو ان دونون حقیقتون کا ادراک ہمین کس طرح ہوا، ظاہر ہے کہ انسان نے مادہ کو اس وقت محسوس کیا، جب وہ خود عالم وجود مین آیا،

یعنی جب ذہن پیدا ہوا اسی وقت مادہ کا شعور و ادراک بھی ممکن ہوا، انسانی ذہن و شعور کے وجود سے قبل
اس دنیا مین کیا تھا، اور کیا نہین تھا، اس کا علم و وقوف حاصل کرنے والا کون تھا، ممکن ہو کہ انسان سے قبل
کائنات مین مادہ موجود ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان سے پہلے اس دنیا مین کوئی شے موجود نہ ہو، لیکن
یہ سب امکانات یا زیادہ سے زیادہ احتمالات ہین، لیکن اصل حقیقت کا پتہ کیسے چلے جب حقیقت کا مشاہدہ
اور تجربہ کرنے والا کوئی ذہن نہ ہو، اگر مارکسیت کو خدا سے اس لئے انکار ہے کہ ہمارے مشاہدات و تجربات
سے اس کا وجود ثابت نہین ہوتا ہے، یا یہ کہ وہ انسان کے حواس و مدرکات سے بالاتر ہے، تو یہی اعتراض
مادہ کے ازلی وجود پر بھی ہو سکتا ہے، آج ہم مادہ کو محسوس کرتے ہین، اس کا مشاہدہ کرتے ہین، وہ ہمارے
تجربہ مین آتا ہے، اس لئے ہم اس کے وجود کا اقرار کرتے ہین، لیکن جب ہم نہ تھے، نہ ہمارا ذہن تھا، نہ کوئی
تجربہ و مشاہدہ کرنے والی ہستی تھی، اس وقت مادہ تھا یا نہین اس کا علم کیسے ممکن ہو جس شے کا وجود تجربات اور مشاہدات
سے ثابت نہ ہو بلکہ یون کہنا چاہئے کہ جس شے کے وجود کا تجربہ اور مشاہدہ ممکن ہی نہ ہو کیونکہ انسان سے قبل مادہ کو تجربہ
مین لانے والی کوئی ہستی نہ تھی) اسکی حقیقت کا دعوی ان لوگون کو کہان تک زیب دیتا ہے جو حواس و تجربات کے علاوہ
اور کسی ذریعۂ علم کو تسلیم نہین کرتے ہین، اس کے جواب مین پیروان مارکس ان حجری آثار (Geological remains)
اور بحر و بر کی ان بے شمار نشانیون سے استشہاد کرین گے جن سے انسان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، کہ اس سے
قبل کائنات مین مادہ اور حیات دونون موجود تھے، لیکن اس کے معنی تو یہ ہوئے، کہ حصول علم کا صرف یہی ایک
ذریعہ نہین ہے، کہ انسان براہ راست اپنے حواس و تجربات و مشاہدات سے کسی وجود کا ادراک کرے بلکہ
علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے، کہ کسی شے کی نشانیون اور اس کے آثار و آیات کے مشاہدہ سے
اس کے وجود کا یقین حاصل کیا جائے، خواہ وہ شے بالراست ہمارے حواس و تجربات کی رسائی سے
باہر ہو، پھر اگر اسی طرح حاصل کئے ہوئے علم پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے یقین پیدا ہو سکتا ہے،
تو خدا کے وجود سے انکار کیونکر جائز ہے، جب کہ زمین و آسمان کی بے شمار نشانیان اپنے خالق کے وجود

پر گواہی دے رہی ہین،

اور کائنات کی نظم و ترتیب، مقصدیت اور معنی آفرینی اس امر کی دلیل ہو کہ وہ کسی ایسی قوت کا تخلیقی عمل ہے، جو ارادہ حکمت اور غایت پسندی کی صفات سے متصف ہے، ظاہر ہے کہ خدا کا اقرار اس بنا پر نہین کیا جاتا ہے، کہ اس کا وجود براہ راست ہمارے تجربہ حواس کی رسائی مین ہے، بلکہ اس کی ہستی کا اثبات ہم اس لئے کرتے ہین، کہ کائنات کی بے شمار نشانیان اور لاتعداد آثار و آیات وجودِ حقیقی کی طرف اشارہ کرتی ہین' دوسرا اعتراض اس نظریہ پر یہ وارد ہوتا ہے، کہ مادہ اپنے ذات سے کیونکر موجود ہوا، کیا مارکس کے متبعین کسی ایسے تجربہ یا مشاہدہ کی نشاندہی کر سکتے ہین جس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو جائے، کہ مادہ اپنی ذات سے ابتدائے کائنات مین موجود تھا، یا یہ کہ اس مین اپنی ذات سے موجود اور قائم رہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، یہ دعویٰ کہ ابتدائے آفرینش سے مادّہ بالذات موجود تھا، ایک نرا مفروضہ ہے، جس کی صداقت کا ثبوت تجربہ و مشاہدہ سے نہین ملتا ہے، اور نہ مل سکتا ہے، اس لئے کہ ہر تجربہ کے لئے کسی ذہن کا موجود ہونا ضروری ہے، اور یہان بحث یہ ہے کہ ذہن کے وجود سے قبل مادّہ تھا یا نہین، پھر اگر کسی دلیل کے بغیر محض احتمالاتِ عقلی کی بنا پر ہم مادہ کے متعلق یہ یقین کر سکتے ہین، کہ وہ بالذات ازل سے موجود تھا، اور اپنی ہستی کے لئے کسی اور وجود کا محتاج نہین ہے، تو خدا کے متعلق یہ یقین کرنے مین، کونسا استحالہ عقلی لازم آتا ہے، کہ اس کی ذات ازلی ہے، اور وہ اپنے وجود کے لئے کسی اور خالق کا محتاج نہین ہے یہ ظاہر ہے کہ کائنات کا معمہ حل کرنے کے لئے ہمین کسی نہ کسی ذات کو ازلی اور واجب الوجود (Necessary Existence) قرار دینا پڑے گا، اور اس ذات کو ان تمام صفات سے متصف کرنا پڑے گا جن سے تخلیق کائنات کی توجیہ ہو سکے، مثلاً حرکت، آئین پسندی اور مقصدیت: اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ذات مادّے کی ہے، یا خدا کی یعنی اس مین شعور و ارادہ کی صفت پہلے ہی سے موجود تھی، یا نہین، مادّیین اور خدا پرستون مین فرق صرف اتنا ہے کہ مادہ پرست ذات واجب الوجود اور ہستی ازلی کو شعور و ارادہ

کی صفات سے معرّیٰ قرار دیتا ہے، اور خدا پرست اوس ہستی ازلی مین ان صفات کا اثبات کرتا ہے، دونوں اپنے دعویٰ کا کوئی ایسا قطعی ثبوت نہین رکھتے، جو ٹھوس تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہو، ہر گروہ احتمالات عقلی سے کام لیتا ہے، اور انہی پر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ احتمالات کس کی طرف "زیادہ" ہین، مادیین کی طرف یا اہل مذہب کی طرف اس نقطۂ نظر سے جب ہم غور کرتے ہین، تو ہمین مادیین کا موقف بہت کمزور نظر آتا ہے، اس مین شک نہین کہ مادہ کو انسان کے مقابلہ مین تقدم زمانی (Priority in time) حاصل ہے یعنی احتمال اس کا ہے، کہ مادہ انسان سے قبل موجود تھا لیکن اگر اس احتمال کا قطعی ثبوت بھی حاصل ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے، کہ مادہ زمانی حیثیت سے انسان پہ متقدم ہے، تب بھی یہ اس امر کا ثبوت نہین ہو سکتا کہ کائنات کے جملہ مظاہر جس مین انسان بھی شامل ہے مادہ کی تخلیقی حرکت و قوت کی پیداوار ہین، کیونکہ تخلیقی قوت کے اعتبار سے انسان مادہ پر تقدم اور فضیلت رکھتا ہے، نہ کہ مادہ انسان پر، غور سے دیکھئے تو مادہ انسان کی قوت تخلیق کا محتاج ہے، اگر یہ سوال کیا جائے، کہ مادہ انسان پر حکمران ہے، یا انسان مادہ پر تو مشاہدات اور تجربات اور روزانہ زندگی کے بے شمار واقعات سے اس کا جواب یہی ملتا ہے، کہ انسان مادہ پر فرمانروا اور حاکم ہے، اُسے اپنے اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے، اور جس شکل مین چاہتا ہے، اُسے ڈھالتا ہے، اس لحاظ سے یہ امر قطعی الدلالہ ہے، کہ تخلیقی صفت مین انسان مادہ پر فضیلت رکھتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے، کہ وہ مادہ کی صفت تخلیق سے وجود مین آیا ہو، اگر مادہ خالق ہے اور انسان مخلوق تو یہ عجب خالق ہے جو اپنی مخلوق کا تابع فرمان، اس کے خواہشات و اغراض کا آلۂ کار اور اس کی قوت تخلیق کے آگے عاجز اور بے بس ہے،

درحقیقت مادیین صرف تقدم زمانی (Priority in time.) کی صفت کو دیکھکر یہ حکم لگاتے ہین، کہ جو وجود زمانی حیثیت سے متقدم ہوگا، وہی صفت تخلیق کے اعتبار سے بھی متقدم ہوگا، حالانکہ یہ امر عام مشاہدات و تجربات کے بالکل خلاف ہے، دریا، پہاڑ، جنگل، اور حیوانات کی

بے شمار اقسام طوالتِ عمر اور مدتِ حیات کے لحاظ سے انسان سے بہت قدیم ہین لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ ان کا وجود انسانی وجود سے زیادہ حقیقی ہے، یا انسان انہی کی تخلیقی پیداوار ہے، کیونکہ حقیقی وجود عبارت ہے وجود مؤثر (Effective existence) سے اور بہ لحاظ تاثیر و اثر انسان موجوداتِ عالم مین سب سے زیادہ برتر اور فائق ہے، یعنی دیگر اشیائے مادی کے مقابلہ مین سب سے زیادہ موثر وجود انسان کا ہے اس لئے اس کا وجود زیادہ حقیقی بھی ہے، اگر ایک جاہل کسان ایک سو بیس سال کی زندگی پاتا ہے، اور ایک مصلح شاعر یا انقلابی لیڈر صرف پچاس سال زندہ رہتا ہے، تو کیا اس کے معنی یہ ہین کہ کسان کا وجود اس مصلح، شاعر، یا انقلابی لیڈر کے وجود سے زیادہ حقیقی ہے، اس کا جواب یقیناً نفی مین ہے، کیونکہ وجود دراصل نام ہے تاثیر و اثر آفرینی کا، نہ کہ مدتِ حیات کی کمی و زیادتی کا، اس لئے محض تقدمِ زمانی سے مادہ کو خالقیت کا مرتبہ نہین حاصل ہو سکتا، اب اگر عالم اور اس کے واقعات و مظاہر مادہ کی حرکت و تخلیق سے وجود مین نہین آتے، تو پھر خدا کو خالق تسلیم کرنے کے سوا، اور کوئی چارہ نہین ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادیین نے مادہ کا جو جدید تصور پیش کیا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک قائم بالذات متحرک اور ازلی ہے، جو اپنے باطنی قوانین کا پابند ہے اور خدا کے اس عام تصور مین کہ وہ قائم بالذات ہے، ازلی ہے، فاعل ہے، متحرک ہے اور اپنی مقررہ سنتون مین کوئی تبدیلی نہین کرتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مادیین ہستی ازلی کو، ارادہ، شعور، غایت پسندی اور حکمت یعنی فی الجملہ ان صفات سے عاری کر دیتے ہین، جن سے تشخیص (Personality.) کا تار و پود تیار ہوتا ہے، اور خدا پرست اسی وجود ازلی مین تشخص کا اثبات کرتے ہین یعنی اسے ارادہ شعور اور حکمت کی صفات سے متصف قرار دیتے ہین لیکن درحقیقت ان دونون تصورات کے عملی مضمرات مین زمین و آسمان کا فرق ہے، پہلا تصور صرف ہستی ازلی کے اقرار پر ختم ہو جاتا ہے، اور انسان پر اس کے اقرار سے کوئی ذمہ داری عائد نہین ہوتی، دوسرا تصور صرف زبانی اقرار کا مطالبہ نہین کرتا، بلکہ زندگی مین عملی تغیرات و انقلابات یعنی تکمیل عبودیت چاہتا ہے، یہان یہ شبہہ ضرور پیدا ہوتا ہے، کہ اگر خدا خالق کائنات ہے، اور اسی کا وجود وجود حقیقی ہے تو

پھر وہ ہمارے حواس و مدرکات اور تجربات و مشاہدات کی رسائی سے کیونکر باہر ہے، اس شبہہ کا جواب بھی ہمیں روزمرہ زندگی کے تجربات سے حاصل ہوسکتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مراتب وجود میں جو شے جتنی زیادہ ارفع اور بلند ہے، اسی نسبت سے وہ زیادہ لطیف اور حواس و تجربات کی رسائی سے بعید بھی ہے، انسان کی ظاہری وجاہت اس کے اعضاء کا موزون تناسب یا اس کی جسمانی قوت ایسی صفات ہیں، جو دیکھنے والے کو ایک نظر میں محسوس ہوتی ہیں، اور اس پر فوراً اپنا اثر مترتب کرتی ہیں، ہم ایک طاقتور یا حسین شخص کو دیکھتے ہیں تو اس کی جسمانی قوت یا حُسن صورت سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن کسی شخص کی دماغی صلاحیتوں، اور ذہنی قوتوں کا علم و احساس ہمیں اس وقت تک نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ ہم کچھ دیر اس کی صحبت میں نہ بیٹھ لیں اور روزمرہ کی عام گفتگو کے علاوہ کسی سیاسی، مذہبی یا علمی مسئلہ پر اُسے اظہار خیال کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں، ظاہر ہے کہ انسان کی ذہنی قوتیں اس کی جسمانی قوتوں کے مقابلہ میں زیادہ موثر اور زیادہ حقیقی ہیں، اور مرتبۂ وجود میں، انسان کا ذہن اس کے جسم سے اعلیٰ تر مقام رکھتا ہے، اس کے باوجود ہم جسمانی صفات کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں، اور ذہنی صفات کے احساس میں اوّل تو کچھ وقت لگتا ہے، دوسرے چند مخصوص حالات و شرائط کی تکمیل کے بغیر انسان کی صفات ذہنی کا اظہار نہیں ہوتا، ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے، جو نہ تو جسمانی حیثیت سے ممتاز ہے، اور نہ عقل و ذہن کی جودت کے اعتبار سے لیکن اعلیٰ ترین صفات اخلاقی سے متصف اور سیرت و کردار کے بہترین فضائل سے آراستہ ہو، کیا ایسے شخص کی اخلاقی قوت اوّل نظر میں ہم پر منکشف ہو سکتی ہے، یا محض دو ایک صحبتوں میں ہم اس کی سیرت کا کوئی صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک طویل عرصہ تک اس کی صحبت میں رہنے کے بعد ہی ہم مختلف حیثیات سے اس کے کردار کا مطالعہ کر سکتے ہیں، اور اس گہرے مطالعہ کے بعد ہی اس کے حسن اخلاق اور جمالِ سیرت کا حال ہم پر منکشف ہو سکتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے، کہ اخلاقی قوت جو مرتبہ وجود میں جسمانی اور ذہنی قوتوں سے بلند ہے، اتنی آسانی سے احساس و ادراک کے دائرہ میں نہیں آسکتی، کیونکہ مدارج ہستی میں اس کا مرتبہ جتنا زیادہ بلند ہے، اسی نسبت سے اس میں

لطافت بھی زیادہ پائی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجود جتنا زیادہ حقیقی ہوگا، اتنا ہی زیادہ لطیف بھی ہوگا، اور حقیقت جتنی زیادہ بلند وارفع ہوگی، اسی نسبت سے وہ حواس وتجربات کی رسائی سے دور ہوتی جائے گی، اسی پر قیاس کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ جو مراتبِ وجود مین سب سے زیادہ بلند اور کائنات کی اعلیٰ ترین حقیقت ہے اپنی لطافت ذات کے باعث عام احساس وادراک کی رسائی سے کس قدر باہر ہوگا،

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر

نہ شود گرد نمایان ز رم توسنِ ما

اس کے معنی نہیں ہیں کہ کسی حال مین ذاتِ الٰہی کا عرفان وادراک نہیں ہو سکتا البتہ وجودِ حقیقی کے ادراک کے لئے چند مخصوص حالات و شرائط ضروری ہین، اسی طرح جس طرح انسان کی صفاتِ ذہنی واخلاقی کا علم و احساس چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے،

وحی والہام کی حقیقت اور ابدی صداقتون کا مسئلہ

مارکسیت وحی والہام کی حقیقت سے اس بنا پر انکار کرتی ہے کہ خارجی تجربات کے علاوہ انسان کے معلومات وتصوّرات کا کوئی اور ذریعہ نہین ہے لیکن اگر بالفرض ہم یہ مان لین کہ انسان کو اپنے معلومات وافکار کا سارا ذخیرہ کائناتِ خارجی سے حاصل ہوتا ہے، تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجربہ کرنے والا ذہن اس ذخیرۂ معلومات کی تشکیل وترتیب مین کوئی حصہ نہین لیتا؟ بالفاظ دیگر ذہنِ انسانی کو خارج سے جو مواد علم ملتا ہے، کیا وہ اُسے بلا تبدیلی صورت اور تغیر ہیئت جون کا تون قبول کر لیتا ہے، یعنی اصل مسئلہ یہ ہو کہ خارج سے موادِ علم حاصل کرنے مین ذہن کا حصہ محض انفعالی ہے، یا وہ فاعلانہ حیثیت سے اس موادِ علم کی صورت گری کرتا ہے اگر ذہن کی حیثیت محض ایک آلہ موصولہ (Receiver) کی ہے، جو سرتاسر انفعال وتاثر ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی ماحول مین جتنے انسان پرورش پائین ان سب کے افکار ونظریات یکسان ہون کیونکہ سب کے تجربات بھی یکسان ہین، حالانکہ ایک ہی ماحول ایک ہی عمر اور ایک ہی خاندان کے افراد اکثر اوقات بالکل جداگانہ

بلکہ متضاد نظریات و مقاصد رکھتے ہیں، کیا اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ ہے، کہ ہمارا ذہن ایک قائم بالذات (Independent) تشکیلی قوت ہے، جو خارج سے مواد علم تو وہی حاصل کرتا ہے، جو ہماری عمر اور ہمارے ماحول کے دوسرے اشخاص کرتے ہیں، لیکن اس مواد کی تشکیل و صورت گری اپنے طور پر کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کے افکار و تصورات اور اس کے نظریات و مقاصد کا اطلاق مواد علمی کی اس پختہ حالت پر کیا جاتا ہے، جب ذہن فاعلانہ حیثیت سے موادِ خارجی کی ترکیب و تشکیل کر چکتا ہے، نہ کہ اس موادِ خام پر جو خارج کا فراہم کردہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے انسان کے افکار و تصورات کا خالق درحقیقت اس کا ذہن ہے نہ کہ تجرباتِ خارجی، کیونکہ خارجی تجربات بغیر عمل ذہنی (Mental process) کے مدرکات کا ایک بے معنی طومار ہیں اس میں جو شے معنی پیدا کرتی ہے، وہ وہی انسان کا فاعلانہ ذہن ہے، اس لئے کسی فرد کی دماغی ساخت اور اس کے ذہن کی فاعلانہ قوت ایک مستقل قدر ہے، اب وحی و الہام کی حقیقت پر غور کیجئے، ایک پیغمبر کا دماغ جو اپنی مخصوص ساخت اور لطافت ذہنی اور فیضانِ ایزدی کی بنا پر فلسفیوں مفکروں وسائر عنداوان سے کہیں زیادہ بالغ نظر ہے، اسی موادِ خام کو جو وہ تجرباتِ خارجی سے حاصل کرتا ہے، اپنے ذہن کی مخصوص فاعلانہ قوت سے ایک معین صورت اختیار کرتا ہے، اور پھر دنیا کے سامنے اسے ایک صداقت کی شکل میں پیش کرتا ہے[۱]، یوں تو کائنات عالم کا ہر ذرہ حقیقت کی پردہ کشائی کر رہا ہے، اور خدا کے قانون سعادت و شقاوت کا ظہور اسی دنیا کے ہر واقعہ سے ہوتا ہے، لیکن صرف ایک پیغمبر کا ذہن اپنی مخصوص ذہنی لطافت اور فاعلانہ قوت کے باعث اُن اشارات و کنایات کو سمجھ سکتا ہے، جن میں فطرت اپنے حقائق کا اظہار و انکشاف کرتی ہے، حالانکہ ہم اور آپ انہی اشارات و کنایات سے بے خبری کی حالت میں گذر جاتے ہیں، اور اپنی کثافت ذہنی کی وجہ سے اُن کا مفہوم اخذ نہیں کرتے ہیں :-

---

[۱] اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ مذاہب نعوذ باللہ پیغمبروں کے دماغ کی پیداوار ہیں، وہ سب منجانب اللہ ہیں، یہ طریقہ تعبیر منکرین مذہب کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس کی تفصیل آیندہ آتی ہے،

وَاِن مِن شَیٍٔ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمدِہٖ	اور دنیا کی کوئی ایسی شے نہین ہے، جو
وَلٰکِن لَّا تَفقَہُونَ تَسبِیحَھُم	اس کی حمد وثنا کی تسبیح خوانی نہ کرتی
	ہو، لیکن تم ان کی تسبیحون کو سمجھ
	نہین سکتے ہو،

درحقیقت وحی والہام کی صداقت کو تسلیم کرنے سے مادئین اس لئے تامل کرتے ہین، کہ اُن کے سامنے اہلِ مذہب نے خدا کا صرف ماورائی تصور پیش کیا ہے یعنی ہستی باری تعالیٰ اس کائنات سے مادری اور مافوق ہی، حالانکہ اسلام نے خدا کے ماورائی تصور (Transcendental) کے ساتھ ساتھ اس کے سریانی تصور (Immanent) پر بھی زور دیا یعنی اس کی ذات عالم کائنات سے ماوری ہونے کے ساتھ کائنات انفس وآفاق مین جاری وساری بھی ہے،

وَھُوَ مَعَکُم اَینَمَا کُنتُم	وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہان کہین بھی ہو،

اور یہ روح یعنی ذاتِ باری تعالیٰ محض مخصوص افراد انسانی سے اپنی پیغام رسانی کا کام لے لیتی ہے، اور پیغمبر کے لطیف ذہن ودماغ کا خالق اور صورتگر بھی وہی ہے، جو خارجی واقعات کا پیدا کرنے والا ہے، اس طرح خارج اور باطن دونون کی تشکیل وہی کرتا ہی ھُوَ الاَوَّلُ وَالاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالبَاطِنُ، خارجی تجربہ اور انسان کا مواد علم بھی خدا کے احکام اور اس کے مصالح کا تابع ہے، اور انسانی شخصیت کی تعمیر وتخلیق مین بھی اسی کا پوشیدہ ہاتھ کام کرتا ہے،

ھُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُم فِی الاَرحَامِ	وہی ہے جو رحم مادر مین تمھین جیسی صورت
کَیفَ یَشَاءُ،	صورت چاہتا ہے، عطا کرتا ہے،

رہا یہ دعویٰ کہ دنیا مین کسی ابدی صداقت کا وجود نہین ہے، بلکہ ہر صداقت اپنے وقت اور زمانہ کے لحاظ سے اضافی ہے، اس کے متعلق ہم مارکس اور اس کے پیرودن سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہین، کہ اگر

عالم خارجی کے احوال و واقعات کی تبدیلیاں اس امر کی دلیل ہین، کہ ان قوانین مین بھی تغیر ہوتا ہی، جن کے مطابق یہ تبدیلیان عمل مین آتی ہین، تو پھر کائنات ایک بالکل ناقابلِ فہم وجود ہے، اور اس کے متعلق سائنس نے جس قدر نظریات پیش کئے ہین، وہ سب غلط اور ناقابلِ اعتماد ہین، ہم کائنات کو صرف عمومی قوانین (General laws.) کے ذریعہ سمجھ سکتے ہین لیکن اگر یہ قوانین خود ناپائدار اور تغیر پذیر ہین تو پھر واقعات عالم کی توجیہ کیسے ہو سکتی ہے، مثلاً آئین سٹین کے نظریہ اضافیت کو لیجئے اگر ہم قوانین فطرت کو تغیر پذیر مان لین، تو اضافیت پر کس طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے، کیا معلوم کہ آئین سٹین کی تحقیقات کے بعد یہ قانون بدل گیا ہو، اور اب فطرت کسی اور قانون کے مطابق کام کرتی ہو، پھر اگر اضافیت کے قانون کی جگہ اس دوسرے قانون کی تحقیق شروع کیجائے جس نے اس کی جگہ لی ہے، تو بہت ممکن ہے، کہ ہماری تحقیق و جستجو کے دوران مین ہی یہ قانون بھی باطل ہو جائے اور اشیاء فطرت کسی تیسرے قانون کی پابندی کرنے لگین، اس مین شک نہین کہ آئن سٹین کے نظریہ اضافیت مین آیندہ بہت سی ترمیمات ہو سکتی ہین لیکن یہ اس کا ثبوت نہین ہے، کہ اضافیت کا قانون بدل گیا ہے، بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہو گا، کہ انسان اپنی کوتاہی نظر کے باعث قوانین فطرت کو سمجھنے مین غلطی کرتا ہے، ورنہ یہ تو بالکل بدیہی ہے، کہ حرکتِ اشیا کا جو قانون آج ہے، وہی ہزار برس پہلے بھی تھا، اور ہزار برس بعد بھی ہو گا، اس سے معلوم ہوتا ہی کہ تغیرات صرف حالات و واقعات مین ہوتے ہین، نہ کہ ان قوانین مین جو حالات کی تہ مین کارفرما ہین، بلکہ اس معنی مین فطرت کا دوام و استمرار اٹل ہے، اشیاء کے خواص مین ابتداے آفرینش سے اس وقت تک کوئی تبدیلی نہین ہوئی، جو شے انسان کی جسمانی صحت کے لئے آج مضر ہے، وہی ہزار برس قبل بھی نقصان رسان تھی، اور وہی ہزار برس بعد بھی رہے گی،

طبیعی دنیا کی طرح یہ بات اخلاقیات مین بھی صحیح ہے، جس طرح عالم طبیعی مین قوانین فطرت تبدیل پذیر نہین ہین، اسی طرح اخلاقی دنیا مین بھی قوانین اخلاق کی یکسانی مین کوئی فرق نہین آتا،

یہ اور بات ہے کہ ہم ان قوانین کو سمجھنے مین غلطی کرین، اور جب غلطی کا احساس ہو جائے، تو اپنے نظریات و تصورات مین تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جائین لیکن یہ تبدیلی اصل قانون مین نہ ہوگی بلکہ قانون کی بابت ہم نے جو تصور قائم کیا تھا، اس کی ترمیم و اصلاح ہوگی، جو اخلاق و عادات اور جو طرز فکر و طریق عمل انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے لئے پہلے مہلک تھے، وہی اس زمانہ مین بھی مہلک ہین، شراب خواری، زنا، نسوانی بے پردگی، اور عیش پرستانہ طرز زندگی سے اس ترقی یافتہ دور مین بھی وہی نتائج پیدا ہو رہے ہین، جو گذشتہ زمانون مین پیدا ہوئے تھے[۱]، قومون کے عروج و زوال جماعتون کے ضعف و انحطاط اور اجتماعی سود و بہبود کا قانون آج بھی وہی ہے، جو صدہا برس پیشتر تھا، تاریخ بدلتی ہے، اس کے حالات بدلتے ہین، لیکن اس کے قوانین نہین بدلتے، البتہ حالات و اشکال کی تبدیلی سے اس قانون کے اطلاق مین بھی تبدیلی ضروری ہو جاتی ہے،

جو لوگ تغیر اور محض تغیر کے قائل ہین، کیا وہ اس بات کا تصور کر سکتے ہین، کہ قانون ارتقار جو ابتدائے آفرینش سے کائنات اور اس کے جملہ تغیرات مین کارفرما ہے، دفعۃً باطل ہو جائے اور اس کے بجائے دنیا قانون ارتداد (Law of Retrogression) کے مطابق حرکت کرنے لگے، اگر اس

---

[۱] چونکہ قومون کے عروج و زوال مین متعدد عوامل (Factors) کارفرما ہوتے ہین اور آخری نتیجہ انھین عوامل کے مجموعی اثر سے مترتب ہوتا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ چند عوامل قوم کو بربادی کی طرف لیجائین لیکن دوسرے عوامل کے درمیان مین آجانے سے ان کا اثر پورے طور پر ظاہر نہ ہو سکے، مثلاً امریکہ اور انگلستان مین شراب خواری اور فحش کاری بہت بڑھی ہوئی ہے، اور اس کے ہلاکت خیز اثرات جو ہونا چاہئے تھے، ہو رہے ہین، مگر ان اقوام کی بعض اعلیٰ تر صفات نے اُن کے مضر اثرات کو دبا رکھا ہے جونہی ان اعلیٰ تر صفات کے اثر و قوت مین کمی ہوگی، ان عادات بد کا سیلاب پوری قوم کو قعر بربادی مین ڈھکیل دیگا،

طرح قوانین عالم ایک دوسرے کا ابطال کرنے لگیں تو کائنات یا تو بالکل برباد ہو جائے گی، یا اس کے اندر ایک دائمی جمود و سکون پیدا ہو جائے گا، پھر کیا یہی اصول انسان کے اخلاقی وجود پر صادق نہیں آتا؟ اگر ہم یہ مان لیں کہ قوانین اخلاق اسی طرح بدل کر ایک دوسرے کے اثرات کو بالکل مٹا دیتے ہیں، تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ انسان کا اخلاقی ارتقاء غیر ممکن، اور اس کی روحانی زندگی یکسر بے معنی ہے، پھر کیا بات ہے کہ مارکس اور اس کے پیرو عالم طبعی میں قوانین کے دوام و استمرار سے تو انکار نہیں کرتے ہیں لیکن اخلاق و معاشرت اور انسان کی اجتماعی فلاح کے قوانین کا دائمی ہونا ان پر اتنا شاق گذرتا ہے اگر فطرت اپنے کسی ایک شعبہ میں دوام و استمرار رکھتی ہے، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے دوسرے شعبوں میں دوام و استمرار اور عدم تغیر نہ ہو، یا کائنات کے مختلف شعبے متضاد قوانین کے تابع ہیں، اگر ایسا ہے تو پھر اس میں کوئی اندرونی وحدت نہیں ہو سکتی، حالانکہ مارکسیت ایک طرف تو اصول اضداد کی علمبردار ہے، اور اس کو تسلیم کرتی ہے، کہ دنیا میں متضاد حقیقتیں پہلو بہ پہلو کام کرتی ہیں، اور دوسری طرف اس واقعہ کا انکار کرتی ہے، کہ عالم میں بیک وقت تغیر بھی کار فرما ہے، اور ثبات و دوام بھی، یعنی تغیر اور عدم تغیر کی دو متضاد صفات ایک ساتھ کام کر رہی ہیں، خارجی حالات و واقعات میں ہر دم تغیر و تبدل ہوتا ہے لیکن قوانین تغیر اپنی جگہ دائم و قائم ہیں، اگر اس پر بھی پیروانِ مارکس یہ دعویٰ کریں، کہ قوانین حیات خود تغیر پذیر ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں، کہ جدلیات اور تاریخ کے جو قوانین تم نے سو سال پہلے مرتب کئے تھے، وہ اب تبدیل ہو گئے ہیں، اس لئے تمھیں اپنے تمام اصول و نظریات پر نظر ثانی کرکے مارکسیت کا ایک جدید فلسفہ مرتب کرنا چاہئے،

تاریخی حوادث اور انسانی ارادوں کی ناکامی

گذشتہ صفحات میں ہم نے انجلیس کی تحریروں سے ایک اقتباس پیش کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت اس امر کو تسلیم کرتی ہے، کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے نتائج وہ نہیں ہوتے ہیں جس توقع سے ان کوششوں کا آغاز کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد اور جماعت کی خواہشات، ارادے اور کوششیں دوسرے افراد اور جماعتوں کے ارادوں اور

مقاصد سے متصادم ہوتی ہین، اس تصادم کا نتیجہ اکثر و بیشتر متوقع نتائج سے بہت مختلف ہوتا ہے، اس طرح انسان اگرچہ شعوری مقاصد کے ساتھ کام شروع کرتا ہے لیکن اس کی کوششون کے نتائج شعوری نہین ہوتے، اسی طرح انسانی تاریخ مین بھی انسان کے ظاہری اختیار و ارادہ کی کارفرمائی کے باوجود درحقیقت اس کے ارادون کو بہت کم دخل ہے، غرض تاریخ اور فطرت دونون مین شعور کے بجائے بے شعوری پائی جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ پھر تاریخ کے واقعات مین ربط و تسلسل کیون پایا جاتا ہے، اور یہ واقعات نہ تو بے معنی ہوتے ہین، اور نہ بے قاعدگی کے ساتھ پیش آتے ہین، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان مین کوئی شعوری مقصد کام کررہا ہے، اگر دیانت سے اس پر غور کیا جائے، تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ تاریخی واقعات کی شکل و رفتار ایک بالاتر ہستی کے ارادہ سے متعین ہوتی ہے، جو ذی شعور ہو اور نہ صرف خود صاحب ارادہ ہے، بلکہ انسانی ارادہ کی خالق بھی ہے، لیکن مادیت کی اور شکلون کی طرح مارکسیت بھی خدا کے قریب پہنچکر اور اس کے آثار وجود کو محسوس کرکے اس سے قصداً گریز اختیار کرنا چاہتی ہے، اسی لئے انجلس کو کسی ایسے نظریہ کی جستجو ہوئی، جس سے خدا کا اقرار کئے بغیر وہ تاریخی واقعات کے ربط و تسلسل اور تاریخ کی نظم و رفتار کی توجیہ و تشریح کر سکے، اور اس نے تاریخ کے "مستورہ قوانین" کو اس نظم و مقصدیت کا سبب قرار دیا جو واقعات مین پائی جاتی ہے، یعنی جس طرح عالم فطرت کے واقعات مادہ کے قوانین حرکت کا نتیجہ ہین، اسی طرح واقعات تاریخ کے "قوانین مستورہ" کا نتیجہ ہین، سوال یہ ہے کہ انجلس اور مارکس کے پیروون کو ان قوانین مستورہ کا علم کیسے ہوا، جب کہ وہ ہمارے مشاہدات و تجربات مین نہین آئے اور ہماری نگاہ سے مستور ہین، کیا یہ محض ادعائیت نہین ہے، کہ ہم ایک ایسے اصول و قانون کا اثبات کرین، جو ہم سے مخفی اور پوشیدہ ہے، اور جسے دیکھنے اور محسوس کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہین ہے، اگر اس کے جواب مین انجلس اور اس کے متبعین یہ کہتے ہین، (اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہین ہے) کہ اس قانون کے نتائج و اثرات اور اس کے آثار و شواہد اس کے وجود کی دلیل ہین، تو ہم ان سے عرض کرین گے کہ بالآخر تم نے بھی خالص تجربات و مشاہدات

کے علاوہ حصول علم کا ایک اور ذریعہ تسلیم کر لیا یعنی کسی شے کے آثار و آیات سے اس کے وجود کا ثبوت خواہ وہ شے بالراست ہمارے حواس و مدرکات کی رسائی سے باہر ہو، بعینہٖ اسی طریقہ سے ہم خدا کے وجود کا اثبات و اقرار کرتے ہیں یعنی تاریخ اور فطرت خارجی میں بے شعوری سے شعور کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے، کہ کوئی شعوری قوت اُن کے پس پشت کار فرما ہے، پھر خدا کے تسلیم و اقرار میں آخر کیوں تامل ہے جب کہ اس کا وجود تمام قوانین مستورہ سے زیادہ قرین عقل اور قابل فہم ہے، اس کے علاوہ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے، کہ اگر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انسانی ارادوں اور کوششوں کے نتائج لازمی وہ نہیں ہوتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، تو پھر مارکس اور اس کے پیرو کیسے یقین رکھتے ہیں، کہ اشتمالیت کے قیام کی جد و جہد وہ کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ وہی ہوگا، جو اُن کے پیش نظر ہے، انجلس کے ....

....

نظریہ کی رو سے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ اشتمالیوں کی جد و جہد کے واقعی نتائج ان متوقع نتائج سے بہت مختلف ہوں گے جنھیں پیش نظر رکھکر یہ تحریک شروع کی گئی تھی، یعنی اشتمالی تحریک بالآخر اشتمالیت کے قیام پر نہیں، بلکہ کسی ایسے نظام کے قیام پر منتہی ہوگی، جو مارکس اور انجلس کے تصور کردہ نظام سے بہت مختلف ہوگا، اگر ایسا ہے، اور انجلس کے نظریہ کی بنا پر اسی کا امکان ہے، تو پھر اشتراکی نظام قائم کرنے کی یہ ساری جد و جہد لاحاصل ہے، جب کہ ہمیں پہلے ہی سے یہ معلوم ہے، کہ اس کا نتیجہ پیش نظر مقصد سے بہت مختلف ہوگا، عجیب بات یہ ہے کہ انجلس کے اس صاف بیان کے باوجود انسانی تاریخ میں متوقع نتائج کبھی بر آمد نہیں ہوتے ہیں، مارکسیت اس امر کا دعویٰ کرتی ہے، کہ اشتمالیت کی کامیابی ایک ناگزیر تاریخی وجوب ہے یعنی اشتمالی نظام بہر حال دنیا میں قائم ہو کر رہے گا، کیونکہ تاریخی حالات و واقعات کا ناگزیر تقاضا یہی ہے، اس کے علاوہ چونکہ نظام سرمایہ داری اپنے عروج و منتہی کو پہنچ چکا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس نظام کے اندر سے اس کی ضد پیدا ہو کر اُن کو برباد کر ڈالے، غرض ایک طرف یہ کہا جاتا ہے، کہ مختلف افراد

اور جماعتوں کی خواہشات اور ارادوں کے تصادم کی وجہ سے وہ نتائج کبھی برآمد نہیں ہوتے ہیں، جن کا حصول افراد اور جماعتوں کے پیش نظر ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم جن ارادوں اور مقاصد کو لیکر اٹھے ہیں، وہ بہرحال کامیاب ہو کر رہیں گے، تضاد بیان اور خیالات کے الجھاؤ کی اس سے زیادہ بھی ہوئی کونسی مثال ہو سکتی ہے،

مارکسیت کے بالمقابل تاریخ کے تغیرات و انقلابات کا اسلامی نظریہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے، اسلام نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا، کہ اس کا نظام ہی ایسا ہے، کہ وہ تاریخی واقعات کی ناگزیر رفتار سے خود بخود دنیا کے دیگر ادیان پر غالب آجائے گا، گویا کہ اس کی کامیابی تاریخ انسانی کے ارتقائی عمل کا ناگزیر نتیجہ یا ایک تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کے افعال انفرادی اور اعمال اجتماعی میں جبر کا کوئی عنصر نہیں ہے، یعنی انسان کسی خاص دور یا کسی عہد میں کسی خاص طریق فکر اور طریق عمل کو اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے جس عقیدہ اور جس عمل کو چاہے اپنے لئے پسند کرے، لیکن اس کے اثرات لازمی طور پر اس پر مرتب ہوں گے، اور اس کی کامیابی یا ناکامی کا تعین کریں گے، وہ کائنات کو سعی و عمل کا ایک وسیع میدان قرار دیتا ہے، اور کامیابی کے لئے سعی و تدبر کو شرط قرار دیتا ہے:-

لیس للانسان الا ما سعیٰ ۔ انسان کے لئے بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے، جس کی وہ کوشش کرے،

دنیا میں ہر عقیدہ کے لئے خواہ وہ حق ہو یا باطل اس میں اس کے پیش نظر کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں حتی کہ جو شخص گمراہی اور فساد کی راہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی اپنی سعی و عمل کے مطابق ان میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے، اور کائنات کی کوئی قوت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی، خواہ وہ مقصد اور عمل غیر صالح اور غلط ہی کیوں نہ ہو، کائنات میں کسی حرکت اور کسی عمل کے لئے مزاحمت نہیں پائی جاتی ہے، عدم مزاحمت اس کا بنیادی قانون ہے، ہاں کسی ایسے فرد یا گروہ کو جو خود قدم نہ اٹھائے، کائنات آپ ہی آپ کامیابی نہیں عطا کرتی ہے،

محض خلوص نیت دعائیں اور آرزوئیں خواہ وہ مومن کی ہوں یا کافر کی اُسے کامیاب نہیں کرسکتی ہیں جب تک عمل کی طاقت اس کے پس پشت نہ ہو، لیکن اہل ایمان اور صالحین کے ساتھ خالق کائنات کی مدد شامل ہوتی ہے جب وہ سعی و عمل کے قانون کے مطابق کام کریں اور اپنے مقصد کے لئے ابتدائی قدم (Initiative) اٹھائیں تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی مساعدت کرتی ہیں مگر یہ مساعدت سعی و عمل کیساتھ مشروط ہے یعنی ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی صالح گروہ زمین پر حق کے لئے جد وجہد نہ کرے، اور پھر بھی کائنات کی قوتیں محض اس لئے اس کا ساتھ دیں کہ وہ صالح ہے، بلکہ جد وجہد کی ابتدا اہل ایمان کی طرف سے ہونا ضروری ہے، اس وقت قدرت اُن کی امداد پر آمادہ ہوتی ہے،

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ بھی تمھاری مدد کرے گا،

اس آیت سے صاف ظاہر ہے، کہ کائنات اس امر کی مقتضی ہے کہ کوئی گروہ قیام حق کے لئے کھڑا ہو اور جب ایسا کوئی گروہ پیدا ہوتا ہے، تو فطرت اس کے لئے کامیابی کا سامان بہم پہنچاتی ہے، آیت کا مفہوم یہی نہیں ہے، کہ اللہ تعالیٰ مافوق الفطرت ذرائع سے اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے، جو اُس کے قوانین کے مطابق دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے لئے اپنے جان و مال کی بازی لگا دیتے ہیں، اور مافوق الفطرت ذرائع کی امداد بھی عمل اور جد وجہد پر منحصر ہے، اس کے بغیر کوئی امداد حاصل نہیں ہوسکتی، خالق کائنات نے اس کی فطرت کچھ ایسی بنائی ہے، کہ وہ انسان کے اخلاقی مقاصد اور اس کی روحانی تمناؤں کے ساتھ محض غیر جانبداری، بے تعلقی اور عدم مزاحمت کا رویہ نہیں اختیار کرتی، بلکہ ان مقاصد اور تمناؤں میں انکی شریک ہوتی، اور ہر قدم پر اس کی امداد و اعانت کرتی ہے، گویا کائنات کی تمام قوتیں اخلاقی مقاصد کی تکمیل میں دن رات لگی ہوئی ہیں، اور جب اس کام میں ان کو انسان کی طرف سے کوئی امداد ملتی ہے تو وہ اپنے کام میں اور زیادہ تیزی اور سرگرمی سے منہمک ہوجاتی ہیں، اور اپنے مددگار انسانوں کو قوت بہم

پہنچاتی ہین، کائنات اور انسان دونون کا مقصد حیات ایک ہے فرق صرف یہ ہے کہ کائنات مجبور ہے، اور وہ اُس مقررہ مقصد کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہین اختیار کرسکتی ہے، اس کے برخلاف انسان آزاد ہے اور بسا اوقات اپنی آزادی سے غلط مقاصد کا انتخاب کرتا ہے، مگر جب وہ اپنی غلطی محسوس کرکے صحیح مقصد کو پالیتا ہے، تو انسان اور کائنات روحانی حیثیت سے ہم آہنگ ہوجاتے ہین، اور باہمی تعاون کے ساتھ اُن قوتون کے خلاف جنگ کرتے ہین، جو غلط مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہین، مگر جب اہلِ ایمان کا گروہ مقصدِ حق کے لئے جان نثاری نہین کرتا، اور مقصد باطل کے لئے سرگرم عمل گروہ کے لئے میدان چھوڑ دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے قانون سعی وعمل کے مطابق اس غیر صالح گروہ کو کامیابی حاصل ہوجاتی ہے، جو اپنے مقصد کے لئے سعی وجہد کرتا ہے، ایسی صورت مین کائنات کی قوتین اس گروہ کی مزاحمت تو نہین کرتین کہ ان کا بنیادی قانون عدم مزاحمت ہے لیکن ایجاباً اس کی کوئی مساعدت بھی نہین کرتی ہین، خدا کا قانون یہی ہے کہ جو گروہ جس مقصد کے لئے جد وجہد کرے گا، اس کے لئے کامیابی کی راہ کھلی ہوئی ہے، خواہ اس کا مقصد خالص دنیوی اور غیر اخلاقی ہو،

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا	جو شخص دنیا کے منافع کے لئے جلدبازی
لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ	کرتا ہو تو ہم بھی اس کے لئے جلدی کردیتے ہین
جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا	جہانتک ہم چاہتے ہین اور جس کیلئے ہم چاہتے ہین پھر ہم
مَدْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى	اس کے لئے جہنم کی آگ تیار کرتے ہین،
لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ	جس مین وہ ذلیل وخوار ہوکر جلتا ہے،
كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝	اور جو شخص آخرت چاہتا ہے اور اس
	کے لئے کوشش کرتا ہے، وہ کامیاب
	ہوتا ہے بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو،

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت مین کامیابی کیسے حاصل ہوگی، جب کہ دنیا مین دو گروہ مساوی قوت اور مساوی عقل وشعور کے ساتھ اپنے اپنے مقصد کے لئے جد وجہد کر رہے ہون جن مین سے ایک گروہ کا مقصد ایمان واخلاق کے بالکل منافی اور دوسرے کا مقصد عین مقتضاے ایمان واخلاق ہو، مارکسیت کے اصولون کے مطابق ان دونون کے تصادم کے نتیجہ کی کوئی پیشین گوئی نہین کی جاسکتی، وقتی حالات، اسباب کی مساعدت اور مادی قوت آخری نتیجہ پر موثر ہون گے، کیونکہ جب دو گروہ متضاد اغراض کولے کر اٹھین گے، تو اُن کے تصادم کا نتیجہ تاریخی اتفاقات وحوادث پر موقوف ہوگا، لیکن اسلام قطعی طور پر دعوی کرتا ہے کہ جب مومنین صالحین کی جماعت لوجہ اللہ نظام حق کے قیام کی جد وجہد کرے گی، تو اس کی کامیابی بالکل یقینی ہے، اور محض طبعی اسباب، عوامل یا مادی سروسامان اس کی کامیابی یا ناکامی پر موثر نہ ہون گے،

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ	ان لوگون سے جو ایمان لائے اور جنھون نے
وعملوا الصّٰلحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ	نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے
فی الارض کما استخلف الذین	کہ وہ انھین زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا
مِنْ قبلکم ،	جس طرح اُن سے قبل کے لوگون کو اُس
	نے اپنا خلیفہ بنایا تھا،

اس آیت مین اہل ایمان سے اللہ کا وعدہ قطعی اور غیر مشتبہ ہے، یعنی اگر کوئی جماعت ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنی طرف سے سعی وتدبیر مین کوتاہی نہ کرے تو اس کی کامیابی محض اس بنا پر مشتبہ نہ ہوگی، کہ اسباب مادی یا کثرت تعداد کے لحاظ سے اس کی مقابل جماعتین اس پر فوقیت رکھتی ہین یہ مخالف قوتین کتنے ہی مادی اسباب وآلات سے مسلح ہون، کامیابی بہرحال اسی گروہ کو ہوگی، جو اپنے ذاتی، قومی، طبقاتی اور دنیوی مفاد کے لئے نہین بلکہ عالم انسانی کی اخلاقی فلاح کے لئے مصروف جد وجہد

ہوگا، اس کی وجہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ کائنات اپنے ظاہری طبعی وجود کے باوجود قوانین اخلاق کی محکوم اور فطرت انسانی کے اخلاقی مقتضیات اور روحانی مطالبات سے ہم آہنگ ہے، اور اس میں جو ظاہری اور مخفی قوتیں کار فرما ہیں وہ سب اسکی منتظر رہتی ہیں کہ جب کوئی گروہ اخلاقی اور روحانی مقاصد کو لے کر اٹھے، تو وہ اس کی طرف دستِ تعاون دراز کریں لیکن جب وہ اس سے مایوس ہو جاتی ہیں، تو پھر وہ اپنی طبیعت و فطرت کے مطابق مجبور ہو کر ان جماعتوں کے سامنے جو مادی اغراض اور دنیا کی سرداری و پیشوائی کے لئے جد وجہد کرتی ہیں، کامل غیر جانبداری کے ساتھ کامیابی کی راہ کھول دیتی ہیں، اور آخر میں وہ جماعت کامیاب ہوتی ہے، جو طبعی اسباب، مادی وسائل اور اہلیت کار کے لحاظ سے برتر ہوتی ہے،

نزہتہ القلوب حمد اللہ مستوفی

کے

بعض مسامحات

از

لیفٹیننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب بی ایم آیچ ہیمبو برما،

"اس مضمون مین حمد اللہ مستوفی کی جو غلطیان دکھائی گئی ہین، ان مین سے بعض صحیح ہین، اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس نے ان مقامات کو خود نہین دیکھا تھا، بلکہ دوسرے جغرافیہ نویسون کے بیانات نقل کر دئیے ہین، اور یہ کوئی بعید بات نہین، اس لئے کہ ایک جغرافیہ نویس کے لئے ہر مقام کا خود دیکھنا ضروری نہین ہے، لیکن بعض بیانات کے متعلق جن کا تعلق جغرافی تغیرات سے ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ مین مستوفی نے انکو لکھا ہے، اس زمانہ مین ان کا بیان صحیح تھا، بعد مین جغرافی تغیرات نے ان حالات کو بدل دیا، مستوفی کی وفات ۷۵۰ھ مین ہوئی ہے، اور مضمون نگار نے ان مقامات کو ۱۹۴۲ء یعنی ۱۳۶۱ھ مین دیکھا ہے، اور ان دونون کے درمیان سات صدیون سے زیادہ کی مدت ہے، جو جغرافی تغیرات کے لئے بہت کافی ہے،" م

حمد اللہ مستوفی کی نزہتہ القلوب کے جغرافیائی حصہ کا ترجمہ گب میموریل سیریز کی جانب سے ۱۹۱۹ء مین شائع ہوا ہے، گذشتہ سال یہ ترجمہ میری نظر سے گذرا، یہ کتاب آٹھوین صدی ہجری کی تصنیف ہے دوران مطالعہ مین اندازہ ہوا کہ کتاب کا کچھ حصہ اغلاط پر مبنی ہے، اور بعض بعض مقامات کی تفصیل صحیح نہین ہے، اس لئے مین اُن کے نوٹس

لیتا گیا، کہ جب کبھی موقع ملے گا، تو انھیں یکجا کرون گا، الحمد للہ آج شمالی برما کے قیام مین اس کا موقع مل گیا اور انھین نوٹس کو ذرا پھیلا کر قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے،

جن مقامات اور علاقون کا ذکر مین ذیل مین کرون گا ان مین خود مجھے سیاحت کا اتفاق ہوا ہے اور تمام جگہین میری دیکھی بھالی ہین، اسی لئے مجھے اور زیادہ تعجب ہوا کہ مصنف نے غلط کیون لکھدیا ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جن مقامون کا ذکر کیا ہے، ان مین سے اکثر کو خود دیکھنے کی زحمت گوارا نہین کی ورنہ بعض فاحش غلطیان سرزد نہ ہوتین، اس مضمون مین ان اغلاط کے علاوہ بعض ایسے معلومات بھی ہین جن کا تعلق تاریخ قران کی جدید تحقیق سے ہے،

(۱) صفحہ ۲۰۶ حدیثۃ :- مصنف نے اس مقام کو دجلہ کے کنارے بتایا ہے اور اسی مقام کے محلِ وقوع کے متعلق ص ۲۰۸ پر دوبارہ دریائے زاب کے ذکر مین بھی کچھ بیان ملتا ہے، مصنف کا بیان ہے کہ ان مین سے ایک دریا کو زاب بزرگ کہتے ہین، اور یہ آرمینیا کے پہاڑون سے نکل کر دیا ربکر کے علاقہ سے بہتا ہوا مقام حدیثہ پر دجلہ مین گرتا ہے، ان دونون اقتباسون سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیثہ لب دجلہ واقع ہے، جو صحیح نہین ہے، مجھے حدیثہ کے گرد ونواح مین تقریباً پانچ مہینے رہنے کا اتفاق ہوا ہے، حدیثہ ایک مختصر سا قصبہ ہے جو حیفا اور انا کے وسط مین دریاے فرات پر واقع ہے، یہان سے عراق پٹرولیم کمپنی (I. P. C.) کا ایک اسٹیشن جسے (K 3) کہا جاتا ہے، پانچ میل پر واقع ہے، اس قصبہ کا کچھ دریا کے اندر ایک جزیرے پر واقع ہے، یہ مقام نہایت خوبصورت ہے، ۱۹۴۲ء مین جب مین وہان تھا تو اس وقت اس کی آبادی ڈھائی ہزار کے قریب تھی، اور ہدیز ناحیہ کا علاقہ تھا، ۱۹۴۲ء مین واسم عبد الحمید جو بغداد یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے، مدیر ناحیہ تھے، جو اکثر مریضون کو دیکھنے سے جایا کرتے تھے،

(۲) اسی طرح مستوفی نے زابین کا ذکر بھی غلط کیا ہے، یہ دو دریا مین جو شمال کی طرف سے دریاے دجلہ مین آکر گرتے ہین، ایک کو دریاے زاب بزرگ یا اپر (Upper Zab) زاب کہتے ہین، اور دوسرے کو زاب

خوندیا (۱۰۰۵ تا ۱۰۵۰ میٹر) ناپ کہتے ہیں، ذیل کے نقشے سے ان کا محلِ وقوع بخوبی سمجھ میں آجائے گا،
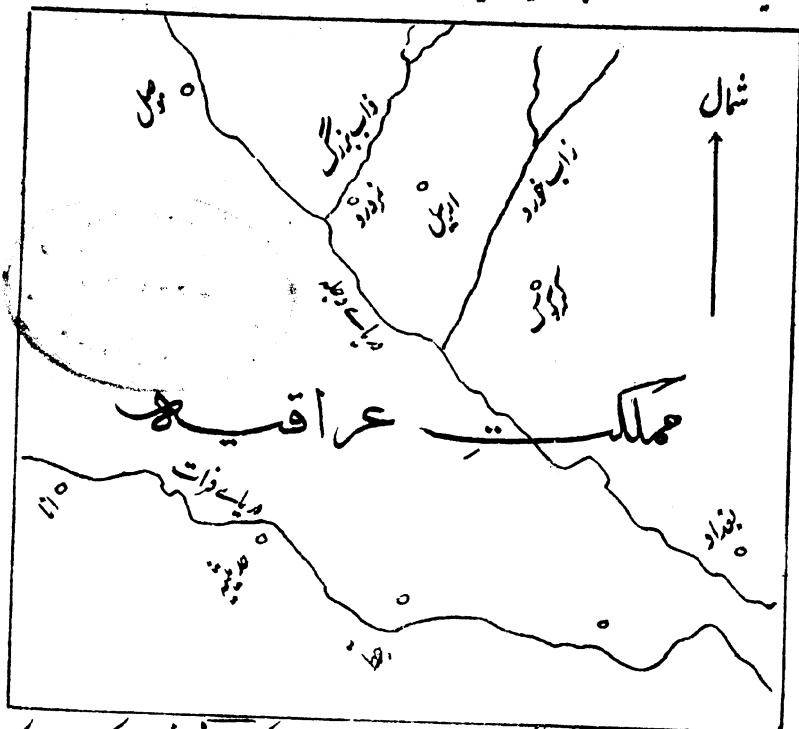
زابین مختصر سی ندیاں ہیں، اگرچہ کہیں کہیں ان کا پاٹ بڑھ گیا ہے تاہم جیسا کہ مستوفی نے بیان کیا ہے، ان کا تعلق دیارِ بکر کے علاقہ سے مطلق نہیں ہے زاب بزرگ نمرود کے قریب آکر دجلہ میں ملتا ہے، اس مقام پر قدیم شہر لاسہ تھا جس کے کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں، نمرود اور حدیثہ میں کم از کم ڈھائی سو میل کا فاصلہ ہے، اسی طرح زاب خورد بھی دیارِ بکر سے ہو کر نہیں گذرتا، جیسا کہ مستوفی نے لکھا ہے، اور وہ اسے مد زاب کہتا ہے یہ دریا تو اربیل اور کرکوک کے درمیان سے ہو کر دجلہ میں گرتا ہے مجھے زابین میں تیرنے کا اتفاق ہوا ہے اور اکثر یہاں مچھلی کا شکار بھی کھیلا ہے، زاب بزرگ کے ساتھ ساتھ مجھے ستر میل شمال کی جانب جانے کا اتفاق ہوا ہے،

(۳) ص ۱۱۹ پر مصنف رقمطراز ہیں کہ اصطخر کے دو ستونوں پر بُراق کی تصویر تراشی ہوئی ہے اس کا چہرہ انسان کے مانند ہے، سر پر تاج ہے، اور پچھلا دھڑ بیل کی مانند ہے" میرے نزدیک یہ غلط تشریح ہے

اس قسم کے مجسمے کثیر تعداد میں ہلال خصیب میں مل چکے ہیں، اور یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ یہ آشوری بیلوں کے مجسمے ہیں جو بطور دیوتا پوجے جاتے تھے، ان پر اکثر خط میخی میں لکھے ہوئے کتبے بھی ملے ہیں، یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مجسمے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پیشتر کے زمانہ کے ہیں، جب لوگوں کو براق کی اہمیت سے واقفیت بھی نہ تھی، بغداد کے آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے اس قسم کے مجسمے حال ہی میں محطۃ القطار کے بالکل متصل ایک بڑے دروازے کے اندر جڑ دیئے ہیں، اور اس دروازے کا نام آشوری دروازہ رکھدیا ہے، یہ مجسمے نورس آباد سے لائے گئے تھے،

(۴) ص ۱۴۹ پر ایک جگہ مصنف نے بیان کیا ہے، کہ "طوس کے مشرق میں امام غزالی کا مزار ہے"، امام موصوف کا مزار بہت سے مقامات کے ساتھ منسوب ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ پیغمبروں اور اماموں کے مزاروں کو ایک نہیں بلکہ متعدد مقامات سے منسوب کیا جاتا ہے، غالباً یہ مجاوروں کے ڈھکوسلے ہیں تاکہ نذر کا روپیہ فراوانی سے آتا رہے، بغداد میں مجھے امام غزالی کا مزار دیکھنے کا اتفاق ہوا[۱]، یہ مزار ایک مختصر سے قبرستان میں واقع ہے، جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے متصل ہے، اس قبرستان کے احاطہ کے اندر ایک بوسیدہ سی چھوٹی اینٹ کی کوٹھری ہے، جس میں آپ کی قبر ہے، دروازے کی چوکھٹ کے اوپر ایک مختصر سا سنگ مرمر کا کتبہ آپ کے پورے نام کے ساتھ لگا ہے،

(۵) اسی صفحہ پر مستوفی نے لکھا ہے، کہ "طوس کے جنوب مغربی حصے میں ایک دروازہ ہے جس کے قریب تین ہزار اولیاے کرام مدفون ہیں، جن میں سے ہر ایک کا نام ابو بکر تھا"!

(۶) ص ۱۵۹ پر مقام رشت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:-

"یہ بہت گرم مقام ہے، اور یہاں رطوبت زیادہ ہے"،

---

[۱] معارف: امام غزالی کا مزار بروایت صحیح طوس کے قریب ایک قصبہ طابران میں ہے، یہیں امام موصوف کا انتقال ہوا تھا، اور یہیں دفن ہوئے اس لئے اس بارہ میں مستوفی کا بیان صحیح ہے، بغداد کا مزار جعلی ہے،

تعجب ہو کہ اگر رشت گرم ہے تو پھر ایران مین ٹھنڈا مقام کونسا ہو سکتا ہے، رشت دریاے خضر سے کچھ ہی دور ہوگا، بلکہ ساحل ہی پر کہنا زیادہ درست ہے، گرمیون مین برسات کی وجہ سے ہوا مین رطوبت ضرور رہتی ہے، مگر اتنی نہین کہ اسے زیادہ کہا جائے، رشت سے قزوین تقریباً ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے، قزوین مستوفی کا مولد ہی، مگر رشت سے بدرجہا گرم اور خشک ہی، موسم گرما مین رشت اور پہلوی ایران کے صحت افزا مقام ہین، اور اکثر لوگ گرمیان یہان آکر گذارتے ہین، مجھے ۱۹۲۲ء مین گرمی کے موسم مین بندر پہلوی مین رہنے کا اتفاق ہوا، یہان سے رشت صرف بیس میل ہے، اس لئے اکثر آنا جانا ہوتا رہتا تھا، آج کل رشت ایک جدید شہر ہے، اور پہاڑون کے دامن مین واقع ہے، مناظر نہایت دلکش اور صفائی کا بہت زیادہ اہتمام ہے، البتہ ملیریا ضرور زیادہ ہی، باغات جگہ جگہ موجود ہین، لوگون کو سیر و تفریح کا بہت شوق ہے، باشندے خوش اور صاف رنگ کے ہین، فیکٹریان، کالج اور ہسپتال بھی موجود ہین، کچھ عرصہ مجھے قزوین مین بھی رہنا پڑا، یہان مین نے مصنف کے مزار کی بھی زیارت کی، ۱۹۴۲ء کے وسط مین اس کی نئی نئی مرمت ہوئی تھی، مخروطی ساخت کی مختصر سی قبر ہی، جو مسجد سنجیدہ کے قریب واقع ہے، اس مسجد کے متعلق مشہور ہے کہ سب اماموں نے یہان نماز ادا کی ہے،

واللّٰہُ اَعلمُ،

(۷) ص ۲۲۱ پر دریاے خضر کا ذکر شروع ہوتا ہے، مصنف کہتے ہین، کہ "دریاے خضر کی تہ مین کیچڑ کے سوا اور کچھ نہین، جس کی وجہ سے اس کا پانی ہمیشہ گدلا اور سیاہ رہتا ہے، اور دوسرے دریاؤن کی طرح جن کی تہ مین ریت ہوتی ہے، اس کا پانی صاف نہین لیکن انکا پانی ایسا شفاف ہوتا ہے، کہ اُن کی تہ نظر آتی ہے"؛

یہ بیان بھی غلط فہمی پر مبنی ہے، کسی دریا کی تہ خواہ اس مین ریت ٹیلے یا کیچڑ ہی کیون نہ ہو، کبھی نظر نہین آتی، دریاے خضر کا پانی اسی طرح صاف ہے، جس طرح دوسرے سمندرون کا ہوتا ہی، پانی کے گدلا نظر آنے کا سبب جس کی طرف مستوفی نے اشارہ کیا ہے، غالباً وہ تیل کی جھلی ہے، جو سطح پر اکثر برسات کے موسم مین نظر آتی ہی،

مجھے خود اُسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، مجھے بھی پہلے دیکھ کر تعجب ہوا، کہ یہ کیا ہے؟ مگر ایک بار نہانے کے بعد جب بدن پر چکناہٹ سی محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ تیل چپک گیا ہے، میرا قیاس ہے کہ باکو با (باکو) سے یہ تیل پانی کی لہرون کے ساتھ پھیل جاتا ہے، یہ بھی ممکن ہو کہ دریاے خضر کے گرد و نواح مین تیل کے کنوئین بکثرت ہین، اس لئے زمین سے یہ تیل خود بخود نکل آتا ہو، اور پانی مین مل جاتا ہو، چونکہ تیل پانی سے ہلکا ہوتا ہے، اس لئے سطح پر تیر آتا ہے، اور اسے گدلا کر دیتا ہے، دریاے خضر کا کنارہ شناوری کے لئے بہت موزون ہو، اور گرمیون مین اچھی خاصی رونق رہتی ہے، کیچڑ کا کہین نام نہین، کنارے سے پانی مین بڑھتے جائیے، جب تک پاؤن زمین کے ساتھ لگتے رہین گے، ریت ہی ریت محسوس ہوگی،

ان اغلاط کے علاوہ مستوفی نے سدّ یاجوج وماجوج سے متعلق نہایت سیر حاصل بحث کی ہے، اور بہت سی مفید باتین لکھی ہین، اس بحث سے چند اہم پہلو نکلتے ہین جنھین ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اس سلسلہ مین اسکا اظہار ضروری ہے کہ اس موضوع پر مولانا ابو الکلام آزاد نے جو تحقیق کی ہے، وہ اپنی نوعیت مین واحد تحقیق ہے، مولانا نے تاریخ قدیم کے تمام پہلوؤن کا جائزہ لے کر ایک خاص نتیجہ نکالا ہے، جو ترجمان القرآن مین سورۂ کہف کے تحت نوٹون مین مفصل درج ہے، جس سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے، اور مزید تحقیق کی ضرورت نہین رہتی، مولانا ابو الکلام کی تحقیق سے پیشتر جو الجھاؤ اس مسئلہ مین تھا میرے نزدیک اس کے تین وجوہ تھے،

اول، یہ بڑی غلط فہمی تھی، کہ سدّ یاجوج وماجوج چین کی بڑی دیوار تھی، (Great wall of china)

دوئم، یہ کہ ذو القرنین سکندر مقدونی تھا،

سوئم، یہ بڑی غلط فہمی تھی کہ ایران کے قدیم بادشاہون کے نامون مین جو نقل (Mathew) واقع ہو گیا تھا، اوس نے معاملہ کو اور بھی الجھا دیا تھا، پہلی غلطی کی وجہ میری سمجھ مین نہین آتی تھی، کہ یہ کس بنا

پر واقع ہوئی، دیوار چین کی موجودگی مورخین کو معلوم تھی، اور ساتھ ہی سد باب الابواب کا بھی علم لوگون کو تھا، پھر کیا وجہ ہوئی کہ بیشتر مورخین کی نگاہ دیوار چین کی جانب اٹھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین نے اس تحقیق مین دلچسپی سے کام نہین لیا، اور اگر لیا ہے تو احتیاط نہین برتی، اور ایک دو مقامات پر لاپروائی کے نمونے نظر آتے ہین، تصنیف زیر بحث کے ص ۲۳۲ پر مترجم نے ایک فٹ نوٹ مین اسی قسم کی غلط فہمی پیدا کر دی ہے، مترجم کہتا ہے،

"سد یاجوج وماجوج دیوار چین ہے" (The wall of gog and-magog is the great wall of china)"

حالانکہ مستوفی نے جس دیوار کا ذکر کیا ہے، جس پر فٹ نوٹ ہے، وہ دیوار چین نہین، بلکہ مستوفی نے صاف طور پر لکھدیا ہے، کہ یہ دیوار باب الابواب مین ہے، جسے دربند بھی کہتے ہین، اس لئے یقیناً یہ دیوار چین نہین ہو سکتی، مترجم نے اپنے بیان کو تقویت دینے کے لئے (M. J. Degorges-) کا حوالہ دیا ہے (-De muur Van gog and magog)، معلوم نہین مترجم کو یہ الجھاؤ پیدا کرنے سے کیا حاصل ہوا، اس سے بیشتر بھی مجھے ایسی دیدہ و دانستہ غلطیان پھیلانے والون کا تجربہ ہوا ہے، اس کی ایک نہایت اہم مثال جو کئی برس سے میری نگاہ مین ہے، عجیب نوعیت کی ہے، اس ضمن مین اگر اس کا ذکر نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے، کہ کہین حافظہ سے اوجھل نہ ہو جائے، اس لئے اس موقع پر اسے بیان کر دیا جاتا ہے،

ڈاکٹر سخاؤ (Sachau) جنھون نے البیرونی کی کتاب الہند کا ترجمہ کیا ہے، انھون نے کتاب کے آخر مین ایک تنقیدی ضمیمے کا بھی اضافہ کیا ہے، اس ضمیمے مین انھون نے ایک مقام پر بڑی غلط بیانی سے کام لیا ہے، جو کسی طرح بھی اُن کے علم کے شایان شان نہین ہے، البیرونی کے ہمہ گیر علم کا اس وقت دنیا مین کون قائل نہین، علم تو ایک طرف رہا، اس کی زبان دانی کا ثانی آج تک دنیا نے

پیدا نہین کیا، سخاؤ خود اپنے دیباچہ مین لکھتے ہین، کہ البیرونی کو چھ زبانون مین مہارت تھی، اور وہ ہر زبان مین خامہ فرسائی کیا کرتا تھا، ترکی، فارسی اور عربی تو خیر اس کے لئے آسان بھی جا سکتی ہین، مگر وہ یونانی، لاطینی اور سنسکرت کا بھی ماہر تھا، اور کتاب الہند لکھ کر اُس نے ہم لوگون پر جو احسان کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے، اور یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے، کہ اگر آج کتاب الہند ناپید ہوتی، تو ہندوستان کے قدیم علوم اس کا تمدن اور کلچر یک قلم ہماری نگاہون سے اوجھل ہو جاتے، ڈاکٹر سخاؤ تنقید مین فرماتے ہین کہ

"یہ جو اقتباسات البیرونی نے دئیے ہین یہ ہرگز بھگوت گیتا کے نہین ہو سکتے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ البیرونی نے بھگوت گیتا کا کوئی ایسا نسخہ استعمال کیا ہے جو ہمارے پاس آج کل موجود نہین، یا جو ہمارے نسخون سے بالکل مختلف تھا، اور یا پھر غالباً ہندوستان مین واحد نسخہ تھا، جو اُن کی نظر سے گذرا"

یہ بیرونی پر کتنا بڑا الزام ہے، گویا اس نے من گھڑت باتین لکھدی ہین، ہم کو بعض تاریخ کے طلبہ سے سُننے کا اتفاق ہوا ہے، کہ البیرونی گپیں بہت ہانکتا ہے، اور حقیقت کم لکھتا ہے لیکن جنھون نے البیرونی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہین کہ یہ سراسر غلط ہے، لوگ بغیر غور کئے ہوئے محض دوسرون کی رائے پر اپنے خیالات کو پختہ کر لیتے ہین، جو ریسرچ کے منافی ہے، سخت تعجب ہے کہ ڈاکٹر سخاؤ کے پایہ کا آدمی جس نے کتاب الہند کے ترجمہ جیسا مشکل کام انجام دیا گیا، اس حقیقت سے آگاہ نہین تھا، کہ بھگوت گیتا کے علاوہ ایک درجن گیتائین ہندوستان مین رائج تھین، ان تمام گیتاؤن کے نامون مین اختلاف تھا، جہانتک مین نے کتاب الہند کا مطالعہ کیا ہے، وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ البیرونی نے کسی ایک جگہ بھی بھگوت گیتا کا نام نہین لیا ہے، وہ محض گیتا ہی لکھتا ہے، نہین معلوم مطلق گیتا سے ڈاکٹر سخاؤ نے یہ کس طرح سمجھ لیا، کہ اس سے مراد بھگوت گیتا ہی ہوگی، بال گنگا دھر تلک اپنی گیتا راسیا مین رقمطراز ہین، کہ

"یہ تمام گیتائین بھگوت گیتا کے بعد کی لکھی ہوئی ہین، اور انھون نے بعد مین شہرت حاصل کی

اور مقبول ہوئیں، البتہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ باقی گیتائیں جو وجود میں آئیں، اس کا سبب ہوا کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا تھا، کہ جب تک ہمارے پاس بھگوت گیتا کی مانند ایک گیتا نہ ہوگی، اس وقت تک ہمارا مذہب ناقص اور ناکمل رہے گا"

اس کے بعد ناظرین خود غور فرمالیں کہ ڈاکٹر سخاؤ کا اعتراض البیرونی پر کہاں تک درست ہے، ؟ ملک نے ان گیتاؤں کی ایک فہرست بھی دی ہے جن کی تعداد بارہ ہے، ان میں سے دو گیتاؤں کے نام یہ ہیں، وائی گیتا اور رام گیتا جن اصحاب کو مزید مطالعہ کا شوق ہو، وہ گیتا رہسیا مطالعہ فرمائیں،

اسی طرح مستوفی کے مترجم نے بھی سدیاجوج و ماجوج سے متعلق غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ہے، پہلے مستوفی کا بیان ملاحظہ ہو، پھر اس کا مقابلہ مترجم کے حاشیہ سے کیجئے، اور دیکھئے کہ مترجم نے کہاں تک ایمانداری سے کام لیا ہے، مستوفی لکھتا ہے :-

"بعض بیانات کے مطابق اس دیوار کو تعمیر کرنے والا ذوالقرنین اعظم تھا"

غالباً اس سے کلام مجید کی طرف اشارہ ہے، یعنی ذوالقرنین بن رومی بن لانتی بن جافت (Japheth) بن نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام، اور بعض بیانات کے مطابق یہ ذوالقرنین سکندر بن دارا، بن آرتخش (Artaxerxes) بن بہامن (Bahaman) بن اسفندیار تھا،

ابن خردادبہ اس دیوار کے متعلق لکھتا ہے :-

"خلیفہ واثق باللہ نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ دیوار میں شگاف ہو گیا ہے تو ۲۲۸ھ میں اوس نے سلام کو جو اس کا ترجمان تھا، اس کی تحقیق کے لئے بھیجا، اور پچاس مسلح سوار اور مکمل رسد اس کے ساتھ کی، یہ شخص سُرّمن را (سمرہ) سے ہوتا ہوا، آرمینیا اور ابخاز کے کے گرنزون کے پاس گیا، اور یہاں سے زلان شاہ اور شروان کے بادشاہوں سے ملتا ہوا آلان اور صریر پہنچا، صریر کا بادشاہ اس وقت باب الابواب (دربند) پر بھی حکمران تھا،

یہاں سے وہ ترخان ملک کے پاس پہنچا، جو خضر پر حکومت کرتا تھا، ترخان ملک نے سلام

کو دیوار تک پہنچا دیا، سلام نے دیکھا کہ ایک خشک پہاڑ، ایک درّے کے اوپر چھایا ہوا ہے.....

اس درّے کے نیچے اُسے دو مینار نظر آئے، جو لوہے کی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے، اور ان کے

جوڑون مین سکہ پلایا ہوا تھا، اس دیوار کے وسط مین ایک دروازہ تھا، جو دوسرے لوہے کی

چادرون سے بنایا گیا تھا،...... دیوار بھی مینارون اور دروازہ کی طرح لوہے کی اینٹون سے

بنی ہوئی تھی، اور اس کے بھی جوڑون مین سکہ پلایا تھا"

اس تفصیل سے ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہین، کہ مستوفی نے سدِ یاجوج وماجوج کا جو دربند مین واقع

ہے، ذکر کیا ہے یا دیوارِ چین کا!

اس دیوار کی تفصیل ایک اور نامور مصنف کے قلم سے بھی سُن لیجئے، مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اس

کتاب کا حوالہ ترجمان القرآن مین دیا ہے،

ولیم جیکسن (William Jackson) نے یہ کتاب (From consta-

-ntinople To the home of omar Khayyam) عرصہ ہوا بطور سفرنامے کے لکھی

تھی، وہ لکھتا ہے:۔

دربند..... اس کی بلند دیوارین فولاد کے مسودے ہین (؟)......... جو کہ متصل سمتون مین بڑھتے

چلے جاتے ہین: اور مغرب کی طرف چالیس میل تک قفقاز کے اندر تک چلے گئے ہین،........

اب اس دیوار کے بعض بعض حصے کہین کہین ملتے ہین، جو بحیرۂ اسود تک چلے گئے ہین، یہ عظیم

دیوار سدِ یاجوج وماجوج ہی ہے...... اس مین چندان تعجب کی بات نہین کہ مرورِ زمانہ سے

اس کی بوسیدہ حالت ہوگئی ہے، قدیم زمانہ مین اسے سدِ آہنی (دمرکپو) یا (Gate of-

-gales) (باب الابواب) کہا جاتا تھا، دربند کی بنیاد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ

یہ دو بادشاہون نے تعمیر کی، ایک سکندر مقدونی (۳۲۳ قبل مسیح) اور دوسرا ساسانی
شاہنشاہ خسرو (انوشیروان عادل) جسے اکثر کیخسرو اوّل (۵۳۱-۵۷۹ قبل مسیح)
بھی کہتے ہین، آخرالذکر سے اس دیوار کی مناسبت زیادہ ہے، کیونکہ بیان کیا گیا ہے کہ کیخسرو
نے اس دیوار کا بیشتر حصہ تعمیر کروایا"

ان دونون بیانون سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مستوفی اور ولیم جیکسن جس دیوار کے متعلق ذکر کرتے ہین
وہ سدّ یاجوج و ماجوج ہی ہے، جو دربند مین واقع ہے، اور ان کا اشارہ ہرگز ہرگز دیوار چین کی
طرف نہین ہے، واللہُ اعلم، مترجم نزہتہ القلوب نے دیوار چین کا مسئلہ کہان سے پیدا کر لیا؟

اس بات کا کہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کیون تصور کیا گیا ہے، میری دانست مین صرف
ایک جواب ہے، وہ یہ کہ قرون وسطی کے مورخین نے سکندر مقدونی کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس پر
اس قدر زور دیا، کہ اصل حقیقت نگاہِ تحقیق سے اوجھل ہو گئی، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک
جدید آخری انکشافات پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے تھے، مگر کیخسرو کا نام تو موجود تھا! طبری نے بھی اس پر زور دیا ہے
کہ سکندر مقدونی ہی نے سدّ یاجوج و ماجوج تعمیر کرائی تھی،

اوپر جو اقتباس نزہتہ القلوب سے دیا گیا ہے، اس سے بھی کچھ مغالطہ کا امکان ہے، اگر اس
کی نوعیت دوسری ہے، اس بیان کے مختلف اجزاء مین مطابقت پیدا کرنا مشکل نظر آتا ہے، خصوصاً
جہان مستوفی نے سکندر کا ذکر کیا ہے، اس نے سکندر کو دارا کا لڑکا بیان کیا ہے، مگر مولانا ابوالکلام
آزاد کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے، کہ سائرس (کیخسرو) گورش تھا، اور یہ ایکمینیز (Achae-
menes) خاندان سے تعلق رکھتا تھا، نہ کہ ساسانی خاندان سے، ولیم جیکسن نے خسرو
(انوشیروان عادل) کو ساسانی بتایا ہے، میرا خیال ہے کہ اس نے دونون خسروون کے بیان
مین غلطی سے کام لیا ہے، بہر حال مستوفی خسرو کا نسب ایکمینیزی تبلاتا ہے، مگر مولانا آزاد نے اس

تمام الجھاؤ کو صاف کر دیا ہے، اور اس کی تصریح کر دی ہے، کہ کیخسرو سائرس تھا، اور یہی ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن کریم مین آیا ہے، اور اُسی نے سدّ یاجوج و ماجوج تعمیر کرائی تھی، اب بات صرف اس قدر رہ گئی، کہ جس سکندر کا ذکر مستوفی کرتا ہے، اور جسے وہ دارا کا لڑکا بیان کرتا ہے، یہ کون شخصیت تھی اس کی وضاحت خود مستوفی کے ایک بیان سے ہو جاتی ہے، ص ۲۲۹ پر وہ لکھتا ہے، کہ

"یہ سکندر بن داراب (Darab) بن بہامن (Bahaman) بن اسفندیار نے تعمیر کرائی"

اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مستوفی کا سکندر، سکندر مقدونی نہیں، بلکہ کوئی اور ایرانی سکندر ہے

عرب کی موجودہ حکومتین

جزیرۃ العرب کے ساتھ مذہبی تعلق و عقیدت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانون کو نجد و حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے حصون اور حکومتون کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، اس لئے اس کتاب مین عرب کا تفصیلی جغرافیہ اور تمام قابلِ ذکر حکومتون نجد و حجاز، عسیر و یمن، تجج. نواحی نسعہ، بحرین، کویت، اور فلسطین و شام کے مختصر حالات جمع کر دیئے گئے ہین، ضخامت ،، اصفحے، قیمت :- عہ

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی اخلاقی، تمدنی، سیاسی اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان مین لکھے ہین،

ضخامت :- ۲۴۲ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

استفسار و جواب

ہندوستان کے عہد اسلامی مین زکوٰۃ کا نظام

جناب شیخ عطاء اللہ ام اے
استاذ شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

مین نے العشر والزکوٰۃ پر معارف مین آپ کا مبسوط مقالہ پڑھا، دو ماہ سے اُس کتاب کی تلاش مین ہون جس پر یہ مقالہ ایک تبصرہ ہے، کل پھلواری شریف لکھا ہے، اگر کتاب دستیاب نہ ہوئی تو آپکے ہان سے عاریۃً حاصل کرونگا،

فی الحال یہ درخواست ہو کہ از راہِ کرم مجھے تاریخ ہند کی کسی کتاب کا حوالہ دیجئے، جس سے آپ کے اس دعوٰی کی تصدیق ہوسکے، کہ ہندوستان کے عہد اسلامی مین بھی نظام زکوٰۃ قائم تھا، اور نیز بیت المال کی آمدنی سے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوسکین،

از راہ کرم اگر معلوم ہو تو یہ بھی ارشاد فرمادین کہ اس وقت کن کن اسلامی ممالک مین نظام زکوٰۃ زیر عمل ہے، اور اُس سے کس قدر سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے، امید ہے کہ آپ اس مسئلہ کے سمجھنے مین میری اعانت فرمادین گے،

معارف:- گرامی نامہ ملا، کتاب العشر کے لئے مکتوب گرامی ملتے ہی پھلواری خط لکھدیا تھا، امید ہے کہ کتاب آپ کو مل گئی ہوگی،

ہندوستان کے عہد اسلامی مین زکوٰۃ کے نظام کے قائم رہنے کا تذکرہ آپ کو اس عہد کی تاریخون

مین عمومی طور پر مل سکتا ہے، جس سے اندازہ ہو سکیگا، کہ عہد اسلامی کے مختلف دورون مین زکوٰۃ کی تحصیل وصول اور اس آمدنی کے مصارف کا طریقہ شرعی احکام کے بموجب قائم رکھا،

اس سلسلہ مین پہلے یہ بات ذہن نشین رکھی جائے، تو حقیقت کے سمجھنے مین آسانی ہوگی، کہ ان اسلامی حکومتون مین جو عہد وسطیٰ مین مشرق و مغرب مین قائم رہی ہین، ان کے مالی نظام مین دو عملی طریق کار جاری ہوگیا تھا، ایک طرف وہ شرع کی پابندی کے لئے زکوٰۃ کے نظام کو قائم رکھتی تھین، اور دوسری طرف مختلف سلاطین اپنی حکومت کے استحکام اور شاہی مصارف، ملکی مہمات اور فوجی ضروریات کے لئے اور دوسرے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے، اس طرح زکوٰۃ کی آمدنی و مصارف کی حیثیت ایک قسم سے دینی سرمایہ کی ہوگئی تھی، حالانکہ اگر یہ سلاطین دین کے ماہرین اور ارباب حل و عقد کے مشورون سے اپنی حکومت کے اقتصادی نظام کو قائم کرتے، تو انھین اس دو عملی طریق کار کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، چنانچہ بعض دیندار سلاطین و ولاۃ نے اسپین اور بعض دوسرے ملکون مین کسی ایک زمانہ مین خالص دینی نظام مالیات کو برقرار رکھکر کامیابی سے حکومت کی، اور انھین دوسرے ٹیکسون کے لگانے کی ضرورت نہیں پڑی،

ہندوستان کے عہد اسلامی مین بھی حکومت کے مالی نظام مین یہی صورتِ حال نظر آتی ہے، مختلف زمانون مین یہان کی حکومتون کے مالی نظام مین زکوٰۃ کا نظام قائم رہا، اگر اس عہد کی تاریخون کو استقصا سے دیکھا جائے، تو مختلف دورون کی تفصیلات سامنے آسکتی ہین، ذیل مین ارشادِ گرامی کی تعمیل مین چند سرسری حوالے پیش ہین،

فیروز شاہی دور مین رعایا کے درمیان مسلم ذمی، امانی، اور دوسری طرف حربی کی تقسیم و اصطلاح قائم تھی، شمس سراج عفیف لکھتا ہے :-

"واہل کفر از طائفہ ذمیان و امانیان زیر سایہ چتر فیروز شاہی از رعیت بادشاہی بفراغت می گذرانیدند و اہل دار حرب را ہر سال نہب و تاراج میکردند (تاریخ فیروز شاہی ص ۱۸۰)

اس دور کے متعلق یہ تصریح معلوم ہے کہ اس مین زکوٰۃ کا نظام قائم تھا لیکن سلطان کے فوجی مہون مین مصروف رہنے کی وجہ سے حکومت کے نظام مین ابتری پیدا ہوگئی تھی، جب اُس نے سلطنت کی اصلاحات کی طرف توجہ کی، اور خصوصًا مسلمانون کے خلاف لشکر کشی سے جو نقصانات متصور ہوئے، اور سامنے آئے، ان مین ذیل کی دو باتین بھی تھین،

"دوم آنست کہ اموال بیت المال برائے آن جمع میکنند تا قوت در اسلام زیادت گردد نہ آنکہ بیت المال خرج کنند وبرائے قلع مسلمانان روند"

"ششم آنست اموال باطل و نامشروع در بیت المال جمع می شود، (ص ۲۶۵)

اسی طرح اسلامی ملکون کے مالی نظام مین دو عملی طریق کار کے جاری ہونے کا جو تذکرہ اوپر گذرا وہی طریقہ اس دور مین ہندوستان مین بھی جاری تھا، فیروز شاہ نے اس کو ختم کرنا چاہا، اور ان تمام ٹیکسون اور محصولون کو جو غیر شرعی طریق سے وصول کئے جاتے تھے، معاف کر دیا، اور حکومت کے مالی نظام کو خالص شرعی حدود مین لانا چاہا، شمس سراج عفیف لکھتا ہے،

"سلطان فیروز شاہ بعنایت الٰہ وحمایت اللّٰہ بلاد ممالک نامشروعات بود برخلاف شرع ردی می نمود تمام از محصول بلاد مملکت دور گنانید، وآن مقدار روشہا کہ در قسم ملکی وضع بود وآن روشہا مخالف شرع می نمود ہمہ را منع گردانید"

اس کے بعد علماء نے نامشروع محصولون کی فہرست تیار کی، اور فیروز شاہ نے ان سب کو موقوف کر دیا، لکھتا ہے:-

"علمائے درگاہ شہنشاہی از آثار خوف حضرت الٰہی جل جلالہ وعم نوالہ چند چیز از قسم نامشروعات پیش حضرت شہنشاہ ششش جہات باز نمودند کہ در عہد سلاطین ماضیہ وضع کردہ بودند"

یہ خرابیان دو قسم کی تھین، ایک تو جائز محصول زکوٰۃ کی وصول مین غیر شرعی طریق اختیار کیا

جاتا تھا، دوسرے سرے سے ناروا ٹیکس عائد کئے جاتے تھے، علما نے ان دونون کے تدارک کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا، چنانچہ فیروز شاہ نے اُن کے متعلق تحقیقات کرنے کا حکم دیا، پھر شرع کے مطابق اپنے فیصلے صادر کئے، شمس سراج عفیف ان تفصیلات کو لکھ کر آخر مین کہتا ہے،

"الغرض جملہ علماے امصار وتمام مشائخ مستثنیٰ وصاحبان دیوان قضا بحضرت شاہ طلب شدہ وازایشان استفتار طلبیدہ، جمیع علماء ومشائخ متفق اللفظ والمعنی فتوی دادند وازکتب معتبر روایات راجح بیرون آوردند، کہ ستون این وجوہات در علم شریعت یکے از مشرو عات است چون علماے شریعت ومشائخ طریقت فتوی بحقیقت تحقیق مرادہ درین محل حضرت شہنشاہ اکمل فرمان فرمود تا این جمع چیز ہا دور گردانند"

اس کے بعد ایک شاہی فرمان تیار کیا گیا، جس مین مشروع محصولات کی تفصیل درج تھی اور آخر مین مذکور تھا،

"اگرچہ سلاطین پیشین از سبب مصلحتے این چنین خراجہا گرفتند، وبا پیش ایشان دستور مشہور بستور بازنہ نمودند چون از روے شرع گرفتن این چنین چیز ہا جائز نبود من در عہد دولت خویش از آثار خوف پیش این جمیع چیز ہا دور گردانیدم"

اس شاہی فرمان کو سنانے کے لئے شاہی لشکر کے مفتی قاضی نصر اللہ ہاتھی پر سوار ہوئے اس کے سننے کے لئے عوام وخواص بڑی تعداد مین یکجا ہوئے، اور غیر معمولی خوشی سے اس فرمان کا خیر مقدم کیا گیا، اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد حکومت کی آمدنی مین تیس لاکھ تنکہ کی کمی ہوگئی، یہ محاصل .... مین بند کئے گئے تھے، (تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۵-۳۷۹)

دوسری طرف جو شرعی محصول وصول نہین کئے جاتے تھے، ان کی وصولی کا حکم جاری کیا، اور غیر معمولی احتجاج کے باوجود منسوخ نہین کیا، اس سلسلہ مین جزیہ کی وصولی کا خاص اہتمام کیا گیا،

عفیف لکھتا ہے :-

"ہمچنین بر روش دین آئین (شرع محمدی) از طائفہ زنار داران جزیہ ستدہ" (ص ۳۸۴)

اسی طرح اس نے اپنی ذاتی املاک میں بھی شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھا، اور اپنی بنوائی ہوئی نہروں سے سیرابی کے معاوضہ میں دسوان حصہ وصول کرتا، اور اوسر زمینوں کو آباد کراتا، ان املاک سے دو لاکھ تنکے وصول ہوتے تھے، اور یہ آمدنی بیت المال سے علیحدہ رہتی تھی (ص ۱۳۰)

بیت المال کی مجموعی آمدنی اس زمانہ میں کیا تھی، اس کے دریافت کرنے میں کسی قدر وقت صرف ہوگا، افسوس کہ اتنی فرصت نہیں کہ اعداد و شمار یکجا کئے جا سکیں، اگر آپ اس دور کی تاریخوں سے یکجا کرنا چاہیں تو وہ فراہم ہو سکتے ہیں، مثلاً ایک جگہ باغوں کے محصول کی مجموعی آمدنی کا ذکر آیا ہے، وہ ایک لاکھ اسّی ہزار تنکہ تھی، اسی طرح دو آب کا محصول اسّی لاکھ تنکہ وصول ہوتا تھا، اور دہلی کے جوار سے ۶ کرور پچاس لاکھ کی آمدنی تھی، عفیف لکھتا ہے :-

"در عہد دولت آن خسرو جہات یک لاکھ و ہشتاد ہزار تنکہ حصۂ دیوانی، خارج حصۂ املاک باغبانان محصول میان دوآب در آن ایام ہشتاد لک تنکہ بود، ہمچنین از بسیارے استمالت آن طالب دین شش کرو ہشتاد و پنج لک تنکہ محصول بلاد و ممالک دار الملک دہلی بود (ص ۲۹۶)

فیروز شاہ نے زکوٰۃ کے مصارف کو ان کے جائز حدود میں صرف کرنے کا اہتمام بھی رکھا تھا، ۲ لاکھ تنکہ امدادی وظائف میں دئے جاتے تھے، اور چار ہزار دو سو اشخاص مستقل طور پر وظیفہ یاب تھے، خیرات خانے قائم تھے، اور نادار دن کو ان کی لڑکیوں کی شادی کے مصارف دئے جاتے تھے، نیز عام صدقات و خیرات کا وسیع سلسلہ قائم تھا، (ص ۳۵۰، ۳۰۹، ۳۶۰)

آئین اکبری کی تصریح کے مطابق اکبر کے زمانہ تک ہندوستان میں زمینوں کی تقسیم شرعی اصطلاحوں کے مطابق تھی، اور اسی لحاظ سے اُن پر محصول واجب الادا تھا، چنانچہ ابو الفضل نے زمین کی عشری، خراجی اور

مملکی قسم اوران کی نوعیت بیان کی ہے، پھر محصولون کے لئے جو اصطلاحین ہین، اُن کو درج کیا ہے، اوران محصولون کا بھی ذکر آیا ہے جن کو سلاطین نے واجب الادا قرار دیا تھا، اور آخر مین بیان کیا ہے، کہ اکبر نے اس نظام کو بدل دیا تھا، (آئینِ اکبری ج ۱ ص ۲۰۴)

با این ہمہ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے، کہ زمین کی خراجی و عشری تقسیم اس دور مین بھی کچھ نہ کچھ قائم تھی چنانچہ ایک جگہ ذکر آیا ہے،

"ہر کہ اراضی خراجی را انگارد و بجہت علت قرق گرداند از گاو میش شش وانہ گاو سہ دام سالیانہ بازیافت کند، (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۹۹) آئین عملگذار)

اس کے بعد جب عالمگیر کا دور آیا، تو فیروز شاہ کے زمانہ کی طرح نئے سرے سے اسلامی احکام کے بموجب حکومت کا نظام مال تیار کیا گیا، مستعد خان لکھتا ہے،

"جہان پناہ نے فرمان مبارک صادر فرمایا کہ تمام ممالک محروسہ مین محاصل موافق احکام شریعت وصول کئے جائین، (مآثر عالمگیری ترجمہ اردو ص ۳۸۳)

اسی طرح غیر شرعی محاصل کی منسوخی کا اعلان کیا گیا، مآثر عالمگیری مین ہے،

"بادشاہ رعیت نواز نے غلہ اور اناج اور وجوہ دابداری و محصول اسباب و دیگر اموال سائر خاص کر محصول تمباکو کو جو بے حد کثیر رقم تھی، اور عملہ کرورگیری جس کے وصول کرنے مین تجار کو بے حد تنگ اور پریشان کرتا تھا، خاص کر مسلمانون کے لئے اور دیگر محاصل مذکورہ کو تمام رعایا کے لئے معاف فرما دیا، اور مورد ثی مطالبات مین جو رقم مناصب مین سے بتدریج مجری ہو کر خزانہ سرکار خالصہ مین ہر سال داخل کی جاتی تھی، اور جس کی وجہ سے خزانہ مین سالانہ معقول رقم داخل ہوتی تھی، یک قلم معاف فرمائی گئی (ایضاً ص ۳۰۰)

اسی طرح کارِ خیر کا انتظام بھی وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا جس کی تفصیل اس عہد کی تاریخوں میں عام طور پر ملتی ہے،

امید ہے کہ یہ اشارات ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں نظام زکوٰۃ کو سمجھنے اور اسی سلسلہ میں مزید معلومات فراہم کرنے کے لئے کافی ہوں گے،

موجودہ اسلامی ملکوں میں سے زکوٰۃ کا نظام کہاں اور کس طور پر قائم ہے، اگر اس سلسلہ میں سفرائے ممالکِ اسلامیہ مقیم ہند خصوصاً سفیر حجاز و افغانستان وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے تو شاید مناسب معلومات مہیا ہو سکیں، والسلام

"س"

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے صاحبِ ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، اُن کی پرجوش مذہبی و ملی، قومی و سیاسی، اور مختلف النوع دلکش و دلپذیر نظموں اور پرکیف غزلوں کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے چھپ گیا ہے، دیوان کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے مبصرانہ مقدمہ ہے، ضخامت ۵۰ا صفحے، قیمت :- للعہ مجلد، ملنے کا پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڈھ

رقعاتِ عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کو لکھے گئے اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت :- ے ر

ضخامت :- ۴۸۷ صفحے،

ادبیات

سرودِ روحانی

از جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی

طائرِ فکر کی پرافشانی | بن گئی یوں سرودِ روحانی
نفسِ مدح خواں کی موجوں میں | اہتزازِ نسیمِ رضوانی
کلکِ مدحت سرا کی جنبش میں | پرِ بلبل کی بال جنبانی
کیوں نہ ہو آج دل کو ہو منظور | وصفِ حُسنِ حبیبِ یزدانی
نعت ہے ایسے مہرِ انور کی | مستفی جس سے ماہ کنعانی
جس کی ہر آن جانفزائے خلق | جس کی ہر شان لطفِ رحمانی
جس کا ہر فعل آیۂ رحمت | جس کا ہر قول نطقِ حقانی
یادجس کی ہے دل کو وجہ سکون | بھولنا باعثِ پریشانی
نور جس کا فروغ صبحِ ازل | ذات بِعکس صفات سُبحانی
مردمِ چشمِ آدم و حوّا | مایۂ نازِ نوعِ انسانی
آرزوئے خلیل و جان ذبیح | مقتدائے کلیم عمرانی
مژدہ گو جس کی آمد آمد کے | ابنِ مریم مسیحِ ربانی
دُرجِ قدرت کا گوہر یکتا | بزمِ فطرت کی شمعِ لاثانی

نوبہارِ حدیقۂ اخلاق　　نگہتِ بوستانِ رحمانی

مولدِ پاک کی سعادت سے　　ارضِ مکہ سپہرِ نسیانی

اور نقشِ قدم کی برکت سے　　خاکِ یثرب شفاے روحانی

گوہرِ شب چراغ کانِ قریش　　تاجِ ہاشم کا لعلِ رُمّانی

آمنہ کے صدف کا دُرِ یتیم　　نازشِ قلزمی و عُمّانی

جس کا بچپن بہارِ حُسن کی صبح　　وجہ تزئینِ باغِ رضوانی

جس گُلِ تر کی تازگی پہ فدا　　صد بہارِ ریاضِ ریحانی

شرفِ بے مثال خُلقِ عظیم　　ہوا خالق سے جس کو ارزانی

صادق القول اور امین ایسا　　جس کے قائل تھے دشمنِ جانی

حلم اُس کا تھا جوہرِ ذاتی　　عفو اس کی تھی فطرتِ ثانی

نہ لیا انتقام دشمن سے　　تھی مظالم کی گرچہ طغیانی

اہلِ قومی زبان پہ روز احد　　حبذا لُطف کی فراوانی

فتحِ مکہ کے طرفہ منظر سے　　چشمِ افلاک وقفِ حیرانی

بدر کا وہ شجاعِ بے ہمتا　　وہ احد کا دلیرِ لاثانی

پیکرِ دل پذیر شرم و عفاف　　جس پہ قربان حیاے نسوانی

وہ شہِ ملکِ فقر جس کا گدا　　نہ کرے آرزوے سلطانی

جس کے سائل کے روبرو بے قدر　　شوکتِ قیصری و خاقانی

جس کے بیت الشرف کا کہنہ حصیر　　رشکِ غالیچہ ہاے کاشانی

قیصری جس کے در کی جاروبی　　خسروی جس کے گھر کی دربانی

اپنے کاموں میں اپنا خادم آپ باوجودِ شکوہِ سلطانی

قائم اللیل وہ کہ جس کی جبین ظلمتِ شب میں شمعِ نورانی

صائم ایسا کہ جس کی خشک لبی صوم کے حق میں آبِ حیوانی

رحم و رافت پہ اس کے ہیں شاہد بصراحت نصوصِ قرآنی

رزم میں وہ مثالِ تیغِ دودم جس کی بُرّش قضائے یزدانی

بزم میں ایسا ابرِ گوہر بار جس کی بخشش سے یم کو حیرانی

شہِ لولاک صاحبِ معراج جس کا طغرا ہے لوحِ قرآنی

وہ حبیبِ خدا کہ جس کا وجود ہے پناہِ عذابِ یزدانی

گفتگو جس کی ذکرِ ربِ جلیل خامشی جس کی فکرِ پنہانی

قامعِ کفر و ماحیِ الحاد دورِ ظلمت میں نورِ ایمانی

وہ سراجِ منیرِ محفلِ قدس جس سے روشن جہانِ ظلمانی

نیک و بد کے لئے بشیر و نذیر رہنما بہرِ انسی و جانی

حشر میں ہم سے عاصیوں کے لئے پیشِ خالق شفیعِ اذعانی

اس کے اوصاف کے صحیفے سے نقشِ حیرت مرقعِ مانی

اس کے اخلاق کی سند کے لئے حرفِ آخر کلامِ ربانی

محفلِ حق کا شاہدِ زیبا بزمِ گیتی کی شمعِ نورانی

وہ کہ جس کا جمالِ دل افروز کاشفِ پردہ ہائے ظلمانی

وہ کہ جس کی نسیمِ الفت سے نقشِ باطل ہوائے نفسانی

اے سپہرِ عطا کے مہرِ منیر ذرّہ ذرّہ پہ جس کی سلطانی

اے کہ تیرے سحاب بخشش سے	پانی پانی ہے ابر نیسانی
مجھ پہ بھی رشحۂ کرم جس سے	دور ہو بحر غم کی طغیانی
اے نگاہ کرم ادھر شاہا	میں بھی ہوں قید غم کا زندانی
اس سے آگے سخن کی تاب نہیں	حرفِ مطلب کی شرح طولانی
تجھ پہ روشن ہے میرا بخت سیاہ	تجھ پہ ظاہر ہے حال پنہانی
کیا عجب ہے طفیل میں تیرے	مور کو ہو عطا سلیمانی

غزل

از جناب شفیق جونپوری

حجاز مرکز ہے اپنی ملت کا منزلِ رہگذر نہیں ہے	تصور اپنا ہی کائناتی وطن بحدِ سفر نہیں ہے
بدل دے اے عندلیب نغمہ جو زمزمے میں اثر نہیں ہے	گراں ہے کانوں پہ لحنِ نغمہ تو کیوں نوا تلخ تر نہیں ہے
تعمیرِ نو غیر پہ گلا تھا کہ راستہ بے خطر نہیں ہے	اور آج منزل ہوئی ہے اپنی تو قافلوں کا گذر نہیں ہے
ستم ہے اے بدنصیب مالی کہ تو نے اب تک صلہ نہ پایا	کہاں ہو زمینِ چمن کی مٹی ترے پسینے سے تر نہیں ہے
کلی کلی کو ستا رہا ہے تمازتِ آفتاب کا ڈر	مٹی گلستاں سے شب کی ظلمت تو اعتبارِ سحر نہیں ہے
خود اپنی شاخوں کو قطع کرنا خود اپنے ہاتھوں مکاں خراب کرنا	چمن پہ حاصل ہوا ہے قابو تو فاتحانہ نظر نہیں ہے
جہاں قلندر نے سجدہ چھو کی زمیں تا دور جگمگا دی	ضمیر درویش کا اجالا اسیرِ دیوار و در نہیں ہے
نگاہ خود جلوہ آفریں ہو تو قدر کر ذرہ ذرہ پہ ہو جوانی	بہار بھی موسمِ خزاں ہے اگر بہارِ نظر نہیں ہے

شفیق کوئی جدید امت ظہور کرنے کو ہے زمیں پر
کہ آج تہذیبِ ہاشمی پر حجازیوں کی نظر نہیں ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

متفرقات غالب مرتبہ جناب مسعود حسن صاحب رضوی صدر شعبہ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۵ صفحے کاغذ سپید ٹائپ روشن، قیمت مجلد ؏، پتہ :- کتب خانہ ریاست رامپور سے ملے گی،

مرزا غالب کی نظم و نثر کا تمام معلوم حصہ اور اُن کے قلم سے نکلی ہوئی ہر سطر شائع ہو چکی ہے، مگر اب بھی اُن کے بعض غیر مطبوعہ نوادر مل جاتے ہیں، متفرقات غالب بھی انہی میں ہیں، جو مرتب کو ایک قلمی بیاض سے دستیاب ہوئے ہیں، اس میں فارسی کے اڑتالیس خطوط، دو قطعے، دو مثنویاں، اردو کی ایک غزل اور ایک سلام ہے، ضمیمہ میں رقعہ ناطق بنام غالب اور غالب کی مذکورہ بالا مثنویوں میں سے جس کی تفصیل آگے آتی ہے، ایک مثنوی کے بعض حصوں کا جواب ہے، مقدمہ میں لائق مرتب نے ان متفرقات کے متعلق جملہ ضروری معلومات تحریر کر دیئے ہیں، مکاتیب میں بعض وہ خطوط بھی ہیں، جو غالب کے مجموعہ مکاتیب پنج آہنگ میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن اس لئے اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے کہ مرتب کے بیان کے مطابق پنج آہنگ میں یہ مکاتیب بہت غلط چھپے ہیں، اسی طریقہ سے دو مثنویوں میں سے ایک مثنوی بادِ مخالف بھی کلیات غالب میں موجود ہے، یہ مثنوی غالب نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں وہاں کے مشہور ادبی ہنگامہ میں لکھی تھی، اس کی اشاعت کا سبب مرتب نے یہ بیان کیا ہے "کہ کلیات کی مثنوی میں کہیں لفظی ترمیم کی گئی ہے، کہیں کوئی شعر گھٹا یا بڑھا دیا گیا ہے، کہیں شعروں کی ترتیب بدل دی گئی ہے،......... اور اس کتاب میں اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتہ والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی" مرتب کا یہ بیان صحیح ہے

لیکن اس کی تصریح کر دینا چاہئے تھا، کہ یہ ترمیمیں اور تبدیلیاں خود غالب کے قلم کی ہیں، اس اجمال سے دھوکا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی ترمیمیں ہیں، مرتب کی شائع کردہ مثنوی کے متعلق اُن کا خود بیان ہے کہ "اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتہ والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی" اس نے اس کی ترمیمات یقیناً بعد کی ہیں، اور کلیات ہی کی مثنوی آخری اصلاح شدہ ہے تاہم مرتب کی شائع کردہ مثنوی سے یہ فائدہ ضرور ہوا، کہ اس کی دونوں شکلیں سامنے آگئیں، دوسری بے نام مثنوی بہادر شاہ کے حکم اور حکیم احسن اللہ خان کی ہدایت کے مطابق بہادر شاہ پر شیعیت کے الزام کی صفائی میں غالب نے لکھی تھی، خواجہ حالی نے یادگار میں اور مرتب نے مقدمہ میں اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے، یہ مثنوی غالباً غیر مطبوعہ ہے، اس سلسلہ میں مرتب نے خواجہ حالی کی اس نمایاں غلطی کی تردید کی ہے، کہ انھوں نے اس مثنوی کا نام "دمغ الباطل" تحریر کیا ہے، حالانکہ انھوں نے وثوق کے ساتھ نہیں بلکہ غالباً کرکے لکھا ہے، اور موضوع بحث کی مناسبت سے اس زمانہ کے مذاق کے مطابق نام کے متعلق اس قسم کا اشتباہ ہو جانا کوئی بعید از قیاس نہیں تھا، کتاب کے آخر میں اس مثنوی کے جواب میں لکھنؤ میں جو مثنوی لکھی گئی تھی اس کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں، بہرحال غالب کے قدردانوں کیلئے یہ متفرقات نادر تحفہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن سے بعض نئے معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس لئے مرتب کی یہ ادبی خدمت قابلِ قدر ہے،

کیبنٹ مشن اور اس کے بعد (انگریزی) مرتبہ جناب شیخ محمد اشرف صاحب تقطیع اوسط،

ضخامت ۲۳۱ صفحے، کاغذ بہتر قیمت چھ روپیہ، پتہ شیخ محمد اشرف کشمیری دروازہ لاہور،

ہندوستان اور پاکستان کی آزادی اور دونوں ریاستوں کے قیام کے سلسلہ میں ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک جو آئینی مراحل پیش آئے اُن کی پوری روداد اس کتاب میں درج کر دی گئی ہے، اور وزیر اعظم برطانیہ کے ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء کے اعلان کے بعد سے اکتوبر ۱۹۴۶ء تک اس سلسلہ میں برطانیہ نے ہندوستانیوں کے سامنے جو تجویزیں پیش کیں، اور لیگ اور کانگریس نے اس سے جو اختلافات کئے، اور جو ترمیمیں چاہیں اُن

ان دونوں میں جو کشمکش ہوئی، اور ہندوستان کے مدبرین نے جو بیان دیئے ان سب کو بغیر کسی تنقید اور اظہار رائے کے جمع کر دیا ہے، اور اُن کے حق و ناحق ہونے اور فائدہ و نقصان کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب گویا ہندوستان و پاکستان کی آئینی آزادی کی تاریخ ہے،

محی الملۃ والدین مؤلفہ جناب عون احمد صاحب قادری تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت چار، پتہ مولوی محبوب عالم صاحب خانقاہ مجیبی پھلواری ضلع پٹنہ و مولوی مقبول احمد صاحب صدیقی مدرسہ مجیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ،

مولانا محمد محی الدین مرحوم سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری و سابق امیر شریعت صوبہ بہار جامع شریعت و طریقت اور صاحب ارشاد و ہدایت بزرگ تھے، مذہبی اور ملی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہتا تھا، اس حیثیت سے اُن کی ذات نہ صرف بہار بلکہ دوسرے صوبوں کے مشائخ و سجادہ نشینوں میں ممتاز تھی محی الملۃ اُن کی سوانحعمری ہے، اس میں اُن کے خاندانی حالات، سوانح زندگی، مذہبی و ملی خدمات، علمی کمالات، ارشاد و ہدایت، اخلاق و سیرت وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تحریر کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے قلم سے صوبہ بہار میں علم و ارشاد اور صوفیہ و مشائخ اور خانقاہ مجیبی کی مختصر تاریخ ہے، یہ کتاب سلسلہ مجیبیہ کے متوسلین کے علاوہ خانقاہی سجادہ نشینوں اور پیرزادوں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ہندی رسم الخط مؤلفہ جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، محصول ڈاک کے لئے ۱۲ر کے ٹکٹ بھیجکر مصنف سے مفت ملے گی، پتہ :- بیت الاسلام سیف آباد حیدرآباد دکن،

اردو کی مخالفت میں عرصہ سے ایک پروپیگنڈا یہ بھی جاری ہے، کہ اس کا رسم الخط ناقص اور اسکے مقابلہ میں ہندی کا زیادہ جامع اور مکمل ہے، جس سے اردو کے بعض ناواقف حامی بھی متاثر ہو گئے ہیں،

یہ کتاب اس پروپیگنڈے کا جواب ہے، فاضل مصنف نے اس میں دونوں رسم الخط کے حروف کی قلت وکثرت، حروفِ صحیح وحروفِ علت، مفرد ومرکب اور متشابہ حروف، اعراب، آوازوں کے تلفظ، تحریر وکتابت کے محاسن ونقائص اور اس کی طوالت واختصار اور دوسری لسانی اور صوتی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کرکے دکھایا ہے، کہ ان تمام حیثیتوں سے ہندی رسم الخط کے مقابلہ میں اردو کا رسم الخط زیادہ جامع اور مکمل ہے، اور اس میں جو خفیف سی خامیاں ہیں، اس کی اصلاح کی تجویزیں پیش کی ہیں، یہ کتاب اردو رسم الخط کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا نہایت مدلل اور شافی جواب ہے جس کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، اس کی عام اشاعت کے خیال سے مصنف نے اس کی کوئی قیمت نہیں رکھی ہے، اور جیسا کہ انھوں نے مقدمہ میں لکھا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کرنا ضروری ہے،

زجر العوام و انذار العشائر ونجات المسلمین — مؤلفہ جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند تقطیع چھوٹی، ضخامت بالترتیب ۴۴ و ۴۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۲ر و ۲ر پتہ دار الاشاعت دیوبند ضلع سہارنپور،

آج کل عام طور سے مسلمانوں کو دینی احکام سے اتنی واقفیت اور ان کی جانب سے اتنی بے توجہی ہوگئی ہے، کہ وہ بہت سے چھوٹے چھوٹے معاملات میں محض لاپروائی کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ بے لذت گناہوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں، جن سے کسی قسم کا فائدہ نہیں حاصل ہوتا، اور اس کا ان کو احساس بھی نہیں ہوتا جن سے وہ آسانی کے ساتھ بچ سکتے ہیں، مصنف نے اس کی اصلاح کے لئے یہ رسالے تصنیف فرمائے ہیں، پہلے رسالہ زجر العوام میں اس قسم کے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی ممانعت اور ان پر وعید کی حدیثوں کا ترجمہ کر دیا ہے، اور جا بجا ان کی تشریح اور فوائد بھی تحریر کر دئے ہیں، اس کے آخر میں انذار العشائر کے نام سے علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری کے ایک رسالہ کا ترجمہ جس میں صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی فہرست ہے، بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے، تیسرے رسالہ نجات المسلمین میں ان اعمال کو

جمع کر دیا ہے، جنمین صحیح احادیث مین گناہون کا کفارہ اور اُن سے بچنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے، اور اس کی ضروری تشریح اور اُن سے متعلق فوائد و نکات بھی بیان کر دیئے ہین، لیکن ان اعمال کا آج کل کے "اصلاحی عمل" سے کوئی تعلق نہین ہے، بلکہ یہ سب اعمال عبادات، دینی احکام و تعلیمات پر مشتمل ہین، اس زمانہ مین جب کہ عموماً گناہون کا احساس بھی بہت کم باقی رہ گیا ہے، ان رسالون کا مطالعہ مفید ہے،

ابلیس کا روزنامچہ از جناب نعیم صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ چھتہ بازار گوڑہ حیدرآباد دکن،

موجودہ تہذیب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے عیب کو بھی ہنر کی شکل دیدی ہے، اور خود غرضی اور ہوا پرستی کے چہرہ پر ایسی دلفریب نقاب ڈالدی ہے، کہ اس کی اصلی شکل پہچاننا مشکل ہے، چنانچہ اس کی تعلیم، تہذیب، معاشرت، سیاست کوئی چیز بھی اس گندم نمائی اور جو فروشی سے خالی نہین، دوسری طرف اس دور کے مسلمانون کا یہ حال ہے، کہ اُن کی زبانون پر تو اسلام کا نعرہ ہے، لیکن اُن کے دل اور ان کے اعمال دونون اُن سے خالی ہین، لائق مصنف نے اس کتاب مین ان دونون امور کو شیطان کی ڈائری کی شکل مین دلکش انداز مین دکھایا ہے، کہ شیطان کیسے کیسے خوبصورت نامون اور کن کن پر فریب طریقون سے انسانون کو دھوکا دیتا ہے، یہ طرز تبلیغ نوجوانون کی اصلاح کے لئے زیادہ موثر ہے،

چمنستان فصاحت جناب سید ہمایون مرزا مرحوم بیرسٹر حیدرآباد، تقطیع چھوٹی ضخامت ۰۰ صفحے قیمت تحریر نہین، پتہ:- صغرا منزل ہمایون نگر حیدرآباد دکن،

مصنف مرحوم کا نام علمی حلقہ مین بے گانہ نہین، وہ متعدد کتابون کے مصنف تھے، شعر و ادب کا ذوق ان کو اپنے نامور اور صاحب کمال باپ شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی سے ورثہ مین ملا تھا، چمنستان فصاحت ان کا دیوان ہے، ان کی شاعری اس دور کی یادگار ہے، جب حیدرآباد مین داغ و امیر کا رنگ چھایا ہوا تھا، اس لئے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہے، زبان صاف، سلیس اور شستہ ہے، "م"